زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم بی۔ اے

نمبر ۱	جنوری ۱۹۳۱ء	جلد ۵۶

فہرست مضامین

تصاویر رُوح اور گناہ (رنگین)۔ شاہنشاہ شاہجہاں اور ایک عالم دین۔ مرگھٹ کے کنارے کا منظر۔ کالا ہرن اور اس کا نگہبان۔ شیر اور بھینسے کی لڑائی۔ مریخ کی تصویر۔ مریخ کے نباتات و حیوانات۔ مولانا محمد علی مرحوم۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت ممالک غیر سے عہ سالانہ ششماہی عہ ہندوستان کے لئے ششماہی تین روپیہ (عہ) تعمی



روح اور گناہ

زمانہ

جلد ۵۶ — جنوری سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۱

میر حسنؔ

(نوشتہ سید احمد اللہ صاحب قادری ایم-آر-اے ایس-نایب ایڈیٹر تاریخ)

میر حسن دہلوی اُردو کے ان باکمال شعرا سے ہیں جن کا نام علمی دنیا میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے آبا و اجداد شہر ہرات کے رہنے والے اور وہاں کے سادات عظام سے تھے۔ ان کے جدِ امجد میر امامی شاہجہاں بادشاہ کے آخری عہد میں ہندوستان میں وارد ہوئے میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک بن عزیز اللہ بن میر امامی تھے، جو فارسی کے شاعر ہوئے ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ بڑے زندہ دل ظریف الطبع اور صوفی منش آدمی تھے۔

میر حسن سنہ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء[1] میں محلہ سید واڑہ پرانی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی عظمت کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ تذکرہ گلزار ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں اُنھوں نے اپنے والد سے درسی کتابیں پڑھیں، اور اُنھیں کے فیض سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا میں یہ اپنے والد ہی سے کلام میں اصلاح لیا کرتے تھے۔

میر حسن نے اپنے ابتدائی زمانہ میں خواجہ سید میر درد (وفات سنہ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) سے شرف تلمذ حاصل کیا جو اُردو کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ خواجہ صاحب کی صحبت کا ان پر خاص اثر ہوا۔ اور انھوں نے جب دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ جانے کا خیال کیا تو اس وقت شیخ وقت کے حضور میں یہ رُباعی پیش کر کے اجازت چاہی:-

---

[1] سید نصیر حسین خاں صاحب خیال نے اپنے مضمون میر حسن مطبوعہ اولڈ بوائے حیدر آباد جلد ۱ نمبر ۳ میں حسن کا سنہ وفات ۱۱۴۱ھ لکھا ہے۔

جاناں ز تو امید نگاہے داریم امید نگاہے ز تو گاہے داریم
ماکشتۂ چشم سرمہ سایت ہستیم نے نامہ و نے فغاں نہ آہے داریم

بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ حسن کو سودا سے شاگردی کا تعلق نہیں تھا، لیکن حقیقت میں یہ سودا کے شاگرد تھے۔ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں جب نواب احمد یار خاں بہادر کا انتقال ہوگیا تو سودا فیض آباد چلے آئے، اور نواب شجاع الدولہ بہادر کے زمرۂ ملازمین میں شریک ہوگئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آئے۔ اس زمانہ میں میر حسن نے اپنا کچھ کلام سودا کو بغرض اصلاح دکھایا تھا۔ چنانچہ اُن کے ہم عصر اور دوست میر شیر علی افسوس (وفات ۱۸۰۹ء) نے دیباچہ مثنوی سحر البیان میں اِس کا ذکر کیا ہے:۔

"سوائے ان کے مرزا مرحوم سے بھی اُن کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح لی تھی۔ چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے[۱۵]۔"

میر ضیاء الدین ضیا اُردو کے شاعر اور مرزا سودا کے خاص شاگرد تھے۔ میر حسن لکھنؤ آنے کے بعد ان سے اپنی غزلوں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ ان کے اصول پر پوری طرح قابو نہیں پا سکے۔ اس لیے ان کو چھوڑ کر میر۔ سودا اور حضرت خواجہ میر درد کی اتباع میں کہنا شروع کیا۔

"اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہٗ سرانجام نیافت بر قدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع السودا و میر تقی میر پیروی نمودم[۱۶]۔"

آب حیات میں مولانا آزاد نے میر حسن کا ایک خط نقل کیا ہے، جو انھوں نے علی ابراہیم خاں کے نام اس وقت لکھا تھا جب خاں صاحب اپنا تذکرہ گلزار ابراہیم[۱۷] مرتب کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے میر ضیا کے تلمذ کا اقرار کیا ہے۔

میر حسن عین عالمِ شباب میں دہلی کی سکونت چھوڑ کر اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ اِس سفر میں انھوں نے ضمناً ڈیگ وغیرہ مقامات بھی دیکھے۔ جس کا مفصل حال مثنوی گلزار ارم میں لکھا ہے۔

لکھنؤ میں نواب سالار جنگ بہادر کی سرکار بڑی فیاض واقع ہوئی تھی، اُن کے بیٹے نواب میر نوازش علی خاں بھی سخن شناس تھے۔ میر حسن نے ان کی مصاحبت میں تقریباً دس گیارہ

[۱۵] دیباچہ سحر البیان صفحہ ۳ [۱۶] تذکرہ میر حسن مطبوعہ صفحہ ۵۸
[۱۷] تذکرہ گلزار ابراہیم ۱۱۹۵-۹۶ھ میں تالیف ہوا۔

سال بسر کئے۔

۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں جب نواب آصف الدولہ بہادر بادشاہ ہوئے تو اُنھوں نے دار السلطنت لکھنؤ سے فیض آباد منتقل کر دیا۔ نواب صاحب کو شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ میر حسن بیداری بخت کی اُمید میں فیض آباد چلے گئے۔ لیکن اِس جگہ بہت کم دن زندہ رہے۔ آخر ماہ ذی الحجہ میں بیمار ہو کر غرۂ محرم ۱۲۰۱ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور یہیں مرزا قاسم علی خاں[۱] کے باغچہ کے عقبی حصہ میں دفن کئے گئے۔ مصحفی سے ان کے خوب تعلقات تھے چنانچہ آپ کی وفات پر انھوں نے ذیل کی تاریخ لکھی:-

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں   رُو۔ ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی   شاعرِ شیریں بیاں۔ تاریخ یافت

مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں ان کا سن وفات ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء تحریر کیا ہے جو غلط ہے۔

علی ابراہیم خاں نے گلزار ابراہیم میں اخلاق اور عادات کے متعلق لکھا ہے کہ بہت سنجیدہ اور خوش خلق آدمی تھے، انھوں نے کبھی معیوب کلام نہیں کہا۔

میر حسن عربی سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ البتہ اُردو اور فارسی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ تمام مورخین کا بالاتفاق خیال ہے کہ ہندوستان کے شعرا کی تمام تصانیف میں کسی کی کتاب کو اتنا قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ جتنا کہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان نے شہرت دوام حاصل کی ہے اور یہی ایسی چیزیں ہیں جس سے مصنف کی علمی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ غزل کہنے میں میر سوز اور میر تقی میر کے دوش بدوش ہیں۔ ان کی غزلیں سادگی دلفریبی اور عاشقانہ رنگ میں وہی لطف دکھاتی ہیں، جو سوز اور میر کی مختص خصوصیات سے ہیں۔

انھوں نے مرثیے اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ البتہ اُن کو قصیدہ کہنے میں عبور حاصل نہیں تھا۔

میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں تین شاعر ہوئے، میر مستحسن خلیق میر محسن محسن میر احسن خلق عام طور پر مشہور اور اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پہلے دو لڑکے مرزا محمد تقی[۲] کی سرکار سے وابستہ تھے۔ میر احسن خلق نواب ناظر ارباب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ خلیق کے بیٹے

---

[۱] قاسم علی خاں کا باغچہ محلہ مفتی گنج میں واقع تھا۔ اُردوئے معلی جلد ۵ نمبر ۴ صفحہ ۴
[۲] مرزا محمد تقی نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد تھے، جو نواب آصف الدولہ بہادر کی والدہ تھیں۔

میر انیس تھے جو مرثیہ نگاری میں یکتائے زمانہ تصور کئے جاتے ہیں، انیس کے بیٹے میر نفیس تھے۔ یہ اعزاز میر حسن کا خاندانی تھا۔ اور اُن کی سپوت اولاد کے مقابلہ میں آج اُردو کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی مدّاحی حسینؑ کا دعویٰ پیش نہیں کرسکتا۔

میر حسن نے خود لکھا ہے کہ میں نے جو شاعری شروع کی ہے، وہ آج یا کل کی نہیں بلکہ میرا آبائی فن ہے۔ میر حسن کے پردادا میر امامی جنکا ذکر اوپر آچکا ہے ہفت قلم اور بڑے پایہ کے شاعر تھے میر انیس نے اپنے ایک مرثیہ میں یہ شعر لکھکر آبائی مدّاح حسینؑ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

لیکن حقیقت میں اُن کی چھٹی پشت تھی۔ چنانچہ اُن کے بیٹے میر نفیس نے وضاحت فرمادی ہے

شمشیر فصاحت یہ ہے یہ ساتواں صیقل

اِس موقعہ پر خاندان میر حسن کا ایک شجرہ پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ صرف ہندوستان میں میر حسن کا ہی ایک ایسا خوش نصیب خاندان ہے جس کی اولاد میں شاعری پشت ہا پشت سے اب تک بطور میراث چلی آتی ہے۔

میر امامی
میر عزیز اللہ
میر ضاحک
میر حسن
خلق — خلیق — محسن
میر انیس — میر مونس — میر انس
نفیس — سلیس — میر عسکری رئیس — میر وحید
جلیس
دولھا صاحب عروج — دختر
عارف

میر حسن نے کئی تصانیف اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں جن میں تذکرہ شعرائے اُردو، مثنوی گلزار ارم، مثنوی سحر البیان خاص طور پر مشہور ہیں۔

مثنوی رموز العارفین | یہ مثنوی اخلاق و تصوف میں ۱۱۸۸ھ میں لکھی گئی ہے اور میر حسن کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ اس میں مصنف نے ابراہیم ادہم بادشاہ بلخ کا سلطنت سے کنارہ کش ہو کر فقیر ہونے کا حال نہایت پر اثر انداز میں تحریر کیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی بزرگوں کے اقوال اور تمثیلیں بھی پیش کی ہیں۔ جس کے پڑھنے سے آدمی پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس میں میر صاحب نے یہ جدت کی ہے کہ دس بارہ مصرعوں کے بعد کسی مشہور اور نامور شاعر مثلاً مولانا روم، حافظ، جامی اور سعدی کے وہ اشعار تضمین کئے ہیں جو معرفت اور نصائح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا ایک خوشخط مخطوطہ ہمارے یہاں موجود ہے جس میں تقریباً ۷۰۰ ابیات ہیں۔

اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:-

ہے سزاوارِ ثنا وہ کردگار — جس نے کی وحدت سے کثرت آشکار
ایک دانے سے عیاں خرمن کیا — ایک شعلے سے جہاں روشن کیا
اور حبیب اور دوست احمد مصطفےٰ — بعد اُن کے انبیا اور اولیا
وہ جو پیرو اس کے ہیں جو دوستدار — چار یار و چار یار و چار یار

مصنف نے مثنوی کا سنہ تصنیف اور نام اس طرح لکھا ہے:-

عارفوں کی بسکہ ہیں رمزیں لکھیں — نام اس کا ہے "رموز العارفیں"
جب ہوا دُرِ معانی سے یہ طشت — تھے ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت

تذکرہ میں اپنے حالات لکھتے ہوئے میر صاحب نے اس مثنوی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کی زندگی میں کافی طور پر مشہور ہو چکی تھی۔

"رموز العارفیں گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ مشہور شدہ است۔"

اِس مثنوی کا حال آج تک کسی مورخ نے نہیں لکھا ہے، واقعی یہ نایاب ہے۔ اِس لیئے ذیل میں چند شعر درج کئے جاتے ہیں:-

تھے ملک نام محمد جائسی — وہ کہ پدماوت جنھوں نے ہے لکھی
مردِ عارف تھے وہ اور صاحب کمال — اُن کا اکبر نے کیا دریافت حال
ہو کے مشتاق اُن کو بلوایا شتاب — تاکہ ہو صحبت سے اُن کی فیضیاب
صاحبِ باطن تھے وہ مستِ الست — لیک دنیا تو ہے یہ ظاہر پرست
تھے بہت بد شکل اور وہ بد قوا — دیکھتے ہی اُن کو اکبر ہنس پڑا

جو ہنسا وہ تو اُنھوں نے دیکھ کر — یوں کہا اکبر کو ہو کر چشم تر
ہنس پڑے مالی پہ تم اے شہریار — یا کہ میرے پر ہنسے بے اختیار
کچھ گناہ میرا نہیں اے بادشاہ — سرخ یاسن تو ہوا اور میں سیاہ
اصل میں مالی تو ہے سب ایک ذات — اختیار اس کا ہے جو ہے اس کے ہات
سنتے ہی یہ حرف رویا دادگر — گر پڑا اُن کے قدم پر آن کر
الغرض ان کو باعزازِ تمام — اُن کے گھر بھجوا دیا پھر والسلام
صاحبِ تاثیر جو ہیں اے حسن — دل پہ کرتا ہے اثر اُن کا سخن

مردِ عارف ایک یحییٰ نام تھا — بھائی نے کعبہ سے اُس کو خط لکھا
یعنی اے بھائی مجھے تھی آرزو — اِن کئی باتوں کی نت تھی جستجو
پہلے تو تھی یہ تمنا سچ کہوں — بہترین اِک شہر میں جا کر رہوں
تو خدا نے کعبۂ مقصد دیا — اس پہ واجب سجدۂ شکر خدا
دوسرے میں چاہتا تھا اک کنیز — باسلیقہ باوقوف و باتمیز
سو خدا نے خادمہ ویسی ہی دی — جس کی خدمت سے عبادت میں نے کی
تیسرے اک آرزو باقی ہے یہ — دل میں اس حسرت کی میرے ہے گرہ
جیتے جی اک بار میں دیکھوں تجھے — دیکھنا تیرا میسر ہو مجھے
آرزوئیں بس ہوئیں اس پر تمام — مدعا باقی نہیں اب والسلام
پہونچا یہ نامہ جو یحییٰ کو شتاب — یوں لکھا اک نامہ اس کے درجواب
یعنی اے بھائی اگر ہے تجھ میں ہوش — رکھیو اِن باتوں پہ میری دل سے گوش
بہتریں گر شہر پایا تو نے گو — چاہیئے تو بہترین خلق ہو
ہے بزرگی شہر سے مردوں کو یا — فخر ہے مردوں کو شہروں سے بھلا
ہے مکیں ہی سے مکانوں کو شرف — قربِ گوہر ہی سے اچھی ہے صدف
شہر ہے کیا چیز تو ہو آپ چیز — جس جگہ جائے تو پھر واں ہو عزیز
دوسرے گر مردمی ہوتی تو تُو — خادمِ حق کی نہ کرتا آرزو
اپنا خادم خادمِ حق کو نہ کر — اِس خیالِ خام سے تو درگذر

خادمی در کار ہے بھائی تجھے — نہ کر مخدومی یہ کیا بھائی تجھے
ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — آں کہ خود را دید او محروم شد
ہے صفت مخدومی اُس معبود کی — خادمی ہے بندۂ نابود کی
وہ جو ہے حق کی صفت اسکے تئیں — چاہنا بندے کو ہے لائق نہیں
تیرے گر دیکھنا مدنظر — ہے میرے دیدار کا اسے بے خبر
تو تو دعوائے عاشقی کا خام ہے — عاشقی سے تجکو پھر کیا کام ہے
گر خدا سے کچھ خبر ہوتی تجھے — یاد ہی لاتا نہ تو ہرگز مجھے
رہ خدا کی یاد میں اس طرح شاد — تا کوئی بھائی نہ آئے تجھکو یاد
اے برادر اُس کو گر پایا غرض — مجھ سے پھر باقی رہی کہہ کیا غرض
اور نہ پایا جب نشاں اُس یار سے — فائدہ پھر کیا میرے دیدار سے
وہ اگر ہے یار تو سب یار ہیں — ہے اگر وہ غیر سب اغیار ہیں
آرزو رکھے تو رکھ اللہ کی — ہے یہی اک بات سب میں راہ کی
دھیان رکھ اللہ سے تو اے حسن — بھول جا دنیا کے سب رنج و محن

مثنوی کے آخر میں ستائیس بیت کی مناجات فارسی میں لکھی ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

اے صبا رَو از گدائے خستہ حال — سوئے شاہنشاہ با عز و جلال
عرض دار از من باں سلطانِ دیں — کاے طفیلت گشت پیدا آں و ایں
اے ز نورت آفتاب و مشتری — وے طفیلت جملہ انسان و پری
سیّد و سردار فخر کائنات — باعثِ ایجاد و تقریب نجات
خاکِ درگاہت دوائے دردِ ما — آب و رنگِ چہرہ ہائے زردِ ما

تذکرۂ شعرائے اردو | یہ تذکرہ میر حسن کی دوسری تصنیف ہے جس کو انھوں نے غالباً سنہ ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) یا سنہ ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) کے ابتدائی ایام میں تالیف کیا ہے[1]۔

[1] مسٹر رام بابو صاحب سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۱۹۲ھ قرار دیا ہے، اور مولانا ...

اُردو شاعری کے متعلق جس قدر تذکرے اب تک لکھے گئے ہیں اُن کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا نصف آخر ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلا تذکرہ مشہور شاعر میر تقی میر کا نکات الشعرا ہے، جو سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں تصنیف ہوا ہے۔ اس کے بعد اِسی سنہ میں فتح علی گردیزی نے اپنا تذکرہ ریختہ لکھا ہے۔ اس کے تین سال بعد سنہ ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴ء) میں قیام الدین قائم چاندپوری نے مخزن نکات کو تالیف کیا تھا۔ مخزن نکات کے تقریبًا سات سال بعد سنہ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں لچھمی نراین شفیق کا تذکرہ چمنستانِ شعرا تمام ہوا ہے۔ یہ چاروں تذکرے اُردو شاعری کی تاریخ کے اساسِ اولین ہیں۔ پہلے تین تذکروں میں کم و بیش ایک سو تیس شعرا کا حال ہے۔ شفیق نے اپنے تذکرے میں ۲۰۵ شعرا کے حالات جمع کئے ہیں۔

میر کے نکات الشعرا کے تقریبًا ستائیس سال بعد میر حسن نے اپنا تذکرہ لکھا۔ ان کے تذکرے میں تین سو شعرا کا حال ہے۔ اِس تذکرہ کا بہت بڑا حصہ مصنف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے اور فیض آباد میں نواب آصف الدولہ کے عہد میں تالیف کیا گیا ہے۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جب شعرائے اُردو کا دَورِ سوم ختم ہو چکا تھا، اور دَورِ چہارم کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میر حسن کی عمر اِس وقت تینتالیس ۴۳ سال کی ہو چکی تھی، اور وہ بہت سے شعرا سے بذات خود واقف تھے۔ چنانچہ میر، سودا، درد، اثر، مظہر کو دیکھا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا بہت بڑا حصہ مصنف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔

اِس کی تقسیم و ترتیب میں بھی خاص سلیقہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے تین دَور متقدمین، متوسطین، اور متاخرین کے ردیف وار۔ حروف تہجی کے حساب سے قائم کئے ہیں۔

دَورِ متقدمین میں فرخ سیر سے پہلے کے شعرا کا حال اور زبان ریختہ کا دکن میں مروج ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ دورِ متوسطین فرخ سیر کے آخری عہد سے محمد شاہ کے ابتدائی زمانہ پر ختم ہوتا ہے دورِ متاخرین میں اِس کے بعد کے زمانہ کے شعرا کے حالات مصنف کے عہد تک مرقوم ہیں۔

یہ تذکرہ حقیقت میں ایک غیر معمولی اَدبی یادگار ہے جس کی بدولت اُردو کی ارتقائی تاریخ کے مطالعہ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ سنہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی کے ایک

---

(۱) حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے مقدمہ میر حسن میں سنہ ۱۱۸۰ھ و سنہ ۱۱۹۲ھ تحریر فرمایا ہے۔ سکسینہ صاحب مولانا شیروانی کی تحریر سے واقف ہیں، اس پر بھی آپ نے سنہ ۱۱۹۴ھ لکھا۔ ہم نے جہاں تک میر حسن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ مثنوی گلزار ارم سے پہلے لکھا گیا تھا۔ مثنوی گلزار ارم سنہ ۱۱۹۲ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اگر یہ گلزار ارم کے بعد تالیف ہوتا تو ضرور تھا کہ میر حسن اپنے حالات میں مثنوی گلزار ارم کا بھی تذکرہ فرماتے، جیسا کہ اُنھوں نے رموز العارفین کا کیا ہے۔

مفید مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع ہوچکا ہے۔
کریم الدین صاحب نے تذکرہ شعرا میں لکھا ہے کہ یہ زبان ریختہ تصنیف کیا گیا تھا لیکن حقیقت میں فارسی زبان میں ہے۔

مثنوی گلزار ارم میر حسن کی تیسری تصنیف ہے، جو ۱۱۹۲ھ ۱۷۷۸ء میں تمام ہوئی ہے۔ گلزار ارم اسکا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۹۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔

اس میں مصنف نے اپنے سفر کا تذکرہ کیا ہے، جو انھوں نے دہلی سے لکھنؤ آنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ یہ نہایت غیر معمولی چیز ہے۔ اس سے اِن کے حالات پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب اپنے چند عزیز دوستوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے، اور دہلی سے نکلکر سب سے پہلے چند مہینے دیگ میں قیام کیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مکن پور گئے اور وہاں ایک عظیم الشان میلہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں نہایت حسین حسین اور گل اندام عورتیں بھی شریک ہوا کرتی تھیں، ان کے حسن اور پوشاک کی بڑی تعریف کی ہے مثنوی کے آخر میں لکھنؤ کی مذمت اور فیض آباد کی ستایش ہے، اور یہاں تک کہ اُسے باغ فردوس سے تعبیر کیا ہے۔

گارسن ڈی ٹاسی، بلوم ہارٹ، اور کریم الدین نے اسکو مثنوی سحر البیان کے ساتھ غلط ملط کر دیا ہے۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب کمیاب ہے۔

یہ مثنوی سحر البیان کے آخر میں مخزن پریس لاہور میں ۱۹۰۸ء میں چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک قدیم نسخہ مصنف کے عہد کا لکھا ہوا میرے کتاب خانہ میں موجود ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ہوا آوارہ ہندوستان جب سے	قضا پورب میں لائی مجکو تب سے
لگا تھا ایک بت سے واں مرا دل	ہوئی اُس کی جدائی سخت مشکل
مری آنکھوں میں وہ صورت کھڑی ہے	پیالی میں وہ چینی سی جڑی ہے
اگرچہ واں سے بس آنے تو آیا	ولے اُس کی جدائی نے ستایا

چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار
قفس میں جس طرح صید گرفتار

غرض کرتے تو کی قطعِ منازل
و لے ہر ہر قدم رہتا گیا دل

جب اُس کی بات آجاتی ہے کچھ یاد
جرس کی طرح مَیں کرتا ہوں فریاد

بہانہ رکھ جدائی کا وطن کی
میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی

بگولے کی طرح گہ مضطرب حال
گہے نقشِ قدم کی طرح پامال

بہر صورت غرض اُفتاں و خیزاں
چلا آتا تھا میں حیراں پریشاں

تشتت تھا مجھے اُس گلبدن کا
کہ پھر منہ کیوں کے دیکھونگا چمن کا

کسی سے کہہ نہ سکتا تھا میں احوال
کہ تھی شرم و حیائے عشق دنبال

مثالِ شمع جی دیتا تھا کھپ کھپ
گرے پڑتے تھے آنسو میرے ٹپ ٹپ

ہر اک میدان تھا اس اشک سے گل
کٹی برسات میں وہ اپنی منزل

کسی رہ میں نظر پڑتا تھا جب باغ
میں اپنے دل کے لگتا دیکھنے داغ

رہا میں دیگ میں آکر کئی ماہ
چلا واں سے رضائے حق کے ہمراہ

جب آیا مَیں دیارِ لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں

کیا تھا غم نے ازبس دل پہ ڈیرا
لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا

بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا
و لے جا گہ جو بد ہو تو کریں کیا

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں
کسی کا جیو پڑا تحت الثریٰ میں

نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا
زمانے پر عبث رکھنا بہانا

عجب ہے یہاں کی رسم و راہ گندی
گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں یاں غنچہ کا دم

ہر ایک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گذر ہے

فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے
ہر ایک گھر تنگ کا سا دل یہاں ہے

کہوں میں کیا قدامت اس مکاں کی
پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی

مثالِ فرد جو اینٹ اس کی ہے لال
لکھا ہے اس میں دقیانوس کا حال

یہ دیکھی میں نے جب کیفیت شہر میرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
کہ کیجئے سیر فیض آباد جاکر چلا میں یاں سے اپنا دل اُٹھا کر
جوں ہی داخل ہوا میں اس نگر میں کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورۂ آباد پایا مثال گل ہر اک دل شاد پایا

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی
بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا مجھے جنت سے جوں آدم نکالا
دعا میری یہی ہے اب شب و روز کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز
وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھروں میں چہچے کرتا جہاں میں غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رہیں میری غزل خوانی میں شامل رجب بیگ و حبیب اللہ و فاضل

مثنوی سحر البیان | یہ مثنوی میر حسن کی سب میں آخری اور مایہ ناز تصنیف ہے۔ اور اس قدر مشہور و مقبول ہوئی ہے کہ اتنی شہرت و ناموری کسی کی تصنیف کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

سحر البیان یا قصہ بے نظیر و بدر منیر ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں ختم ہوا ہے، اور نواب آصف الدولہ کے نام پر معنون ہے۔ اس میں شہزادہ بے نظیر اور شاہزادی بدر منیر کے حسن و عشق کا افسانہ ہے، اور ضمنی طور پر بہت سی حکایات بھی آگئی ہیں، جس سے قدیم زمانہ کے رسم و رواج شادی بیاہ اور پوشاک وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

یہ مثنوی اس قدر صاف اور سلیس لکھی گئی ہے کہ اس کا ہر مصرع لاجواب اور زور بیان اور تسلسل کے اعتبار سے غیر معمولی درجہ رکھتا ہے۔ اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ دلی کیفیات اور جذبات سے آدمی پوری طرح روشناس ہو سکتا ہے۔ مولانا آزاد مرحوم نے آبحیات میں نہایت تعجب سے لکھا ہے کہ سحر البیان کو تصنیف ہو کر آج ڈیڑھ سو برس کا زمانہ ہوتا ہے لیکن اس کا مصنف سو برس پہلے کی زبان سے کیسے واقف ہے۔ اور یہ وہی زبان لکھتا ہے جو آج ہم کہتے اور لکھتے ہیں۔ اس وقت کہ یہ مثنوی تصنیف ہوئی تھی بہت سے الفاظ ایسے بھی تھے جو اب متروک ہو گئے ہیں، لیکن حسن نے وہ الفاظ اپنی کتاب میں کہیں نہیں آنے دیئے ہیں۔

شمس العلما مولانا امداد امام نے بہارستانِ سخن میں سحرالبیان پر ایک بسیط نوٹ کتاب کے خلاصہ کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ذیل میں اُن کی رائے درج کی جاتی ہے:-

"ان کی مثنوی ایک نہایت حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اُردو میں تو یقیناً ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے۔ فقیر کی دانست میں فارسی اور اُردو کے کسی مثنوی نگار نے میر حسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اُس نے گویا شاعری کا لطف ہی نہیں اُٹھایا۔ اس مثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص سب کتابیں پڑھ ڈالے اور شکسپیئر، الف لیلہ اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے محروم رہ جائے۔ کوئی صاحب مذاق آدمی ایسا نہیں ہے جو اس مثنوی سے لطف کثیر نہ اُٹھائے، اور زبان اُردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے۔ یہ مثنوی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی پہلوؤں سے پُر از فوائد ہے۔ اس مثنوی کی قدر دانی سوائے حکیم کے کسی سے ہو نہیں سکتی۔ اس کی خوبیاں قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ جو قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اس کے اجزاء تناسب کے اعتبار سے خوب ہیں۔ سوم یہ کہ تشبیہات و استعارات فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ چہارم یہ کہ مبالغے اناپ شناپ نہیں ہیں۔ ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے۔ پنجم یہ کہ رسم و رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ ششم یہ کہ جو سین یعنی معاملہ خارجی بیان ہوا ہے تصویر کا حکم رکھتا ہے۔ ہفتم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پیرایۂ شاعری میں بڑی راستی اور پُر تاثیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں۔ ہشتم یہ کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ نہم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں جس کے باعث بے اختیار دل اُن کی جانب کھنچتا ہے۔ المختصر یہ مثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم کی شاعری کا پورا لطف دکھاتی ہے۔ اور اپنے مصنف کی قابلیت عام کی بڑی مثبت ہے۔"

گارسن ڈی تاسی نے مثنوی سحرالبیان اور بدر منیر کو دو علیحدہ علیحدہ تصانیف خیال کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت میں مثنوی سحرالبیان کا دوسرا نام ہے۔

میر شیر علی افسوس[۱] اور میر حسن سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ اور حسن دونوں ایک ہی سرکار یعنی نواب نوازش علیخاں کے یہاں ملازم تھے۔

---

۱ افسوس فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز اہل قلم میں ہیں۔

حسن کے انتقال کے کوئی سترہ برس بعد آفسوس نے سنہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمایش سے مثنوی پر ایک دیباچہ[1] تحریر کیا ہے۔ جس میں حسن کے حالات زندگی اور مثنوی کے محاسن مرقوم ہیں۔

ڈی ٹاسی نے تاریخ ادبیات ہند میں اسی دیباچے کی مدد سے میر حسن کے واقعات زندگی مرتب کئے ہیں۔

دیباچہ میں دیباچہ نگار نے اپنا نام وغیرہ کہیں بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ گارسن ڈی ٹاسی بھی دیباچہ نگار سے واقف نہیں ہے۔ البتہ دیباچہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دیباچہ سے میر حسن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک ہی سرکار کے دونوں نوکر اور ایک ہی صاحبزادے کے دس سال تک ہم نشین تھے۔ انھوں نے آپس میں ایک ہی طرح میں غزلیں بھی کہی تھیں۔ اس موقعہ پر ہم دیباچہ کی چند سطریں پیش کرتے ہیں:-

"دس برس تک دن رات ایک جگہ پر رہے، بلکہ آپس میں غزلیں ہم طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں۔ لیکن نہ بطور استنادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خاں مغفور نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن اس مرحوم سے بھی کیا ہے اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ ہرگاہ فقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا معترف ہے باوجود اس کے شاعری اس کی کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی۔ پھر کس لئے اس بات کا انکار کیا۔ قاعدہ ہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں، لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔ میں اُن کے ہمراہ بنارس آیا۔"

دیباچہ اور علی ابراہیم خاں کے تذکرے سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا مصنف شیر علی آفسوس ہے۔ کیونکہ علی ابراہیم نے آفسوس کو حسن کا شاگرد لکھا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ نوازش علی خاں کی سرکار میں وہ اور یہ ایک ہی ساتھ ملازم تھے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۷ء) میں آفسوس شہزادہ مرزا جواں بخت کے ساتھ بنارس چلے گئے تو اُن کا ساتھ چھوٹ گیا۔

مثنوی کے قدیم مطبوعہ نسخوں میں یہ دیباچہ شامل ہے۔ چنانچہ میرے یہاں اس کے دو[2] نسخے

---

[1] یہ دیباچہ تاریخی حیثیت سے اہم اور نایاب ہے لہذا آیندہ نمبر میں اسکو ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا۔ (زمانہ)

شمس العلما مولانا امداد امام نے بہارستانِ سخن میں سحرالبیان پر ایک بسیط نوٹ کتاب کے خلاصہ کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ذیل میں اُن کی رائے درج کی جاتی ہے:-

"ان کی مثنوی ایک نہایت حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اردو میں تو یقیناً ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے۔ فقیر کی دانست میں فارسی اور اُردو کے کسی مثنوی نگار نے میرحسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اُس نے گویا شاعری کا لطف ہی نہیں اُٹھایا۔ اس مثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص سب کتابیں پڑھ ڈالے اور شکسپیئر، الف لیلہ اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے محروم رہ جائے۔ کوئی صاحب مذاق آدمی ایسا نہیں ہے جو اس مثنوی سے لطف کثیر نہ اُٹھائے، اور زبان اُردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے۔ یہ مثنوی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی پہلوؤں سے پُر از فوائد ہے۔ اس مثنوی کی قدردانی سوائے حکیم کے کسی سے ہو نہیں ہو سکتی۔ اس کی خوبیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اول یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ جو قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اس کے اجزا تناسب کے اعتبار سے خوب ہیں۔ سوم یہ کہ تشبیہات و استعارات فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ چہارم یہ کہ مبالغے ناپ شناب نہیں ہیں۔ ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے۔ پنجم یہ کہ رسم و رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ ششم یہ کہ جو سین یعنی معاملہ خارجی بیان ہوا ہے تصویر کا حکم رکھتا ہے۔ ہفتم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پیرایۂ شاعری میں بڑی راستی اور پُر تاثیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں۔ ہشتم یہ کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ نہم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں جس کے باعث بے اختیار دل اُن کی جانب کھنچتا ہے۔ المختصر یہ مثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم کی شاعری کا پورا لطف دکھاتی ہے۔ اور اپنے مصنف کی قابلیت عام کی بڑی مثبت ہے۔

گارسن ڈی ٹاسی نے مثنوی سحرالبیان اور بدر منیر کو دو علیحدہ علیحدہ تصانیف خیال کیا ہے، لیکن یہ حقیقت میں مثنوی سحرالبیان کا دوسرا نام ہے۔

میر شیر علی افسوس[۱] اور میرحسن سے جید دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ اور حسن دونوں ایک ہی سرکار یعنی نواب نوازش علیخاں کے یہاں ملازم تھے۔

---

[۱] افسوس فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز اہل قلم میں ہیں

حسن کے انتقال کے کوئی سترہ برس بعد افسوس نے ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں ڈاکٹر جان گلگرسٹ کی فرمایش سے مثنوی پر ایک دیباچہ[۱] تحریر کیا ہے۔ جس میں حسن کے حالات زندگی اور مثنوی کے محاسن مرقوم ہیں۔

ڈی ٹاسی نے تاریخ ادبیات ہند میں اسی دیباچے کی مدد سے میر حسن کے واقعات زندگی مرتب کئے ہیں۔

دیباچہ میں دیباچہ نگار نے اپنا نام وغیرہ کہیں بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ گارسن ڈی ٹاسی بھی دیباچہ نگار سے واقف نہیں ہے۔ البتہ دیباچہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دیباچہ سے میر حسن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک ہی سرکار کے دونوں نوکر اور ایک ہی صاحبزادے کے دس سال تک ہم نشین تھے۔ انھوں نے آپس میں ایک ہی طرح میں غزلیں بھی کہی تھیں۔ اس موقعہ پر ہم دیباچہ کی چند سطریں پیش کرتے ہیں:-

> "دس برس تک دن رات ایک جگہ پر رہے، بلکہ آپس میں غزلیں ہم طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں۔ لیکن نہ بطور استفادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خاں مغفور نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن اس مرحوم سے بھی کیا ہے اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ ہر گاہ فقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا معترف ہے باوجود اس کے شاعری اس کی کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی۔ پھر کس لئے اس بات کا انکار کرتا۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں، لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔ میں ان کے ہمراہ بنارس آیا۔"

دیباچہ اور علی ابراہیم خاں کے تذکرے سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا مصنف شیر علی افسوس ہے۔ کیونکہ علی ابراہیم نے افسوس کو حسن کا شاگرد لکھا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ نوازش علی خاں کی سرکار میں وہ اور یہ ایک ہی ساتھ ملازم تھے۔ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۷ء) میں افسوس شہزادہ مرزا جواں بخت کے ساتھ بنارس چلے گئے تو ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔

مثنوی کے قدیم مطبوعہ نسخوں میں یہ دیباچہ شامل ہے۔ چنانچہ میرے یہاں اس کے دو نسخے

---

[۱] یہ دیباچہ تاریخی حیثیت سے اہم اور نایاب ہے لہذا آیندہ نمبر میں اسکو ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا۔ (زمانہ)

ہیں، ایک جان گلکرسٹ کے حکم سے بسنہ ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) میں چھاپا گیا تھا اور دوسرا عبدالماجد نامی نے مطبع طبّی میں بسنہ ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں چھپوایا تھا۔ اس کے سرنامہ پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مثنوی بجید نایاب ہے اور پانچ دفعہ آگے بھی چھپ چکی ہے۔ حال کے مطبوعہ نسخوں میں یہ دیباچہ نہیں ہے، اور بہت سے لوگ اِس سے بے خبر ہیں۔

مثنوی سحرالبیان کا ترجمہ اُردو نثر میں نثرِ بینظیر کے نام سے ہو گیا ہے، جس کو میر بہادر علی حسینی[۵۱] نے جان گلکرسٹ کے ایما سے بسنہ ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں کیا تھا۔ یہ کتاب کلکتہ میں ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں چھپ چکی ہے۔ یہ ترجمہ بامحاورہ صاف اور سلیس اُردو میں کیا گیا ہے۔ مترجم نے اس کو دلپذیر بنانے کی بے حد کوشش کی ہے۔

مرزا قتیلؔ مصحفیؔ اور فخرالدین ماہرؔ[۵۲] نے مثنوی پر تاریخی قطعات لکھے تھے، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

بہ تفتیشِ تاریخ ایں مثنوی — کہ گفتش حسن شاعرِ دہلوی
زدم غوطہ در بحرِ فکرِ رسا — کہ آرم بکف گوہرِ مدعا
بگوشم ز ہاتف رسید ایں ندا — بریں مثنوی باد ہر دل فدا
(۱۱ ۔ ۱۱۹۹)

میاں مصحفیؔ کو جو بھایا یہ طور — انھوں نے بھی کر فکر از راہِ غور
کہی اِس کی تاریخ یوں بر محل — یہ بت خانۂ چین ہے بے بدل
(۱۱ ۔ ۱۱۹۹)

سُنی جب کہ ماہرؔ نے یہ مثنوی — تو محظوظ ہو فکرِ تاریخ کی
یہ مصرع پڑھا وُہیں پاکر فرح — ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح
(۱۱ ۔ ۱۱۹۹)

کتاب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں سحرالبیان کے دو قلمی نسخے ہیں۔ اِن میں ایک نہایت قدیم خوشخط اور مطلا ہے۔ جو سنہ ۱۲۰۲ھ (۱۷۹۲ء) یعنی مصنف کی وفات کے سات سال بعد لکھا گیا تھا۔ دوسرا بھی قدیم ہے جو وفات کے اکیس سال بعد سنہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں برہان پور میں تحریر ہوا ہے[۵۳]۔ اس کے آخر میں

---

۵۱ میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے متعلق اور وہاں کے میر منشی تھے۔

۵۲ فخرالدین ماہر اشرف علی خاں پٹھان کے فرزند اور مرزا رفیع سوداؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا وطن لکھنؤ تھا۔ طبقات الشعرا از کریم الدین صفحہ ۱۹۱۔

۵۳ ان کے علاوہ ایک اور نسخہ بھی ہے، اس پر سنہ کتابت تحریر نہیں ہے، لیکن میر شیر علی افسوسؔ کا دیباچہ ہے

ایک تاریخی قطعہ ہے۔ یہ بالکل نئی چیز ہے اور کسی قلمی اور مطبوعہ نسخے میں درج نہیں ہے۔

ہیں مرزا مغل میرے اِک آشنا	یہ قصہ مجلا میرے پاس لا
کہا اس کو ٹک تم مطالعہ کرو	کہ اس کے معانی پہ تم دل دھرو
یہ کہ کر حسن نے کہانی کہی	یہی سچ ہے کہ طور اس کے نئی
کہی اس کی تاریخ یاروں نے مل	کہ جو تھے وہاں سب کے سب اہلِ دل
میاں مصحفی و رفیق[۱] و شفیق[۲]	کہ سید حسن کے ہیں دونوں رفیق
کہا تم کو ہے ذوق تاریخ کا	کہو خوش ہو تاریخ سے دل مرا
اس نامی کو تھی ان کی خاطر عزیز	ہے خاطر سے بہتر نہیں کوئی چیز
سنو یارو اب مجھ سے تاریخ کو	برائے خدا اس کی ٹک داد دو
کہ تاریخ تعمیہ میں ہے کمال	وہ عاقل جو رکھتا ہے اسکا خیال
بنائے زکا[۳] حسن بدرِ منیر	کے تاریخ قصہ کی ہے بے نظیر
ہزار آفریں اس کے ناظم کو ہو	الٰہی حسن کو رکھو سرخرو

مثنوی کے چند شعر بہ طور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:۔

کروں پہلے توحید یزداں رقم	جھکا جس کے سجدے کو اول قلم
سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں	کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

(بقیۂ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) یہ دیباچہ شروع سے مکمل ہے لیکن کاتب نے آخر کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ دیباچہ کے خاتمہ پر یہ شعر درج ہے؎

یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام　　کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

مثنوی کے ابتدائی ورق پر ایک مہر ثبت ہے لیکن صاحبِ مہر کا نام پڑھا نہیں جاتا، البتہ مہر میں سنہ ۱۲۳۷ھ لکھا ہوا ہے
انڈیا آفس کے کتاب خانہ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ نمبر ۱۴۱ پر موجود ہے جو منتد سور نامی شخص کا ہے۔ رجب سنہ ۱۲۳۶ھ کا لکھا ہوا ہے (اُردو مخطوطات از بلوم ہارٹ صفحہ ۵۶)

[۱] رفیق مرزا اسد اللہ بیگ کا تخلص تھا جو حکیم ثناء اللہ فراق کے شاگرد اور سلطان بہادر شاہ ظفر کے خاص آدمی تھے
طبقات الشعراء از کریم الدین صفحہ ۳۳۲

[۲] شفیق مظہر علی خاں کا تخلص تھا۔ ان کو حکیم ثناء اللہ فراق سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو خواجہ میر درد علیہ رحمہ کے شاگرد تھے۔ طبقات الشعراء از کریم الدین صفحہ ۳۲۹
اس قطعہ میں انہی کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

[۳] بنائے زکا کہ الف است آں را دور کند و باقی عدد آں را گرفتہ یعنی عدد ز۔ک با عدد بے نظیر مخلوط سازد عدد حاصل شود یعنی تاریخ می برآید۔

ز۔ک۔ بے نظیر
۱۱۹۹ = ۱۱۷۰ + ۲۰ + ۷ ... (۱۱　۲۰　۹۹۹)

قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا　　ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک　　تیری ذات ہے وحدہٗ لا شریک
پرستش کے قابل ہے تو اے کریم　　کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ　　کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
بہت حشمت و جاہ و مال و منال　　بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج　　خطا اور ختن سے وہ لیتا خراج
کوئی دیکھتا آکے جب اس کی فوج　　تو کہتا کہ ہے بحر ہستی کی موج
جہاں تک کہ سرکش تھے اطراف کے　　وہ اس شہ کے رہتے تھے قدموں لگے
رعیت تھی آسودہ و بے خطر　　نہ غم مفلسی کا نہ چوری کا ڈر
عجب شہر تھا اس کا مینو سواد　　کہ قدرت خدائی کی آتی تھی یاد
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم　　مگر ایک اولاد کا تھا الم
وزیروں کو اک روز اس نے بلا　　جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال　　فقیری کا ہے میرے دل کو خیال
وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب　　نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت　　فقیری میں ضائع کرو اس کو مت
مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم　　سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
بلاتے ہیں ہم اہل تنجیم کو　　نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
بلا کر انہیں شہ کنے لے گئے　　جو نہی روبرو سب وہ شہ کے گئے
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا　　چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا
یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں　　خطر ہے اسے بارھویں سال میں
نہ آئے یہ خورشید بالائے بام　　بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ　　رہے برج میں یہ مہ چار دہ
گئے نو مہینے جب اس پر گزر　　ہوا گھر میں شہ کے تولد پسر
ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر　　رکھا نام اس کا شہ بے نظیر

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ   ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان   لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار   دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا   کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال   نگہ کو وہاں سے گزرنا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں   وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
وہ مخمل کا فرش اُسکا ستھرا کہ بس   بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں تخلخے اُس میں روشن مدام   معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں   چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں
زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک   ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمرد کے مانند سبزے کا رنگ   روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
چمن سے بھرا باغ گل سے چمن   کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا   کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان   مدن بان کی اور ہی آن بان
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار   ہر ایک گل سفیدی سے مہتاب وار
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن   عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑا آب جو ہر طرف کو بہے   کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا   اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر   نشے کا سا عالم گلستان پر

پلا ساقیا مجھ کو اک جام گل   جوانی پہ آیا ہے ایام گل
غنیمت شمر صحبتِ دوستاں   کہ گل پنج روز است در بوستاں
ثمر لے بھلائی کا گر ہو سکے   شتابی سے بولے جو کچھ بو سکے
کہ رنگِ چمن پر نہیں اعتبار   یہاں چرخ میں ہے خزان و بہار

جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ سن　　مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن
کبھی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف　　کہ ہو چاندنی اس صفا کی غلاف
کبھی خوش ہے دل اور کبھی دردمند　　زمانے کا جیسے ہے پست و بلند[۱۵]

کلام میر حسن ان کا ایک دیوان ہے جس میں جملہ اقسام سخن مثلاً ترکیب بند. قطعہ. مخمس واسوخت، مثلث، (جس میں شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے) مرثیہ، رباعیات ہیں۔ تذکرے میں اپنے حال میں لکھا ہے :۔

"فقیر دریں مدت قریب ہفت ہزار بیت گفتہ باشد"

یہ بیان اس وقت کا ہے جب کہ مثنوی سحرالبیان تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ سکسینہ صاحب نے تاریخ ادب اُردو میں گیارہ مثنویات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں تین تو وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے باقی مثنویات اب ناپید ہیں جن کے نام سے ہم آشنا نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی ہجویں بھی تصنیف کی ہیں جن میں ہجو عظیم کشمیری، ہجو قصاب، نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ خاص چیزیں ہیں۔ اور یہ خاص انداز میں پُرلطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے سات قصائد مختلف اشخاص کی تعریف میں اب بھی موجود ہیں۔

قصیدہ، ہجو اور رباعی کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم　　جس کی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم
خوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جس کے　　نقش پا سے گل نرگس کو کرے دام شمیم
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب　　عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کس کے دو نیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور　　غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گذر　　کہ ہے وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم　　نائب ظل الٰہ صاحب تاج و دیہیم

ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر　　دو روپیہ کے تئیں کرائے پر

[۱۵] یہ اشعار ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ ہر ایک موقع پر میر حسن نے اس قدر تفصیل سے لکھا ہے کہ مطلق اضافہ کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اور وہ باتیں بیان کی ہیں جس سے ہم خالی الذہن ہیں۔

جان سے ہیں تنگ اُس میں لوگ — گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
پہلے اس گھر کی خوبی یہ پائی — آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
کتّہ آماس کر گیا سارا — پہلے ہی مجھ پہ گھر نے منہ مارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال — پہلے مُنہ چومتے ہی کاٹا گال
صحن اس کا بتاؤں کس مقدار — ایک دو تین چار پائی وار
پانچ بلّی کا کُنہ سا چھپّر — ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
نو کا یا دس کڑی کا اِک دالان — تِسپر اک ٹوٹے جھوپڑے کی شان
سیڑھی اک بانس کی پُرانی سی — آنے جانے کے واسطے ہے دھری
نہ تو مطبخ نہ واں مکانِ ضرور — دونوں باتوں کا واں نہیں دستور
ایک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ — صحن میں ساری جاضرور کی کیچ
تِسپہ دو ٹٹیاں برائے اوٹ — وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
ڈیوڑھی کا بند کیجئے جب در — بیٹھئے جاضرور تب جا کر
آنے والا جو کوئی آجاوے — دیکھ دروازہ بند پا جاوے
یعنی دَر جو کھلا نہیں پایا — کوئی ہے جاضرور کو آیا
گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی — گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
ٹوٹا پھوٹا جلا بھنا سارا — دھوپ سے گرم جیسے انگارا
چیز آبی و بادی اس میں کم — زور خاکی و ناری کا ہے ہم
یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ — کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
خوب یاں کا کھلا جو ہم پہ بھید — چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید
دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی — رات پلکوں سے قطرہ افشانی
گرد میں صورتیں اَٹی ہیں سب — ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب
کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار — دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے — جوں تیمم کی خاک کے تھیلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جُزداں — ہو گئے کل وہ کوہ ریگستاں
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات — جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات

تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم — ریگ ماہی ہوئے تمام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب — حرف مِٹ مِٹ کے ہوگئے ہیں خواب
صاف آٹا نہ کوئی سانے گا — خوب جب تک نہ خاک چھانے گا
کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں — خاک کھاتے ہیں کیچ پیتے ہیں

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے — معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں — یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

ولہ

کیا وحش و طیور و انس وجاں عالم میں — جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اِس غم میں
روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں — جلتے ہیں یہ دل حسین کے ماتم میں

میر حسن کے خود نوشتہ حالات اور مصحفی کی رائے

اس موقعہ پر ہم ان کی خود نوشتہ سوانح عمری جو اُنھوں نے اپنے تذکرہ میں لکھی ہے درج کرتے ہیں۔ اِس سے اُن کی فارسی تحریر کا پتہ لگ جائیگا۔ اور مشہور شاعر مصحفی ان کی نسبت جو رائے رکھتے ہیں اُس سے بھی واقفیت ہو جائے گی :-

پوشیدہ نماند کہ اصل ایں فقیر ابن غلام حسین ولد میر عزیز اللہ بن امامی ہروی از ہرات است میر امامی نور اللہ مرقدہٗ ہفت قلم و فاضل متبحر بودند بسبب فضیلت در شاہجہاں آباد آمدہ بین الاقران ممتاز گردیدند، گاہ گاہ شعر ہم میفرمودند پس ایں عاجز سخن را رشتۂ شاعری اجدادی است نہ امروزی، حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت ایں فقیر بطرف سخن بیشتر بود بارے حق تعالیٰ دریں فن کم وبیش موافق ظرف استعداد قبولیت بخشید، اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرزِ اوشاں از من کما حقہٗ سرانجام نیافت بر قدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم شروع جوانی از گردش روزگار بد ہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نکردہ است بطرف لکھنؤ وفیض آباد رسیدم۔ بارے کم وبیش از قدر دانی نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ بلب ناں رسیدہ در خدمت مرزا نوازش علی خاں بہادر صحبت گزیدم کہ خلف ارجمند اوست چنانچہ تاحال بہر نوع گزران مے نمایم اکثر بفرمایش نواب معلی القاب مرثیۂ امام علیہ السلام نیز بہ گفتن می آید از کیہ

طبع عالی آں بزرگوار در ہمہ فن بلند افتادہ است علی الخصوص در علم موسیقی کہ حصر و بیان بیرونست سوز ہائے مرثیہ طرح می نمایند و ایں حسنہ برائے آخرت است اجرہ الی اللہ و سردار جنگ بہادر نیز ہمیں طور دریں فن ذہن رسا و گوش شنوا دارد حق تعالیٰ عمر و دولت ایشاں را تا جہانست مع فرزندان قایم دارد۔ فقیر دریں مدت قریب ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ مشہور شدہ است دو سہ بندا و در اواخر قلمی خواہد شد

(ماخوذ از تذکرہ میر حسن مطبوعہ صفحہ ۸۶)

از اوایل عمر سشں طبیعتش موزوں بود اکثر خود را معدوت و مشغول ایں شغل خطیر میداشت و شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین کہ دراں ایام از مشہوراں دریں دیار بود میگذرانید بعد از آنکہ دَور دَور مرزا رفیع السودا شد و زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بحکم قوت ممیزہ بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا میر تقی میر و میاں محمد قایم وگذاشتہ زبان خود بمرتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانید۔ دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ۔

(ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

شعر کی ایک تعریف تو وہی ہے جو صدیوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہے اور علم عروض و قافیہ کی کتابوں میں عموماً کسی تغیر و تبدل کے بغیر پائی جاتی ہے یعنی شعر وہ کلام موزوں ہے جو متکلم نے بالقصد موزوں کیا ہو۔ یہ قصد و ارادہ کی قید خوش اعتقاد بزرگوں نے جس وجہ سے لگائی اُس کی تصریح کا یہ محل نہیں ـــــ دیکھنا یہ ہے کہ وزن و ارادہ کے علاوہ اور بھی کوئی چیز ہے جسے شعر کی اصل حقیقت کہہ سکتے ہیں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں بلکہ اس کی روح رواں تخئیل ہے۔ اساتذہ فارس نے بھی تخئیل ہی کو شاعری کی جان مانا ہے۔

(ماخوذ)

عہدِ مغلیہ کی مصوّری

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

سولھویں صدی کے شروع میں اور سلطنتِ مغلیہ کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ فنِ مصوری کے جدید باب کی بھی بنیاد رکھی گئی۔ جس کی ارتقا و ترقی سولھویں صدی کے آخری نصف دَور میں شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبرِ اعظم سریر آرائے سلطنت تھا۔ عہدِ جہانگیری میں مغل مصوری کا آفتابِ ترقی نصف النہار تک جا پہونچا۔ لیکن چونکہ سنگِ بنیاد کچھ زیادہ مستحکم و پائدار نہ تھا اس لئے وہ فلک بوس عمارت جو پہلوئے ریگ سے اُٹھ کر فضائے رنگین کی بلندیوں میں پہونچ گئی تھی عرصۂ دراز تک غیر متزلزل نہ رہ سکی۔ چنانچہ شاہجہاں کے بر سرِ اقتدار ہوتے ہی اس فن کا زوال شروع ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ شاہ وقت کی تمام تر توجہ فنِ تعمیر نے جذب کر لی، چنانچہ اس ذوقِ کامل نے جنونِ عشق کو وہ حسنِ صورت عطا کیا جو حشر تک ممتاز صورتوں میں سرتاج رہیگا۔

گو شاہجہاں کے اس یک طرفہ انہماک کا دوسرے فنون پر مضر اثر پڑا تاہم اس کے عہد میں فنِ تصویر کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دینے کی کوئی کوشش بھی نہیں ہوئی۔ ہاں اورنگ زیب کی ہوسِ عالمگیری نے فنونِ لطیفہ کا جنازہ ہی نکلوا کر دم لیا، لیکن اس حالتِ زبوں میں بھی مصوری افتاں و خیزاں نوابانِ اودھ کے دربار تک جا پہنچی اور برسوں ان کے زیرِ سایہ جاں کنی کی حالت میں زندگی بسر کرتی رہی۔ بالآخر اٹھارھویں صدی کے اواخر میں برطانوی سطوت و اقتدار کے نادیدہ ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر کے فنا کی میٹھی نیند سو گئی۔

عہدِ مغلیہ کی مصوری کا زمانہ کم و بیش ڈھائی سو برس تک رہا، اس کے وطن مالوف ہونے کا جائز فخر ہرات اور سمرقند کو حاصل ہے، جہاں پندرھویں صدی عیسوی میں شاہانِ تیموریہ کی سرپرستی میں ایرانی صنعت گری اوج و کمال کی انتہائی بلندی پر پہونچ گئی تھی۔ بعض اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ مغل مصوری اپنے مولد و ماوے کو خیرباد کہہ کر لالہ زارِ ہند میں چلی آئی۔

۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر امیر تیمور کا حملہ ہوا، لیکن ملکی فنون پر اِس یورش کا مطلق کوئی اثر

نہیں ہوا کیونکہ تاتاری قبائل قتل وغارتگری وخونریزی و آتش زدگی کے سوا اور کوئی دوسری یادگار اپنے پیچھے نہیں چھوڑ گئے۔ اخلافِ تیمور پر ان کے متقدمین کے جہل و بربریت کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ درحقیقت ایران کے حکمرانوں میں ان سے زیادہ مہذب، علم نواز اور دلدادۂ علوم وفنون تاجدار کسی دوسری نسل میں آج تک پیدا نہ ہوئے۔ مصوری کے آغاز وعروج کا بھی ان کی ذات بابرکات سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ چنانچہ درباری علوم ومعارف کی صف میں اس کو ہمیشہ بلند درجہ ملتا رہا اور مشہور ومعروف مصور نسلاً بعد نسل شاہی ملازموں میں شمار ہوتے رہے۔

بہزاد نے سلطان حسین والیِ خراسان کی ہنرپروری کے دامن شفقت میں رنگ آمیزی وتصویرسازی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ جب پندرھویں صدی رخصت ہو رہی تھی تو دنیائے مشرق بہزاد کو اپنے عہد کا بے عدیل وبے مثل مصور تسلیم کر چکی تھی، اور مغرب نے بھی اُسے مشرق کا سرتاج مصوراں تسلیم کر لیا تھا۔ بہزاد کے کمالات کا اندازہ اسی بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ بابر بانیِ سلطنت مغلیہ اپنی توزک میں اس کا ثناخواں ہوا اور اُسے اُس کے ہم پیشہ معاصرین پر فوقیت دی۔ بابر کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے بہزاد کے شاہکاروں کا نقادانہ معائنہ کیا ہے۔ اس یکتائے فن دیگانۂ روزگار مصور کے مائدۂ فن کے خوشہ چینوں نے ہند میں مغل اسکول کی بنیاد رکھی، اور اکبر کی فیاضانہ داد ودہش نے اسے قابل رشک تقویت دی۔

مغل بادشاہوں کی امتیازی خصوصیت ان کی علمی وفنی دلچسپیوں ہی میں مضمر رہی ہے۔ بابر نے دشمنوں کے نرغہ میں دم توڑا اور اُسے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ استحکام سلطنت کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھاتا۔ پھر تکمیلِ ذوق کا تو ذکر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ بہر نوع اکبر کا عہد ایک حد تک امن وعافیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ بعض زندہ علامات ونشانات کی بنا پر (جن کا تعلق براہِ راست صنعت گری ومصوری سے ہے) استدلال کیا جاتا ہے کہ اکبر کو فنِ تصویر سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُس نے مصوری کی بقا وبہبود کے لئے وہ کام کیا جو اُسکی شایانِ شان تھا

عہدِ اکبری میں مصوری کی جو کیفیت تھی اُس کا حال شہرۂ آفاق ابوالفضل نے آئین اکبری میں بالتفصیل قلمبند کیا ہے۔ شہنشاہ اِس فنِ رنگین کا قدردان ہی نہ تھا بلکہ اُسے مصوروں اور اُن کے تخیل کے نمونوں سے عشق کے درجہ تک دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس مد میں اُسکی بے پایاں وعام فیاضیوں کا اتنا شہرہ ہوا کہ ممالکِ غیر کے اہلِ کمال اس کے جود وسخا کے چشمۂ شیریں پر

مو، و بلخ کی طرح اُمنڈ آئے ۔ اُن متعدد ایرانی مصوروں میں سے جن پر اکبر نے اپنا دستِ شفقت رکھا چند منتخب اساتذہ فن کے نام جن کا ذکر آئین اکبری میں بھی ہے حسب ذیل ہیں :-

۱ ۔ فرخ ،
۲ عبدالصمد شیرازی ،
۳ ۔ میر سید علی تبریزی ،

اس مختصر فہرست سے مغل اسکول کی ابتدائی کارگذاری اور بنیادی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ، نیز اس ماحول پر بھی کافی روشنی پڑجاتی ہے جس کے زیر اثر اس کی نشو و ارتقا ہوئی ۔ بیرونی مصوروں کی آمد و رفت کا سلسلہ اکبر کی وفات کے بعد بھی برابر جاری رہا چنانچہ جہانگیر کے عہد میں سمرقند کے اکثر ماہرینِ فن دشوار گذار منزلیں طے کر کے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عہدِ مغلیہ کے مصوروں پر ایرانیوں کا مستقل اثر پایا جاتا ہے ۔ اِن واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مغلوں کی طرح مغل مصوری بھی بیرون ملک سے اجنبیت و مغائرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہند میں داخل ہوئی ۔ مگر جس طرح مغل بتدریج ہند کے باشندوں میں خلط ملط ہو کر ہندوستانی شمار ہونے لگے اُسی طرح مغل مصوری بھی ہندوستان کی ملکیت بن گئی ۔

اِن غیر ملکی اہلِ کمال کے دوش بدوش باکمال ہندی مصور بھی دادِ فن دیتے اور بلند حوصلہ و اُلوالعزم شہنشاہ سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ۔ درباری مصوروں میں ابوالفضل نے چند ہندوؤں کے بھی نام گنائے ہیں ، مثلاً :-

۱ ۔ بساون (Basawan)
۲ ۔ وسونت (جسونت)
۳ ۔ کیسوداس ، وغیرہ

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کی قدردانی و کمال پروری ہمیشہ تعصب سے محفوظ رہی ہندو مصوروں نے جس حُسن و خوبی کے ساتھ ایرانیوں کے اثرات کو جذب کیا اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے مربّی کے ایما سے نظامی اور دیگر فارسی شعرا کے شاعرانہ جذبات کا تصویر کے پردے میں ایسا عکس اُتارا ، کہ خود ایرانی مصور عش عش کرنے لگے ۔ اِن مصوروں کے شاہکار دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اُن کے کمالات نے صفحۂ دنیا پر صرف چابکدستی



ایک سڑک کے کنارے کا منظر
اٹھارویں صدي (کانگڑہ قلم) کي
هندوستاني مصوري کا نمونه



شاهنشاه شاهجہاں ایک عالم دین کي خدمت میں
سترهویں صدي (عہد مغلیه) کي هندوستاني
مصوري کا نمونه

ہی کا سکہ نہیں بٹھایا بلکہ اُن بزرگوں کا نام بھی ابد تک کے لئے روشن کر دیا جو برسوں اجنتہ کے غاروں کی آرائش و زیبائش کا سامان فراہم کرنے کیلئے کارفرما ہے۔

ایرانی مصوروں کے اثرات قبول کرنے سے پہلے ہندو مصور قدیم اصولوں پر کاربند تھے مگر جیسا پروفیسر براؤن[۱] کا خیال ہے اُن کے آنے کے بعد دو مختلف الاصول ماہرین نے ایک ایسی جدید راہِ عمل کی داغ بیل ڈالی جو اس تعاون و اشتراک کا قدرتی نتیجہ تھی اور جس پر ہر کس و ناکس بید ریغ گامزن ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ بادشاہ کی پسند مقدم تھی اس لئے ہندوؤں کو اپنا راستہ بدلنا پڑا۔ تاہم ایرانیوں نے اُن کی خصوصیات سے ایک بڑی حد تک استفادہ کیا۔

بعض قدیم تحریروں سے مغل مصوری کے عام حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ تقریباً تمام اہل الرائے اِس بارے میں متفق ہیں کہ یہ لوگ سرکاری ملازم شمار ہوتے تھے، حالانکہ انھیں کوئی مقررہ تنخواہ نہیں دی جاتی تھی، لیکن ہر کارنامہ پر بطور انعام و اکرام ایک معتدبہ رقم ملجاتی تھی جو تمام لوازم زندگی کی کفیل ہوتی تھی۔ بادشاہ اُن کی بڑی آؤ بھگت کرتا اور خلوص کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُنھیں دربار میں امتیازی جگہ ملتی تھی۔

مغل مصوری کے مختلف قلم ہیں، یہ تقسیم یا تو جغرافیائی نقطۂ نظر سے عمل میں آئی ہے یا وضعِ تشکیل و تراش کی معمولی تبدیلیوں پر مبنی ہے۔ بہرصورت ان میں سے بعض مشہور قلم یہ ہیں:-

۱- دہلی قلم
۲- لکھنؤ قلم
۳- دکھنی قلم
۴- ایرانی قلم
۵- کشمیری قلم
۶- پٹنہ قلم
۷- جے پور قلم

---

[۱] پروفیسر موصوف کے بیان سے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغل اسکول کے وجود سے پیشتر مصوری کی کیا کیفیت تھی؟ مگر یہ ایک ایسا عقدۂ لاینحل ہے جس کی بابت خود پروفیسر براؤن بھی زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ۵۲ پرسی براؤن۔

اکبر کے عہد میں صرف دو طرز گل مروج تھے جن کا فرق بآسانی نمایاں کیا جا سکتا تھا۔ درباری مصوری میں مادیت کا عنصر غالب تھا اور وہ عوام کی طرز معاشرت و ملکی خصوصیات سے بالکل معرا تھی۔ دربار میں یہ فن رنگین شاہی تفریح و دلبستگی کا ایسا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا جس سے باہر کی دنیا قطعاً بے بہرہ تھی۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی اس کا چرچا شروع ہوا، اور اب مصور آزادانہ زور قلم دکھلانے لگے۔ اسی آزادانہ روش نے طرز جدید کی صورت اختیار کر لی جو رفتہ رفتہ درباری انداز و ادا سے دُور ہوتی گئی۔

عہد مغلیہ کی مصوری بحیثیت مجموعی حقایق کا بے نظیر مرقع پیش کرتی ہے۔ جہاں شاہی انداز اور درباری زندگی کی شاندار تصویر کے علاوہ عام مذاق کا مسالہ شاذ و نادر ہی نظر آجاتا ہے۔ مغلی اسکول کے فنی کارنامے نہ تو طول و عرض ملک میں بودھوں کے تخلیق کی ہمسری کر سکتے ہیں اور نہ ان میں فلسفۂ مذہب کی وہ تابناک جھلک نظر آتی ہے جس نے زمانۂ بودھ کی مصوری کو قبول عام کی خلعت بخشی تھی۔ غالباً مغلوں کی تصویر کشی کے پردے میں پابندی شرع و پاس مذہب کا مخلوط جذبہ بھی مستور ہے۔

ابتک صرف ایسے چالیس افراد کا پتہ لگا ہے جنھوں نے اکبر کے زمانہ میں دل کھول کر داد فن دی تھی۔ لیکن ان کی سرگرمیوں سے مصوری کی روز افزوں ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غرض اِس بلند پایہ و عالیشان مصوری کی تکمیل جس کا سنگ بنیاد بابر نے رکھا تھا جہانگیر کے عہد میں ہوئی۔

سترھویں صدی کے اول نصف دَور میں مغربی سیاحوں کی آمد آمد کا غلغلہ ہوا، ان میں سے بعض نے زندہ دل جہانگیر کی ان غیر معمولی دلچسپیوں کا بڑے دلکش پیرایہ میں تذکرہ کیا ہے جو مصوری کے دامنِ رنگین سے وابستہ تھیں۔ خود جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں مصوری کا راگ گایا ہے۔ درحقیقت بادشاہ اپنے عہد کے مصوروں پر جس قدر نازاں ہوتا کم تھا۔

اِس کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دَور میں بھی ہندو مصور اپنے معاصرین سے پیش پیش رہے۔ جہانگیر نے برملا بشن داس کو اپنے عہد کا لاثانی مصور تسلیم کیا ہے۔ بشن داس کو خط و خال کی تشکیل اور وضع شبیہ میں اس قدر ملکہ حاصل تھا کہ خود اہل فارس کی بھی وہاں تک دسترس مُحال تھی۔ دُور دُور تک اُس کا ثانی نظر نہ آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جگہ اُس کی پرستش تھی۔ ایک بار جہانگیر نے اُسے شاہ عباس صفوی اور اس کے دربار کے دیگر ممتاز امرا و وزرا کی تصویر بنانے کے لئے ایران بھیجا جہاں مصور موصوف

نے بڑے کمال وخوبی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دیے اور اِس حسنِ خدمت کے صلے میں بیش بہا تحائف کے علاوہ اس نے ایک ہاتھی بھی انعام پایا۔

جہانگیر کے عہد کے اساتذۂ فن کی کوششوں کا حاصل سواری وشکار کے دلکش مناظر، والیانِ ملک، صاحبِ اقتدار رؤسا اور غدارسیدہ وجہاں دیدہ بزرگوں کی بارعب وتقدس مآب تصاویر ہیں کبھی کبھی آزادِ مطلق چرند وپرند، خودرو نباتات، اور سبزہ زاروں کے بصیرت فروز عکس سے بھی حسنِ صفات کو نمایاں کیا جاتا تھا۔ غیر معمولی پھولوں اور نایاب ونادرالوجود جانوروں کی تصویریں بھی بادشاہ کی خاص فرمایش سے تیار ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض نوادر تو ابتک موجود ہیں اور اہلِ بینش کے روبرو اپنے بنانے والے کے کمالِ فن کا زندہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

جس وقت مغل مصوری عروج واقبال کے آخری منازل طے کر رہی تھی مغربی حسن وانداز کے چند اعلیٰ نمونے ہندوستان لائے گئے، جہانگیر کے اشارہ پر اُن کی نقلیں لی گئیں اور اس شعبہ میں بھی مغل مصوروں نے اپنا کمال فن دکھایا۔ بالعموم یہ تصویریں مسیحی تعلیم وتلقین اور ان افسانوں کا آئینہ تھیں جو مسیحی معبدوں اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں، شاید اسی لئے اُن کی نقل اہمیت قبول عام کا شرف حاصل نہ کرسکی۔

اہل مغرب اپنے ہمراہ ایک نیا مذہب اور اس کی نشرواشاعت کا خیال بھی لائے۔ چنانچہ برسوں تبلیغ مذہب کی ہوس فنِ تصویر کے پردے میں روپوش ہوکر عوام کے دلوں کو اپنے تیرِ نظر کا نشانہ بنانے کی سعیِ لاحاصل میں منہمک رہی۔ مگر لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوئے، گو ہندوستانی مصور کبھی کبھی ان کی نقلیں اُتار کر اپنے ادراک کمال کا ثبوت دیتے رہے۔

شاہجہاں کے تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے ہی مصوری کا زوال شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ہندی مصور اُس شاہراہِ عمل سے دور ہوتے گئے جو مدتوں کی کشاکش کا نتیجہ تھی، اب نہ وہ خصوصیت ہی باقی رہ گئی تھی جو عہد مغلیہ کی مصوری کی میراث ہوگئی تھی اور نہ وضع وتشکیل جذبات میں وہ پاکیزگی ونفاست نظر آتی تھی، جو جہانگیر کے عہد میں عام تھی۔ حالانکہ شاہجہاں کے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی فنِ تصویر برسوں زندہ رہا، مگر اس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ چونکہ حکومت کا صدر مقام دہلی تھا اور مصوری شاہی دربار میں پروان چڑھی تھی اسلئے دہلی قلم عرصۂ وجود میں آیا۔ جو آج تک اِس زوال کی حالت میں بھی اپنے بقائے حیات کے لئے کم وبیش کوشاں ہے۔

اورنگ زیب کے تعصب کی چیرہ دستیوں نے ضعیف العمر مصوری کو جلد ہی صفحۂ ہستی سے

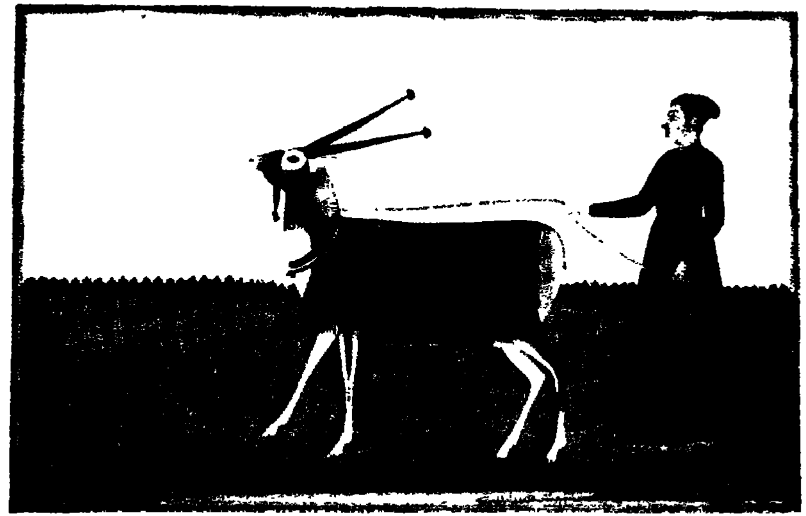
مٹا دینے کا سامان فراہم کر دیا۔ بعض امرائے دربار جو جہانگیر کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اب بھی اس فنِ لطیف کی رنگینیوں کو برقرار رکھنے کے خیال میں تھے۔ چنانچہ چابکدست مصوروں کی قدر دانی میں بڑی دریا دلی دکھاتے تھے۔ مگر چونکہ اب اس متحدہ نظام کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا جو بادشاہ کے زیرِ نگیں حسنِ عمل کے رنگا رنگ جلووں سے اپنے ماحول کو معمور کر رہا تھا اس لئے اس کا تنزل بالکل یقینی بات تھی۔ پس اس پریشانی کے ہاتھوں تنگ آ کر مصوری ملک کے مختلف اقطاع میں بکھر گئی اور اس طرح مختلف قلموں کی صورت میں اطرافِ ملک میں اپنا رنگ جمانے لگی۔

اورنگ زیب کے فاتحانہ حملوں کا طوفانِ عظیم مصوری کو دکن بہالے گیا۔ جنوبی ہند نے اس کا پُرجوش استقبال ہی نہیں کیا بلکہ اس کے قالب بیجان میں تازہ روح پھونک دی۔ یہ حیاتِ نو پانے کے بعد مصوری نے دکنی قلم کی بنیاد رکھی، اور شاہراہِ ترقی پر بسرعت گامزن ہونے کے لئے ایک جداگانہ انداز اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری ایسی مثال نہیں ملتی جہاں شمالی ہند سے نکل کر مغل مصوری نے اپنا سکہ چلایا ہو۔

دکنی قلم کے آخری ایام دکن سے کوسوں دور پٹنہ (بہار) کی سرزمین میں بسر ہوئے۔ دکنی وضع کے مصور اپنے بزرگوں کے وطن کی بھی خاک چھانتے پھرے مگر ناموافق حالات نے انھیں وہاں دو گھڑی بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اور قسمت کے مارے مصور تلاشِ معاش میں برسوں اِدھر اُدھر سرگرداں رہے۔

روایت ہے کہ اورنگ زیب اس لئے مصوری کے درپئے آزار ہوا کہ ایک دفعہ چغل کماری نے اُس کی شبیہ کی بُری طرح تذلیل و تحقیر کی تھی اور جس کا انتقام اُس نے شرع کی آڑ لیکر لیا، بہرحال اس کے عہدِ سلطنت میں یہ فن کوئی ترقی نہ کر سکا۔ اورنگ زیب کے صاحبِ فراش ہوتے ہی ملک کے سیاسی مطلع پر بدنظمی و ابتری کے تاریک بادل چھا گئے۔ تاہم اس کے بعد دیگر شاہانِ مغلیہ نے تا بہ مقدور اس فن کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ حتیٰ کہ یہ فن نوابانِ اودھ کی نظر چڑھ کر لکھنؤ جا پہونچا۔ لکھنؤ کی رنگین فضا میں سانس لیکر مصوری نے بھی نئے انداز نکالے، اور اس قدر فروغ پایا کہ واجد علی شاہ کی قدِ آدم تصویر ایسی پاکیزگی کے ساتھ بنائی گئی کہ ایک بار نظر ملتے ہی دنیائے مغرب کی مغرور حیا دوشیزہ کے ہواس پرّاں ہو جاتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام تک مصوری بیحد خراب و خستہ حال ہو گئی تھی۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں پرتکلف مشاطۂ مغرب نے اس پیرانہ سال عروس کے غبار آلود چہرہ پر غازۂ رنگین ملا اور از سرِ نو اس کی آرایش و زیبایش کے طور نکالے۔



کالا ہرن اور اُسکا نگہبان
سترھویں صدی (عہد مغلیہ) کے ہندوستانی مصوری کا نمونہ



بھینسے اور شیرنی کی لڑائی
ابتدائے سترھویں صدی (عہد مغلیہ) کے ھندوستانی مصوری کا نمونہ
جسکی اصل برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے

اِس دورِ جدید میں چھوٹے پیمانہ کی تصویریں مرغوب ہوئیں، اور یہی مشغلہ عمومیت کا جامہ زیب تن کر کے اکتسابِ معاش کا ایک معمولی آلۂ کار بن گیا۔ ہندی مصوّروں کی کثیر تعداد نے مغربی مذاق کے مطابق اپنی روش بالکل بدل ڈالی۔ اِس تبدیل ہیئت سے وہ خود اپنے ہاتھوں آپ اجنبی بن گئے۔ لیکن یہ بھی اقتضائے زمانہ تھا اور شاید ایسا کئے بغیر کچھ بن نہ پڑتا۔ سیکڑوں باوقار خاندانی مصوّر لیستہ دیائے جان کمپنی کے سوداگروں کی حسبِ منشا اُن کی تصویریں بناتے پھرتے تھے۔ اِس کس مپرسی و بے توقیری نے مغل اسکول کی بنیاد ہلا ڈالی اور اُسے ہمیشہ کے لئے معدوم کر دیا۔

ہندوستان اور اس کی اُردو زبان کی خصوصیات و تعلقات نے اُردو شاعری میں وہ رموز شاعری، نکات شعری اور قیود فنی جمع کر دیے ہیں کہ وہ صرف یورپ کے اشعار میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں نہیں ہیں۔ بعض خالص انگریزی داں اُردو شاعری کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی وہاں کی طرح ہر ادیب شاعری کا نقاد ہو سکتا ہے۔

اکثر نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی نقادی کے لئے شاعری میں کمال حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جو لوگ اُردو کی ان خصوصیات امتیازی سے واقف ہو گئے ہیں وہ اِس جوئے کو شاعری کی گردن سے اتار لینا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شعر میں جس قدر قیود ہیں سب فضول ہیں۔ مگر اُردو کے وہ مخصوص اُصول جو اس کو تمام دنیا کی شاعری سے ممتاز اور لطیف بنا رہے ہیں ہرگز قابلِ اخراج نہیں ہیں۔

(ماخوذ)

نواب صدر جہاں بیگم

از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی

اودھ کے فرمانروا سب نیشاپوری تھے، اور اُن کا طرزِ تمدن بھی نیشاپوری تھا۔ نیشاپور کی سب سے پہلی بیگم جو اودھ میں داخل ہوئیں اُن کا نام نوابِ صدر جہاں بیگم تھا، اور بڑی بیگم کے نام سے مشہور تھیں اِن کی مادری زبان فارسی تھی اودھ میں اُردو زبان حاصل کی، نہایت ذکی اور بیدار مغز عورت تھیں۔ فیاض نیک دل اور اپنے شوہر کی مطیع، اِن کے مورثِ اعلیٰ کے اودھ میں داخل ہونیکے حالات میں لکھا ہے کہ:-

میر محمد یوسف شاہ عباس ثانی کے دربار میں اِس خدمت پر مامور تھے کہ جب بادشاہ شکار کو جاتے تھے سواری سے آگے آگے گھوڑے پر سوار ہوکر چلتے تھے۔

ایرانی قواعد کے موافق یہ منصب سوا سادات کے دوسرے کو نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن بادشاہ شکار کے لئے جنگل میں جارہے تھے کہ ایک شیر ببر جھاڑیوں سے نکلا اور بادشاہ پر حملہ آور ہوا۔ میر محمد یوسف نے اپنی جان کی کچھ پروا نہ کی، گھوڑے سے کود کر شیر کے سامنے آموجود ہوئے اور پیش قبض مار کر شیر کا خاتمہ کر دیا۔

بادشاہ اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے اس سے ان کو کچھ صدمہ نہیں پہونچا۔ اِس جاں نثاری کے صلہ میں بادشاہ نے چاہا کہ ان کو اپنا وزیر بنائے، مگر میر محمد یوسف وزیرِ عہد ہی کی سفارش سے شاہی دربار میں ملازم ہوئے تھے اور وزیر سے اُن کی گہری دوستی تھی، اِس لئے ہاتھ باندھکر بادشاہ سے عرض کی کہ فدوی سیّد ہے اور سیّد سے یہ خدمت نہیں ہوسکتی اِس لئے اِس سے مجھے معذور رکھیئے، مگر اتنی گزارش ہے کہ محمد نصیر میرا چچازاد بھائی ہے اُس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اُمیدوار ہوں کہ وزیر رضا قلی بیگ کی دختر سے اُس کا نکاح ہوجائے۔ تو میرے واسطے باعثِ عزت ہوگا بادشاہ نے اِس درخواست کو قبول کرلیا، اور دوسرے دن وزیر سے فرمایا کہ میر نصیر ہمارا بیٹا ہے، تم اپنی بیٹی سے اُس کی شادی کردو۔ وزیر نے دست بستہ عرض کی، مجھے اِس میں کچھ عذر نہیں، لیکن اتنی درخواست ہے کہ اگر میر نصیر سے کوئی بیٹی پیدا ہو تو میری قوم قزلباشیوں میں منسوب کی جائے

اور یہ دستور نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے۔ بادشاہ نے اِس شرط کو بخوشی منظور کرلیا۔ اور یہ شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔

دونوں میاں بیوی نہایت آرام سے رہنے لگے، ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بموجب قرارداد کے قوم قزلباش جعفرخاں بیگ بن محمد قنجان بیگ بن منصور سے جو بادشاہ ترکمان مرزا یوسف قراشاہ پراغ کی نسل سے تھے منسوب ہوئی۔ اُن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام میر محمد باقر رکھا گیا۔ دو برس کے بعد دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام میر محمد امین رکھا۔ کچھ مدت کے بعد جب میر محمد امین جوان ہوئے تو میر نصیر نے اُن کی شادی میر محمد یوسف کی دختر خدیجہ بیگم سے کردی، میر محمد یوسف میر محمد امین کے حقیقی چچا تھے اور اُمرائے نامدار سے تھے، جائداد بہت رکھتے تھے اور خدیجہ بیگم کے سوا کوئی اولاد نہ تھی اِس لئے اُنھوں نے میر محمد امین کو خانہ داماد بنا لیا۔ میر محمد امین اپنے چچا کے پاس رہنے لگے اور نہایت آرام سے زندگی بسر ہونے لگی۔ سال بھر کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کی ولادت کی بہت خوشی ہوئی، اس کا نام صدر جہاں بیگم رکھا گیا۔

۱۱۵۱ھ میں میر محمد نصیر اپنے بڑے صاحبزادے میر محمد باقر کو ہمراہ لیکر بتلاشِ معاش ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے، اور جہاز کی سواری پر عظیم آباد میں پہونچے۔ وہاں کسی اچھے خاندان میں میر محمد باقر کی شادی کی، میر محمد باقر سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میر نیاز محمد رکھا، جسے آخر میں نواب شیر جنگ کا خطاب ملا، اُنھیں کے نام سے لکھنؤ میں باغ شیر جنگ مشہور ہے۔

میر محمد امین نہایت نیک مزاج تھے اور ابھی تک آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے لیکن میر محمد یوسف کے تمام عملے والے اُن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور خدیجہ بیگم کو یہ بے عزتی شوہر کی ناگوار تھی۔ ایک دن موقع پر اس نیک بخت نے میر محمد امین سے کہا کہ "تم یہاں پڑے ہوئے سُسرال کی روٹیاں توڑ رہے ہو، یہ امر اگرچہ ہمارے والدین کے عین منشا کے موافق ہے تاہم اہل عملہ بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں، اِس میں ہماری اور تمہاری دونوں کی بے عزتی ہے، افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے سُسر میر محمد نصیر ہندوستان چلے گئے ورنہ ہم اُنھیں کے ساتھ چلکر رہتے۔ ماشاءاللہ تم خود جہاں دیدہ ہو محنت مزدوری کرکے چار پیسے کماؤ اور ہم کو الگ مکان میں رکھو تو ہماری آنکھ میکے میں نیچی نہ ہو۔" بی بی کی یہ بات میر محمد امین کے کلیجے پر تیر کی طرح لگی۔ صاحب غیرت تھے بُرا معلوم ہوا، باپ کو یاد کرکے خوب روئے۔ اس کے بعد آنسو پونچھ کر خاموش ہو رہے۔ ایک دن فاقہ کیا، دوسرے دن پوشیدہ پوشیدہ سامان سفر تیار کرکے اور رات ہی رات بی بی اور کمسن لڑکی صدر جہاں بیگم کو ہمراہ لیکر

توکل بخدا گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اور جہاز پر سوار ہوکر سیدھے ہندوستان کا رخ کیا۔ ابھی جہاز میں سوار تھے کہ دریا سے ایک مچھلی اوچھل کر میر محمد امین کی گود میں آرہی، اُنھوں نے اس کو شگون نیک سمجھکر اپنے پاس رکھا، یہ مچھلی شاہان اودھ کے خزانہ میں مدت تک رہی۔ کچھ دنوں کے بعد میر محمد امین مع بی بی خدیجہ بیگم اور صدرجہاں بیگم سنہ ۱۱۲۰ھ میں ہندوستان پہونچے، اثنائے راہ میں دوتین روز کرنال میں مکان کرایہ لیکر قیام کیکے مصائب سفر سے آسودگی حاصل کی۔ اِسی مکان میں ایک روز پچھلی رات کو صدرجہاں بیگم نے خواب دیکھا کہ سورج ان کے پیٹ سے پیدا ہوکر بلند ہوتا جاتا ہے اور اُس کی روشنی ہر طرف پھیلتی جاتی ہے اور سب لوگ اس کی روشنی میں کام کرتے ہیں اور سب خوش وخرم ہیں۔
صبح کو لڑکی نے باپ سے خواب بیان کیا اس وقت لڑکی کی عمر سات برس کی تھی، میر محمد امین نے دریافت کیا کہ اس شہر میں کوئی تعبیر دینے والا ہے، لوگوں نے کہا میر جعفر ساکن کرنال بہت اچھے منجم ہیں اور خواب کی تعبیر اُن سے بہتر کوئی نہیں دیتا۔ میر صاحب طلب کئے گئے اور لڑکی نے اُن کی شکل دیکھ کر نہایت ادب سے سلام کیا۔ خواب سُنکر کہا کہ حقیقت میں یہ لڑکی بہت خوش نصیب ہے، اِس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو باون ہزاری ہوکر اودھ کی وزارت پر سرفراز ہوگا، اور آخر میں اُس کی نسل اودھ پر بادشاہی کرے گی۔ میر محمد امین اِس تعبیر سے بہت خوش ہوئے اور میر جعفر کو کچھ نقد دیکر رخصت کیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ میر محمد امین کی دختر کا نام صدرالنسا بیگم تھا۔ میر محمد امین ابھی ہندوستان میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے باپ میر نصیر نے انتقال فرمایا اس خبر کو سنکر میر محمد امین کو بہت صدمہ ہوا اور عظیم آباد میں پہونچکر معاش کی فکر لاحق ہوگئی۔

عظیم آباد اُس وقت ناظم بنگالہ کے متعلق تھا۔ شجاع الدولہ ناظم نے کچھ تنخواہ بطور مدد خرچ معین کی، میر محمد امین نے اس کو اپنے مصارف کا مکتفی نہ سمجھکر وہاں سے کوچ کیا اور صوبہ گجرات کی سرکار میں نواب سربلند خاں کے یہاں خیمہ نصب کرنے پر مامور ہوئے۔ ایک دن اتفاق سے رات بھر شدت سے پانی برسا اور خیمہ کے اندر پانی بھر گیا۔ نواب ان پر بہت خفا ہوئے اور فرمایا تمہارے دماغ سے یہ ہفت ہزاری نہیں جاتی۔ ان کو یہ کلمہ بہت ناگوار ہوا، فوراً نوکری چھوڑکر دہلی روانہ ہوئے، اِس زمانہ میں فرخ سیر دہلی کے بادشاہ تھے، اُن تک تو رسائی نہ ہوئی لیکن شہزادوں تک رسائی حاصل کرکے جاگیر کا ٹھیکہ لیا، اس ٹھیکہ کا روپیہ ادا کرنے کے بعد بھی جو روپیہ بچتا تھا اُس میں سے چہارم شہزادوں کے نذر کردیتے تھے۔ ان کی ایمانداری اور دیانت سے تمام شہزادے خوش تھے۔ دیانت اور ایمانداری ایسا زینہ ہے جو انسان کو ترقی کے بام تک پہونچا دیتا ہے۔ چنانچہ شہزادوں کے وسیلہ سے بادشاہ تک

رسائی ہوئی اور بادشاہ نے انھیں ہفت ہزاری کا منصب عنایت فرماکے داخل زمرۂ امرائے سلطنت کیا۔ پھر رائے رتن چند وزیر سلطنت کے ذریعہ سے بندوبست علاقہ منڈلان کا حاصل کیا۔

ان کی بیوی خدیجہ بیگم بیمار ہوئیں، چندہی روز میں حالت ایسی ہوگئی کہ اطبا نے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس بیماری میں صدر جہاں بیگم نے ماں کی بہت خدمت کی لیکن صحت نصیب نہ ہوئی۔ ماں کے انتقال کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اسی زمانہ میں فرخ سیر بادشاہ بھی قتل کئے گئے۔ اس واقعہ کے سال بھر کے بعد میر محمد امین نے اپنی دوسری شادی محمد تقی خاں کی دختر سے کی۔ سلطنت کے کارکن عبداللہ خاں اور حسن علی خاں دو بھائی تھے اور یہی فرخ سیر کے قاتل بھی تھے۔ انھوں نے مرزا رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا۔ رفیع الدرجات بھی ان باغیوں سے سہم کر چند ماہ کے بعد مرگئے۔ پھر بہادر شاہ کے فرزند محمد شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔ محمد شاہ کے جلوس کے بعد ایک شخص محمد امین کو کنی فوج کا سردار مقرر ہوا۔ اس سے اور حسن علی خاں سے کچھ رنجش پیدا ہوئی۔ ادھر عبداللہ خاں نظام دکن کے تدارک کے واسطے روانہ ہوا۔ اُدھر میر حیدر کاشغری نے محمد امین کو کنی کے اشارے سے حسن علی خاں برادر عبداللہ خاں کو قتل کرڈالا۔ اور حسن علی خاں کے لڑکے نے میر حیدر کاشغری کا کام تمام کیا۔

جب یہ خبر عبداللہ خاں کو پہونچی، دکن سے اُلٹے پاؤں بھاگے اور سیدھے دہلی کا رخ کیا اور تمام ناظموں کو اپنی مدد کے واسطے طلب کیا اور میر محمد امین ناظم ہنڈون کو بھی بلایا اور ارادۂ قتل بادشاہِ دہلی کا کیا۔

میر محمد امین کو جب یہ ارادہ معلوم ہوا تو وہ عبداللہ خاں کے شریک نہ ہوئے بلکہ بادشاہ کی امداد کے واسطے بارہ ہزار سوار و پیادہ فوج لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ محمد امین کو کنی اور میر محمد امین صرف بادشاہ کے طرفدار تھے، باقی تمام فوج باغی ہوگئی۔ عبداللہ خاں نے خزانہ اور فوج پر قبضہ کرلیا۔ بادشاہ بہت گھبرائے۔ اس وقت میر محمد امین کو محمد امین کو کنی نے اپنی فرزندی میں لیکر بادشاہ سے سعادت خاں کا خطاب دلوایا پھر دونوں شریک ہوکر عبداللہ خاں کے مقابل آئے اور نہایت جانفشانی سے جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ بتائید الٰہی عبداللہ خاں کو زندہ گرفتار کیا۔ فوج کو شکست فاش دی اور فوج و خزانہ پر قبضہ کرکے بادشاہ کو نوید فتح سنائی۔

بادشاہ میر محمد امین کی خدمت سے نہایت خوش ہوئے۔ محمد امین کو کنی کو اُن کی ترقی دیکھکر حسد پیدا ہوا۔ میر محمد امین نے جب یہ حالت دیکھی تو اُن کو حیرت ہوئی کہ باپ کو بیٹے سے یہ رشک پیدا ہوا آخر وہ اکبرآباد کی نظامت حاصل کرکے دہلی سے اکبرآباد چلے گئے، مگر بادشاہ ہر وقت اُن کو یاد فرمایا کرتے تھے

اِس سبب سے محمد امین کو کسی نے چاہا کہ میر محمد امین کو کسی پُر خطر مقام پر روانہ کریں۔

اُس وقت صوبہ اودھ کی خبریں متواتر آرہی تھیں، تعلقداران اودھ بڑے سرکش تھے، اور کئی صوبہ داروں کو قتل کر چکے تھے۔ حاسدوں نے مشورہ دیا کہ صوبہ داری اودھ کی میر محمد امین نواب سعادت خاں کو دی جائے۔ بادشاہ نے اُن کو دہلی میں طلب فرمایا اور خطاب برہان الملک میر محمد امین نواب سعادت خاں کا عطا کر کے صوبہ داری ملک اودھ کی عطا فرمائی۔

حسب حکم بادشاہ یہ جانے پر تو مستعد ہوئے مگر دل میں خیال کیا کہ میرے پاس اتنی فوج کہاں ہے، بادشاہ کی طرف سے چند توپیں اور کچھ اسلحہ مرحمت ہوئے۔ گھر بار زیور بیع کر کے توپ خانے کے بیل مول لئے، اس زمانے میں قوم مغل بہت پریشان اور بے روزگار تھی، نواب برہان الملک نے اکابرین قوم کو طلب فرما کر کہا کہ بھائیو! اگر اس وقت سوکھے ٹکڑے قبول کر کے ہمارا ساتھ دوگے تو ایک دن اس خدمت کا نفع بھی حاصل ہوگا۔ سر دست صوبہ اودھ کا انتظام درپیش ہے۔ مغل تو فاقہ کشی کر رہے تھے، کالی ٹوپی سر پر رکھ اور ولایتی کمر سے لگا آغا صاحب بنکر فوج میں بھرتی ہوگئے، کچھ تنخواہ بھی نواب نے تقسیم کر دی۔ جب اکبر آباد پہونچے وہاں کے صوبہ دار نے دعوت کرنا چاہی، آپ نے مصلحت وقت سمجھ کر صوبہ دار سے کہا ہم کو دعوت کا روپیہ نقد دیدو، اور وہ روپیہ لیکر حصہ رسدی فوج پر تقسیم کر دیا، اور سامان سفر درست کر کے بریلی آئے، یہاں سے بھی دعوت کا روپیہ لیکر فرخ آباد آئے، وہاں کے نواب نے بڑی عزت کی اور بہت روپیہ دعوت کے نام سے دیا، وہاں سے فیض آباد آئے اور ہنومان گڑھی پر مقام کیا، اور متصل ٹیلہ کے ایک مسجد بنوائی اور دریائے گھاگرا کے قریب ایک بنگلہ بنوایا جس کا نام گلاب باڑی رکھا۔

الغرض نواب برہان الملک کے حسن انتظام سے اودھ جس کی آمدنی سابق میں سترہ لاکھ تھی ایک کروڑ ساڑھے لاکھ کی تحصیل ہوئی، اور بقایا بھی ایک کروڑ وصول کیا۔ بادشاہ اُن کے انتظام سے بہت خوش ہوئے۔ اس زمانے میں صوبہ اودھ کی فوج بائیس ہزار سوار مغلیہ کی تھی، جس کے رسالدار خدایار خاں، آغا باقر، میر اعظم خاں، میر جہانگیر خاں، ابو تراب خاں، برلاس بیگ خاں تھے۔

اب برہان الملک کو نواب صدر جہاں بیگم کی شادی کی فکر ہوئی، بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ صدر جہاں بیگم ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں، مگر یہ قول معتبر نہیں ہے۔ نواب صدر جہاں بیگم کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی، نواب صدر جہاں بیگم بڑے نازوں سے پلی تھیں، ان کے بعد برہان الملک کے یہاں

[1] لکھنؤ کے مختلف محلوں کے نام انھیں سب لوگوں کے یادگار ہیں۔

بیٹیاں ہی پیدا ہوئیں مگر اُن کی پرورش میں کوئی خاص اہتمام نہ ہوا۔

نور جہاں بیگم صدر جہاں بیگم سے چھوٹی تھیں، ہما بیگم عرف ہندی بیگم اُن سے چھوٹی، محدی بیگم اُن سے چھوٹی، آمنہ بیگم اُن سے چھوٹی۔ برہان الملک صدر جہاں بیگم سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کو اپنی ترقی کا سبب سمجھتے تھے، اُن کی تعلیم بھی باقاعدہ ہوئی تھی۔

مرزا محمد مقیم ولد مرزا جعفر بیگ جو خاندان شاہ یداغ سے تھا یہ میر محمد امین کی بڑی بہن کا چھوٹا بیٹا تھا بیچارہ ابھی چھ مہینہ کا تھا کہ ماں نے انتقال کیا۔ خالہ نے خون کی محبت سے اپنا دودھ پلا کر پرورش کیا۔ اس کا بڑا بھائی چار برس کا تھا، دونوں نے خالہ کے گھر میں پرورش پائی تھی، اور وہیں تعلیم پاکر جوان ہوئے۔ خط بھیجکر اپنی بہن کو نیشا پور سے بلوایا، اور اُن کے مشورہ سے مرزا محمد مقیم کی شادی نواب صدر جہاں بیگم سے کردی اُسی سال سے اُن کو بڑی بیگم کا خطاب ملا، پھوپھی کو بڑی بیگم سے بہت محبت تھی، مرزا محمد مقیم جوان تھے، برہان الملک نے اپنا نائب مرزا مقیم کو کیا اور بادشاہ سے ابوالمنصور خاں نواب مرزا محمد مقیم صفدر جنگ کا خطاب دلوایا۔

زمانۂ پیری میں دوسرے محل سے خدا نے بُرہان الملک کو ایک لڑکا بھی مرحمت کیا اور محمد شاہ بادشاہ نے اس لڑکے کو صوبہ دار صوبہ اودھ مقرر کیا تھا لیکن چند دنوں کے بعد وہ لڑکا چیچک کے عارضہ میں مرگیا۔

ابھی لڑکا زندہ تھا کہ برہان الملک بعد فراغ بندوبست صوبہ اودھ محمد شاہ بادشاہ کے حضور میں گئے، وہیں بیمار ہوگئے اور چند روز بیماری کے بعد انتقال کیا۔

جب لڑکے کا بھی انتقال ہوگیا تو مرزا محمد مقیم صفدر جنگ بہادر صوبہ دار اودھ مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں نیاز محمد خاں نواب شیر جنگ بہادر نے درخواست بھیجی کہ غلام برہان الملک کا حقیقی بھتیجا ہے اور صوبہ داری کا حقدار ہے، مرزا محمد مقیم برہان الملک کے بھانجے ہیں۔ بھتیجے کے ہوتے ہوئے بھانجے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ یہ درخواست خاص بادشاہ کے بھائی طہماسپ خاں نے پیش کی۔

راجہ لچھمی نراین وکیل نواب ابوالمنصور خاں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو ایک درخواست معرفت عبدالباقی خاں بادشاہ کو بھیجی کہ برہان الملک کی وارث موجودہ حالت میں اُن کی دختر نواب صدر جہاں بیگم اور اُس کا شوہر ابوالمنصور خاں ہے۔ نواب صدر جہاں بیگم نے اپنی طرف سے ابوالمنصور خاں کو منتظم صوبہ اودھ کیا ہے۔ امیدوار ہوں کہ اودھ کی نیابت نواب صدر جہاں بیگم کو عنایت فرمائی جائے کہ بموجب شرع بیٹی صحیح وارث ہوسکتی ہے۔

درخواست کے ساتھ دو کروڑ روپیہ کی نذر پیش کش کی گئی۔ بہرحال محمد شاہ بادشاہ نے دونوں عرضیوں کو سُنکر خلعت سرفرازی صوبہ اودھ نواب صدر جہاں بیگم کو مرحمت فرمایا اور دو سو سوار معہ خلعت کے زر پیش کش لینے آئے۔

نواب صدر جہاں بیگم نے ابوالمنصور خاں کو اپنی طرف سے نائب صوبہ اودھ مقرر کیا۔

مشہور ہے کہ نواب ابوالمنصور خاں نواب صدر جہاں بیگم سے نہایت خوش تھے، اور ملک کے اہم معاملات میں ان سے صلاح لیتے۔ اور ہر امر میں اُن کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور سوا اُن کے زندگی بھر کوئی دوسرا محل نہیں کیا اور نہ کسی سے کوئی تعلق رکھا۔ سفر اور حضر دونوں میں ہر وقت نواب صدر جہاں بیگم ساتھ رہتی تھیں۔ اُنھیں کے حکم سے فوج کے افسروں کی برطرفی ہوتی تھی، تمام عملہ بھی سمجھتا تھا کہ ہماری موقوفی اور بحالی کا اختیار بیگم کو ہے۔

نواب صدر جہاں بیگم کو خدا نے ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام نواب شجاع الدولہ مرزا جلال الدین حیدر رکھا گیا۔

دانشمند بیگم اپنے صوبہ کے انتظام میں مشہور تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ نواب صفدر جنگ بہادر اپنے کمسن فرزند نواب شجاع الدولہ بہادر کو جو ابھی پانچ برس کے تھے ساتھ لیکر معہ اپنی چہیتی بی بی نواب صدر جہاں بیگم کے دہلی میں رونق افروز تھے۔ اس وقت صوبہ اودھ کی صوبہ داری پر راجہ نول رائے بہادر مقرر تھے۔ دفعتہً پٹھانوں نے میدان خالی پاکر اودھ پر حملہ کر دیا۔ اِس جنگ میں راجہ نول رائے سخت معرکہ کے بعد قتل ہوگئے، اور صوبہ پر پٹھانوں نے قبضہ کر لیا۔ اس خبر وحشت اثر کو سُنکر نواب صفدر جنگ کو راجہ نول رائے کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا اور حواس منتشر ہوگئے۔ اسی رنج و غصہ میں بادشاہ سے اجازت لیکر نواب صفدر جنگ بہادر دہلی سے دوڑے ہوئے آئے اور آتے ہی معرکۂ جنگ میں گُھس پڑے اور جی توڑ کر لڑے۔ قریب تھا کہ ملک فتح ہو جائے کہ دفعتہً ایک گولی آن کے پانوں میں لگی، سواری سے اُتر پڑے لشکر شکست کھا کر بھاگا۔

پٹھانوں نے خوب لوٹ مار کی، اور امیر خاں نام ایک مسخرے کو صوبہ دار اودھ بنا دیا۔ نواب صفدر جنگ شکست خوردہ دہلی میں آئے کہ بادشاہ سے کچھ امداد حاصل کریں۔ یہاں حاسدوں نے ان کے خلاف پہلے ہی سے بادشاہ کے کان بھر رکھے تھے جس کے سبب سے شرف باریابی حاصل نہ ہوا۔

نواب صفدر جنگ نے مایوس ہو کر بھرت پور و جے پور کے مہاراجہ ہلکر اور سندھیا سے درخواست کی

اونھوں نے بادشاہ دہلی کے برہمی مزاج کے خوف سے امداد کا وعدہ نہ کیا۔ ناچار دہلی واپس آئے نواب صدر جہاں بیگم سے تمام واقعہ بیان کیا، بیگم اپنے لڑکے نواب شجاع الدولہ بہادر کو ہمراہ لیکر فوراً شاہی محل میں جا اُتریں اور ایک درخواست بادشاہ کو پیش کی کہ آپ کی رعایا میں سے پٹھانوں نے غدر کردیا اور راجہ نول رائے کو قتل کرڈالا، نواب صفدر جنگ نے اجازت انتقام طلب کی مگر حضور تک رسائی نہ ہوئی، اب حضور میں یہ درخواست پیش ہے کہ مجھے اجازت انتقام مرحمت فرمائی جائے۔ کچھ امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے دستخط فرمادیے کہ ما بدولت اجازت دیتے ہیں کہ نواب صدر جہاں بیگم پٹھانوں سے بد امنی کا انتقام لیں۔

نواب صدر جہاں بیگم نے اس حکم شاہی کو مشہور کردیا۔ اس وقت تمام رجواڑے مثل مہاراجہ سندھیا اور ملکہ راوی وغیرہ کے شریک ہوگئے اور بے شمار فوج فراہم ہوگئی۔ بیگم نے کچھ جدید فوج خود رکھی۔ ایک طرف سے نواب صفدر جنگ دوسری طرف سے نواب صدر جہاں بیگم فوج جرار لیکر پٹھانوں پر لوٹ پڑے، دم لینے کی کسی کو مہلت نہ دی، اور الہ آباد بنارس فرخ آباد تک قبضہ کرکے باغیوں کو منتشر کردیا۔ اِس کے بعد بادشاہ بھی نواب صفدر جنگ سے خوش ہوگئے۔ بیگم کی اِس کارگزاری کا فوج پر بہت کچھ اثر پڑا۔

نواب صدر جہاں بیگم کی طرح نواب شجاع الدولہ بھی نہایت شجاع اور بہادر تھے۔ جب فنون سپہ گری اور تعلیم سے فارغ ہوچکے تو اُن کی شادی نواب محمد اسحاق خاں مخاطب بہ موتمن الدولہ وزیر دہلی کی بیٹی سے کردی۔ اس شادی میں بادشاہ خود معہ ارکان دولت کے شریک ہوئے تھے۔ دہلی میں یہ شادی یادگار زمانہ ہوئی، اور چھیالیس لاکھ روپیہ اس میں صرف ہوا۔

نواب صدر جہاں بیگم بہو کو لیکر فیض آباد آئیں۔ بہو بھی تمیزدار، نیک مزاج، خداترس تھی۔ جہیز میں کئی کروڑ روپیہ ملا تھا، مگر اپنے شوہر کی اطاعت فرض سمجھتی تھی۔

نواب شجاع الدولہ نے بھی کوئی دقیقہ اُن کی خاطر و مدارات کا اُٹھا نہ رکھا، اور اس بیگم کا نام امتہ الزہرا اور خطاب بہو بیگم تھا۔

خدا نے شادی کے دوسرے برس نواب بہو بیگم کو بیٹا عنایت کیا، جس کا نام مرزا یحییٰ عرف مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر تھا

نواب صدر جہاں بیگم بچہ کو دیکھکر بہت خوش ہوئیں اور اُس کی چھٹی بہت دھوم دھام سے ہوئی اتفاق وقت سے نواب ابوالمنصور صفدر جنگ پاپر گھاٹ نظامت سلطان پور کے بندوبست

میں مصروف تھے اور نواب صدر جہاں بیگم جو سفر اور وطن میں ہمیشہ نواب کے ساتھ رہتی تھیں، ہمراہ تھیں کہ نواب کے ایک دنبل نکل آیا اور تپ محرقہ ظاہر ہوئی۔ اطبا نے ہر چند علاج کیا مگر دوا نے کوئی اثر نہ کیا اور اجل نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ فیض آباد میں چلے آتے۔ اسی مقام پر رات کو انتقال کیا۔

عقلمند بیگم نے اس واقعہ کو پوشیدہ رکھا، کیونکہ اگر سرکش زمینداروں کو یہ خبر ہو جاتی تو وہ غدر کر دیتے۔ صبح کو ہاتھی کی عماری پر نعش لیکر فیض آباد میں داخل ہوئیں۔ محلسرا میں پہونچکر اعلان قضا فرمایا۔ جنازہ بہت دھوم دھام سے اُٹھا۔ نعش کو دہلی بھجوایا اور وہاں سے کربلائے معلیٰ بھجوا کر دفن کیا۔

نواب ابوالمنصور خاں کے نائب مال راجہ رام نراین تھے، ان کے باپ راجہ تول رائے تھے جنھوں نے اپنے نام سے فیض آباد میں تول گنج قائم کیا۔

نواب صدر جہاں بیگم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو مسند نشین وزارت کیا۔ مگر وہ مغل فوج جو برہان الملک کے ساتھ آئی تھی نواب شجاع الدولہ کے خلاف ہو گئی، اس نے چاہا کہ نواب قلی خاں کو وزیر بنا کر خود مختار رہے، ان میں ایک اسمٰعیل بیگ خاں کابلی بڑا سرکش تھا۔ نواب کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی مگر نہایت شجاع اور دور اندیش۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ راجہ ہمت بہادر نے نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں کھتری قوم کی ایک عورت پیش کی تھی مگر فوج کے افسروں نے اس کے وارثوں کو بہکا کر فساد کرنا چاہا۔ کھتریوں نے راجہ رام نراین سے داد چاہی، اور بارہ ہزار کھتری جمع ہو کر اسمٰعیل بیگ خاں کے پاس گئے۔ اسمٰعیل بیگ نے اِس موقع کو غنیمت جان کر سرداران قبیلہ کو ساتھ ملا لیا اور تجویز یہ ٹھہری کہ نواب محمد علی خاں کو الہ آباد سے بلوا کے مسند نشین کیا جائے اور نواب شجاع الدولہ کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ یہ تجویز کر کے نواب شجاع الدولہ کو لکھ بھیجا کہ گسائیں ہمت بہادر اور اوس کے بھائی کو ہمارے حوالہ کر دیجئے ورنہ ملک میں فساد ہو جائے گا۔ نواب شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ اگر وزارت ایسی کٹ پتلی ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو میں اس مسند سے بوریائے فقر کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اِس معاملہ کی باز پرس مجھ سے ہونا چاہیئے نہ کہ ہمت بہادر سے۔ اگر تم لوگ اپنی فوج کے متفق ہو جانے سے مغرور ہو گئے ہو تو میں تمہارے مقابلہ کو قلت فوج سے مستعد ہوں، ہمت بہادر کو میں کسی طرح نہیں دے سکتا۔ اِدھر نواب صدر جہاں بیگم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو راجہ رام نراین کو درِ دولت پر بلوا بھیجا اور خود پس پردہ بیٹھکر فرمایا کہ دیوان جی، آفریں صد آفریں، شرفا کا یہی کام ہے جس آقا کا نمک کھائے اُس کی اولاد کے ساتھ نمک حرامی کرے۔ جس آقا کی بدولت تم خاک سے پاک ہوئے آج اُس کی اولاد کے دشمن بنتے ہو۔ کیا صفدر جنگ نے تمہاری پرورش اِسی دن کے واسطے کی تھی۔ ہم کو معلوم نہ تھا کہ اس گھر کی خرابی کے تمہیں باعث ہو گئے، اور

نواب قلی خاں نواب برہان برہان الملک کا بھتیجا ہے لیکن بقائے نام تو اولاد سے ہوتا ہے نہ کہ بھائی سے۔ راجہ رام نراین نے ہاتھ باندھکر کہا کہ حضور اگر ہماری جان بھی نواب کے کام آجائے تو بھی ہم آپ کے حق نمک سے ادا نہیں ہوسکتے۔ لیکن حضور خیال کریں کہ ایسی حرکتوں سے تمام ہندوستان میں وزارت بدنام ہوتی ہے، اور دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ ہم کو نواب قلی خاں سے کیا غرض۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس بات کا اتنا طول ہوگا۔ جس طرح حضور نے غلام کو یاد فرماکر تنبیہ فرمائی ہے اسمٰعیل بیگ کو بھی فہمائش کردیجئے اور مغل سرداروں کو سمجھادیجئے۔ بیگم نے اسمٰعیل بیگ کو اور سرداران مغل کو بلاکر بہت ڈانٹا اور کہا تم وزارت کو کمزور نہ سمجھو، روٹیوں سے محتاج ہوجاؤگے، آقا سے نمک حرامی کرکے کچھ پھل نہ پاؤگے۔ کیا تم برہان الملک اور صفدر جنگ کے احسانات کو بھول گئے ہو، نمک حرامی اچھی نہیں ہے۔ اور سب کو خلعت فاخرہ مرحمت کرکے رخصت کیا۔ اسی زمانہ میں محمد قلی خاں اجل گرفتہ فیض آباد کی طرف آرہا تھا، راہ میں دوسرا خط ملا کہ نواب شجاع الدولہ سے معاملہ طے ہوگیا۔ اُسنے راہ سے پھر جانا مناسب جانا کہ نواب شجاع الدولہ کو شک گزرے گا، مشہور کیا کہ میں نواب شجاع الدولہ کی ملاقات کو آتا ہوں۔ جناب عالی نے دو کوس پر ان کا استقبال کیا اور نہایت دھوم سے دعوت کی۔ اسی اثنا میں مرزا اسمٰعیل بیگ بھی مرگیا۔ نواب اعتماد الملک نے دہلی سے ایک خط شجاع الدولہ کو بھیجا کہ نواب محمد قلی خاں سے ہوشیار رہنا۔ نواب قلی خاں اس وقت عالمگیر ثانی کے پاس چلے گئے تھے۔ نواب شجاع الدولہ نے انھیں خط بھیجکر بلوایا۔ ان کے ساتھ ان کا بھائی مرزا حسن علی خاں اور زین العابدین خاں بھتیجا بھی تھا، قلعہ جلال آباد میں قید ہوئے اور رمضان المبارک میں عین تلاوت قرآن میں قتل کیے گئے اور لاش کچے کنوئیں میں ڈال دی گئی۔ اولاد نواب مقتول ان کا ہر سال عرس کرتی ہے۔

نواب صدر النساء بڑی بیگم نے اپنے شوہر کا عروج دیکھا، ان کے ساتھ سفر میں گئیں پھر فیض آباد میں بیٹھکر اُسے آباد اور معمور کیا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے نواب شجاع الدولہ کو مسند وزارت پر بٹھایا نمک حراموں کو سزا دی، پھر اپنے پوتے کی مسند نشینی دیکھی۔ یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ وزیر ہوئے تو اپنی والدہ سے کئی لاکھ روپیہ زبردستی لے گئے اور دادی پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا اور اُن سے طالب زر ہوئے، وہ نواب ابو المنصور کی بیوی اور نواب شجاع الدولہ کی والدہ تھیں فوراً ناراض ہوکر بولیں، کچھ تیری شامتیں آئی ہیں، تو نہیں جانتا کہ صوبہ اودھ میرا مول لیا ہوا ہے اور ساری فوج میری ہے۔ یہ کہکر نواب ناظر سے کہا کہ ابھی اطلاع دو کہ فوج ہمارے در دولت پر حاضر ہو۔ یہ سنکر آصف الدولہ بہادر کے ہوش اُڑگئے اور وہاں سے رات کو بھاگ کر لکھنؤ چلے آئے۔ اِس کے بعد بڑی بیگم نے بہو بیگم

سے کہا، بیٹا! ہم تم سے اسی واسطے کہتے تھے کہ نواب سعادت علی خاں کو اس کی پیش دستی میں رکھو تاکہ انتظام ٹھیک رہے۔ تمہارا لڑکا فضول خرچ ہے تم نے نہ مانا اب تم کو ستا کر روپیہ لے چکا تو مجھے دھمکانے آیا۔ میں تو چراغ سحری ہوں مگر تم کو یہ لڑکا چین سے نہ بیٹھنے دیگا۔ نواب بہو بیگم نے کہا۔ دیکھئے میرا تو اس لڑکے کے سوا کوئی دوسرا وارث نہیں ہے اب نہ دوں تو مرنے کے بعد یہی وارث ہوگا۔

آخر نواب صدرجہاں بیگم نے ستانوے ۹۷ برس کی عمر میں دنیائے فانی سے انتقال فرمایا اور فیض آباد گلاب باڑی میں دفن ہوئیں۔

اس واقعہ سے نواب بہو بیگم کو بڑا صدمہ ہوا، اور کہا مجھے تو اس ساس میں ماں کا مزا ملتا تھا خدا کل جہان کی عورتوں کو ایسی ساس نصیب کرے۔ جب تک زندہ رہیں میری طرف سے اپنے بیٹے کو سمجھاتی رہیں کہ دیکھو بہو بیگم کا دل میلا نہ ہونے پائے بڑے نازوں کی پلی ہے۔ اگر کبھی میری انگلی بھی دکھتی تھی تو ہزاروں حکیم جمع کئے جاتے تھے اور ہر وقت آپ پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ اور تمام عملہ میری خدمت میں لگا رہتا تھا۔

ایک دفعہ محمد شاہ بادشاہ نے کہا، کہ آپ کی بہو تو آپ کی بہت مدّاح ہے۔ کہنے لگیں، کیا کروں میرا دل یہی چاہتا ہے کہ جس آرام سے اس نے شاہی محل میں پرورش پائی ہے اسی طرح میرے یہاں بھی آرام سے رہے۔ کیونکہ میرا ایک ہی بیٹا اور ایک ہی بہو ہے۔

بہو بیگم نے چالیس روز تک برابر تمام شہر میں مساکین غربا، فقرا کو کھانا بھی کھلایا اور زر نقد بھی دیا، اور ان کا تمام اسباب چہلم کے روز سیّدوں کو تقسیم کردیا۔ اور اُن کے تمام عملے کو برقرار رکھا۔ قبر پر روشنی کرنے والے۔ جاروب کش۔ روضہ خواں۔ قرآن خواں مقرر کردیے۔ فیض آباد گلاب باڑی میں اُن کا مقبرہ مشہور عام ہے۔ لوگ دور دور سے زیارت کو آتے ہیں۔ قبر پر روشنی اور قرآن خوانی ہوتی ہے۔ محرم میں دس دن تک مجلسیں ہوا کرتی ہیں۔

دولت و حکومت ہمیشہ قائم نہیں رہتی، انسان کو چاہیئے کہ صاحب دولت و حکومت ہونے پر مغرور نہ ہوجائے، بلکہ منعم حقیقی و حاکم اصلی کے سامنے سرنیاز جھکائے، اہلِ حاجت کی مدد کرے، زیردستوں پر کرم فرمائے۔ تاکہ دین و دنیا میں بہبودی و سُرخروئی نصیب ہو۔ جو لوگ دولت و حکومت کے نشہ سے مخمور ہوکر مغرور ہوجاتے ہیں وہ کبھی آرام اور چین نہیں پاتے۔

(ماخوذ)

بعض سیاروں میں آبادی کا احتمال

از مسٹر جے۔ آر۔ رائے

عالم بالا۔ خلائے بے پایاں اور مسکنِ سیارگان سے ایک ہی بات مراد ہے۔ آسمان اور فلک کا بھی وہی مفہوم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آسمان میں بھی ہمارے جیسی ذی عقل ہستیاں ہیں؟ یہ بڑا پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ جسکی طرف روشن خیال اہل فکر کی توجہ کبھی کبھی مائل ہوتی ہے۔ یہ سوال بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے مگر اسکے ساتھ فلکیات کے اور کئی سوالات بھی وابستہ ہیں مثلاً آسمان میں اگر انسانی ہستیوں کا احتمال ہے تو کہاں کہاں ہے؟ کونسے سیارے قدرتاً اس قابل ہیں۔ جو انسان کی ہستی پر ناز کر سکتے ہیں؟ اور سب سیاروں میں آبادی کا امکان کیوں نہیں ہو سکتا؟

ارکانِ شمسی کی مساحت کا تخمینہ

سب سے پہلے نظامِ شمسی پر اجمالی نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ برما سے قطع نظر ملک ہند کا کُل رقبہ پونے سولہ لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے تیس کروڑ نفوس ہے۔ تمام ہندوستان میں ساڑھے چھ لاکھ دیہات ہیں۔ ہندوستان ایک ہے۔ دنیا میں ایسے بیسوں ممالک ہیں جن کے مجموعہ سے جہان بنا ہے جس کا کل رقبہ انیس کروڑ ستر لاکھ مربع میل ہے خشکی ایک حصہ اور تری دو حصے ہے۔ اور کل آبادی ایک ارب اسی کروڑ ہے۔ ماہران طبیعات نے کرۂ ارض کے وزن کا تخمینہ لگایا ہے جو ساڑھے سنکھ ٹن ہے۔ ہماری وسیع دنیا نظامِ شمسی کا ایک ناچیز حصہ ہے۔ گو باعتبار کثافت یہ باقی سیاروں پر فائق ہوگی مگر مساحت اور حجم میں اس کا درجہ بہت ادنیٰ ہے۔ متعلقینِ آفتاب میں سیارہ بدھ (عطارد) مریخ (منگل)، اور شکر (زہرہ) ادنیٰ سیاروں میں شمار ہوتے ہیں اور کرۂ ارض سے چھوٹے ہیں۔ سورج سے بدھ تین کروڑ ساٹھ لاکھ۔ شکر پونے سات کروڑ۔ کرۂ ارض نو کروڑ تیس لاکھ اور منگل چودہ کروڑ ساڑھے بارہ لاکھ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ بڑے بڑے سیاروں میں مشتری (برہسپت) جس کا قطر ۸۶۰۰۰ میل ہے آفتاب سے اڑتالیس کروڑ تیس لاکھ اور سنیچر (زحل) جسکا قطر ۷۳۰۰۰ میل ہے آفتاب سے اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل کے فاصلہ پر گھومتا ہے۔ یورے نس[2] ایک ارب اسی کروڑ میل اور نپ چون[1] دو ارب اسی کروڑ میل کی دوری پر طواف کرتے ہیں اور یہ دونوں

---

[1] NEPTUNE
[2] URANUS

11459

سیارے زمانۂ حال کی فلکی تحقیقات سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ورنہ اسلاف تو "سیارگان سبع" ہی سے آشنا تھے اور ان ہی کی وظیفہ خوانی کرتے تھے گذشتہ مارچ میں امریکہ کے ماہروں نے ایک اور نیا سیارہ مشاہدہ کرکے اعلان کیا ہے۔ جس کی ہستی موہوم کی بابت کئی امریکن فلکی پچاس سال سے استدلال ریاضی کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ نپ چون سے پرے دیکھنے میں آیا ہے۔ آفتاب سے اس کا فاصلہ پونے چار ارب میل تخمینہ کیا گیا ہے۔ سورج کے گرد تین سو سال میں طواف کرتا ہے۔ اسکا حجم کرۂ ارض سے سات آٹھ گنا بڑا سمجھا گیا ہے۔ پہلے تو نپ چون نظام شمسی کا چوکیدار شمار ہوتا تھا لیکن اب یہ نیا سیارہ اس فرض کو انجام دیگا ماہر کہتے ہیں کہ اس سے بھی آگے ایک اور سیارہ ہے جس کا فاصلہ سورج سے سوا نو ارب میل اندازہ کیا گیا ہے مگر ابھی دوربینوں میں یہ نظر نہیں آیا ہے۔ نئے سیارے سے قطع نظر پرانے سیاروں کے ہمرکاب چوبیس چاند ہیں۔ سورج کے کنبے میں دو ہزار سیارگانِ خورد بھی ہیں۔ ان میں سے تین ہزار کا ابھی بخوبی پتہ نہیں لگا ہے۔

نظام شمسی کی وسعت

اب نظام شمسی کی وسعت کا اندازہ کیجئے۔ آفتاب اس کا مرکز ثقل ہے۔ باقی چھوٹے بڑے سیارے اسی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ صحیح ہے کیونکہ شروع میں یہ سب آفتاب کے مادے کے اجزائے فطری تھے۔ سورج کا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل ہے۔ یہ کرۂ ارض سے دس لاکھ گنا بڑا ہے مگر وزن میں فقط تین لاکھ درجے بڑا ہے۔ کیونکہ اسکے اندر گیسوں کی کثرت ہے۔ ہر وقت شعلے اُٹھتے رہتے ہیں۔ تمام سیاروں اور چاندوں سے سورج چھ سو گنا بڑا ہے۔ اس وجہ سے سب کو اپنے دامن میں لئے رہتا ہے۔ سیاروں میں برہسپت سب سے بڑا ہے جس کا رقبہ پونے تین کھرب مربع میل ہے۔ سنیچر کا رقبہ انیس ارب ساٹھ کروڑ مربع میل اور یورے نس کا تین ارب چوراسی کروڑ مربع میل ہے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ ہماری دنیا ان عظیم الوسعت سیاروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ نظام شمسی کتنا وسیع اور عظیم ہے۔ آفتاب کا رقبہ انیس نیل۔ ساٹھ کھرب مربع میل ہے۔ باقی سیاروں کا رقبہ برہسپت کے رقبہ کے نصف کے برابر ہے یعنی انکی مساحت ایک کھرب ساڑھے سینتیس ارب مربع میل ہے۔ اس حساب سے نظام شمسی کی مجموعی مساحت انیس نیل چونسٹھ کھرب۔ اور بارہ ارب مربع میل ہے۔ اور اس کا حلقۂ اثر آٹھ ارب میل کا وسیع ہے۔ فلکی مساحت میں کروڑ فقط نظام شمسی میں شمار ہوتے ہیں لیکن جب ساکنین خلا سے بحث کی جائے تو پھر ارب کھرب۔ نیل۔ پدم۔ سنکھ وغیرہ اعلیٰ ترین اعداد شمار ہی میں نہیں آتے۔

آسمان کے بحر بیکراں میں تیرتے ستارے

شاید ناظرین نظام شمسی کی وسعت پر حیران ہونگے مگر بحر خلا میں ہمارا سورج اد

اس کا مختصر خاندان محض ایک ننھا سا جزیرہ ہے۔ ماہروں کا تازہ ترین اندازہ یہ ہے کہ عالم بالا میں تیس اور چالیس ارب کے مابین ستارے ہیں اور ہمارا آفتاب ان میں سے ایک ہے۔ شہرۂ آفاق ماہر فلکیات سر جے. جینز[1] کا بیان ہے کہ ہمارے سورج جیسے ایک ارب آفتاب خلا میں ہیں جنکے فوٹو بڑی دوربین کے وسیلہ سے لئے جاسکتے ہیں۔ آسمان میں ایسے ستارے بیشمار ہیں جو ہمارے آفتاب اور اسکے کنبے کو اپنے دامن میں پوشیدہ کرسکتے ہیں۔ ستارہ انٹیرس برجھک نکشتر میں واقع ہے۔ اسکا قطر چالیس کروڑ میل ہے۔ اور سورج کا آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل ہے۔ گویا یہ ایک ستارہ پانچسو سورجوں کے برابر ہے مگر ماہر کہتے ہیں کہ اس سے بھی بڑے بڑے ستارے پائے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ستارہ ایک ہزار سورجوں کے برابر ہے۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ جہاں ایک ارب سورج ہیں وہ میدان کتنا وسیع ہوگا؟ اس کا اندازہ محال ہے لیکن دو ایک مثالوں سے اس بحر ناپیدا کنار کی بعید الفہم وسعت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہمارے آفتاب کی سرحد کے آگے لق و دق صحرائے خلا ہے جہاں کوئی ستارہ نظر نہیں آتا اسے آسمان کا بحر ظلمات کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے آگے چلکر ستاروں کا نیا سلسلہ پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ جس میں بہت مشہور الفہ سنٹاوری ہے۔ یہ ستارہ کتنی دور ہے، اسے ہمارے اعداد ریاضی ظاہر نہیں کرسکتے! ورنہ ہماری زبان میں ایسے الفاظ ہیں جن کے وسیلہ سے بحر خلا کی مساحت کا صحیح اندازہ بیان کیا جائے۔ الفہ سنٹاوری سے روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے ہمارے یہاں سوا چار سال میں آتی ہے۔ مگر اس سلسلہ کا دور افتادہ ستارہ اس سے دس ہزار گنا فاصلہ پر ہے۔ جہاں سے پینتالیس ہزار سال میں روشنی آتی ہے۔ کہکشاں سے کون ناآشنا ہے۔ رات کے وقت آسمان کے وسط میں سیدھی سڑک سی دکھائی دیتی ہے۔ بقول سر جے. جینز[2] یہ دائرہ عالم ہے۔ کیونکہ اس سے آسمان دو حصوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ کہکشاں اتنا چوڑا ہے کہ ایک ماہر کے تخمینہ کے مطابق روشنی پچاس ہزار برس میں اور دوسرے کے بیان کے رو سے تین لاکھ سال میں عبور کرتی ہے۔ بعض ماہر کہتے ہیں کہ اس قسم کے کئی سلسلے ہیں + علاوہ ازیں خلا میں درخشاں سحاب بھی ہیں جن کا شمار بقول سر جے. جینز[2] بیس لاکھ ہے۔ جو سحاب عالم کے پرے حصے میں واقع ہے۔ اس سے ہمارے یہاں دس لاکھ برس میں روشنی آتی ہے۔ ایک اتنا بڑا چکردار سحاب ہے کہ اسے ایک ارب[2]

---

۱ "دی یونیورس راؤنڈ اس" مطبوعہ مئی ۱۹۲۹ء

۲ "دی یونیورس راؤنڈ اس"

آفتاب بن سکتے ہیں۔ علاوہ بریں جزائر خلا (ISLAND UNIVERSES) بھی موجود ہیں جن سے مراد مدور جھرمٹ ہیں۔ امریکن ماہر شیپلے کا یہ اندازہ ہے کہ اس قسم کے انھتر جھرمٹ پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا جھرمٹ اتنا بڑا ہے کہ اسکے قطر کو روشنی تین لاکھ سال میں عبور کرتی ہے۔ امریکہ کے فلکی ماہر ہنڈرسن کی رائے میں مدور جھرمٹوں اور سحابوں کے عالم کے درمیان دوسرا بحر ظلمات پایا جاتا ہے۔ جہاں کوئی وجود فلکی نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ بعض ماہر یہ کہتے ہیں کہ کہکشاں جیسے نظام ملے سیارگان دور تک مسلسل پھیلے ہوئے ہیں اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس عالم سے علیحدہ اور عالم بھی ہونگے جو دوربینوں کی گرفت میں کبھی نہیں آسکتے۔ سر جے۔ جینز کا بیان ہے کہ عالم کے سب سے دور افتادہ اجرام فلکی کی روشنی دس کروڑ برس میں ہمارے یہاں آسکتی ہے۔ ایک سحاب اٹھارویں درجے کا ہے۔ جسکی روشنی چودہ کروڑ برس میں ہمارے یہاں آتی ہے۔ اس کے آگے کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ ماہر موصوف کا یہ بھی اندازہ ہے کہ برھمانڈ کے قطر کو روشنی بیس کروڑ سال میں طے کرسکتی ہے یعنی عالم کا قطر بارہ ہزار سنکھ میل ہے۔ پروفیسر ہنڈرسن کی رائے ہے کہ روشنی عالم کے ارد گرد ایک ارب برس میں طواف کرسکتی ہے۔ اور اس خیال سے پروفیسر آئن اسٹائن اور ڈی سِٹر کو اتفاق کلی ہے۔

اس اجمالی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عالم بالا کی وسعت کتنی ناقابل فہم ہے۔ جب آپ اجرام فلکی کی مساحت اور ان کے بعد الفی مابین پر غور کیجئے گا تو یہ امر باسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ آسمان میں انسانی آبادی کے احتمال کی نسبت کسقدر وثوق کے ساتھ قیاس آرائی ہوسکتی ہے۔ اگر اسکی نسبت کوئی گمان ہوسکتا ہے تو صرف نظام شمسی کے ارکین ہی کی بابت ہوسکتا ہے۔ جو ہمارے قریب واقع ہیں۔ بڑی دوربینوں اور دیگر آلات تحقیقات کی وساطت سے ان کی نسبت بہت سی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

مسکن انسان نہیں

نظام شمسی کے ساتھ ہی ساکنین خلا کا جو اجمالی تذکرہ آیا ہے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جانداروں اور پودوں کی ہستی کے احتمال کو ستاروں اور سیاروں کی طبعی حالت سے کسقدر تقویت پہونچ سکتی ہے۔ اوّل تو اجرام فلکی اتنے دور دور واقع ہیں کہ دوربین اور دیگر آلات تحقیقات سے ان کے طبعی اور سطحی حالات دریافت کرکے کوئی قطعی رائے قائم کرنا قریب محال ہے۔ بلکہ ممتاز ماہر انگریز پروفیسر ایڈنگٹن اور دیگر عالمان ہیئات کا یہ پختہ خیال ہے کہ بہت سے ستاروں کا درجہ حرارت ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں

مرتبہ ہوتا ہے وہاں پر کوئی پودہ اور جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ نظام شمسی کے کئی اراکین کی یہ کیفیت ہے کہ حرارت ہزاروں درجے غالب رہتی ہے۔ آفتاب جو سرچشمہ حرارت ہے شعلہ نما گیسوں کا منبع ہے۔ اسی طرح برہسپت بھی مختلف گیسوں کا مرکب ہے جن کی حرارت کی تیزی ہزاروں درجے کی ہوتی ہے۔ یورے نس اور نپ چون کی طبعی حالت برہسپت کے مشابہ ہے۔ اب صرف دوسرے درجے کے چار سیارے ہیں کرۂ ارض۔ شکر۔ منگل اور بدھ۔ ان میں اول الذکر تو ہمارا مسکن ہے اسکے ذکر کی چنداں ضرورت ہی نہیں۔ باقی تین میں منگل ہی ایسا ہے کہ جس کے طبعی حالات کرۂ ارض کے متشابہ قرار دیئے گئے ہیں۔ اور اس بنا پر اسے مسکن حیوانات اور نباتات قرار دیا گیا ہے۔

منگل کے جغرافیائی حالات

منگل درجہ دوم کے سیاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا قطر چار ہزار دو سو تیس میل ہے اور سورج سے چودہ کروڑ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ مگر اپنے دورہ کے دوران میں کبھی کبھی یہ سیارہ زمین کے بہت قریب آجاتا ہے۔ اسوقت اس کا فاصلہ تین کروڑ میل رہتا ہے۔ ایسے موقع کو ارباب تحقیق غنیمت تصور کر کے رات دن دوربینوں سے مشاہدے کرتے اور آلات فوٹوگرافی سے مختلف فوٹو لیتے ہیں۔ ان مشاہدات سے کئی قسم کے حالات استنباط کئے جاتے ہیں۔ آفتاب کے گرد اسکا گشت چھ سو ستاسی دن میں ختم ہوتا ہے۔ یعنی اس کا سال ہمارے سال سے دگنا بڑا ہے اور اپنے محور پر کرۂ ارض کی مانند چوبیس گھنٹے سینتیس منٹ میں گھومتا ہے۔ گویا زمین اور منگل کا دن مساوی ہے۔ منگل کے ہمرکاب دو چاند ہیں مگر ہماری دنیا کو ایک ہی درخشاں چاند پر اکتفا کرنا پڑتی ہے۔ چونکہ کرۂ ارض سے یہ چھوٹا ہے اسوجہ سے اسکے ارتقا کے قریب قریب تمام مراحل ختم ہو گئے ہیں۔ کرۂ ارض کے مقابلہ میں یہ کہن سال ہے۔ اسکی حرارت کا ذخیرہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ پانی بھی ختم ہو رہا ہے۔ خشکی بڑھ رہی ہے۔ ماہران فلک کہتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں کہ جب مریخ ہمارے چاند کی طرح سرد اور بالکل بے جان ہو جائے گا۔ اگر فی الواقع وہاں پر جان دار اور روئیدگی ہوگی، تو پانی کی عدم موجودگی سے سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔

آبادی کے احتمال کا گمان کیسے ہوا؟

ہر قسم کے حالات مشاہدہ کرنے کے بعد ماہروں نے یہ قرار دیا ہے کہ مریخ کے طبعی حالات کرۂ ارض کے مشابہ ہیں۔ اس وجہ سے وہاں پر حیوانات اور نباتات کا وجود ناممکنات سے نہیں ہے۔ اسے اصطلاح میں استدلال تمثیلی کہتے ہیں یعنی زمین اور مریخ

کے قدرتی اور جغرافیائی حالات کی مشابہت سے منگل کو مسکن حیوانات و نباتات فرض کر لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اٹلی کے ممتاز فلکی ماہر شیاپرلی نے ۱۸۷۷ء میں عرصہ کے مشاہدہ اور تحقیقات کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ منگل کی سطح پر نہروں کا جال بچھا ہوا معلوم ہوتا ہے جو طبعی نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔ یہ ایسی نالیاں گمان کی گئی تھیں جن کے راستہ سے پانی ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچتا ہے۔ اس سے اس محقق نے یوں استدلال کیا کہ اگر مریخ پر نالیاں بنی ہوئی ہیں تو ان کے بنانیوالے ذی عقل انسان ہونگے۔ اگر وہاں پر انسان ہیں تو وہ ضرور کھیتی باڑی کرتے ہونگے جنکی آب پاشی کیواسطے نہریں کھودی گئی ہیں۔ جب اخباروں میں اسکا اعلان ہوا تو سائنس والوں نے اسے کچھ وقعت نہ دی۔ بلکہ اُنھوں نے اسے شیاپرلی کے ذہن کی پریشانی کا سبب قرار دیا۔ بہتوں نے اسکا مذاق اُڑایا مگر بعض سنجیدہ مزاج اور بلند خیال ماہروں نے بطور خود تحقیقات کرنے کی ٹھان لی چنانچہ ان میں امریکہ کے نامی ماہر پروفیسر لوئل بھی تھے۔ آپنے برسوں کے مسلسل مشاہدہ اور وسیع تحقیقات و غور و فکر کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ مریخ کی سطح پر نہروں کا جال پھیلا نظر آتا ہے جو قدرتی نہیں ہے بلکہ ذی عقل ہستیوں کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غرضکہ آپنے شیاپرلی کے خیالات کی اپنی جداگانہ تحقیقات سے تائید کر دی۔ اسکے بعد مریخ کے مسکن نباتات و حیوانات ہونے کا احتمال قوی ہو کر مسلّم ہو گیا۔ برطانیہ کے عالی دماغ ناول نویس نے "اہل مریخ کا حملہ برطانیہ پر" ایک دلچسپ ناول میں قلم بند کر کے اس خیال کو بہت مقبول بنا دیا۔ ۱۹۰۰ء میں ایک فیاض لیڈی نے ایک رقم خاص اس مقصد سے عطا کر دی کہ اہل مریخ سے نامہ و پیام کی سبیل نکالی جائے بعد ازاں اور لوگوں نے بھی روپیہ دیا۔ جس سے بہت بڑی رقم جمع ہو گئی ہے۔ بے تار برقی کے ماہر مارکونی اور بعض ماہروں نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ آبشار نیاگرا (امریکہ) کی برقی قوت ممالک کے راکی پہاڑ پر جمع کی جائے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مریخ والوں کو پیام بھیجا جائے۔ بعض ماہر یہ گمان کرتے ہیں کہ اہل مریخ ہم سے اشاروں کے وسیلہ سے گفتگو کرنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ پانچ چھ برس ہوئے کہ لندن کے اخبار ڈیلی میل نے یہ خبر مشہور کی تھی کہ مریخ والوں کے برقی پیام مارکونی کے سلسلۂ بے تار برقی میں آکر حرکت "تس" پیدا کرتے ہیں جس سے مہذب دنیا میں ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہو گئی' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں وہ لوگ جو روشنی اور تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں کیسی گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

حال کی تحقیقات کے معنی خیز نتائج

منگل پندرہ سولہ برس میں ایک مرتبہ چکر لگاتا ہوا زمین کے بہت قریب آجاتا ہے اُسوقت اسکا فاصلہ تین کروڑ میل سے بھی کم ہوتا ہے۔ لوئل نے ۱۹۰۹ء میں اپنی

تحقیقات کے نتائج پیش کئے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ سیارہ پھر زمین کے پاس آیا لیکن سب سے زیادہ وسیع مشاہدے سنہ ۱۹۲۴ء میں کئے گئے تھے جنکی بابت مانڈویل واقع جمیکا سے جی۔ ایچ۔ ہملٹن نے اخبار ٹائمز لندن میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اسکا خلاصہ یہ ہے کہ جیسا کہ لوئل نے اپنے مشاہدے سے ظاہر کیا تھا۔ مریخ کی نہروں کا سلسلہ انسانی صنعت ثابت ہوتا ہے اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے۔ شیا پریلی نے ان نہروں کو ہزارہا نالیاں قرار دیا تھا۔ لوئل نے انھیں ذی عقل انسانوں کی صنعت ٹھہرایا جو پانی کے بہاؤ کے واسطے بنائی گئی ہیں منگل کے قطبوں کی برف کا پانی موسم گرما میں ان ہی نالیوں سے بہ کر درمیانی خطہ کی طرف آتا ہے اور سارے ملکوں کی آبپاشی کا واحد وسیلہ ہے۔ وہاں پر پانی کی سخت قلت ہے۔ اس وجہ سے قطبوں کی پگھلی ہوئی برف کا پانی نہروں کے وسیلہ سے لایا جاتا ہے جو بڑے بڑے تالابوں میں جمع رکھا جاتا ہے۔ ایک نہر دو ہزار پانچسو تینتیس میل لمبی تخمینہ کی گئی ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ اہل مریخ کیسے دانشمند اور ہوشیار ہیں جو برف کے پانی سے بڑی حکمت سے کام لیتے ہیں۔

اری زونہ امریکہ کی رصدگاہ کے مہتمم ڈاکٹر ڈگلس نے جو مشاہدے کئے تھے انکا ماحصل یہ ہے کہ سطح مریخ پر جو سیاہ رقبے نظر آتے ہیں وہ روئیدگی سے ڈھکے رہتے ہیں۔ بادل بھی نظر آتے ہیں جو کرۂ ہوا میں چودہ چودہ میل پر معلق اُڑتے پھرتے ہیں۔ انکی رفتار فی گھنٹہ اٹھارہ میل ہوتی ہے۔ مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوتی جاتی ہے کہ کرۂ ارض اور منگل کے طبعی حالات میں گہری مشابہت ہے نئے مشاہدوں سے کوئی نئی بات عیاں نہیں ہوتی۔ کوہ ولسن کی رصدگاہ کے مہتموں نے جو مشاہدے کئے تھے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مریخ میں کرۂ ہوا ہے۔ اور اسکی سطح پر سیاہ دھاریاں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں جنمیں خاص موسم میں تغیر نظر آتا ہے اور یہ تغیر کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ بقول لوئل موسموں کے تغیر و تبدل سے رونما ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سطح مریخ پر موسم بہار اور جاڑے کی ابتدا کے تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں پیرس کی رصدگاہ میں ایک بہت بڑی دوربین کے ذریعہ سے بھی منگل کی سطح کا مشاہدہ کیا گیا تھا جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ مریخ کی آب و ہوا میں آکسیجن اور بخارات پائے جاتے ہیں۔ دن کی گرمی ہمارے یہاں کے جاڑے کے ابتدائی ایام کی خنکی کے مشابہ ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سطح مریخ پر آندھیاں اور طوفان برپا ہوتے ہیں۔ غرض سنہ ۱۹۲۴ء کے مشاہدات سے مریخ کے طبعی حالات کرۂ ارض کے مشابہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور نہروں کا جال ظاہر ہوتا ہے جو ذہین لوگوں کی حکمت و دانش پر دال ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سطح مریخ کے تغیرات عین اُس

زمانہ میں رو نما ہوتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں موسم بدلتے ہیں مگر ان کی میعاد کرۂ ارض کے موسموں سے زیادہ ہوتی ہے۔

فصلوں کے انقلابات

ڈاکٹر واٹر فیلڈ نے لندن کے مشہور اخبار "ڈیلی نیوز" میں ایک مضمون طبع کرایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ میں سردی نسبتاً زیادہ پڑتی ہے۔ ہوا بلند پہاڑوں سے کہیں بڑھکر لطیف ہے علاوہ ازیں منگل میں سمندر نہیں پائے جاتے۔ جیسے کہ اس دنیا میں ہیں۔ وہاں پر روئیدگی ضرور ہے اسمیں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ مریخ کی نہروں اور سبزی مائل سیاہ دھاریوں کے ردوبدل سے ذی عقل ہستیوں کا احتمال قوی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دھاریاں روئیدگی کے خطہ سے نکل کر سرخ رنگ کے چٹیل میدانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اور بالکل سیدھی ہیں۔ یہ دھاریاں بھی سبزی کے نقطہ جات کی نمائندہ ہیں۔ نہروں کے کناروں پر ہریاول پیدا ہوجاتی ہے۔ اسوجہ سے یہ سیاہ دھاریاں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر واٹر فیلڈ کہتے ہیں کہ مریخ میں انسانوں کی آبادی کے حق میں ایک یہ امر پیش کیا جاتا ہے۔ کہ روئیدگی کے بعض حصے سالوں تک بدستور رہتے ہیں اور انکی صورت ظاہری میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ اسکے بعد اسکی ہیئت بدل جاتی ہے اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتی ہے۔ بعد میں اسکی وہی پہلی جیسی شکل نمایاں ہوتی ہے۔ یہ کوئی قدرتی امر نہیں ہے ماہر کہتے ہیں۔ اس تغیر و تبدل کا بڑا سبب یہ ہے کہ جب فصلیں بوئی جاتی ہیں تو زمین کی صورت کچھ مدت تک بدلجاتی ہے، چونکہ وہاں کرۂ ارض کی نسبت خشکی زیادہ ہوتی ہے اسوجہ سے اناج پک کر تیار ہونے میں زیادہ عرصہ لگتا ہے مگر جب کٹ جاتا ہے تو زمین غیر مزروعہ پڑی رہتی ہے۔

مریخ کی نباتات اور حیوانات

پچھلی بحث پڑھنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مریخ پر انسان بستے ہیں تو شکل و صورت میں ہمارے جیسے ہیں۔ یا ہم سے مختلف؟ پچاس سال کے مشاہدات اور گہری تحقیقات سے یہ امر خوب واضح ہوگیا ہے کہ مریخ اور زمین کے طبعی حالات یکساں ہیں۔ اسوجہ سے وہاں پر نباتات اور حیوانات کا امکان قوی ہے۔ منگل کے روئے زمین کی ہیئت ظاہری میں عرصہ معینہ کے بعد خاص تغیر پیدا ہونا اور پھر مدت مقررہ کے بعد وہی صورت عیاں ہونا۔ نیز نہروں کے جال سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ وہاں پر ذی عقل انسان پائے جاتے ہیں، اسوجہ سے منگل میں انسان کی موجودگی کا گمان کرکے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہاں پر لمبے لمبے دُبلے پتلے آدمی ہونے چاہئیں کیونکہ وہاں کی کشش اور کثافت ہمارے یہاں کی بہ نسبت کم تر ہے۔ یعنی اگر بھاری بھرکم ہاتھی کسی حکمت سے منگل میں چلا جائے تو وہ ہرن کی طرح قلانچیں مارتا پھریگا۔ اور ہمارے یہاں کے کاہل



موسم کے تبادلے کا منظر



..... کے حیوانات کا تصور

جھول آدمی بندر کی طرح پھرتیلے ہوجائیں گے۔ بعض ماہروں کا یہ گمان ہے کہ اہل مریخ ہماری صورت کے ہیں اور بعض ارباب تحقیق انھیں ہم سے بدرجہا ذہین اور ہوشیار تصور کرتے ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنے قصے میں مریخ کے آدمیوں کی شکل وصورت ایسی دکھائی ہے جیسے کوئی ریچھ پچھلے پاؤں کے بل جھک کر سورج کی طرف تاک رہا ہو۔ نباتات، درخت بہت اونچے اور انکے تنے اور شاخیں تیلی ہونی چاہئیں اور پودے باریک نازک بیلوں کی مانند تصور کئے جاتے ہیں۔ ہمارے جاندار پروٹو پلازم (مادۂ حیات) سے پیدا ہوئے تھے کیا مریخ کے جانور بھی اسی مادہ سے معرض وجود میں آئے تھے؟ اور کیا کرۂ ارض کی مانند عمل ارتقا کی بدولت وہاں پر بھی ہزارہا قسم کے نباتات اور حیوانات ہوئے تھے؟ ان سوالات کا جواب نہایت دشوار ہے۔ موجودہ طریقۂ تحقیقات اور آلات وغیرہ کی وساطت سے یہ گورکھ دھندا ابھی نہیں سلجھ سکتا بلکہ آنیوالے زمانہ میں حل ہو سکے گا۔ مگر انگریز ماہر پروفیسر ایچ اے وگر کا قیاس ہے کہ اگر مریخ میں انسان اور نباتات اور حیوانات ہیں تو وہ اس دنیا کے حیوانات اور نباتات سے مختلف ہونگے جانور بہت ٹھگنے اور تیز رو ہونے چاہئیں۔

اہل مریخ سے نامہ وپیام

سائنس کے مسائل کو دلفریب پیرایہ میں بیان کرنیکی بے نظیر شہرت کے مالک پروفیسر جے۔ آرتھر۔ ٹامسن نے لندن کے رسالہ ڈسکوری میں ایک مضمون پچھلے دنوں طبع کیا تھا۔ جس میں اہل مریخ سے اشاروں سے بات چیت کرنے کے مسئلہ پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ذیل کی دلچسپ اور مفید معلومات اس سے مستعار ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس اہم سوال سے دوچار ہوتے ہیں کہ "کیا ایسا پیام تین کروڑ میل پر بھیجا جاسکتا ہے جو اہل مریخ تک پہونچ سکتا ہے؟" اگر ہمارا پیام وہاں تک پہونچ جائے تو کیا وہ اسکا مطلب سمجھ سکیں گے؟ جب ہم ان نازک سوالات پر غور کرتے ہیں تو سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا اہل مریخ ایسے آلات سے بہرہ اندوز ہیں۔ جن سے ہم کام لیتے ہیں۔ اسقدر فرض کرنے میں تو ہم حق بجانب ہیں کہ منگل کے لوگ بجلی اور مقناطیس کی لہروں کو پہچان سکتے ہیں چونکہ وہ عقل ودانش سے آراستہ ہیں۔ اسوجہ سے وہ روشنی کے اشارے سمجھ سکتے ہیں مگر وثوق کے ساتھ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ آیا روشنی کا احساس انکی آنکھوں پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ہماری آنکھ کی پتلی پر ہوتا ہے۔ یہ امر تو مسلمہ ہے کہ کرۂ ارض اور مریخ کے درمیان نامہ وپیام کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اسوجہ سے روشنی سے کام لینا بہت ضروری ہے۔ جو خلا سے گزر کر منگل تک پہونچ سکے۔ اس مقصد کے واسطے بجلی کا خوفناک شرارہ بہت اچھا ثابت ہو سکے گا۔ مگر اسکے متعلق بڑی دقت یہ ہے کہ کرۂ ارض گہرے کرۂ ہوا سے محیط ہے جو برقی روشنی کو جلد جذب کرلیتا ہے۔ اسوجہ سے یہ شرارہ اتنا طاقتور ہونا چاہئے۔ جو کرۂ ہوا کو چیر کر

اور اسکی مزاحمت سے بچکر تین کروڑ میل طے کرے اور سطح مریخ پر نمایاں ہو اور اس سرزمین کے بسنے والوں کی آنکھوں کو متاثر کرے۔

اگر بالفرض کوئی سبیل ایسی نکل آئے جس سے ہم برقی شرارہ سے اشارہ کر سکیں۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "کیا مریخ میں ایسے انسان ہیں جو ہمارے پیام کا مطلب سمجھنے کی قدرت سے بہرہ ور ہیں؟" کئی ماہروں نے منگل میں ذی عقل ہستیوں کے احتمال پر بہت خامہ فرسائی کی ہے مگر یہ صرف خوش اعتقادی ہے لیکن یہ عقل و دلیل سے محض بیگانہ نہیں ہے۔ فی زمانہ ارباب طبیعات خیال آرائی سے متاثر ہونے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ کیونکہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جو بات ابتدا میں خیالی اور اعتباری نظر آتی ہے وہ بعد میں ایک اعلیٰ درجہ کی حقیقت ثابت ہوتی ہے عقل یہ تسلیم کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ کہ سارے عالم میں کرۂ ارض ہی مسکن زیست ہے اور باقی اجرام فلکی نباتات اور حیوانات کی ہستی سے سراسر خالی ہوں! اکثر ارباب تحقیق کا یہ دعویٰ ہے کہ دیگر سیارے جانداروں کے رہنے سہنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر یہ گمان سراسر بے سروپا اور لایعنی ہے۔ ہمارے یہاں جاندار پروٹو پلازم (مادۂ حیات) سے پیدا ہوئے تھے۔ منگل اور زہرہ میں بھی اس قسم کا مادہ وہاں کے طبعی حالات کے مطابق پیدا ہو سکتا ہے۔ جس سے جاندار معرض وجود میں آتے ہیں۔ یہ تو قرین قیاس نہیں کہ ان دونوں سیاروں میں اگر ذی عقل ہستیاں ہوں تو وہ اسی قسم کے آلات سے بہرہ یاب ہوں جس سے ہم کام لیتے ہیں۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ برقی لہریں عالم کے گوشے گوشے میں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ بالکل ایک ہی جیسی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل تسلیم ہے کہ مظاہر طبعی اور انکے تغیرات کے عمل کا اثر ذی عقل ہستیوں کے دل و دماغ پر مساوی ہوتا ہے۔ رات دن اور دیگر مظاہر کا جو اثر ہمارے حواس پر ہوتا ہے وہی مریخ اور زہرہ کے آدمیوں پر ہوگا۔

اگر ان مشکلات کا کوئی آسان سلجھاؤ ہو جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "پیام کس قسم کا ہو اور وہ کن الفاظ میں ہونا چاہئے۔" یہ تو ممکن نہیں ہے کہ مریخ کے باشندے ہماری زبان سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں لیکن یہ قیاس بالکل معقول ہے کہ بعض تصورات عالمگیر نوعیت کے ہیں اور وہ اس دنیا اور دیگر سیاروں میں بھی مسلمہ ہونگے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ بلند پایہ برقی آلات کے ذریعہ سے تین کا ہندسہ ظاہر کیا جائے۔ اگر مریخ والے مسلسل چار مرتبہ برقی اشارہ کریں تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ منگل والوں نے ہمارا اشارہ سمجھ کر اسکا جواب دیا ہے۔ اس طرح کرۂ ارض اور منگل کے مابین تین اور چار کا مسلمہ اشارہ قرار پا سکتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد

کسی بلند پایہ ماہر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کرۂ ارض کے کسی وسیع میدان میں ایسا عظیم الوسعت مثلث بنایا جائے۔ جسے اہل مریخ دیکھ کر ہمارا پیام تصوّر کرسکیں۔ اقلیدس کے اُصول موضوعہ عالمگیر نوعیت کے ہیں اور تصوراتِ ریاضی بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ آیا ہم مریخ میں اپنا پیام بھیج سکتے ہیں؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ سردست ہمارے یہاں ایسے آلات موجود نہیں ہیں، جنکی وساطت سے پیام بھیجا جائے مگر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور یہ اُمیّد کرنا بیسُود نہ ہوگا کہ آنیوالے زمانہ میں کوئی ایسی ترکیب دریافت ہوجائے گی جس سے اہل مریخ پر ہم اپنا مافی الضمیر ظاہر کرسکینگے۔

دیگر اجرام فلکی میں آبادی کا امکان

اکثر بڑے بڑے ماہران فلکیات کا یہ گمان ہے کہ منگل کی طرح شکر بھی نباتات اور حیوانات کا مسکن ہے۔ یہ سیارہ کرۂ ارض سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ اس کا قطر سات ہزار سات سو میل ہے اور سورج سے چھ کروڑ ستر لاکھ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ کبھی کبھی گشت کرتا ہوا یہ سیارہ زمین کے بہت قریب (دو کروڑ ساٹھ لاکھ میل) آجاتا ہے جسکے باعث اسکے حالات طبعی مشاہدہ کرنیکا عمدہ موقع بہم پہنچ جاتا ہے اس کے موسم دوہرے ہوتے ہیں۔ یہ سورج کے گرد ۲۲۴ دن میں اپنا دورہ تمام کرتا ہے۔ اسوجہ سے اس کا سال زمین سے چھوٹا ہے۔ اسکی ہوا ہمارے یہاں کی ہوا سے کہیں زیادہ کثیف ہے۔ اسمیں بخارات بکثرت معلق رہتے ہیں۔ پروفیسر اے۔ ایس۔ ایڈنگٹن برطانیہ کے نامور ماہر فلکیات نے اپنی تازہ تصنیف میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شکر کے طبعی حالات ہمارے یہاں کے حالات کے عین مشابہ ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہاں پر نباتات اور حیوانات پائے جاتے ہیں۔ شکر میں کرۂ ارض سے کہیں زیادہ گرمی پڑتی ہے۔ مگر آب وہوا اچھی ہے اگر کوئی آدمی اس دنیا سے اُڑ کر وہاں جا رہے تو اسے اپنے عادات میں ترمیم کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی"[۱]۔ پانچ چھ سال ہوئے کہ ڈاکٹر ایڈیسن۔ امریکہ کے ماہر ہیئیات نے بھی تفصیلی بحث کے بعد شکر کے آباد ہونے کا خیال کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ ماہرین کے نزدیک ان طبعی حالات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جو پودوں اور جانوروں کی زندگی کے قیام کے واسطے لابدی ہیں۔ اس لئے استدلال تمثیلی کی بناء پر کئی ماہروں نے شکر کو مسکن نباتات وحیوانات قرار دیا ہے۔ لیکن منگل کی طرح تفصیلی حالات بیان کرنے میں وہ سب قاصر ہیں۔

آفتاب نظام شمسی کا مرکز ثقل اور اراکین نظام شمسی اور سیّاروں کا باوا آدم ہے۔ یہ

---

[۱] "دی نیچر آف دی فزیکل ورلڈ" گفرڈ لیکچرز ۱۹۲۷ء

کرۂ نور و نار ہے۔ کیا وہاں پر انسان زندہ رہ سکتے ہیں؟ فلکی ماہروں میں بہت تھوڑے ایسے ماہر ہونگے جو سورج کو مسکن آبادی تسلیم کرینگے۔ فرانسیسی ماہر فلکیات فلے مراآن نے جو دنیا کے نامور ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی برس ہوئے کہ ایک قابل قدر تصنیف میں آفتاب میں انسانی ہستیوں کے احتمال پر خامہ فرسائی کی تھی یہ ماہر اپنے انوکھے خیالات اور قیاسات کے سبب سائنس دانوں کی دنیا میں خاص شہرت رکھتا تھا اس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ آفتاب میں انسانی آبادی کے بارہ میں اسکا یہ خیال ہے کہ "آفتاب کا بیرونی حلقہ جو خطۂ نور کہلاتا ہے اس قابل ہے کہ وہاں پر انسان رہ سکیں مگر وہ کیسے انسان ہونگے؟ اس خطہ میں رہنے والے نورانی آدمی ہونے چاہئیں جو کرۂ ارض کے آدمیوں سے کلیتہً مختلف ہونگے۔ اگر وہ ایسے نہ ہوں تو کرۂ نور میں وہ کیسے زندہ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے جسم وہاں قائم نہیں رہ سکتے"۔ اس قسم کے خیالات سے بہت تھوڑے ماہروں کو اتفاق رائے ہے۔

اس بحث سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ عالم بالا میں کہاں کہاں نباتات اور حیوانات کی بود و باش کا گمان ہو سکتا ہے۔ کرۂ ارض کے ماسوا مریخ اور زہرہ ان دو اور سیارے انسان اور حیوان اور روئیدگی کے مسکن تصور کئے جاتے ہیں۔

جے۔ آر۔ رائے

مذہب

مذہب وہ روحانی عینک ہے جس سے انسان خدا کو دیکھتا ہے اور جس سے انسان انسان کو پہچانتا ہے۔

مذہب ایشور کے آستانے تک پہنچنے کی سیڑھی ہے، وہ نورانی ڈور ہے جسکا رشتہ فرش سے عرش تک ہے۔

مذہب اعلیٰ سیرت کو مکمل کر کے حیوان ناطق کو انسان کامل بنا دیتا ہے۔

مذہب خدا کے بتائے ہوئے چند قوانین کا نام ہے جو ناقابل ترمیم ہیں اور دنیا کے ارتقا کے ساتھ انکی اہمیت روشن تر ہوتی جاتی ہے۔

مذہب دنیا و دین کے لئے شمع ہدایت ہے جسکے بغیر جادۂ ہستی کو طے کرنا دشوار ہے۔

مذہب انسان کے دل میں عزم بالجزم۔ ہمت۔ صداقت اور راسخ الاعتقادی کی بنیادیں استوار کر دیتا ہے جن کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

(محمود اسرائیلی)

فلسفۂ حسن و جمال

از حضرت حسن عسکری مجازی

فلسفۂ شک کا علمبردار ہیوم دنیائے الحاد کا پیمبر ہو گذرا ہے، اس کا خاص مسئلہ یہ ہے کہ اشیاء کی حقیقت نامعلوم اور ہستی کا راز فہم انسانی سے باہر ہے۔ ہماری زندگی کیا ہے؟ بقول خیام

این چرخ فلک کہ ما درو حیرانیم　　فانوس خیال ازو مثالے دانیم
خورشید چراغدان و عالم فانوس　　ما چوں صوریم کاندرو گردانیم

بہرحال اُس کے نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم حسن و جمال کی دنیا کو نگاہِ غور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دنیا میں حُسن و جمال کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ انسان کے دماغ میں ایک ایسا جذبہ یا رجحان ہوتا ہے جو حسن و جمال کا معیار بنجاتا ہے

اس کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کے مختلف قوموں کے جداگانہ رسم و رواج کی طرح اُن کے معیارِ حُسن بھی مختلف ہیں۔ مثلاً انگریز سرخ و سفید رنگ، بھورے بال اور کرنجی آنکھیں پسند کرتے ہیں، تو حبشی سیاہ رنگ، گھونگھروالے بال اور چپٹی ناک کے فریفتہ ہیں، اور ہندوستانی شعرا سانولے رنگ اور کنول جیسے پاؤں کی تعریفیں گایا کرتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور میگزین 'نیچر' نے ایک مرتبہ افریقہ کی ایک سیاہ فام قوم کے مذاقِ حسن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہاں مرد کا حسن یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس کا لبِ زیریں لٹکتا ہوا ہو چنانچہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کا نیچے کا ہونٹ چھید دیا جاتا ہے اور اُس میں ایک کرٹی ڈالکر کوئی وزنی شے لٹکا دی جاتی ہے جس قدر ہونٹ لٹکتا جاتا ہے اُسی قدر زیادہ وزنی کرٹی ڈال دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض ہونٹ سینہ تک لٹک جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کان چھید کر اُن میں بالیاں پہنائی جاتی ہیں، وہاں ہونٹ چھیدے جاتے ہیں۔ اور جس طرح ہمیں لٹکتے ہوئے ہونٹ ناپسند ہیں، اُسی طرح اُن کی نظر میں بالیوں سے لدے ہوئے کان۔ چینیوں کا مذاقِ حسن یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں پر فریفتہ ہیں، اس لئے وقت پیدائش ہی سے وہ لڑکیوں

کے پاؤں میں لوہے کے جوتے پہنا دیتے ہیں۔ تاکہ پاؤں بڑھنے نہ پائیں۔ [۱]

پھر جس قدر جس قوم کا معیارِ حسن ہماری قوم کے معیار سے زیادہ موافقت رکھتا ہوگا اُسی قدر اُسے ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں زیادہ ترجیح دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یوروپین کے مقابلہ میں ہندوستانی پوزیشین کو زیادہ حسین سمجھتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یوروپین کے مقابلہ میں یوریشین ہمارے نفسیات کو زیادہ اپیل کرتا ہے۔

مگر مختلف اقوام کے معیارِ حسن پر تو ہم بعد میں بحث کریں گے، پہلے اپنی ہی قوم پر نگاہِ غائر سے کیوں نہ دیکھیں۔ خود ہماری قوم میں مختلف مذاق کے لوگ ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت حسن کا کوئی خاص معیار معین نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کبھی کسی عاشق سے ذرا اس امر کی التجا کیجئے کہ وہ آپ کے سامنے اپنی محبوبہ کی تصویر کھینچے۔ پہلے تو وہ آپ سے پوچھے گا کہ کیا آپ نے کبھی کسی حور یا پری کو بھی دیکھا ہے۔ اگر آپ نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ کہے گا کہ پھر آپ میری محبوبہ کے حُسن کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ آہ اُس کی آنکھیں کیسی نرگسی ہیں، آواز کیسی دلکش ہے۔ چنانچہ آپ کو یہ خیال کرکے خاموش ہو جانا پڑیگا کہ فرطِ محبت نے اُس بیچارے کے تمام حواس مختل کر دیے ہیں

اِس سے بھی قطع نظر آپ خود بھی غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حسن محض ایک خیالی شے ہے اصلی نہیں۔ ذرا اپنی عمر رفتہ پر نظر ڈالیے، اُس زمانہ کا تصور کیجیے جب آپ ایک کم سن بچے تھے یعنی آٹھ نو برس کے۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کے احساس کی قوت کمزور تھی اور دل میں جذبات پیدا نہیں ہوتے تھے۔ یا یوں سمجھئے کہ جب آپ کے جذبات درجۂ اعتدال پر نہیں پہنچے تھے۔ کیا اُس زمانہ میں بھی آپ کی آنکھیں حُسن سے اُسی قدر لذت اندوز ہوتی تھیں جتنی کہ آج؟ کیا ایک معمر وضعیف انسان بڑھاپے میں بھی عالمِ شباب کی طرح حُسن سے متاثر ہو سکتا ہے؟

ایک ہی شخص کی نظر میں بعض اوقات کوئی خاص صورت بہت حسین معلوم ہوتی ہے، اگرچہ دوسرے زمانہ میں اُسی شخص کو اُس کی طرف وہ التفات نہیں رہتا۔ اور یہ تو قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر ایک عرصہ تک آپ کو حسین سے حسین شخص کو برابر دیکھنے کا موقع ملے تو اُس کی وہ کشش آپ کے دماغ سے جاتی رہتی ہے جو اوّل اوّل اُسے دیکھنے سے ہوتی ہے۔ البتہ محبت بڑھ جاتی ہے۔ اِس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دراصل حُسن میں کوئی خاص کشش نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہیجان

---

[۱] اب یہ رواج متروک ہوتا جارہا ہے۔ اڈیٹر

بنکر دماغ میں جاگزیں ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حسن ایک خیالی شے ہے۔ جس میں کوئی کشش نہیں، وہ صرف ایک رجحان کی صورت میں دل و دماغ کے اندر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اِسی قانون کے مطابق ہر جاندار کے ذکور اور اناث کے باہمی اجتماع کے ساتھ ایک مکمل فرد بنتی ہے۔ ورنہ ذکور و اناث اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ ناقص اور غیر مکمل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صنف حیوانات اپنی ہی صنف کے اندر اُسے پاتی ہے اور یہی تولیدِ نسل کا راز ہے۔ انسان کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیئے، ورنہ اُس کا مصرف قانونِ قدرت کے خلاف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی مقتدر ہستیاں گذری ہیں اُنھوں نے حُسن پرست جذبہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مشہور انگریز فلاسفر لارڈ بیکن کہتا ہے کہ :-

"حسن کوئی شے نہیں، مگر وہ وصف ظاہری ہے، اور وصف نام ہے حُسنِ باطن کا۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حسین کوئی نہیں تو پھر یہ حُسن کا لفظ کیوں خلائق کے زبان زد ہے اِس کا جواب یہ ہے کہ ہر قوم کے نفسیات کے مطابق متعدد ہستیوں کی نظر جسے حسین قرار دے دیتی ہے وہ حسین ہو جاتا ہے۔ اور وہ لوگ جن کی نظر فطرتاً حسن پر پڑتی ہے اہل مذاق کہلاتے ہیں۔ قوم کے فطری شاعر میں یہی خصوصیت ہونی چاہیئے۔

ایک مرتبہ میں ایک دوست کے ساتھ موسیقی کانفرنس میں گیا، وہاں مجھے ایک راگ نہایت پسند آیا، اگرچہ اُسی راگ سے میرے دوست کو سخت نفرت تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ راگ کی بُرائی یا بھلائی نہ تھی۔ بلکہ بات یہ تھی کہ میوزیشین (گانے والا) اپنے گلے سے ہَوا میں جو آوازیں پیدا کرتا ہے اُن کا کیفیات دماغی کے ساتھ ایک تعلق ہے، مگر وہ تعلق ہر دماغ کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا بلکہ جداگانہ طریقہ پر۔ پس ایک ہی راگ سے اختلافِ مذاق ہونا دراصل اُس راگ اور دماغی کیفیات کے تعلق میں اختلاف ہونے کے سبب تھا۔ عموماً کسی ایک ہی ملک میں اختلافِ تعلق کم ہوتا ہے، کیونکہ نفسیات میں تعلق زیادہ ہوتا ہے، مگر غیر ممالک کے جداگانہ نفسیات کے لحاظ سے اختلافِ تعلق بھی قدرتاً زیادہ ہوتا ہے۔

یہ اختلافِ مذاق جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے، اون کے بعض اصناف موسیقی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً گھڑیال، سانپ، چھپکلی وغیرہ، اور بعض بالکل نہیں۔ اول الذکر کے دماغ میں ایک فطری رجحان ہوتا ہے جو موسیقی سے متاثر ہوتا ہے جبکہ آخر الذکر کے دماغ میں وہ رجحان نہیں ہوتا۔

یہ قانون فقط حسنِ صورت ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ہر طرح کے حُسن سے تعلق رکھتا ہے۔ گوتم بُدھ رحم و کرم کا مجسمہ تھا اُس کے خلاف کربلا میں لشکرِ یزید کا جنرل ظلم و ستم کا پُتلا۔ ان دونوں کے اختلافِ مذاق کا فرق فقط محض اُن کے رجحانات کے اختلاف پر مبنی تھا نہ کہ کسی حقیقت پر۔ یہی کُلیہ آپ کو ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔

اوراقِ پریشاں

از محمد صادق حسین بی۔اے (علیگ) کراؤن سائز۔ ۱۶۰ صفحات مجلد قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ۔ صفدر حسین۔ ادریس گنج۔ ہردوئی (اودھ)

یہ چار افسانے اور چھ مضامین کا مجموعہ ہے جو لکھنؤ اور لاہور کے ادبی رسائل میں شایع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں عبارت سلیس و رواں اور اندازِ تحریر دلکش ہے۔ اگرچہ یہ مصنف کی ابتدائی مشقِ نگارش کا نتیجہ ہیں تاہم مطالعہ کے لائق ہیں۔

حالاتِ انبیاء

حالاتِ انبیاء۔ مولفۂ مولوی احید الدین۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ کراؤن سائز ۲۴ صفحات قیمت ۱؎

اس مختصر رسالہ میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے پڑھنے کے لئے تمام نبیوں کے حالات مختصر طریقہ پر بہت صاف اور سادہ زبان میں جمع کئے گئے ہیں۔ آخر کتاب میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی ہے نیز ہر نبی کے حالات کے بعد چند سوالات بھی لکھ دیے ہیں تاکہ مطالعہ کے بعد بچوں کو اسپر غور کرنے کا موقع ملے

چار یار

چار یار۔ مؤلفۂ احمد الیاس مجیبی صاحب۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ کراؤن سائز۔ ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲؎ ار

اس کتاب میں خلفائے راشدین کے مستند حالات مسلمان بچوں کے مطالعہ کے لئے لکھے گئے ہیں ہر خلیفہ کے نام و نسب وغیرہ کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات نیز اُن کے دوران خلافت میں جو ممالک فتح ہوئے اور اندرونی بیرونی جو واقعات ظہور پذیر ہوئے اُن سب کا ذکر سادہ زبان میں کیا گیا ہے۔ عبارت باوجود سادگی کے دلکش ہے اور واقعات پڑھنے والے کے دل کو متاثر کرنے والے ہیں۔ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ مسلمان بچوں کو اسکا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ کم علم مرد اور عورتیں بھی اسکو پڑھکر فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم

(از جناب اقبال ورما سحر ہنگامی)

مسلم لیڈران ملک میں ایسی شخصیتیں بہت کم پائی جاتی ہیں جن کو وہ ہردلعزیزی نصیب ہوئی ہو۔ جو مولانا محمد علی صاحب مرحوم کو حاصل ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی بےوقت وفات پر تمام ملک میں ماتم برپا ہے جس میں ہندو مسلمان سبھی شریک ہیں۔ مرحوم کے ذات باصفات میں ایثار نفس کا وصف ایسا مستقل وصف تھا جو اون کی تلون مزاجی کے باوجود بھی ہمیشہ اُن کا خاص جوہر بنا رہا اور جس سے مختلف خیال کے لوگ بھی یکساں متاثر رہے۔ مرحوم کی زندگی کے دوران میں اس جذبۂ خالص کا اظہار مختلف موقعوں پر ملک کی بےغرضانہ عملی خدمات کی صورت میں ہوتا رہا۔ درحقیقت ایسے مقدس جذبے کے ماتحت مولانا محمد علی اشد علالت کے زمانہ میں بھی گول میز کانفرنس کے لئے لندن کا سفر اختیار کیا۔ یہی جذبہ ہے جو انسان کو لافانی بناکر اوسے "فوق البشریت" کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔

مولانا کی ولادت ۱۸۷۸ء میں بمقام ریاست رامپور ہوئی جہاں اُن کے پدر بزرگوار مولانا عبدالعلی خاں صاحب ریاست کے اعلے عہدہ دار تھے۔ مولانا محمد علی اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی دونوں بچپن ہی میں اپنے والد ماجد کے سایہ سے محروم ہوگئے اور دونوں بچوں کی پرورش و پرداخت بیوہ ماں نے کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بی اماں مرحومہ نے اپنے مادری فرائض بہترین طریقہ پر انجام دیئے اور اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ ماں کے ذاتی اوصاف اولاد پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بی اماں اپنے بچوں سے غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات نہایت رقت آمیز لہجہ میں بیان کیا کرتی تھیں، اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی بتلایا کرتی تھیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستبرد نے کس عجلت سے حکومت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا۔ ایسی دردمند ماں کی گود میں پلے ہوئے بچوں کے دلوں میں حب الوطنی کے نشو و نما کے لئے کتنی وسیع فضا مل سکتی ہے۔!

مولانا محمد علی اپنی ابتدائی تعلیم رامپور میں ختم کرنے کے بعد بریلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کرکے علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے اور ازاں بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں تکمیل تعلیم کی۔ وہ سول سروس کے امتحان میں بھی شریک ہوئے مگر ملک کی خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں وہ ہندوستان واپس تشریف لائے۔ پہلے ریاست رامپور کے چیف ایجوکیشنل افسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ریاست بڑودہ کے محکمۂ افیون کے افسر اعلیٰ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس ملازمت کا سلسلہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۰ء تک قائم رہا۔

یوں تو مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ مولانا اس کے بانیوں میں تھے۔ مگر در اصل وہ سیاسی میدان میں اُس وقت داخل ہوئے جب اُنھوں نے ۱۹۱۱ء سے اپنے مشہور و معروف اخبار کامریڈ کی اشاعت کلکتہ میں شروع کی۔ ۱۹۱۲ء میں دار السلطنت کی تبدیلی کے ساتھ یہ اخبار بھی کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۹۱۳ء سے مولانا نے اپنا مشہور اُردو روزانہ "ہمدرد" نامی بھی دہلی سے جاری کیا۔ اسی سال کانپور کی مسجد والا ناگوار واقعہ رونما ہوا۔ اس جدوجہد سے مولانا نے گہری دلچسپی لی اور اُس کے وفد کے ساتھ انگلستان بھی تشریف لے گئے۔

۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور بعد چندے حکومت ترکی بھی اس میں شامل ہوگئی۔ اُس وقت مولانا نے اپنے اخباروں میں چند ایسے مضامین لکھے جو گورنمنٹ ہند کی نظروں میں قابل اعتراض قرار پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ مع اپنے بڑے بھائی کے پانچ سال تک مہرولی، چھندواڑہ اور بیتول میں نظر بند رہے۔ بالآخر ۱۹۱۹ء میں شاہی اعلان کے بموجب دیگر سیاسی قیدیوں کی طرح آپ بھی رہا ہوئے۔ بعدہ مارچ ۱۹۲۰ء میں مولانا پھر انگلستان گئے، اس دفعہ آپ اس وفد کے امین خاص تھے جو ترکی سے شرائط صلح طے کرنے کی غرض سے گیا تھا۔

بالآخر آپ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے ناکامیاب ہوکر ہندوستان میں واپس آگئے یہاں اس وقت ہر طرف تحریک ترک موالات کی ابتدائی سرگرمیاں نظر آرہی تھیں۔ مولانا نے بھی برطانوی طرز عمل سے مایوس و بددل ہوکر خلافت کے متعلق جدوجہد میں مہاتما گاندھی کا ہاتھ بٹایا اور اس مستعدی سے اس تحریک میں حصہ لیا کہ دونوں مہاتما جی کو "باپو" کے لقب [illegible]۔

اور مہاتما جی بھی انھیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔ بہر نوع اس تحریک کے سلسلہ میں ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا، جہاں مولانا صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں سرکار انگلشیہ کو دشمن اسلام اور سرکاری ملازمت کو ایک خلاف شرع فعل قرار دیا۔ مولانا کی یہ تقریر بھی قابل اعتراض سمجھی گئی اور اس کے پاداش میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا جس میں مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ بعض دیگر حضرات بھی ماخوذ تھے بہرحال مولانا کو پھر دو سال قید سخت کی سزا ملی۔ ۱۹۲۳ء میں رہا ہو کر آپ نے ہندو مسلم نفاق کا وہ منظر خونیں دیکھا جس نے ان کے دل کو ہلا دیا۔ آپنے ان دونوں عظیم الشان قوموں کے درمیان اتحاد باہمی کرانے کا تہیہ کر لیا، لیکن اس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی

۱۹۲۳ء میں مولانا صاحب کوکنیڈا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے، آپ کا خطبۂ صدارت نہایت قابلانہ تھا۔ مگر حب الوطنی کے ساتھ اسلامی جذبات کی جھلک بھی اس میں موجود تھی۔ بات یہ ہے کہ موصوف کے محب وطن ہونے میں کوئی کلام نہ تھا، مگر اُن کی حب الوطنی پر اسلامی جذبات بھی غالب ہو جاتے تھے۔ وہ "وطنیت" کے خیال سے فرقہ وارانہ خیالات کو دبا سکتے تھے مگر انھیں بالکل بھول جانا اون کے حیطۂ امکان سے باہر تھا۔ بالآخر اس رویۃ میں کچھ زیادہ سرگرمی نظر آنے لگی جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اتحادی مساعی سے کنارہ کش ہو جانے پر مجبور ہو گئے بلکہ ہندو اُن سے اور وہ ہندوؤں سے کسی قدر بدظن ہو گئے اور اس میں مہاتما گاندھی کی اعلیٰ شخصیت بھی شامل ہو گئی۔ نہرو رپورٹ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کا ایک قابل قدر نتیجہ تھی مگر مولانا کو اس سے شدید اختلاف رہا، چنانچہ ۱۹۲۸ء کے بعد وہ کانگریس سے بھی علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے ملک کی موجودہ سیاسی تحریک میں کوئی حصہ لینا مناسب نہیں سمجھا۔

لیکن اس سے اُن کی ہمت مردانہ پر حرف نہیں آسکتا، ملک و مذہب کے لئے ذاتی آسایشوں کو قربان کر کے انواع واقسام کی صعوبتیں برداشت کرنا کسی معمولی ہمت والے شخص کا کام نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی بات مولانا ممدوح کے دل نشین ہو جاتی تھی تو پھر وہ کسی دُنیاوی تکلیف یا آرام کے خیال سے اُسے پورا کرنے سے باز نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک عرصے سے وہ ذیابیطیس کے مہلک عارضہ میں مبتلا تھے، مگر جب ایک مرتبہ اُنھوں نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھ لیا تو بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کا مشورہ و اصرار بھی اُنھیں سفر لندن سے باز نہ رکھ سکا۔ آپ نے اس کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"یا تو میں آزاد ہندوستان کو واپس ہونگا یا سرزمین انگلستان ہی میں میری قبر بنے گی۔"
افسوس کہ یہ آخری بات سچ ہو کر رہی، اور موصوف کا لندن میں ۴ جنوری ۹ ۱ء بجے صبح کو انتقال ہو گیا۔ اُن کے حیرت انگیز استقلال کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ ۳ جنوری کی نصف شب تک ہندو مسلمانوں کے نام اپنی آخری عرضداشت کی نظر ثانی کرتے رہے، جس میں اُنھوں نے ہندوستانی قومیت کے نام فریقین کے لیڈروں سے اپنے باہمی اختلافات مٹا دینے کی اپیل کی تھی۔ اس طرح مولانا نے مرتے مرتے ایک بار پھر اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیا اور اسی اعلیٰ جذبہ پر اپنی جان تک قربان کر دی!

مولانا کی علمی قابلیت مسلمہ تھی، وہ ایک خوش بیان اور فصیح مقرر تھے مگر اُن کی تحریر و تقریر دونوں طولانی ہوتی تھی۔ تقریر میں ظرافت کی چاشنی ہوتی تھی جس کا سامعین کے دلوں پر بہت ہی خوشگوار اثر پڑتا تھا۔ بحث کا بھی اُنھیں خاصہ ملکہ تھا اور اُن کا مدِّ مقابل آسانی سے اُنھیں مغلوب نہ کر سکتا تھا۔ آپ کی طبیعت کو شاعری سے بھی لگاؤ تھا اور جوہر تخلص کرتے تھے، مگر اُن کی بے شمار مصروفیتیں اُنھیں اس معشوقۂ دیر آشنا و زود رنج کی ناز برداریوں کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ تاہم آپ کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ شائع ہو گیا ہے ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
اثرِ خوف ہے اِس درجہ تو مرنا ہے یہی
قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
عین پستی ہے کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اِسکا تو اُبھرنا ہے یہی

(مولانا محمد علی مرحوم)

تنقید کتب

انتخاب مثنویاتِ میر

مرتبۂ آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۳۲ صفحات - قیمت ۱۲؍

اردو زبان کے شعرا میں میر کا درجہ سب سے بلند ہے، ناسخ و غالب جیسے یگانۂ روزگار شعرا بھی میر کے معتقد ہیں۔ اور کہتے ہیں ع،

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میر صاحب نے طویل عمر پائی اور زندگی بھر فکرِ سخن میں مصروف رہے، ان کا کلام چھ دیوان اور متعدد مثنویات پر مشتمل ہے، دواوین کے متعدد انتخاب شایع ہو چکے ہیں مگر مثنویات کا انتخاب ابھی تک شایع نہیں ہوا تھا حالانکہ میر صاحب کی مثنویاں شاعرانہ حیثیت سے بھی ایک خاص درجہ رکھتی ہیں۔ شکر ہے کہ یہ کمی اب آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب کی توجہ سے پوری ہو گئی۔ اس لائق تحسین ادبی خدمت کے لئے اردو ادب کے شایقین کو آپ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سخت عدیم الفرصتی کے باوجود اردو ادب کی خدمت کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے آپ دیوان و قصائد کا ایک قابل قدر انتخاب بھی شائع فرما چکے ہیں۔

اس انتخاب کے شروع میں آپ نے ایک بسیط و محققانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں میر صاحب کے ذاتی حالات کے علاوہ ان کے اخلاق و عادات کے بیان میں مختلف تذکرہ نویسوں نے جو افراط و تفریط سے کام لیا ہے اُس پر سیر حاصل بحث کر کے ایک فیصلہ کن رائے ظاہر کر دی گئی ہے جس سے عام شایقین و محققین دونوں کے لئے یہ مقدمہ دلچسپ و قابل قدر ہو گیا ہے فاضل مؤلف نے میر کے ذاتی حالات کے متعلق مختلف بیانات و روایات کا بڑی دقیق نظری سے موازنہ کر کے اپنا محققانہ فیصلہ پیش کیا ہے جس کی بدولت اس کتاب کے مقدمہ کو قول فیصل کی حیثیت مل گئی ہے۔

اِس مجموعے میں چھوٹی بڑی بتیس ۳۲ مثنویوں کا انتخاب کیا گیا ہے، اور انتخاب میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایسے اشعار جو فحش اور موجودہ زمانہ کے اخلاقی معیار کے منافی تھے حذف کر دئے گئے ہیں اور صرف وہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں جو فنِ شاعری کے نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں، اور اگرچہ بقول مرتب صاحب دو یا تین مثنویوں کے سوا دیگر مثنویات کے پورے قصّے پیش نہ کئے جا سکے تاہم چونکہ اصلی غرض عمدہ کلام شائع کرنے کی تھی اس لئے اس خامی کو گوارا کیا گیا۔ بعض مثنویوں کے متعلق تاریخی نوٹ بھی دئیے جا سکتے تھے تو اس انتخاب کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ انتخاب قابلِ قدر ہے۔

فاضل مؤلف نے عام شائقین کی سہولیت کے لئے فٹ نوٹس میں مشکل الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کی بھی تشریح کر دی ہے جو آجکل استعمال نہیں ہوتے ہیں مگر میر کے زمانہ میں روزمرہ میں داخل تھے۔

طائرِ خیال

جناب سدرشن کی کہانیوں کا مجموعہ، سدرشن پبلشنگ ہاؤس لاہور، قیمت ۱۲؍

موجودہ زمانہ کو کہانیوں کا جگ سمجھنا چاہئیے، مادّی ضروریات میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ معمولی انسان اونھیں پورا کرنے کی کوشش میں دن رات مصروف و پریشان رہتا ہے ایسی حالت میں اوسے منطق و فلسفہ وغیرہ کے دقیق مسائل پر غور کر کے اُن سے مفید نتائج اخذ کرنے کی فرصت کہاں؟ اگر وہ متمنّی رہتا ہے تو ایسے سبک لٹریچر کا جس پر وہ اپنی معروفیت کے اوقات میں ایک نگاہِ غلط انداز ڈال سکے۔ اس عام رجحان کی بدولت مختصر افسانوں کو ادب میں ایک خاص جگہ مل گئی ہے۔ فسانہ نویسی کے طرز میں بھی اس وجہ سے جدّت آگئی ہے عام عدیم الفرصتی کے لحاظ سے بڑے افسانوں کی بہ نسبت چھوٹی چھوٹی کہانیاں زیادہ عام پسند ہو رہی ہیں۔ مگر ان کی ترتیب میں فسانہ نویس کو زیادہ دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اِسی نقطۂ خیال سے مسٹر سدرشن کی کہانیوں کا مجموعہ جو حال میں طائرِ خیال کے نام سے شائع ہوا ہے اپنے مشہور و معروف مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا ایک دلخوش کن ثبوت ہے۔ اِس سے پہلے سدرشن صاحب کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔

طائرِ خیال میں کل بارہ کہانیاں ہیں، اور کیا بلحاظ بندش و دلکشی اور کیا باعتبار سبق آموزی

سب قابل قدر ہیں۔ جس قصہ کو اس مجموعے میں پہلی جگہ دی گئی ہے وہ واقعی اسی کا مستحق ہے۔ اُس کا عنوان "عروسِ شاعری" ہے۔ جس میں ایک سنیاسی راجہ ہرش کو اپنے "برہمچریہ" کا ثبوت نہایت دلکش طریقہ پر دیتا ہے۔

دوسرا قصہ ہے "گورو منتر"۔ ایکناتھ پنڈت جناردن کا مُرید ہونا چاہتا ہے، مگر اس کے لئے اوس کو بہت سخت آزمایشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس قصہ کو پڑھکر ناظرین کو اون رشی مُنیوں کی یاد آئے گی جو کسی کو حلقۂ مُریدی میں داخل کرنے سے پہلے خوب پرکھ لیتے تھے۔ اور بعض اوقات یہ آزمایش نہایت صبر آزما اور جاں گسل ہوا کرتی تھی۔

تیسرا قصہ "مصور کی زندگی" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات اہل کمال کو افلاس وتنگدستی کی وجہ سے کیسی کیسی روحانی وجسمانی تکالیف اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اس میں مصوّر کی بیوی کا "راضی برضائے حق" ہوکر عمل پیرا ہونا قابل تعریف ہے۔ وہ بقول مصنّف "شوہر کی روحانی اذیّت کا خاتمہ کرنے کے لئے اُمید کی دیوی" بنجاتی ہے۔ "جو مایوس ہونا گناہ سمجھتی ہے"۔

چوتھا قصہ "سکھداس" ہے۔ جس کی تصویر مصنف نے ان الفاظ میں پیش کی ہے: "بیجناتھ کے مندر کے دیوتا پُرانے ہوگئے تھے، بھگوان نے نیا دیوتا بھیجدیا ہے۔ اُن کی طرح اس دیوتا کا جسم بھی پتھر کا سا ہے مگر دل میں پرماتما کی جوت جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ دیوتا ہماری آنکھوں کے آنسو دیکھتے ہیں اور پھر بھی چُپ رہتے ہیں..... لیکن اس جیتے جاگتے دیوتا کا سینہ محبت وہمدردی کا سوتا ہے...... وہ آسمان کے دیوتا ہیں، یہ زمین کا فرشتہ ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتے ہوئے بھی ہم سے الگ رہتے ہیں، لیکن یہ دیوتا ہمارے کس قدر قریب۔ کتنا پاس ہے۔" سکھداس کو "در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست" کا بالکل مصداق سمجھنا چاہیئے۔ اس کی یہ اصول پروری دیکھکر ہم کو مہاتما گاندھی کی یاد آجاتی ہے۔

پانچواں قصہ "باپ" کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باپ ظاہر میں خواہ کتنا ہی بیدرد ہو مگر اوس کا دل محبت پدری سے خالی نہیں ہوتا۔

چھٹے قصہ کا عنوان "ایک نامکمل کہانی" ہے۔ اور قصہ کو دیکھتے ہوئے ہمکو اس عنوان کی موزونیت میں شک ہوتا ہے۔ قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ فوری جذبات سے مغلوب ہوکر بلا سوچے سمجھے کوئی کام کر بیٹھنا بُرا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

ساتواں قصہ "دوسروں کی طرف دیکھ کر" کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں ایک عورت

دوسری شاعرہ عورت کو دیکھکر خود شاعرہ بننے کا عزم بالجزم کرتی ہے۔

آٹھویں قصہ کا عنوان "دوخدا" ہے جو بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی دلکش اور نتیجہ خیز ہے۔
نواں قصہ "جب لاش نے شہادت دی" مشہور بنگالی ناولسٹ بنکم چندر چٹرجی مجسٹریٹ کی انصاف کوشی کا مظہر ہے۔

دسواں قصہ "شعلۂ مضطر" ہے جس میں ایک گناہگار شخص کا پراشچت (کفارہ) اور ہندوستانی عورتوں کی وفا پرستی بھی دکھائی گئی ہے۔

گیارھواں قصہ کایا پلٹ" ہے، جس میں ایک پردہ دار عورت دُنیوی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے اپنا پردہ ترک کرتی ہے اور وہ اور اوس کا شوہر اس آن کو نبا ہنے کے لئے اپنے گھر تک کو خیرباد کہدیتے ہیں۔

بارھواں اور آخری قصہ "بچپن کا ایک واقعہ" ہے، جس میں عہد طفلی کے جذبات ومشاغل کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ قصہ کے آخری الفاظ میں کتنی جامعیت ہے:-

"ماں بھی مارتی ہے، ماسٹر بھی مارتا ہے، بلاشبہ دونوں کے دل میں میری بہتری کا خیال ہے لیکن دونوں کے مارنے میں کتنا فرق ہے۔ ماں مارتی ہے اور روتی ہے، ماسٹر مارتا ہے اور بھول جاتا ہے۔"

غرض اِن سب قصوں کے پلاٹ کی تخئیل وترتیب بہت پسندیدہ ہے، اور کہیں کہیں شاعرانہ تشبیہات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جیسے (۱) لفظ معمولی تھے لیکن گجری کے تن بدن میں آگ لگ گئی جیسے خشک بارود بعض وقت رگڑ سے بھی جل اُٹھتی ہے۔ (۲) اوس کی شکل......خوفناک تھی لیکن آواز ایسی دلکش اور شیریں...... ناریل اوپر سے سخت اور کھُردرا ہوتا ہے لیکن اُس کے اندر کا پانی کس قدر میٹھا ہوتا ہے، کتنا صحت بخش۔

سدرشن صاحب کو انسانی جذبات کے بیان کا بھی اچھا خاصہ ملکہ ہے، اس مجموعے کے قصوں میں جہاں جہاں میاں بیوی کے مکالمے ہیں ان میں فریقین کے احساسات کا سچا اظہار ہوتا ہے۔ سدرشن صاحب کا طرز بیان دلکش ہوتا ہے لیکن اُن کی عبارت میں محاورات کی غلطیاں باقی رہ جاتی ہیں جن سے اُن کی تصنیف کی عام خوبی میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) "جن کے دل کو لگی ہو" (صفحہ ۲۹) "دل کو لگی ہو" صدمہ ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے "دل سے لگنا" ٹھیک ہے۔

(۲) "سُنا اَن سُنا کرکے" (صفحہ ۴۸) محاورہ نہیں ہے۔ بلکہ "سُنی اَن سُنی" ہونا چاہیئے۔
(۳) "آنکھوں میں پانی آنا" اکثر مقامات پر لکھا گیا ہے۔ پانی کے بجائے آنسو چاہیئے۔
(۴) "چنگے بھلے" (صفحہ ۱۰۳) کی بجائے "بھلے چنگے" لکھنا چاہیئے تھا۔
(۵) "حُسن کی بقا کے گھڑیاں ہے" (صفحہ ۱۷۱) یہ "کے گھڑیاں" نہایت غیر فصیح ہے۔
(۶) "بنی ہوئی بگاڑ دی" (صفحہ ۲۱۸) "بنی بات بگاڑ دینا" کہتے ہیں نہ کہ "بنی بگاڑ دینا"
(۷) "مغالطہ لگ جانا" (صفحہ ۲۴۰) کے بجائے "مغالطہ ہو جانا" چاہیئے۔
(۸) "بھاگ کر مٹھائی لائے" (صفحہ ۲۴۳) بھاگ کر نہیں بلکہ "دوڑ کر" درست ہے۔
بعض مقامات میں کہیں مذکر و مؤنث کے الفاظ میں بھی غلطی ہو گئی ہے۔ جیسے "آشیر واد دی" (صـ۱۳) "زدو کوب کیا" (صـ۱۹۵) مگر ایسی غلطیاں بہت کم ہیں۔ عجب نہیں کہ بعض غلطیاں کاتب کی ہوں، بہر حال ہم کو امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں یہ رفع ہو جائیں گی۔
مسٹر سُدرشن نے اس کتاب کے دیباچہ میں ماضی و حال کے چند مشہور فسانہ نویسوں کے نام درج کئے ہیں، مگر اس فہرست میں منشی پریم چند کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ منشی صاحب موجودہ زمانہ کے بہترین اُردو فسانہ نگار کی حیثیت سے اس کے ہر طرح مستحق ہیں۔ کتاب سفید چکنے کاغذ کے ۲۰۰ صفحات پر صفائی کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ اور قیمت بھی مناسب ہے۔

پردۂ غفلت

مصنفہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب
قیمت ۸؎ ملنے کا پتہ :- شرکت آوبیہ علی گڈھ

یہ ایک ڈرامہ ہے جس کے مصنف ڈاکٹر عابد حسین صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی ہیں اس ڈرامہ کا خاص مقصد ہے اس امر کو واضح کرنا کہ شادی کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی نہایت ضروری ہے۔ بلکہ اُس کو اس معاملہ میں کسی حد تک آزاد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس ڈرامہ کی ہیروئن سعیدہ کی شادی اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہوئی ہے۔ سعیدہ کا بھائی منظور ایک روشن خیال نوجوان ہے جو اپنی بہن کی حمایت میں اپنی چچی رضیہ بیگم کی قدامت پرستی کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ ایک مشہور جرمن محقق کاؤنٹ کیسرلنگ کی رائے یہ ہے کہ "بہترین نسبتیں وہ ہوتی ہیں جو والدین یا سرپرستوں کے ذریعہ قرار پاتی ہیں۔" ہندوستان میں بھی صدیوں سے اسی پر عمل ہو رہا ہے اور ہندو مسلمان دونوں میں لڑکے لڑکیوں کی شادیاں والدین ہی

کی مرضی سے طے ہوتی ہیں۔مگر غالباً کاؤنٹ صاحب کا بھی یہ منشا نہیں کہ کوئی معقول نسبت صرف کسی ہٹ دھرمی کی بنا پر نہ کی جائے۔

اِسی سلسلہ میں پردہ کا بھی ذکر آگیا ہے جس کی حمایت میں اسلامی مذہب کی آڑلی گئی ہے۔ اس ڈرامہ میں ایک برگزیدہ بزرگ "شیخ جی" کی زبانی مذہب کی جو تشریح کی گئی ہے وہ نہایت قابلِ قدر اور مؤثر ہے جس میں مذہب کو وسیع النظری اور فراخدلی کا مترادف بتلایا گیا ہے۔

ڈرامہ میں ایک جگہ منظور کی زبان سے یہ الفاظ کہلائے گئے ہیں "سوائے اون پیشوں کے جو امورِ خانہ داری اور تعلیم و تربیت سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے، اور کسی میں عورتیں مردوں کی طرح کامیاب نہیں ہوتیں۔" مگر اس بارے میں جان اسٹوارٹ مِل نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف Subjection of Women میں جو دلائل پیش کئے ہیں اور یورپ میں عملی طور پر جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے اس کے لحاظ سے اس قسم کے خیالات سے اتفاق نہیں ہوسکتا ہے۔ بہرحال منظور و سعیدہ کے چچا میر الطاف حسین ایک رئیس المزاج بزرگ ہیں جن کا شمار اُن رؤسا میں ہے جن کی غفلت و بے پروائی سے بڑی بڑی جائدادیں بالآخر قرض و سود کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اُردو میں ڈراموں کی کمی ہے، اس لحاظ سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی یہ کوشش بہت قابلِ قدر ہے۔ بہ حیثیت مجموعی بھی کتاب خوب لکھی گئی ہے اور زندگی کے کئی اہم شعبوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ چھپائی ٹائپ کی ہے اور یائے مجہول کی جگہ یائے معروف ہی چھپی ہے کہیں کہیں بعض محاورے کھٹکتے ہیں، مثلاً نظر (بینائی) ملنا اور آنی اثر۔ تقطیع چھوٹی، کاغذ نفیس تعداد صفحات ۱۴۶ ہے۔

پردہ از محمد فضل الرحمٰن صاحب لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن، مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ، کراؤن سائز، حجم ۸۴ صفحات۔ قیمت ۸/

پردہ کے متعلق یہ ایک اور چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس کے مصنف منشی محمد فضل الرحمٰن صاحب لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن ہیں، اس میں ایک قدامت پسند خان بہادر رئیس کی لڑکی دوشیزہ اپنے منگیتر صادق کے کہنے سننے سے اپنا پردہ دور کرکے کسی پارک میں تفریح کے لئے جاتی ہے۔ اِس پر ایک اخبار میں سخت نکتہ چینی شائع ہوتی ہے اور دوشیزہ پر علانیہ آوارگی کا الزام لگایا جاتا ہے جس سے شہر میں ہلچل سی مچ جاتی ہے اور ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوتا ہے، اور لوگ خان بہادر کے مکان پر جاکر

صادق کو پتھر سے زخمی کرتے ہیں۔ آزادی کی موجودہ جدوجہد میں عورتوں کی (جس میں بعض مسلمان خواتین بھی شامل ہیں) سرگرمیاں دیکھتے ہوئے کسی خاتون کے محض بے پردہ سیر و تفریح پر عوام کا اس قدر برافروختہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ڈرامہ واقعات زندگی کی ایک حد درجہ مبالغہ آمیز تصویر پیش کرتا ہے۔ مگر جس خاندان کا اس ڈرامہ میں خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اُس کے سبھی افراد افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ بوڑھے خان بہادر تو خیر پُرانی وضع کے بزرگ ہیں مگر ان کا بھتیجہ صادق جو اصلاح تمدن کا پکا حامی ہے وہ بھی اپنے چچا کو جب وہ لڑکی کی بے حجابی پر بگڑتے ہیں "آنکھ کا اندھا" اور "کان کا بہرا" تک بنا ڈالنے میں تامل نہیں کرتا گو بعد کو اپنی سخت کلامی کی معافی کا خواستگار ہوتا ہے مگر اس سے اسکی بدخلقی کی تلافی نہیں ہوسکتی ہے۔ کسی اصلاح پسند نوجوان کے منہ سے اپنے خاص بزرگوں کی شان میں ایسی باتیں نکلنا سخت نازیبا ہے۔

خان بہادر کے خادم قادر کا پارٹ کسی قدر ظرافت آمیز ہے۔ اوس کی منکوحہ یا منگیتر گل بہار پر خان بہادر کے صاحبزادہ اظہار کا عاشق ہونا اور اُسے بیاہنے پر تیار ہوجانا ایسے واقعات ہیں جس میں مصنف صاحب نے شاید مساوات انسانی کے اصولوں کو نباہنے کی کوشش کی ہے، لیکن بطور خود یہ بہت بھونڈا واقعہ ہے۔ اگر بیاہ ہوا تو معلوم نہیں، غریب قادر پر کیا گزری۔ بہرنوع بلحاظ فن یہ ڈرامہ بالکل ناقص ہے اور ہم کو شک ہے کہ یہ ڈرامہ اسٹیج پر بھی دلچسپی و کامیابی کے ساتھ کھیلا جا سکتا ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۶۴ صفحات پر یہ ڈرامہ آیا ہے، لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی طور پر عمدہ ہیں قیمت البتہ زیادہ ہے۔

رہنمائے صحت

مصنفہ مہاتما گاندھی، مترجمہ محمد اعظم خاں صاحب (نصیر ولا۔ عثمان پورہ حیدرآباد دکن) کراؤن سائز۔ ۲۴ اصفحات، قیمت ۱۲ر

مہاتما گاندھی حقیقی معنوں میں ہندوستان کے مصلح ہیں۔ سیاسی معاملات سے قطع نظر اہل ہند کو رسم و رواج کی بیجا پابندیوں سے نجات دلانے اور عام فلاح و بہبودی کے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے اظہر من الشمس ہے۔ یہاں پر اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب کو مہاتما جی نے گجراتی زبان میں لکھا تھا جس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے، اور اُردو داں اصحاب کے فائدہ کی غرض سے مترجم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں اس کو اُردو میں منتقل کیا ہے

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں مہاتما جی نے صحت قائم رکھنے پر زور دیتے ہوئے

تجربہ کر چکے ہیں، بعض اصول ایسے بھی ہیں جن کا تجربہ خود مہاتما جی نے تو نہیں کیا مگر اُن کی رائے میں سچے ہیں۔

شروع میں مترجم صاحب نے مختصر طور پر کتاب کی خوبیاں ظاہر کی ہیں، اس کے بعد اصل کتاب ہے جس میں مقدمہ کے علاوہ نو باب ہیں۔ ان ابواب میں صحت کے معنی، انسانی جسم کی بقدر ضرورت تشریح۔ ہوا۔ پانی۔ غذا۔ لباس۔ ورزش اور جنسی تعلقات۔ تمام ضروری باتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اگرچہ مہاتما جی نے جا بجا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت یہ امید کرنا کہ عوام فوراً اس پر عمل شروع کر دیں فضول ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ مہاتما جی کی رائے میں آدمی کو صرف پھلوں یا گیہوں پر گزر کرنی چاہیئے۔ اور ترکاریاں، دالیں، گھی، دودھ وغیرہ تمام چیزیں ترک کر دینی چاہئیں۔ اِسی طرح لباس کے متعلق مہاتما جی کی رائے ہے کہ "تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس" برہنہ سر، برہنہ پا، برہنہ جسم رہنا اصلی صحت کے لئے ضروری و فطری طریقہ ہے۔ مگر اس کے باوجود عملی حیثیت سے عام طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زندگی میں سادگی اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ مہاتما جی کو بھی عام مشکلات کا بخوبی احساس ہے اور اس لئے اُن کی ہدایت ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد سادہ کھانا کھایا جائے جس میں زیادہ گھی، مصالحہ وغیرہ نہ ڈالا جائے، گھی کی جگہ روغن زیتون کا استعمال بہتر ہے۔ لباس میں سادگی کے متعلق ان کی رائے ہے کہ بوٹ اور موزہ ترک کر دینا چاہیئے جنسی تعلقات کے متعلق مہاتما جی کی رائے ہے کہ چار پانچ سال تک صرف اولاد پیدا کرنے کی غرض سے میاں بیوی کو یکجائی زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ ان سب ہدایات پر فوری عمل بہت لوگوں کو مشکل معلوم ہوگا، لیکن اگر ہندوستانی سادھوؤں کی سی زندگی بسر نہیں کر سکتے تو کم از کم موجودہ طرز معاشرت میں بہت آسانی سے ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اور فضول عیش و عشرت سے اجتناب ہو سکتا ہے بہرحال ہر شخص کو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جہاں تک ممکن ہو اپنی طرز معاشرت کو سادہ بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے جس کا نتیجہ یقیناً مفید ہی ہوگا۔

نغمۂ توحید

از خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر بی۔اے لکھنوی

ہر صفت تیری عین ذات ہوئی ذات آئینۂ صفات ہوئی
متشکل ترا خیال ہوا لفظ و معنی میں اتصال ہوا
رہِ تفرید ہو گئی پیدا درِ توحید وا نظر آیا
قلزمِ احدیت میں جوش اٹھا قطرہ قطرہ میں اک خروش اٹھا
عشق سے حسن کی نمود ہوئی مجلس آرائی شہود ہوئی
ایک مظہر جو ذات کا ٹھہرا ایک مظہر صفات کا ٹھہرا
عشق آئینۂ جمال ہوا رو کشِ حسنِ بے مثال ہوا
دیکھ کر آپ اپنی رعنائی حسن بے پردہ ہو کے چھا آئی
چشمِ بینا کی آڑ میں چھپ کر گو بڑھا دی لطافتِ منظر
حسن و الفت میں امتیاز ہوا ناز بیگانۂ نیاز ہوا
بد گمانی شعارِ عشق ہوا برہمی کاروبارِ عشق ہوا
حسن اور جلوۂ خود آرائی عشق اور اک جہانِ رسوائی

دائرہ شوق کا ہے نا محدود ایک شورش ہے مدعا مفقود
ہے تغیر مجھے قیام تجھے ہے فنا مجھ کو اور دوام تجھے
دور مرکز سے ہو گیا اتنا کہ نشان بھی ترا نہیں ملتا
یہی صورت ہے ایک تسکیں کی تجھ سے نسبت ہے دور ہی کی سہی
عارضی ہے یہ شب جدائی کی
تیری جانب ہے بازگشت مری

پیامِ عمل

از مولوی محوی صدیقی لکھنوی

پھر دل کے غمکدے میں ہے جوشِ شادمانی
آتے ہیں پھر نظر کچھ آثارِ زندگانی
رخصت ہو میرے دل سے اے دورِ نوحہ خوانی
میں بھول جاؤں اپنی سب دکھ بھری کہانی
دل یاس سے خفا ہے

ملنے لگی ہے لذت پیتا ہوں میں دل کو
چھیڑا ہے پھر کسی نے ہر زخمِ مندمل کو
بھڑکا دیا ہے اب پھر جذباتِ مضمحل کو
پاتا ہوں مضمحل میں اندوہ متصل کو
بدلی ہوئی فضا ہے

افسردگی سی دل میں ہر دم جو رونما تھی
آکر کسی نے گویا اک آن میں مٹا دی
حالت کچھ اور ہی ہے اس دردآشنا کی
مدت سے تھی جو خاموش آگ پھر وہ بھڑکی
دل شاد ہو رہا ہے

اب اپنی غفلتیں خود بیدار کر رہی ہیں
پھر خوابِ ہستی سے ہشیار کر رہی ہیں
کیفِ عمل سے دل کو سرشار کر رہی ہیں
قدموں کو وقفِ جوشِ رفتار کر رہی ہیں
کیا دورِ جانفزا ہے

نظارہ جو ہیں آنکھیں پھر محفلِ جہاں میں
اُمید کی جھلک ہے پھر رنگِ آسماں میں
بیٹھے رہیں گے کب تک ہم اپنے آشیاں میں
پیدا کرینگے گلشن ایک اور گلستاں میں
کیا دل کشا ہوا ہے

مضراب جوشِ دل ہے اور بربطِ امل ہے
کیا خوشنوا ہے مطرب، کیا غم ربا غزل ہے
پیدا دل و جگر میں ہنگامۂ عمل ہے
دیکھو جدھر شگفتہ اُمید کا کنول ہے
دلکش سماں بندھا ہے

کب تک زبان رہتی محوِ سکوتِ پیہم مانا کہ ہے طبیعت مانوسِ لذتِ غم

برباد حسرتوں کا کب تک یہ رنج و ماتم ہر زخم کے لئے ہے آخر کوئی تو مرہم

ہر درد کی دوا ہے

کب تک خموش رہکر ایذائے غم اٹھائیں گھُل گھُل کے اس طرح سے کیوں زندگی مٹائیں

اب تو سنبھل کے اپنی شانِ عمل دکھائیں چارہ گروں سے کیونکر زخمِ کُہن چھپائیں

جو حد سے بڑھ چکا ہے

یوں محوِ کس مپرسی کب تک کوئی رہے گا ناکامیوں کے کب تک جور و ستم سہے گا

اپنی زبان سے تو گو کچھ نہیں کہے گا ہر آبلہ جگر کا خود پھوٹ کر بہے گا

چپ کی بھی انتہا ہے

غافل! یہ زندگی ہے؟ کیا خاک زندگی ہے! یہ راحت و سکوں ہے؟ غفلت ہے بیحسی ہے!

جانِ ضعیف وقفِ آلام ہو رہی ہے لیکن زبان و لب پہ ہر وقت چُپ لگی ہے

آخر یہ بات کیا ہے

ہو جا رہینِ صد غم، جو دُکھ پڑیں اُٹھا لے او بے خبر! کہاں تک تجھ کو کوئی سنبھالے

کرلے قوی ارادہ، ہمت کا آسرا لے اپنے عمل سے اپنی دنیا نئی بنا لے

منھ کس کا دیکھتا ہے

جنبش جو دست و پا کو ہوتی نہیں یہ کیا ہے کیوں بارِ دوسروں پر آخر تو ہو رہا ہے

یہ عہد کش مکش ہے، یہ دورِ ابتلا ہے جس نے نہیں کیا کچھ، وہ آپ مٹ گیا ہے

اسکے لئے فنا ہے

ہیں مبتلائے خواری راحت طلب جہاں میں ہمت جنھوں نے ہاری وہ آج ہیں زیاں میں

ممتاز تیز رو ہیں دنیا کے کارواں میں پہونچے ہیں اہل ہمت آغوشِ آسماں میں

جیت انکی برملا ہے

چھوڑ اپنی کاہلی کو مصروفِ کار ہو جا او پیکرِ تغافل! اُٹھ ہوشیار ہو جا

دورِ عمل میں رشکِ لیل و نہار ہو جا بے برگ و بے نوا ہے؟ سرمایہ دار ہو جا

یورپ یہ کہہ رہا ہے

احساس ضعفِ ہمت ہے موت کی نشانی دنیا تمام تر ہے محنت کی راجدھانی

مزدوری ہی کے سر پہ ہے تاج کامرانی کھول آنکھ! دیکھ تو بھی نیرنگ جانفشانی
یہ رتو ہر بلا ہے

ہلچل ہی آج ہر سو پیدا ہر ایک دل میں پاتا ہوں روح جسم بے جانِ آب و گل میں
اک جانِ تازہ آئی خود جوشِ مضمحل میں پنہاں ہے کامیابی ہر عزم مستقل میں
کیا یہ نہیں سنا ہے

باندھا ہے اپنا سامان افسردہ خاطری نے بدلی ہے پھر سے کروٹ خاموش زندگی نے
چھوڑا ہے رنگِ غفلت اس دور میں سبھی نے کچھ کر کے ہے دکھایا دنیا میں ہر کسی نے
ہر غنچہ کھل گیا ہے
محنت کا پھل ملا ہے

محتاج نظر

از جگیشور ناتھ ورما بیتاب بٹالوی

دیارِ بے بقا میں کب کسی نے لی خبر اپنی اسی کو بے خبر پایا پڑی جس پر نظر اپنی
پتہ راہِ طلب میں کھو کے ملتا ہے حقیقت کا اسی کو باخبر سمجھو نہ ہو جس کو خبر اپنی
رہے گوشہ نشین ہنگامہ زارِ بزم امکاں میں جمعیت سے رہی برگشتہ طبع منتشر اپنی
سراپائے بشر اک دفترِ اسرارِ ہستی ہے کسی کو کیا خبر کیا ہے حیاتِ مختصر اپنی
تمنا تشنہ ہے حسنِ ازل کے ہی نظارے کی ذرا صورت تو دیکھے خاک کا پتلا بشر اپنی
جدھر دیکھو اُدھر چشمِ نظارہ بیں کے جلوے ہیں مگر نیرنگیٔ عالم ہے محتاجِ نظر اپنی
برنگِ بوئے گل دوشِ صبا پر میں وہاں جاتا
اگر بیتاب بزمِ ناز میں ہوتی گذر اپنی

نسیمِ صبح

از سید ابو محمد ثاقب - کانپوری

اے نسیمِ صبح، اے رنگینیِ باغِ جہاں — تیری جنبش میں ہے پنہاں زندگیِ کائنات
بن گئی ہے خستہ جانوں کیلئے روحِ رواں — قوتِ نشو و نما کو تجھ سے حاصل ہے ثبات

تجھ سے ڈھارس پاتے ہیں دنیا میں مایوسِ حیات — جن کی شمعِ زندگانی آہ گُل ہونے کو ہے
تیرگی میں تو ہی بن جاتی ہے فانوسِ حیات — نا اُمیدی دامنِ امید میں سونے کو ہے

جان و دل کو چھیڑتی ہیں تیری ہلکی شوخیاں — غنچۂ دل کو ہنسا دیتی ہے تیری گُدگُدی
تیرے دامن میں ہیں پنہاں زندگی کی بجلیاں — تیرے ہی دم سے ہے قایم ارتباطِ زندگی

تو گُلوں کے عشق میں بے چین ہے بیتاب ہے — پھول بھی تیری اداؤں پر تبسُّم ریز ہیں
دیدۂ نرگس محبت میں اگر بے خواب ہے — شوخیاں غنچوں کی بھی کتنی سرور انگیز ہیں

دل میں کوئل کے تو بھر دیتی ہے روحِ اضطراب — نغمہائے عشق ملتے ہیں تری آغوش میں
جب الٹ دیتی ہے رخ سے تو کبھی اپنی نقاب — پھول آجاتے ہیں اپنی بیخودی سے ہوش میں

یہ تو سب سچ ہے مگر ہے قلبِ شاعر نا اُمید — تو نے اُسکے دل کو ظالم آہ چھیڑا ہی نہیں
اُسکی حسیات ہیں محروم جذباتِ جدید — تو نے اُس کی منتشر حالت کو دیکھا ہی نہیں

تیتری

از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

ناظورۂ نازآفریں اے پیاری چھوٹی تیتری!
دلکش ادائیں ہیں تیری ہے تجھ میں شانِ دلبری
پَر ہیں یہ تیرے مخملی
یا اک رِدائے ریشمیں

اِک موجِ رنگینِ صبا پھولوں کی رنگت سے بھری
دامن پہ تیرے اے پری نقش و نگارِ آذری
یہ حُسن و زیبائی تری
اے طائرِ رنگیں ادا

اِک ذرۂ خوش رنگ ہے مصروفِ رقصِ دلبری
"تو از پری چابک تری وز برگِ گل نازک تری"
دیکھی جو تیری تھرتھری
کبکِ دری بھی دنگ ہے

شبنم میں ہے تو غوطہ زن پھولوں کو تو ہے چومتی
تھوڑی سی تیری زندگی حاصل تجھے پھر بھی خوشی
آزادگی تیری کھری
تجھ کو نہیں رنج و محن

پرواز کا منظر ترا کرتا ہے گو پیدا خوشی
مجھ کو نہیں حاصل ذرا کچھ اِس سے حظِ خرّمی
ہے کیونکہ صرف اِک دو گھڑی
میری مسرت کو بقا

لطفِ سخن

از حضرت جگر مراد آبادی

تو وہ بہارِ تازہ دنیائے رنگ و بو کی
اِک بار جس نے دیکھا تا حشر آرزو کی

یہ حدِ آخری ہے عاشق کی جستجو کی
بَن بَن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

کیا خاک سیر کیجئے دنیائے رنگ و بو کی
مہلت نہ آرزو کی فرصت نہ جستجو کی

اللہ شرم رکھ لے تو میرے جنگجو کی
آئنہ روبرو ہے چوٹیں ہیں دو بدو کی

تم دِل اُسے سمجھ لو یا جان آرزو کی
سینہ میں اَب سے پہلے اِک بوند تھی لہو کی

اَب کیا جواب دوں میں کوئی مجھے بتائے
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کیوں میری آرزو کی

راتیں گذارتے ہیں یوں ہیکسانِ فرقت
جب دل کو آگیا غش تاروں سے گفتگو کی

دل خود بھی تنگ ہے اَب لیکن علاج اسکا
عادت سی پڑ گئی ہے ظالم کو جستجو کی

مایوس ہو کے پلٹیں جب ہر طرف سے نظریں
دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے گفتگو کی

مجھ سے ہی کچھ رہے ہیں مجھ سے ہی چھپ رہے ہیں
میرا قصور یہ ہے کیوں مَیں نے آرزو کی

عینِ شکستگی ہی حُسنِ شکستگی ہے
چاکِ قبائے گل کو حاجت نہیں رفو کی

عالم سے چھپنے والے، معلوم تیرا چھپنا
سَو بار تجھکو دیکھا سَو بار گفتگو کی

ہاں نشترِ نوازش اِک اور بھی اشارہ
محسوس ہو چلی ہے جنبش رگِ گلو کی

پردہ جب اُٹھ گیا ہے دیکھا یہی ہے اکثر
اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی

تو خوب جانتا ہے اے جان و دل کے مالک
ہر حال میں جگر نے تیری ہی آرزو کی

جناب ناطق لکھنوی

تجلیوں میں یہ رنگ اپنا دیکھتا ہوں میں	کہ بجلیاں ہیں اور اُن میں گھرا ہوا ہوں میں
عبودیت میں عجب خواب دیکھتا ہوں میں	کہ جیسے بیخودیِ غوق کا خدا ہوں میں
نگاہ گرم ہے وہ اشکِ مدعا ہوں میں	لگا رہا ہے وہ آگ اور بجھا رہا ہوں میں
یہ کیا معاملہ یارب ہے وادیِ دل میں	کلیمِ طور کی آواز سن رہا ہوں میں
حبابِ بحر ہوں میرا وصال و ہجر نہ پوچھ	جُدا نہیں ہے وہ مجھ سے مگر جدا ہوں میں
حریمِ ناز سے دل تک تو صاف تھا رستہ	مگر نگاہوں میں اپنی اُلجھ گیا ہوں میں
دعائیں سب کی جہاں مستجاب ہوتی ہیں	کچھ اُس مقام سے آگے بڑھا ہوا ہوں میں
ہوا تو علم مجھے نور کی حقیقت کا	مگر حجاب میں اُس دن سے مبتلا ہوں میں

سکوتِ ضبط سے ناطق جو دل مرا ٹوٹا
صدائے غیب یہ آئی تری صدا ہوں میں

روح اور گناہ

اِس ماہ کی رنگین تصویر جیمس کلارک نامی ایک یوروپین مصور کی صناعی کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ روح، مادہ سے ایک علیحدہ ہستی ہے، اُس کا تعلق بلحاظ برکات و حسیات خدا سے ہے۔ مگر وہ اپنے گناہوں کے سبب جسم کے مادی قیود کی پابند ہونے کے باوجود حقیقی طور پر ہر وقت مبدء فیاض سے واصل ہونے کے لئے بیقرار رہتی ہے۔ اور مادی علائق سے آزاد ہوکر اپنے مقدس ترین مرکز کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے مگر گناہوں کی گرانبار طاقت اوس کو بار بار اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑے ہوئے دنیوی پستی سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ یہ جدوجہد ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اِس جدوجہد میں کامیاب ہونا یعنی گناہ کی گرفت سے آزاد ہونا ہی اِنسانی زندگی کا آخری مقصد ہے اِسی جدوجہد کا نظارہ اِس تصویر میں دکھلایا گیا ہے، اور حق یہ ہے کہ اس کے دکھانے میں چابکدست مصور نے جس کمال کا اظہار کیا ہے اُس پر بے اختیار آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے۔

دیگر تصویریں مضامین سے متعلق ہیں اور بڑی کوشش سے زمانہ کے لئے حاصل کی گئی ہیں۔

گذشتہ ماہ کے چند قومی جلسے

تقریباً نصف صدی سے دسمبر کا آخری ہفتہ کانگریس اور دیگر قومی جلسوں کے لئے وقف ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن مدت دراز کے بعد پچھلے کرسمس میں انڈین نیشنل کانگریس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا، اور بہت سے دیگر قومی جلسے بھی جو اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے منعقد نہیں ہوئے ہاں مسلم لیگ کا جلسہ ڈاکٹر اقبال صاحب کے زیر صدارت الہ آباد میں منعقد ہوا - ہندو سبھا کا اجلاس بھی بھائی پرمانند صاحب کی رہنمائی میں بمقام انبالہ ہوا۔ ایک عرصہ سے ان دونوں صاحبوں کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہو رہی ہے بھائی پرمانند صاحب کی نگاہ میں ہندوؤں کی قومی زندگی خطرہ میں ہے۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کہاں ہندوستان کو سارے جہان سے اچھا سمجھ کر اس کا راگ گاتے تھے کہاں اب ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک نہیں بلکہ دو اسلامی ریاستیں ایسی قائم کرنا چاہتے ہیں جو ہندوؤں کو ہمیشہ دبائے رکھیں۔ اس وقت وہ انگریزوں، ہندوؤں، اور دیسی ریاستوں سبھی سے بدظن ہیں۔ ان دونوں رہنماؤں کی اسکیم باہمی غلط فہمیوں اور غیر ملکی منصوبوں کا نتیجہ ہیں مگر ہمکو ان سے پریشان ہونیکی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہند کی سیاسی نجات کے لئے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہ دونوں حضرات بے وقت کی راگنی الاپ رہے ہیں۔ ہندوستان کی کثیر تعداد ایک عام ملکی جدوجہد میں مصروف کار ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ گو بھائی جی ہندوؤں کی علٰحدہ تنظیم کے حامی ہیں مگر وہ متحدہ قومیت کا نام لئے جاتے ہیں اور مسلم لیگ کا اجلاس ڈاکٹر اقبال کی صدارت کے باوجود بہت ہی پھیکا رہا۔ ممبروں کی اقل ترین تعداد بھی[1] اس کے بعض اجلاسوں میں موجود نہ تھی۔ ملک کے بعض مشہور مسلم رہنماؤں نے بھی اس تقریر سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے۔

ان دو جلسوں کے علاوہ جن کو ہم چنداں اہمیت نہیں دیتے ہیں بنارس میں دو قابل ذکر جلسے ہوئے ہیں جن کا مفید اثر ہماری ملکی زندگی پر دیرپا رہنا چاہئے۔ آل ایشیا تعلیمی کانفرنس کے اجلاس کے لئے ہندوستان میں اسکے قدیم تعلیمی مرکز بنارس سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ موجودہ سیاسی جدوجہد کے باوجود یہ کانفرنس بہ حیثیت مجموعی بہت کامیاب رہی۔ ملک کے نامور

[1] جو قواعد کے رو سے ضروری ہے۔

عالم پروفیسر رادھاکرشن صاحب اس کے صدر تھے اور تقریباً پندرہ ہزار اصحاب شریک اجلاس ہوئے۔ خواتین بھی سیکڑوں کی تعداد میں موجود تھیں چین۔ جاپان، لنکا، جزائر فلپائن تک کے ڈیلی گیٹ تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح مہاراجہ صاحب بنارس کے دست مبارک سے ہوا۔ ممدوح نے اپنی افتتاحی تقریر میں بجا طور پر ارشاد فرمایا کہ مشرقی تہذیب کی بنیاد ایسی تعلیم پر ہے جسمیں غرور وحسد و رشک و شبہ اور بے اعتباری دور ہو کر دلوں میں محبت و ہمدردی، مساوات و یکجہتی کے خیالات جاگزیں ہوجاتے ہیں۔ مغربی تعلیم کا مقصد جماعتی ترقی ہے، مگر قومیت کا معیار انسانیت کے معیار کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ آپ نے یہ اُمید ظاہر کی کہ یہ کانفرنس مشرق کی بیداری کا باعث ہوگی۔

صدر اجلاس نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ یہ کانفرنس درحقیقت کل دُنیا کے مدرسین سے تعلق رکھتی ہے، آپ نے فرمایا کہ ایشیا اور یورپ کا فرق بہت بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ چند خصوصیتیں ایشیا میں اور چند یورپ میں ترقی پا گئی ہیں پس ہماری تفریق امتیاز کے لئے ہوگی نہ کہ ہمارا امتیاز تفریق کیلئے دنیا اسقدر تنگ و مختصر ہے کہ اسمیں محبت کے سوائے اور کسی جذبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مدرسین کو یہ بات طے کرنی ہوگی کہ آیا وہ ایشیا اور یوروپ کو ایک دوسرے کا دوست بنانا چاہتے ہیں یا دشمن کیونکہ ملکی خدمات کے نشوونما کا بہت کچھ انحصار اُنھیں پر ہے۔ آپنے تعلیم کا مقصد روحانی ارتقا و ترقی بتلایا اور کہا کہ اگر ہم اپنے تعلیمی معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کی بنیاد راستی، اخلاق، خلوص، دانشمندی اور روحانیت پر قائم کرنا ہوگی جس سے جملہ انسانوں میں مساوات و یکجہتی پیدا ہو۔ ہمکو ایک بہتر ہندوستان، بہتر ایشیا اور بہتر دنیا کی تعمیر کرنی ہوگی۔ اگر مغرب کے سائنس دنیا کی آرام و آسائش کے لئے ضروری ہے تو مشرق کا فلسفہ دنیا کی نجات کے لئے لابدی ہے۔ انسانی روح کے اعتبار سے مشرق یا مغرب کوئی چیز نہیں، تمام دنیا ایک ہے۔

پرنسپل شیشادری نے اپنی تقریر میں اس ملک کی تعلیمی ضروریات کے احساس و اندازہ کو ایک اہم مقصد بتاکر کانفرنس کی توجہ اُنکی جانب مبذول کی۔ آپنے فرمایا کہ ہندوستان میں عورتوں اور مردوں کے موجودہ تعلیمی فرق کی وجہ سے گھروں میں ایک تہلکہ سا برپا رہتا ہے۔ اچھوت اقوام کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ایسے ملک کے لئے کوئی پُر اُمید مستقبل نہیں ہوسکتا جو کہ اپنے ہی بچوں کو جہالت میں رکھکر اُنھیں چھونا تک گوارا نہ کرے۔

کانفرنس میں پرنسپل دھرو، راجہ موتی چند، راجہ بہادر کشل پال سنگھ، ڈاکٹر بسنٹ، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد وغیرہ کی بھی تقریریں ہوئیں۔ شریمان پنڈت مدن موہن مالویہ بھی خرابیِ صحت کے باوجود ۳۰۔ دسمبر کے

اجلاس میں شریک ہوئے اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ تعلیم پر کسی قوم یا مذہب کا اجارہ نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کا ایک مسئلہ ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ تمام اقوام کے لئے امن اور خوش اعتمادی پیدا کرے۔

چین کے مشہور عالم مسٹر وَنگ نے حاضرین کی تعداد کثیر پر حیرت کا اظہار کیا اور کانفرنس کی نمایش میں شہرۂ آفاق چینی لیڈر ڈاکٹر سن یات سین کی تصویر دیکھکر فرمایا کہ جس طرح آپ لوگ موصوف کے مداح ہیں اُسی طرح اہل چین مہاتما گاندھی کے معترف ہیں۔ آپ نے اس امر کا بھی یقین دلایا کہ ہندوستان اپنی ترقی کے لئے جو کوشش کرتا ہے اُس سے چین کو بھی غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ مس عطیہ فیضی کی تقریر بھی قابل ذکر تھی آپ نے موجودہ تعلیم کے نقائص بیان فرمائے۔

بہرحال کانفرنس کی کارروائی کو دیکھتے ہوئے اُمید ہوتی ہے کہ یہ نہ صرف ایشیا بلکہ کُل دنیا کے لئے مبارک ثابت ہوگی اور غالبًا وہ وقت جلد آئیگا کہ کُل دنیا کے علماء کرام اس کانفرنس کے ساتھ اپنی عملی دلچسپیوں کا اظہار کرکے اسکے اُصُولوں کی عوام میں اشاعت فرمائیں گے۔ بقول پنڈت مالوی علم پر کسی مخصوص قوم کا اجارہ نہیں ہونا چاہئے، اس پر کل بنی نوع انسان کا یکساں حق ہوتا ہے۔ جس کو دنیا کی کوئی طاقت زائل نہیں کرسکتی ہے۔ اسی حق کی بدولت ہر شخص ترقی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۴۲

آل ایشیا تعلیمی کانفرنس کے ساتھ ساتھ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بیالیسواں اجلاس بھی ڈاکٹر سیّد راس مسعود صاحب وائس چانسلر علیگڈھ یونیورسٹی کی زیر صدارت بنارس میں ہوا۔ اِس اجلاس کے اوقات ایسے رکھے گئے تھے کہ اسکے ڈیلیگیٹ آل ایشیا تعلیمی کانفرنس میں بھی شریک ہوسکیں۔ بنارس میں اسلامیہ ہائی اسکول قائم کرنے کی تجویز کے علاوہ اس کانفرنس کا اہم واقعہ نواب مسعود یار جنگ بہادر کی صدارتی تقریر ہے۔ جس میں آپ نے مسلمانوں کی علمی ادبی اور تعلیمی عام ترقی کے متعلق قابل قدر مشورہ دیا ہے۔ آپکی تقریر کا ایک ایک فقرہ ہندوستانی مسلمانوں کے غور و فکر کا مستحق ہے۔ ترقی کی جو شاہراہ آپ نے مسلمانانِ ہند کو دکھلائی ہے اس پر چل کر وہ دنیوی عزّت و عظمت کے تمام مدارج طے کرسکتے ہیں، آپنے بجا طور پر فرمایا کہ قومی زندگی کے تقریبًا ہر شعبہ میں مسلمانوں نے "اپنے آپ کو واقعات کا کھلونا بنا رکھا ہے"۔

آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں پر ایک دور اندیش خیر خواہ اور وسیع الخیال اُولوالعزم مُصلحِ ملک کے نقطۂ خیال سے نظر ڈالی ہے اور عورتوں کی تعلیم، زبان اُردو کی توسیع و ترقی، مسلمانوں کی تمدنی اصلاح وغیرہ وغیرہ تمام ضروری مسائل کے متعلق عزیزانِ وطن کی صحیح رہنمائی کی کوشش کی ہے،

اِس سوال کا جواب کہ مسلمانوں کی شائستگی کی کیا نوعیت ہو جو قوم کا مدار زندگی ہے آپ نے یہ دیا ہے :-

"اسلامی اصول زندگی کے بقا و قیام کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ ایک دائمی جدال و قتال کی حالت پیدا کر دی جائے ۔ میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے اور یہ عقیدہ آج سے زیادہ کبھی مضبوط نہ تھا کہ نفرت کی بنیاد پر کبھی کوئی مضبوط عمارت قائم نہیں ہو سکتی - علاوہ بریں ایک قوم جو اپنے اوپر اعتماد رکھتی ہے اور جسے خود اپنی شائستگی کی عمدگی کا یقین ہے وہ وہ قوم نہیں ہے جو اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ لڑنے جھگڑنے کی عادی ہو"

آپ کی رائے میں ہندوستانی مسلمانوں کو علانیہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ "ہندو تہذیب و شائستگی سے مسلمانوں نے اتنا ہی لیا ہے جتنا اُسے دیا ہے ، اور خیال یا فن کی حدود کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں ہندو عنصر ہی تھا جس نے اُنھیں دنیا کے دوسرے حصوں میں آباد مسلمانوں سے مختلف قوم بنایا"

اِس قابل قدر اور لائق غور ایڈریس کا آخری حصہ بھی نقل کرنے کے قابل ہے - آپنے فرمایا کہ
"بنارس میں جو ایک عظیم الشان تہذیب کا مولد ہے اور جس کی خاک تک کو عقیدت و خدمت نے قدیم ترین زمانہ سے مقدس و متبرک بنا دیا ہے، میں اپنے خطبہ کو ہندوستان میں رہنے والی دونوں بڑی قوموں سے صدق دل سے یہ درخواست کئے بغیر ختم نہیں کر سکتا ہوں کہ دونوں باہمی بدگمانی و بے اعتمادی کا خاتمہ کر دیں - کیا ہمارا ملک اتنا بڑا نہیں ہے کہ اِس میں دو ایسی شائستگیاں (جن میں سے ہر ایک نایاب ہدایا پیش کر سکتی ہے) سما سکیں اور پہلو بہ پہلو ترقی کر سکیں - کیا وہ سرزمین جہاں گذشتہ زمانہ میں بڑے بڑے مذاہب اور فلسفے پیدا ہوئے اب اس درجہ پست ہو گئی ہے کہ ایک رزم گاہ بن جائے جہاں انسانوں کے دو گروہ ایک دوسرے کو فنا کرنے کے لئے ایک طویل جنگ میں باہم مصروف پیکار ہوں"

ہمکو امید ہے کہ اِس اپیل پر جو ایک دردمند دل سے نکلی ہے، ہندو مسلمان دونوں سچے دل سے غور کرکے ملکی مشکلات کے حل کا کوئی مفید راستہ تجویز کریں گے . تاکہ ملک میں باہمی محبت و رواداری کے ایک نئے صحیفے کا آغاز ہو اور گذشتہ بدگمانیوں کے بدنما زخم مندمل ہو جائیں

نفسیات شباب

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی

کھلی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب نومبر ۳۲ء کے آخری ہفتہ میں شائع ہوئی اور دوز اشاعت سے تین دن کے اندر چار سو فروخت ہو گئی یہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفہ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر کی تالیف Psychologie des Jugendalters کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے ڈاکٹر صاحب جرمن اور اردو دونوں زبانوں میں اسقدر دستگاہ رکھتے ہیں کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات بھی ترجمہ میں اصل سے زیادہ صاف ہو گئے ہیں

نفسیات شباب میں نوجوانوں کی نفسی زندگی کا خاکہ ہے کائنات کے گورکھ دھندے کا سر انسان ہی کی ذات ہے یہیں سے اس پیچ در پیچ راستہ کا پتہ چلتا ہے جو فلسفیانہ تحقیق کی خلش رکھنے والوں کو منزل مقصود تک لیجاتا ہے۔ انسان کی عمر کا سب سے اہم زمانہ نوجوانی کا زمانہ ہے۔ اس عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے مزاج کو سمجھنا والدین اور معلمین کا سب سے اہم فرض ہے اسلئے کہ طوفان اور تلاطم سے جو نوجوانوں کے نفس میں برپا ہوتا ہے اگر واقفیت نہ ہو تو یہ کبھی صحیح سلامت ساحل تک نہیں پہونچ سکتے۔

نوجوانوں کی مجموعی نفسی سیرت انکی تخئیلی زندگی ان کے عشق انکے تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر نفسیات شباب سے بہتر کوئی کتاب نہیں پھر زبان اتنی صاف اور عام طرز تحریر اسقدر دلکش ہے کہ شروع کرنیکے بعد اسکے مطالب میں بالکل محویت ہو جاتی ہے

کتاب کی ضخامت بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحہ اور قیمت اردو کی بلند پایہ علمی ادبی کتابوں کے مقابلہ میں نسبتہً کم یعنی صرف تین روپے ہے

ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں

تلاش حق ترجمہ خودنوشت سوانح حیات مہاتما گاندھی کا مشہور و معروف کتاب جلد اول و دوم ۲؍ اس موضوع پر یہ اردو میں پہلی کتاب ہے

تاریخ فلسفہ اسلام ایک جرمن تصنیف کا ترجمہ قیمت ۱؍

پردۂ غفلت ایک معاشرتی ڈرامہ جو ڈاکٹر صاحب نے قیام جرمنی میں لکھکر مکمل کیا

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ تھا یہ ایک دلچسپ اور مفید تعلیمی رسالہ ہر شخص پڑھکر فائدہ اٹھا سکتا ہے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

زمانہ

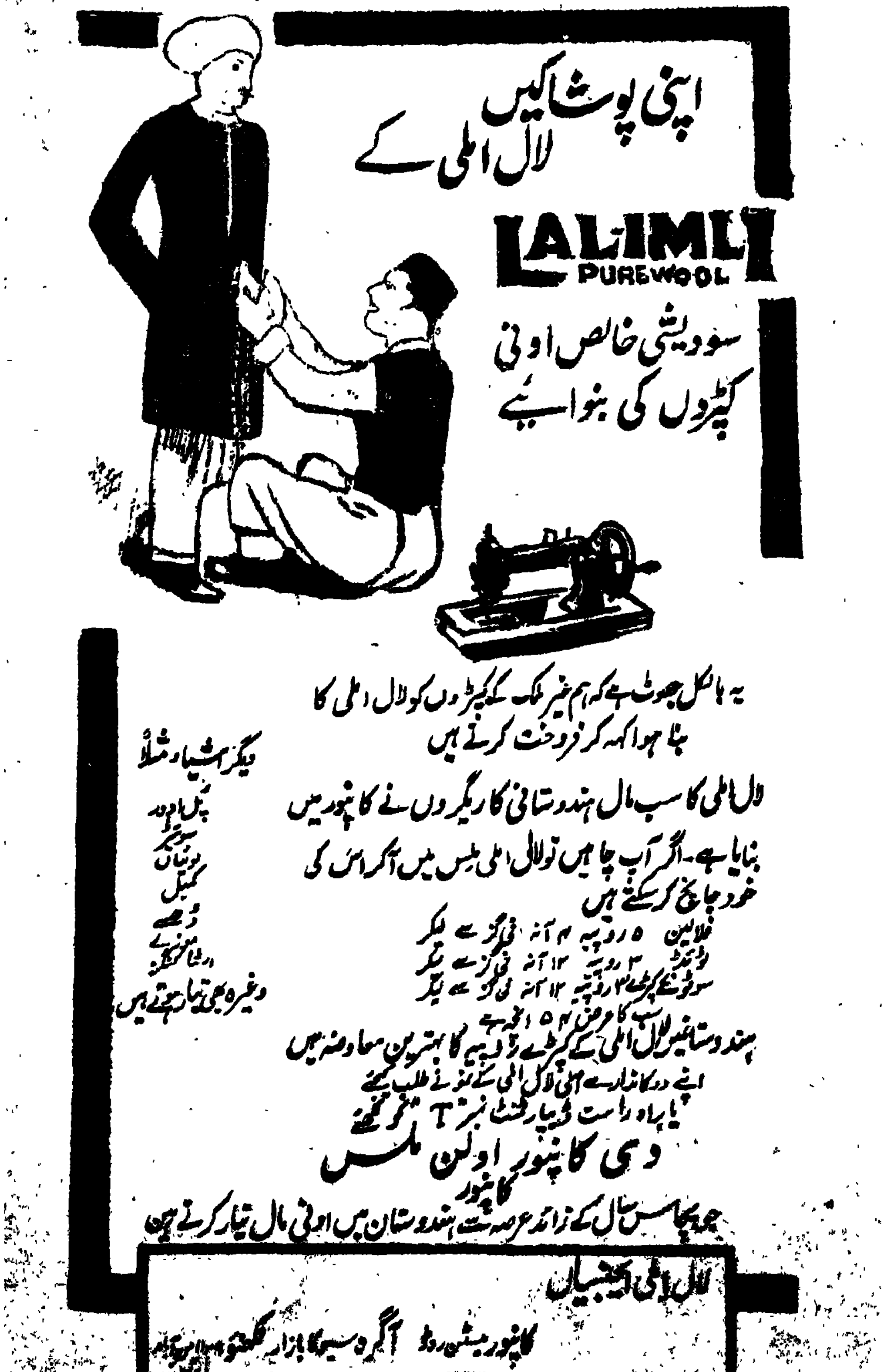
مرتبہ دیا نراین نگم بی۔ اے۔

جلد ۵۶	فروری ۱۹۳۱ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ... ہندوستان کے بڑے شہروں ... تین روپیہ


اپنی پوشاکیں
لال املی کے
LALIMLI
PUREWOOL
سودیشی خالص اونی
کپڑوں کی بنوایئے
یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ہم غیر ملک کے کپڑوں کو لال املی کا
بنا ہوا کہہ کر فروخت کرتے ہیں
لال املی کا سب مال ہندوستانی کاریگروں نے کانپور میں
بنایا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو لال املی ملس میں آکر اس کی
خود جانچ کرسکتے ہیں
فلالین ۵ روپیہ ۴ آنہ فی گز سے لیکر
ٹویڈ ۳ روپیہ ۱۲ آنہ فی گز سے لیکر
سوٹوں کے کپڑے ۳ روپیہ ۱۲ آنہ فی گز سے لیکر
سب کا عرض ۵۴ انچ ہے
ہندوستان میں لال املی کے کپڑے روپیہ کا بہترین معاوضہ ہیں
اپنے دوکاندار سے اپنی لال املی کے نمونے طلب کیجئے
یا براہ راست ڈیپارٹمنٹ نمبر T تحریر کیجئے
دی کانپور اولن ملس
کانپور
چھپچاس سال کے زائد عرصہ سے ہندوستان میں اونی مال تیار کرتے ہیں
دیگر اشیاء مثلاً
پٹی یا وردی
سوٹنگ
بنیان
کمبل
ڈسے
موزے
وغیرہ بھی تیار رہتے ہیں
لال املی ایجنسیاں
کانپور مشن روڈ آگرہ سیو کا بازار لکھنؤ

زمانہ

جلد ۵۶ — فروری ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

سیناپتی پشیہ متر

از پروفیسر سری رام شرما، ایم۔اے

ہندوستان قدیم کے قابل ترین فرمانرواؤں میں پشیہ متر کا نام ایک ممتاز جگہ کا مستحق ہے لیکن شومیِ قسمت سے تواریخ کے صفحے اِس کے کارناموں سے ابھی تک مزین نہیں ہوئے۔ موریا خاندان کے مشہور و معروف شہنشاہ اشوک کی عظمت نہ صرف اُس کے خاندانی جانشینوں کی فراموشی کا باعث بنی، بلکہ موریا خاندان کے جانشین سنگا خاندان کے راجاؤں کو بھی قعرگمنامی میں رکھنے کا موجب ثابت ہوئی۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح ناٹک کی دنیا میں شیکسپیئر کی ذات نے اس کے قابل ہم عصروں کی یاد کے لئے دہر قاتل کا کام کیا۔ اشوک کے کارنامے سنانے کے بعد مورخ کچھ اُکتائے سے معلوم ہوتے ہیں اور اس لئے تاریخ ہند کی باقی منزلوں کو جلد جلد طے کر کے خاندان گپتا تک پہونچ کر ہی دم لیتے ہیں۔

سنگا خاندان کے بانی سیناپتی پشیہ متر نے ہندوستان کو ایک نہایت ہی خطرناک غیرملکی حملے سے بچایا۔ اس نے ہندو دھرم کو پھر نئے سرے سے شاہی مذہب بنایا، وہ پہلا بادشاہ ہو گذرا ہے جس کے اشومیدھ یگیہ کو سرانجام دینے کے متعلق تاریخی ثبوت بہم پہونچتا ہے۔ اس یگیہ کو کوئی

فاتح اعظم ہی کرا سکتا ہے۔

بُدھ روایات کے مشہور مجموعے دِویاوان کے مصنف نے پشیہ متر کو پشیہ دھرما کا لڑکا بتلایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مصنف پشیہ متر کو موریا خاندان ہی کا راجہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اِس بارہ میں پورانوں کی شہادت اور کالیداس کے مشہور ڈرامے مالوکا گنی مترم کے بیانات قدرتاً زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں۔ پشیہ متر سنگا خاندان کے براہمنوں میں سے تھا۔ اِس کے آبا واجداد موریا خاندان کے راجاؤں کے شاہی پروہت تھے۔ جب اشوک اعظم نے بُدھ مت کو اختیار کیا تو لازمی طور پر اِن پروہتوں کی قدر و منزلت کم ہوگئی۔ کیونکہ اشوک نے پروہتوں کے کام کو سرانجام دینے کے لئے بُدھ مت کے پیرو دھرم مہاماتر نامی سرکاری افسر مقرر کر دیئے تھے لیکن مہاراجہ اشوک کے وفات پاتے ہی بُدھ دھرم کی وہ قدر و منزلت نہ رہی۔ اس کے جانشین بُدھ مت کے پیرو نہ تھے، پس یہ عین ممکنات سے ہے کہ مہاراجہ اشوک کی موت کے بعد شاہی پروہتوں کے اِس خاندان نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پھر حاصل کر لیا ہو۔

پُشیہ متر نے اپنے خاندان کے جاہ و مرتبہ کی نئے سرے سے بنیاد قائم کی، وہ تھا تو برہمن لیکن اوائل عمر ہی سے اُس نے فنِ جنگ و جدل میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ بڑے بڑے سورماؤں سے بازی لے گیا۔ برہدرتھ موریا خاندان کا آخری راجہ اس وقت مگدھ کے تخت پر متمکن تھا۔ اب وہ چندر گپت موریا اور اشوک اعظم کی بات تو وہاں نہ تھی پھر بھی پاٹلی پتر کا دربار ہندوستان کے عظیم ترین شاہی درباروں میں سے تھا۔ پشیہ متر راجا برہدرتھ کی فوج میں نوکر ہوگیا، اور آخر کار وہ مہاراجہ برہدرتھ کی فوج کا سپہ سالار اعظم مقرر ہوا۔

مہاراجہ برہدرتھ سلطنت کے کاموں میں بہت دلچسپی نہ لیا کرتا تھا۔ اودھر مگدھ کی سلطنت دوسری صدی قبل از مسیح میں وہ عظیم الشان سلطنت نہ رہی تھی جس سے یونانی سورما تک خوف کھاتے تھے۔ اشوک کے جانشین رفتہ رفتہ بہت سے علاقے اپنے ہاتھوں سے کھو چکے تھے۔ دکھن میں آندھرا خاندان کے بادشاہ زور پکڑ رہے تھے۔ اُدھر اُڑیسہ اور اس کے ملحقہ علاقہ جات پر چیت خاندان کے جین راجا قابض ہو رہے تھے۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ حسب معمول شمال مغربی سرحد پر نمودار ہو رہا تھا۔ سکندر کے ایشیائی جانشین سیلوکس کی موت کے کچھ عرصہ بعد اس یونانی سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے تھے۔ اِس طوائف الملوکی میں چند منچلے یونانیوں نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے چند علاقوں پر قبضہ جما لیا رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان یونانیوں

نے ہندوستان کے خاص علاقوں پر بھی دانت جمانے شروع کئے۔ غالباً ڈیمیٹریس نامی ایک یونانی اس وقت کابل اور اس کے ملحقہ علاقوں پر حکومت کر رہا تھا۔ اس نے مگدھ کو جو کمزور پایا تو ہندوستان پر حملہ کردیا۔ وہ پنجاب کے علاقے فتح کرتا ہوا دوآبہ میں آوارد ہوا اور یہاں بھی کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مہاراجہ برہدرتھ غفلت کی نیند میں سوئے پڑے تھے۔ اُنھوں نے اس بات کی پرواہ تک نہ کی کہ اس حملہ آور سے ملک کو بچاتے۔ خوبیِ قسمت سے ڈیمیٹریس کے کابلی علاقے میں خانہ جنگی گھر کر گئی، اور اُسے اپنے گھر کی حفاظت کے لئے واپس جانا پڑا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس یونانی حملے نے پشیہ متر کو موقع دیا کہ وہ ملک کو برہدرتھ جیسے کمزور[۱] راجا سے نجات دلائے۔ مگدھ کے جانباز سپاہی جن کے پیشرووں نے سکندر کی فوج کو مار بھگایا تھا اور سیلوکس کے سپاہیوں کو خوفزدہ کردیا تھا پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

ایسی حالت میں سیناپتی پشیہ متر نے بغاوت کا جھنڈا اُٹھایا۔ اُس نے فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا جس میں وہ تھوڑی کوشش کے بعد ہی کامیاب ہوگیا۔ بس اب کیا تھا برہدرتھ کو ایک دن فوج کی سلامی لینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ جب وہ پریڈ کے میدان میں پہونچا اور فوج کے ٹھٹ کھٹ، نوجوانوں کی چال ڈھال دیکھنے میں مشغول تھا تو پشیہ متر نے چپکے سے اس پر حملہ کردیا، طیاری اتنی مکمل تھی کہ کسی نے اپنے راجہ کی امداد کے لئے ہاتھ نہ اُٹھایا، برہدرتھ مارا گیا، اور سات سال کی حکومت کے بعد رعایا کو اُس سے چھٹکارا ملا۔ اُس کے مرتے ہی موریا خاندان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

دنیا کی تاریخ میں انقلابات حکومت کے کئی دلچسپ واقعات موجود ہیں لیکن اس واقعہ کا ثانی مشکل سے ہی ڈھونڈھے ملے گا۔ مہاراجہ برہدرتھ کے حامیوں میں سے صرف ایک وزیر ہی نے پشیہ متر کے راستے میں رُکاوٹ ڈالی تھی جو راجہ اگرسین والیِ برار کا سالا تھا۔ پشیہ متر اس کو بھی قید کرنے میں کامیاب ہوگیا، اور پھر چین سے پاٹلی پتر میں راج کرنے لگا۔ پشیہ متر راجہ تو بن گیا لیکن سیناپتی (سپہ سالار) ہی کے مشہور لقب سے اپنی ساری سلطنت میں

---

[۱] بان بھٹ نے اپنی مشہور کتاب ہرش چرت میں مہاراجہ برہدرتھ کو "پرگیا دربل" (عقل میں کمزور) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور ہرش چرت کے انگریزی مترجمان پروفیسر کارل اور پروفیسر طامس نے بھی برہدرتھ کو بے وقوف ہی ٹھہرایا ہے۔ پروفیسر پولر نے "پرگیا دربل" کی جگہ "پرتگیا دربل" پڑھنا تجویز کیا ہے جسکے معنے ہیں "عہد میں کمزور" چونکہ وہ اُس عہد کو نباہنے میں کمزور ثابت ہوا جو رعایا کی حفاظت کے متعلق اس پر قایل پابندی تھا۔

یاد کیا جاتا رہا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۵ء قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ وایو پران کی رو سے وہ ۳۶ سال مگدھ کے تخت پر جلوہ افروز رہا اور اس لحاظ سے ۱۵۹ء ق م میں اُس کی وفات ہوئی۔

سب سے پہلا کام جو پشیہ متر کو اب کرنا تھا وہ مگدھ کی گئی گزری شان و شوکت کو واپس لانے کا تھا۔ اِس کے لئے اُسے اپنے گرد و نواح کے راجاؤں سے جنگ و جدل کا سلسلہ جاری کرنا پڑا۔ برہدرتھ کے پاس غالباً بنگال و بہار کے علاقے ہی تھے، پشیہ متر نے ان میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ آخر فتوحات کے سبب اس کی سلطنت کی وسعت بہت ہوگئی۔ اُس نے اودھ، آگرہ، بندیلکھنڈ، اور راجپوتانہ کے علاقے فتح کر لئے جنوب میں اُس کی حکومت دریائے نربدا کے اُس پار تک پھیل گئی۔ برار کا راجہ اگرسین بھی آخر کار اُس کا باجگزار رہا۔

لیکن دن سدا ایک ہی سے نہیں رہتے، اس جدوجہد میں راجہ پشیہ متر کو اڑیسہ کے مشہور راجہ کھارے ویل سے واسطہ پڑا۔ مہاراجہ کھارے ویل ۱۹۷ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے، اپنے والد کے عین حیات میں وہ کچھ دنوں اڑیسہ میں غالباً شاہی گورنر کے طور پر حکومت کرتے رہے ۱۷۳ء ق م میں اُن کے والد کی وفات ہوئی اور وہ کلی طور پر اڑیسہ کے مالک بن گئے۔ اُن کے عہد حکومت میں خاندان چیت کا شہرہ دور دراز تک پھیل گیا۔ اُنھوں نے اندھرا خاندان کے مشہور راجہ ست کوئی گو جو مہاراشٹر کے علاقے پر حکمران تھا شکست دی۔ کھارے ویل اور پشیہ متر جیسے جنگجو بادشاہ بغیر ٹکر کھائے کیسے رہ سکتے تھے۔ ۱۶۵ء ق م میں کھارے ویل نے شمالی ہند پر دھاوا کرنے کی ٹھانی۔ ہندو راجاؤں کے قدیم دستور کے مطابق دسہرہ کے مشہور تیوہار کے بعد فوج نے کوچ کیا۔ گوردھاگری (ضلع گیا) نامی مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، یہ لڑائی غالباً نا فیصلہ کن رہی، کھارے ویل کو گیا سے آگے جانے کی فرصت نہ ملی، غالباً پشیہ متر کا کوئی سپہ سالار کھارے ویل کے سدراہ ہوا۔ لیکن جب کھارے ویل کی فتح کی خبر پاٹلی پتر پہونچی تو پشیہ متر گھبرا گیا اور پاٹلی پتر چھوڑ کر متھرا میں جاکر پناہ گزین ہوا۔ لیکن پشیہ متر کی خوش قسمتی سے کھارے ویل کو واپس لوٹنا پڑا، اور پاٹلی پتر دُشمن کے حملے کی زد سے بچ گیا۔

مگر یہ وقفہ دیرپا نہ ثابت ہوا ۱۶۱ء ق م میں کھارے ویل پھر شمالی ہند پر چڑھ آیا اور پاٹلی پتر پر حملہ آور ہوا۔ اب کی دفعہ پشیہ متر (جسے اس کتبے میں برہسپتی متر کے نام سے پکارا گیا ہے) کو شکست ہوئی، پاٹلی پتر پر دشمن کا قبضہ ہوگیا۔ کئی دن شہر کھارے ویل کی فوج کے ہاتھوں

لٹتا رہا۔ مہاراجہ نند اول نے جین دھرم کی چند مقدس اشیاء اڑیسہ سے لے جاکر پاٹلی پتر میں رکھی تھیں، کھارے ویل اِن سب کو واپس لے گیا۔ اِن اشیاء میں سب سے قیمتی چیز بانی جین مت کی ایک مورت تھی، جسے مہاراجہ کھارے ویل نہایت تزک و احتشام سے واپس لایا

پشیہ متر ہارا تو سہی مگر وہ دل سے ہارنے والا انسان نہیں تھا۔ شکست کے اس داغ کو اُس نے آمٹ نہیں تصور کیا، بلکہ دوگنے جوش سے از سرِ نو فوج کو منظم کرنے میں مصروف ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مگدھ کے گرد و نواح میں سکہ بٹھانے کے بعد جلد ہی اُس نے گرد و نواح کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ وسط ہند اور گوالیار تک کے علاقے پر قابض ہوگیا۔

بُدھ مورخوں نے پشیہ متر کا شمار بدھ دھرم کی بیخ کنی کرنے والوں میں کیا ہے۔ ودیا وان نامی کتاب میں لکھا ہے کہ پشیہ متر نے ایک دن اپنا دربار کیا، سارے مشیروں کو جمع کرکے دریافت کیا کہ وہ اُس کو کوئی ایسا گر بتائیں جس سے وہ اپنا نام دنیا میں لافانی کر جائے۔ جتنے منہ اُتنی باتیں، ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ ایک من چلے نے کہہ دیا کہ مہاراجہ اشوک نے بُدھ مت کی اشاعت کے لئے ۸۴۰۰۰ چھوٹی بڑی عمارتیں تعمیر کیں، کوئی پاس سے بول اُٹھا کہ جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں اشوک کا نام امر رہیگا۔ راجہ یہ سُن کر جل بھن گیا، فوراً سب عمارتوں کو گرانے کی ٹھان لی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس نے بُدھ مت کے پیرؤوں کو اس قدر ستایا کہ اُس کا نام ہی مُنی ہت (بھکشوؤں کو مارنے والا) پڑ گیا۔ عمارتوں کو گرانے اور بھکشوؤں کو خود مارنے کے علاوہ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ جو کوئی آدمی اس کے پاس بدھ مت کے کسی عالم کا سر لائیگا اوسے خاطر خواہ انعام ملے گا۔ یہ کہانیاں سچی ہوں یا جھوٹی، اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ جہاں بدھ مت کے مصنفوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے، وہاں ساتھ ہی ان کہانیوں کی تہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی، رائی کا پہاڑ تو بن جاتا ہے لیکن رائی کے بغیر تو ایک ٹیلا بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ پشیہ متر نے اپنی شاہی طاقت کو بدھ دھرم کے خلاف استعمال کیا۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ پشیہ متر نے بدھ دھرم کے خلاف جہاد مذہبی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی بنا پر شروع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ برہدرتھ ایک بودھ راجہ تھا اور جب پشیہ متر نے اُس کے خاندان کو ملیامیٹ کر دیا تو لازمی طور پر اُسے بدھ بھکشوؤں کے خلاف جو اس قدیم خاندان کے طرفدار تھے، تباہ کن کارروائیاں کیں

کالی داس کے مشہور تواریخی ڈرامہ "مالوِکا گنی مترم" میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پشیہ متر کا لڑکا

اگنی متر بھیلسہ (ریاست گوالیار) میں ایک خودمختار بادشاہ کے طور پر حکمراں تھا۔ باپ بیٹے کے ایک ہی وقت میں ملک کے دو مختلف حصوں پر حاکم ہونے کی گتھی کو سلجھانے کے لئے کئی بار کوششیں کی گئی ہیں۔ مسٹر کاشی پرشاد جیسوال نے جو کہ اس مضمون کے ماہر ہیں اس عقد کا ایک حل پیش کیا ہے۔ برسوں ہوئے مالوکا گنی مترم کے مشہور انگریزی مترجم ٹانی صاحب نے لکھا تھا کہ اگنی متر اور اُس کے باپ پشیہ متر کے درمیان تنازع کا باعث بدھ دھرم کے متعلق پشیہ متر کی ناروا داری تھی۔ اگنی متر نے پشیہ متر کے اس جور و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہ پاٹلی پتر چھوڑ کر وسط ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں اُس نے بھیلسہ میں اپنی راجدھانی قائم کی۔ برار کے راجہ یگیہ سین کا سالا ویر بدرتھ کا وزیر تھا۔ وہ اگنی متر کی قید میں تھا۔ اب یگیہ سین اور اگنی متر میں لڑائی شروع ہوئی جس میں یگیہ سین کو شکست ہوئی اور اُسے اپنا آدھا علاقہ اگنی متر کے حوالہ کر دینا پڑا۔ ٹانی صاحب اور جیسوال صاحب کے نقطۂ نگاہ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگنی متر اور پشیہ متر میں جو تنازع ہوا وہ زیادہ دیرپا نہ تھا۔ یہ باور کرنے کی وجوہات نہیں ہیں کہ اگنی متر خودمختار حکمران تھا، اگنی متر کا لڑکا وسومتر اپنے دادا کے دربار میں موجود تھا، پس یہ ماننا ہی قرین مصلحت ہوگا کہ اگنی متر پشیہ متر کے وائسرائے کی حیثیت ہی سے بھیلسہ میں حکمراں تھا۔

اب پشیہ متر کی طاقت بڑھنی شروع ہوگئی، رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ اُس نے سارے ہندوستان کے شہنشاہ ہونے کا دعوے کرنے کی ٹھان لی۔ مدتوں سے اس بات کا سب سے موثر طریقہ اشومیدھ یگیہ کرنا تھا۔ دعوے دار راجہ ایک جرار فوج کسی نامی سپہ سالار کے زیرکمان بھیج دیتا تھا، اسی فوج کے ساتھ ایک گھوڑا کھلے بند وں چھوڑا جاتا تھا جس طرف اس گھوڑے نے منہ اُٹھایا اُسی طرف اس کی محافظ فوج بھی اپنا رخ کرتی تھی۔ جب کسی راجہ کے راج سے اس گھوڑے کا گزر ہوتا تھا اُسے یا تو دعوے دار راجہ کی اطاعت قبول کرنی پڑتی تھی یا پھر گھوڑے کو پکڑ کر اور اُسے اصطبل میں باندھ کر اُس کی محافظ فوج سے لڑنا پڑتا تھا۔ پشیہ متر نے بھی اپنے پوتے وسومتر کے زیرکمان ایک عظیم الشان فوج روانہ کی۔ گھوڑا چھوڑ دیا گیا جس نے پشیہ متر کے دعوے کا ہر چہار سمت اعلان کرنا شروع کر دیا۔

ملک کے کسی حصے میں تو اس گھوڑے اور اس کی محافظ فوج سے کسی نے چھیڑ نہ کی لیکن جب یہ گھوڑا راجپوتانہ پہونچا تو یہاں اُسے دریائے سندھ کے کنارے یون لوگوں سے واسطہ پڑا

یہ یونانی لوگ غالباً ڈے میٹریس کے خاندان کے مشہور بُدھ راجہ میناندر کی فوج کے تھے۔ میناندر کابل اور غالباً پنجاب کا بھی حکمران تھا۔ اور بدھ مت کا پیرو۔ بدھ مت کی مشہور کتاب مِلند کے سوالات (میناندر کے سوالات) میناندر اور ایک بدھ بھکشو کی بحث کی داستان ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ میناندر کا دربار بڑا شاندار تھا۔ جہاں علما کا اچھا خاصہ مجمع رہتا تھا۔ اِس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میناندر بدھ مذہب کا ایک بہت بڑا عالم تھا۔ علاوہ بریں وہ ایک فاتح حکمران بھی تھا میناندر کی فوج پنجاب سے نکل کر راجپوتانے پر حملہ کئے ہوئے تھی۔ پشیہ متر کا شہنشاہ ہند ہونے کا دعویٰ اُسے نہایت شاق گزرا اور اُس نے فوراً گھوڑے کو پکڑ کر اصطبل میں باندھ لیا۔ وسومتر بھی یہ خبر سنکر آپے سے باہر ہو گیا۔ فوراً لشکر کو کیل کانٹے سے تیار ہونے کا حکم دیا۔ اور یونانیوں پر فوراً حملہ کر دیا۔ میناندر بھی غضب کا جنرل تھا اور وہ ہندوستان کے مختلف حصوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ وسومتر اور میناندر کی مڈبھیڑ ہوئی۔ گویا ایک طرف تو یونانی اور ہندوستانی سپاہیوں کی جنگ تھی اور دوسری طرف ہندو مذہب اور بدھ مت کے علم برداروں کی نبرد آزمائی ۔ وسومتر کے ماتحت مگدھ کی فوج نے وہ ہاتھ دکھائے کہ میناندر کو بھاگتے ہی بنی۔ سیلوکس اور چندر گپت کی لڑائی کی یاد ایک مرتبہ پھر تازہ ہو گئی۔ ڈے میٹریس کی فتح کا داغ دُھل گیا۔ راجپوتانے کا علاقہ دوبارہ پشیہ متر کے قبضہ میں آیا اور میناندر کے نمایندوں کو پشیہ متر کے یگیہ میں ایک ماتحت راجہ کی حیثیت سے حاضر ہونا پڑا۔

اسی طرح ایک سال تک دشت و صحرا، آبادی و ویرانہ کا چکر کاٹتا ہوا اشومیدھ یگیہ کا یہ گھوڑا پاٹلی پتر واپس آیا۔ جہاں اشومیدھ یگیہ کی رسم نہایت شاندار طریقہ پر ادا کی گئی۔ اگنی متر بھی اس یگیہ میں حصہ لینے کے لئے پاٹلی پتر جا پہونچا۔ دونوں باپ بیٹے مگدھ کی سلطنت کی اس عظمت کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔

پشیہ متر کی بلند اقبالی کی صرف یہی حد نہ تھی۔ یونانی پڑوسیوں کے ساتھ اُس کا جھگڑا پھر شروع ہوا۔ پشیہ متر ہندو دھرم کی عظمت پھیلانے کا دعوے دار تھا تو میناندر بدھ دھرم کی اشاعت میں مصروف تھا۔ یونانی کابل اور پنجاب پر حکمران تھے۔ میناندر کا سکہ سارے شمالی ہندوستان میں چلتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی پشیہ متر کی اطاعت تو قبول کرتے تھے لیکن گاہے بگاہے اِس جوئے کو اُتار پھینکنے کے لئے بھی طیار ہو جاتے تھے۔ اب کی دفعہ پشیہ متر نے چندر گپت موریا کے اصول کی پیروی کرتے ہوے یہ مطالبہ کیا کہ یونانی بادشاہ اپنی ایک لڑکی کی شادی مگدھ کے شاہی خاندان سے کرے۔ یونانی بھلا ایسی بات آسانی سے کب ماننے والے تھے؟ یونانیوں نے انکار کیا

تو اُن پر فوراً حملہ کر دیا گیا، مگدھ کی فوج ایک مرتبہ مینانڈر کے سپاہیوں کو شکست دے ہی چکی تھی تو اب بھلا کب چوکنے والی تھی۔ یونانی سپاہیوں کو ہار ماننی ہی پڑی۔ آخرکار ایک یونانی شہزادی مگدھ کے شاہی خاندان میں بیاہی گئی اور اس طرح پشیہ متر نے یونانی حکمرانوں کی اطاعت کو مستقل صورت دی۔

پشیہ متر کا زمانۂ حکومت ہندو دھرم کے عروج کا زمانہ تھا۔ رشی پاتنجلی کی تصنیفات ہی اس زمانے کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ پاتنجلی نے جہاں سنسکرت کے قواعد پر مشہور کتاب مہا بھاشیہ لکھ کر اپنی زباں دانی کا ثبوت دیا وہاں ساتھ ہی یوگ درشن لکھ کر قانون روحانی کا کاشف ہوا۔ اس کے علاوہ اشومیدھ یگیہ کا ہونا خود ہی ہندو دھرم کے انتہائی عروج کا ثبوت ہے۔ اس زمانے کے علم ادب سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اُس وقت ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ عورتوں کو آزادی تھی وہ عموماً تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور اکثر اُپدیشکا تک بنکر دھرم کے اصول کا پرچار کرتی پھرتی تھیں۔ اُن میں مصوری، ناچ اور راگ ودیا کا عام رواج تھا۔ پردہ بالکل نہ تھا شراب نوشی عورتوں تک میں پہونچ گئی تھی۔ لڑائی کے موقع پر ہارے ہوئے لوگ قیدی تو نہیں بنائے جاتے تھے لیکن کبھی کبھی ہارا ہوا راجہ چند اشخاص کو تحفے کے طور پر فاتح راجہ کی خدمت میں بھیج دیا کرتا تھا جو بالعموم مطرب یا مصور ہوتے تھے۔

مشرق و مغرب

مشرقی تخیل سے کام لینے کے دعویدار ہیں، مغربی مطالعہ پر نازاں ہیں، مشرقی دل پیش کرتے ہیں، مغربی دماغ۔ مشرقی داد طلب ہیں، مغربی انعام طلب۔ مشرقی اپنی منزلِ مقصود کے لئے پگڈنڈیاں تلاش کرتے ہیں، مغربی شوقِ تحقیقات میں دوری منزل پسند کرتے ہیں۔ مغربی اپنی ہنرمندیوں اور صناعیوں کی تعریف اپنا فرض سمجھتے ہیں، مشرقی تنقید کو باعث غیرت خیال کرتے ہیں مغربی اپنے کاریگروں کا روپیہ کی مدد سے حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ مشرقی ہر عمدہ چیز کو مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اولوالعزم استاد بغیر قوم کی توجہ اور سرپرستی کے کامیاب نہیں ہوئے۔ مریلو جیسے نامور مصور کو مارکیٹ میں برتن رنگنے کی ضرورت پیش آئی، اور بعد کو ایک سرپرست مل جانے پر وہ بہت ترقی کر گیا۔

(ہمایوں)

دیباچہ مثنوی سحرالبیان

(از میر شیر علی افسوس)

زمانہ بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں سید احمد اللہ قادری صاحب کا جو مضمون میر حسن کے متعلق شائع ہوا ہے اُس کے سلسلہ میں یہ دیباچہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (ایڈیٹر)

حمد کی لیاقت اُسی صانع کو ہے جس نے عناصرِ اربعہ کو کہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہے، اپنی قدرتِ کاملہ سے ربط دیکر ارکان ٹھہرایا اور کیفیت متوسط پر مرکبات کے اجسام کو بنایا لیکن انسان کو ہر مخلوق سے شریف تر اور لطیف تر خلق کیا کہ نفس ناطقہ نے علاقہ اُسی سے پکڑا اور وہی کلیات وجزئیات کی حقیقت سے ماہر ہوا یہاں تک کہ تعلیم وتعلم کا سلیقہ اُسے بخوبی آگیا اور اُس کی زبان میں بھی استعداد ہر لغت کے تلفظ کی بخشی چنانچہ اُس نے جس بولی کو چاہا سیکھ لیا بلکہ سکھا دیا۔ پس لازم ہے کہ اس کے شکر میں ہر دم اپنی زبان گویا رکھے اور اُس کے حمد کو ہر حال میں اپنا ورد کرے۔

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول ۔۔۔ کہ یاد اُس کی ہے دو نو جگ کا حصول
اُسی کو مددگار اپنا سمجھ ۔۔۔ اُسی کو فقط یار اپنا سمجھ
بُرے وقت میں کوئی اُس کے سوا ۔۔۔ ترے کام آوے یہ امکان کیا
محبت سے سب کی اُٹھا اپنا دل ۔۔۔ فقط اُس سے ہی بس لگا اپنا دل
زباں تیری گویا رہے جب تلک ۔۔۔ اور امکاں سخن کا رہے جب تلک
کیا کر ثنائے جہاں آفریں ۔۔۔ سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں
جو بعد اس کے منظور ہو کوئی بات ۔۔۔ تو کہہ نعتِ احمد سرِ کائنات

فی الواقع ستودہ خدا سب انبیا واوصیا ہیں، تعریف اُن کی موافق مقدور ہر یک کو ضرور ہے خصوصاً نعت ومنقبت خاتم المرسلین اور اُس کے وصی امیر المومنین علیہما السلام کی کیونکہ

انھوں ہیں نے دنیا میں ہم کو راہ ہدایت کی بتلائی کہ ہم نے منزل ایمان کی بسہولت پائی۔ عاقبت میں بھی امیدِ شفاعت کی اور نجات کی انھیں سے رکھتے ہیں۔

بھروسا کسی کا نہیں اِک ذرا ہے اُن کا ہی ہم کو فقط آسرا
نبیؐ و علیؑ اپنے ہیں پیشوا نبیؐ و علیؑ اپنے ہیں رہنما
اِنھی سے ہے کونین میں مجکو کام وے مولا ہیں میرے مَیں اُنکا غلام
دُرود اُن پہ اور اُن کی اولاد پر بدل بھیجتا ہوں میں شام و سحر

بعد اِس حمد و نعت کے مثنوی سحرالبیان اسم بامسمّیٰ ہے کیونکہ اِس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لبھانے کو موہنی منتر ہے۔ اور ہر داستان اس کی سحر سامری کا ایک دفتر جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طبائع کو مقبول و مرغوب ہوتی ہے۔ راست ہے کہ اس کا انداز سراپا اعجاز ہے۔ اور وہ ہر ایک صاحبِ طبیعت کی دمساز، تعریف اُس کی جہاں تک کیجئے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے۔ احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اُس کی بندش میں سُستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اِس لئے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بقلت شمار میں نہیں آتا، اور تعرض اُس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا۔ بقول شخصے (ع) شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست۔ صلے کے اس کے ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچے میں سے نکلوا کر مصنف کو عنایت کیا۔ رتبہ تو اس کا البتہ بڑھا پہ دل گھٹ گیا، اس لئے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا۔ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے، کیونکہ مال کھرا خریدار اتنا بڑا او سودا خاطر خواہ نہ ہوا بلکہ گھاٹا آیا۔

یہ چند سطریں مصنف کے حسب و نسب اور احوال میں مصنف اس کا میر حسن دہلوی متخلص بہ حسن خلف میر غلام حسین ضاحک کا۔ وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات گردشِ فلکی سے اُنھوں نے شہر مذکور کو چھوڑا، اور دلّی میں آکر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا بلکہ سنِ تمیز کو پہونچا۔ دادا اس عالی قدر کا سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا، لیکن باپ فضیلت نہ تھی مگر طالبعلمی میں شرح مُلّا تک پڑھا تھا پر فارسی میں استعداد اچھی تھی، بلکہ شعر بھی شیریں و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا، چنانچہ یہ رباعی طبع زاد اُس کی راقم نے اُسی کی زبانی سُنی ہے:۔

فریاد دلا کہ غمگساراں رفتند سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار درخاک چو قطرہائے باراں رفتند

قصیدہ بھی ایک آدھ اس مغفور کا رتبہ دار دیکھا ہے، لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا غزل کہنی ترک کی تھی قیامت ہنسوڑا اور ٹھٹھول تھا، تخلص اُس کا اِس پر دال ہے، بہ ظاہر نہایت ثقہ اور متشرع۔ اکثر عمامہ عربی سبز سر پر بندھا رہتا تھا، اور جامہ کم گھیر امل پہنتے کا گلے میں داڑھی متوسط لبیں لی ہوئی قد میانہ گندم گوں لیکن میر حسن داڑھی منڈواتے تھے، پر جامہ نیمہ اِن کا بھی ویسا ہی تھا اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستان زادوں کی سی۔ قد لنبا تھا اور رنگ گندمی ہر چند وضع تو ایسی تھی پر شوخ مزاج و لطیفہ گو وے بھی تھے نہ ہزال و فحاش۔

سوائے اس کے بردباری اور ملنساری اُن کی خلقت میں تھی، کسی کو میں نے اس عزیز سے شاکی نہیں پایا، اور بیزار نہیں دیکھا۔ طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا۔ اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سے مستفید شاہ جہاں آباد میں لڑکائی کے بیچ ہوا ہے بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ اودھ میں آیا سکونت فیض آباد میں اختیار کی علاقہ روزگار کا نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہونچایا۔ مصاحب مرزا نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ دام ثروتہ کا ہوا، مرزائے موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے۔ خدا اُسے سلامت رکھے کہ اشعار سے اُسے رغبت اور شعرا سے محبت ہے چنانچہ میر مذکور کو بھی اُس نے اپنا انیس و جلیس کیا تھا۔ اور وہ تھا بھی اسی لایق اگرچہ علم عربی اُسے مطلق نہ تھا، ہاں فارسیت تھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی کبھو کہہ بھی لیتا تھا لیکن علم مجلس میں بے بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا۔ مشق سخن اس نے اسی ملک میں میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے کہ ہم مشق مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے تھے کی تھی۔ سوائے ان کے مرزائے مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح کی تھی چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے۔ غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے، غزل، رباعی، مثنوی، مرثیئے، میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا ہے۔ بلکہ سوائے قصیدے کے ہر قسم کی نظم پر قادر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ادا بندی کا حق اُتنے خوب ادا کیا۔ اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا، خدا ایش بیامرزاد راقم کو اُس سے دوستی دلی تھی کبھو رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی، حالانکہ اسی سرکار میں مَیں بھی نوکر اور اسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے بلکہ اکثر آپس میں غزلیں ہم طرح ہوئیں اور صحبتیں

شعر کی رہیں ۔لیکن نہ بطور استفادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خاں مغفور نے بے تحقیق اپنے تذکرہ میں لکھا ہے ۔صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے۔ اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا ہرگاہ حقیر میر حیدر علی حیراں کی شاگردی کا مقر ہے باوجود اس کے کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی پھر کس لئے اس بات کا انکار کرتا۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں۔ لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سے نناوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔ میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا، بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذوی حج سن بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا۔ ندآں غرہ محرم کو کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے اس دار فانی سے اُس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خاں بہادر دام ظلہ کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا خدائے کریم اسکو یہاں دارالسلام عطا کرے اور وہاں قصر جنت بخشے

عدم سے مسافر جو آیا یہاں ۔۔۔ مقرر وہ ایک روز جاوے گا واں
رہے جگ میں ہر چند وہ ہر کہیں ۔۔۔ پر اُس کا ٹھکانا ہے زیر زمیں
نہ غفلت میں اپنی تو اوقات کھو ۔۔۔ ارے بے خبر جاگتے میں نہ سو
جہاں میں تو مہماں ہے چند روز ۔۔۔ ترے جسم میں جان ہے چند روز
یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام ۔۔۔ کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

فی الواقع نیک نامی بھی عجیب چیز ہے، انسان کا نام اسی سے زندہ رہتا ہے یا کلام و اولاد سے سو وہ خوش نصیب بیٹے دونوں اُس سمیت چھوڑ گیا، چار بیٹے فضل الٰہی سے اس کے اب تک موجود ہیں تین شاعر ہوئے۔ بود و باش اُنھوں نے فیض آباد میں اختیار کی معاش نوکری پر ہے۔ چنانچہ میر مستحسن خلیق تخلص اور میر محسن محسن تخلص مرزا تقی بہو بیگم صاحب مادر آصف الدولہ مدظلہا کے داماد کے رفیق ہیں اور میر حسن خلق تخلص داراب علیخاں ناظر کے ساتھ ہے۔ یہ اور خلیق دونوں صاحب دیوان ہیں۔ شعر اپنے باپ ہی کے انداز پر کہتے ہیں۔ لیکن خلیق کا سر رشتہ اصلاح کلامیاں مصحفی سلمہ اللہ سے تعلق رکھتا ہے، خدا اُسے اور اُنھیں سلامت رکھے۔ یے (یہ) چند فقرے بطور دیباچہ زبدۂ نویان عالیشان مظہر شہر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی لارڈ گورنر بہادر دام اقبالہ کے عہد میں کہ ۱۲۱۸ھ ہجری مطابق ۱۸۰۳ء عیسوی کے ہیں حسب الارشاد صاحب والامناقب جان گلکرسٹ بہادر مدرس ہندی دام دولتہ کے اس عاصی نے لکھے اور ان کو اس مثنوی کا ضمیمہ کیا۔

کلام تعشق

(از میرزا محمد بشیر صاحب)

شاعری سے ذوق و شوق رکھنے والوں نے کلام تعشق کو اس نظر سے نہ دیکھا جس کا وہ مستحق تھا، عوام تو درکنار تی زمانہ بہت سے ذی علم بھی اس طوطیِ سخن کی شیریں کلامی سے نا آشنا ہیں۔
یوں تو جناب تعشق کا کلام خوبیوں کا ایک مرقع ہے جس میں معنی آفرینی، نازک خیالی، فصاحت، سلاست محاکات و محاورات کی جیتی جاگتی مثالیں موجود ہیں لیکن انکے کلام میں جو بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے یہ ہے کہ وہ اظہارِ جذبات کے لئے ایسے الفاظ انتخاب کرتے ہیں کہ سننے والے کا دل موہ لیں اس پر طرہ یہ کہ ہر لفظ مضمون کی مناسبت سے برمحل اور ناقابل ترمیم ہوتا ہے۔ پھر مضمون کی شوخی، کلام کی گرمی ایک قیامت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:۔

سنا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح — زبان بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

خواجہ حیدر علی آتش کا شعر بجنسہ اسی مضمون کا ہے۔

شنا ہے ہم نے بھی قرآں، قسم ہے قرآں کی — جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

زبان کے اعتبار سے دونوں شعر خوب ہیں لیکن مضمون کے خیال سے آتش کے یہاں صرف تعریف ہے اور تعشق کے یہاں تعریف کے ساتھ ایک واقعہ بھی ہے جس نے مضمون میں ایک جدت پیدا کر دی ہے۔ مرزا تعشق کا شعر ہے۔

یوں جلاتا ہے فلک گورِ غریباں پہ چراغ — کوئی جگنو کبھی بالائے مزار آتا ہے

اِس مضمون کو جس خوبی سے تعشق نے کہا وہ داد طلب ہے۔ ایک مغربی شاعر (سر والٹر اسکاٹ) نے بھی یہ خیال نظم کیا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تعشق کے تخیل کی پرواز اسکاٹ کے خیال سے زیادہ بلند ہے۔

لہ *The glow-worm o'er grave and stone.*
Shall light thee steady "
(The Bride of youth by Sir W. Scott)

مرزا تعشق نے بعض خیالات کا عجیب پیرایہ میں اظہار کیا ہے مثلاً ؎

خونِ ناحق کا عوض آخر ہوا کس حسن سے   نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازو دوست

اہل سخن شاہد ہیں کہ عروس معنی کو تعشق جس آن بان سے جامۂ نو پہنا کر جلوہ نما کرتے ہیں وہ مستحق ستائش ہے، یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مرزا صاحب فضول استعاروں اور تشبیہوں سے ہمیشہ دامن کش رہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اشعار دلکش اور مؤثر ہیں، فرماتے ہیں ؎

سرشت میں ہو نزاکت حیا ہے خو تیری   نکل سکے نہ کبھی پیرہن سے بو تیری

افتادہ رہنے ہی کی تھی زمیں دل کی اسلئے   امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

ہم کو مل جاتی ہے اپنے دل زخمی کی خبر   ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے

دیکھ آؤ کہ بیمار تمہارا تو نہیں ہے   رکھا ہے جنازہ سر بازار کسی کا

ہم خونِ آرزو کا جو محضر بنائیں گے   تجھکو گواہ اے دلِ مضطر بنائیں گے

تمام رات رہا دل سے ذکر خیر ترا   گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

محاورات کی برجستگی نے ان کے کلام میں چار چاند لگا دیے ہیں، اس کی مثالیں متعدد ہیں

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا   چند تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

آپ نے سیکڑوں بیمار محبت مارے   بس انھیں باتوں پہ دعویٰ ہے مسیحائی کا

قفس میں بھی ہے اسیرو تمھیں وہی سودا   لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو

کہتے ہو کہ آج آنکھ پھڑکتی ہے ہماری   بیتاب بہت ہے دلِ بیمار کسی کا

مضمون کیسا ہی پامال کیوں نہ ہو اس میں ندرت و لطافت اور اثر پیدا کرنا ان کا حصہ ہے ؎

مجھی کو ناز سے دیکھا جلا جو پروانہ   تم ایک بزم میں مردم شناس بیٹھے ہو

ہم ہیں، سو حسرتیں ہیں اور دل ہے   مہرباں دیکھنے کی محفل ہے

خلاف سب کے ہوئی کی جو آرزو تیری   پھری ہوا ادھر آنے لگی جو بو تیری

کسی واقعہ یا منظر کی تصویر کھینچنا اور پھر مؤثر لفظوں میں ایک بہت بڑی صنعت ہے مرزا صاحب کے کلام میں محاکات کی مثالیں بہت ہیں، مثلاً۔

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اداس بیٹھے ہو   یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو

جس طرح چلتے ہیں نزع میں غزالِ صحرا   یوں تری چشم کے بیمار چلے آتے ہیں

یہ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں ورنہ بقول فغانی ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

سکھ[1]

(از شریمتی چاندرانی صاحبہ آنجہانی)

دنیا میں دو چیزیں ہی زیادہ غور کے قابل ہیں، ایک دُکھ[1]، دوسرا سکھ۔ سکھ کے حاصل کرنے اور دُکھ سے چھٹکارا پانے کی فکر میں ہر جاندار لگا رہتا ہے۔ اور اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی فکر ہے کیونکہ سکھ جب ہی حاصل ہوگا جب دُکھ مٹ جائیگا۔ کیونکہ سکھ اُس جذبہ کا نام ہے جس کا محسوس کرنے والا خوشی اور فرحت حاصل کرتا ہے۔ برخلاف اس کے دُکھ وہ پرخوف جذبہ ہے جس کا محسوس کرنے والا تکلیف و رنج میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اس لئے لوگ دُکھ سے ڈرتے ہیں اور اس سے بچنے اور دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سکھ سے محظوظ ہوتے اور اُس کے پانے اور ملنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

آہا! سکھ، آنند، آرام وغیرہ سب ہم معنے الفاظ ہیں، اور انسان کی ایک ہی حالت کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے پیارے اور ہر دلعزیز الفاظ ہیں کہ جہاں منہ سے نکلے بولنے اور سننے والے کے چہروں پر رونق آگئی۔ سکھ کا خیال آتے ہی دل کو فرحت اور روح کو راحت نصیب ہوتی ہے، قلب کی حالت آناً فاناً بدل جاتی ہے۔ غرض سکھ کی جھلک دیکھتے ہی انسان کا عجیب حال ہو جاتا ہے۔ دکھ کی طرح سکھ بھی انسانی ظرف کی جانچ کرنے کا اعلیٰ ذریعہ ہے، کیونکہ اس کے آتے ہی کم ظرف اُبل پڑتے ہیں، اِترانے لگتے ہیں اور خودی کی ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں۔ گوشائیں تلسی داس فرماتے ہیں۔ کشدر (छंद)

ندی بھر چل اِترائی ۔۔۔ جِم تھوڑے دھن کھل بَورائی

لیکن وہ جو کہ شریف ہیں آم کے درخت کی طرح نیچے کو جُھک جاتے ہیں۔

---

[1] سکھ اور دکھ کے متعلق زمانہ کی نامور مضمون نگار مرحومہ چاندرانی صاحبہ نے دو نادر مضامین لکھے تھے جنمیں سے دکھ کے متعلق مضمون تو زمانہ جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع ہوگیا تھا مگر یہ مضمون جسکو مرحومہ نے اُسی زمانہ میں لکھا تھا اُنکی بے وقت موت نے انکو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ اسکو بھی صاف کرکے شائع کرا سکتیں اب ایک مدت دراز کی کس مپرسی کے بعد مرحومہ کے والد اور بھائی کی توجہ سے یہ قابل قدر مضمون ہدیۂ ناظرین ہو رہا ہے۔ (زمانہ)

سکھ کے لئے جس قدر کشمکش دنیا میں ہو چکی یا اب تک ہو رہی ہے، اس قدر کوشش شاید پرماتما کے لئے بھی نہیں ہوتی۔ سکھ کو سب چاہتے ہیں اور پرماتما کو کوئی کوئی۔ لیکن سکھ حاصل کرنا بھی پرماتما کے حاصل کرنے سے کم دشوار نہیں، آج سے نہیں ہمیشہ سے یہی قاعدہ چلا آرہا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں، کائنات کے سارے جاندار، چرند، پرند، ملک، خاکی، بادی، آبی، آتشی، نباتات اور جمادات سب کو سکھ کی چاہت ہے، آج تک جتنے رشی، منی، گیانی، دھیانی جتی، ستی، جوگیشور، تپشوی، راجہ، رنک، امیر، غریب، گندھرب، اپسرا، دیوتا ہوئے سب سکھ کے شیدائی اور متلاشی تھے۔ سارے اوتار، پیر، پیغمبر، نبی، اولیا، حکیم، فلاسفر، عقیل، فہیم، سکھ ہی سکھ پکارا کئے۔ دنیا کی تمام متبرک کتابیں حتیٰ کہ شری وید بھگوان سے لگا کر شیوں اور منیوں کے لکھے ہوئے گرنتھ سب ایک زبان ہو کر سکھ ہی سکھ پکار رہے ہیں، سکھ پانے ہی ہی کی تعلیم دیتے ہیں، بلکہ محض سکھ ہی حاصل کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ سکھ کے مسئلہ ہی کو لیکر اور اسی کو حل کرتے کرتے دنیا میں لاتعداد مذہب پھیل گئے۔ اسی کے نام پر صدہا فقیر ہو گئے، پچاسوں گرو بن بیٹھے، ہزاروں پوجنے لگے۔ کسی نے کرۂ شمس کو آرام کا مرکز مانا، کسی نے کرۂ قمر کو آرام کا منبع جانا، اسی سے زندوں اور مُردوں کی پرستش قائم ہوئی۔ اسی کے لئے وید ویاس اور وید بھگوان نے تعلیم دی۔ اسی کو حاصل کرنے کا حضرت موسیٰ اور عیسیٰ نے وعظ کہا، اسی کو پانے کی حضرت محمدؐ، راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند، سوامی دویکانند اور سوامی رام تیرتھ جیسے مہاپرشوں نے تلقین کی۔ مسجد، مندر، گرجا سب اسی کے لئے بنے سکھ ہی کے لئے مہاتماؤں کی قربانیاں ہوئیں۔ عذاب، ثواب، سزا جزا، حلال حرام، جنت دوزخ سب سکھ ہی کے لئے اختراع ہوئے۔ بلکہ اگر زیادہ باریک نظر سے دیکھا جائے تو دنیا میں تمام کام محض سکھ کے حاصل کرنے کے لئے ہو رہے ہیں۔ جس قدر رشتے دنیا میں قائم ہیں سب کی تہ میں سکھ موجود ہے۔ باپ کو بیٹے سے سکھ بیٹے کو باپ سے، شوہر کو بیوی سے، بیوی کو شوہر سے، باغ کو مالی سے، مالی کو باغ سے۔ غرض دنیا کا سارا تعلق پیار محبت، اس کے بغیر سب بیکار ہے۔ کیونکہ ان میں اگر سکھ کا خیال نہ ہوتا تو کوئی کسی کی پروا نہ کرتا۔ یہ سکھ ہی ایک ایسی شے ہے جو انسان حیوان، کیڑے مکوڑے، عقلمند بیوقوف، دانا، نادان سب کے رگ و ریشہ میں پیوستہ ہو رہی ہے اور جس نے سارے برہمانڈ کو اپنے کرشمہ سے قابو میں کر رکھا ہے، لیکن ابتک کسی کا قابو نہیں چلا کہ اس کو پا سکے۔ کیونکہ جب کسی کو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جسکی



مصروف مطالعه نوجوان

از قلم رضا عباسی - به طرز محمدی مصور هرات



مریخ کے حیوانات کا تصور

اُس کو خواہش ہے تو پھر تمام کوششیں اور جد وجہد موقوف ہو جاتی ہیں۔ لیکن آنند کی تلاش میں دنیا اس طرح کوشاں ہے جیسی کہ پہلے دن تھی، اور اس لئے یہی گمان ہوتا ہے کہ دنیا کو سکھ ہنوز نہیں ملا۔ روزمرہ کا نظارہ شاہد ہے کہ برہانڈ میں جس قدر کشمکش، دنیا میں جتنا تلاطم، انسانوں میں جس قدر کوشش، زمین پر جس قدر ہلچل ہو رہی ہے سب سکھ کی تلاش میں ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، ہوتے ہی روتا ہے، دودھ پیتا ہے، کھیلتا کودتا ہے، بڑا ہوتا ہے، پڑھتا ہے، استاد یا ماں باپ کی مار سہتا ہے۔ بالغ ہوتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے، نوکر ہوتا ہے، بیاہ رچا جاتا ہے، بال بچے پیدا کرتا ہے، روپیہ کماتا ہے، روپیہ میں سکھ سمجھ کر ہزارہا سوانگ بناتا ہے، کشتی لڑتا ہے، قلابازی کرتا ہے، یا فقیر ہوتا ہے، فاقہ کرتا ہے، پرماتما کی یاد میں مالا پھیرتا ہے، کسی کو مارتا ہے، کسی کا مددگار ہوتا ہے، غرض عجیب عجیب تماشے کرتا ہے اور بالآخر زندگی کے ایام اسی دوا دوش میں طے کر کے مر جاتا ہے۔ یعنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سکھ کے لئے صرف کرتا ہے، بادشاہ ہے تو سکھ کا خواہشمند، وزیر ہے تو سکھ کا دلدادہ، اسی کے لئے عقلمند پریشان ہیں اور بیوقوف نالاں ہیں۔ بچہ ہے تو سکھ کا متلاشی، جوان ہے تو سکھ کا گرویدہ، طاقتور، نحیف، پہلوان، ضعیف، سب سکھ ہی کی طرف رواں دواں ہیں۔ لوگ لاکھوں طرح کی مصیبتیں اٹھاتے اور دکھ سہتے ہیں، سب سکھ کے ملنے کے لئے۔

میرے معزز بہن بھائیو! سکھ حقیقت میں ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے لئے انسان جس قدر کوشش کرے بجا ہے۔ بلکہ بالفاظ دیگر ہر جاندار کی زندگی کا مقصد یہی سکھ حاصل کرنا ہے۔ انسان چاہے کیسی ہی حالت میں کیوں نہ ہو آرام کا شیریں نغمہ اور سکھ کی میٹھی صدا تلخ سے تلخ زندگی کو شیریں بنا دیتی ہے۔ مریض بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی اُس کے کان میں آواز پہونچی "ارے آرام ہو جائیگا" وہ آنکھ کھول دیتا ہے، حکیم کو دیکھکر چہرے کی شکن جاتی رہتی ہے۔ ایک غریب کئی دن کا بھوکا ہے، جس کی پیٹھ اور پیٹ ایک ہو رہا ہے، دکھ میں مر رہا ہے مگر آواز آئی "فلاں مقام پر جا، سب طرح کا سکھ ملے گا" یہ آواز اُس میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔ غریب۔ لنگڑے۔ اندھے جو دس قدم بھی نہ چل سکتے تھے میلوں دوڑ جاتے ہیں۔

مَیں پورا یقین رکھتی ہوں کہ اگر دُنیا میں سکھ نہ ہوتا تو زندگی وبال ہو جاتی۔ یہ پرماتما کی اپار دیا ہے کہ اُس نے ایسی بیش بہا نعمت ہم کو دے رکھی ہے۔ سکھ کی اہمیت ہی سمجھ کر تو مت یہ

سے مہاتماؤں کی عمریں اس کی تلاش میں صرف ہورہی ہیں۔ گرونانک دیو، مہاتما سالگ رام جی سوامی دیانندجی، سکھ حاصل کرنے ہی کی تلقین کرتے تھے۔ بودھ مہاراج اور شری شنکراچارج سکھ ہی کے راستہ کو بتاتے تھے۔

غرض سکھ حاصل کرنے کے لئے دنیا میں لاکھوں باتیں ہورہی ہیں، گو ان سب باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک پورب کہتا ہے تو دوسرا پچھم، لیکن مدعا سب کا سکھ ہی حاصل کرنا ہو تو کیا یہ سارے انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اپنا مدعا حاصل کیا یا نہیں؟

افسوس دنیا کی حالت دیکھتے ہوئے یہی یقین کرنا پڑتا ہے کہ سکھ کی معراج تک کوئی نہیں پہونچا، اور اس کا مزہ کسی درجہ تک ملا، کیونکہ پرماتمانے سکھ کو اس طرح لٹا رکھا ہے جس طرح راجہ اندر نے پانی کو۔ جب مینہ برستا ہے تو اچھی بری جگہ کی تمیز نہیں رہتی سب پر بارش ہوجاتی ہے۔ ہاں کھیت میں پڑنے سے ناج پیدا ہوتا ہے اور غلاظت پر پڑنے سے بیماری۔ اسی طرح یہ سکھ بھی دکھ کا پیش خیمہ ہوتا ہے، کیونکہ آناً فاناً غایب ہوجاتا ہے اور انسان چاہتا ہے مستقل آنند۔ پس یہ سکھ ایک لمحہ کے بعد غائب ہو کر دوگنا دکھ پہونچاجاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جس نے مکھن مصری نہیں کھایا اس کے سواد سے بے خبر ہے لیکن جب ایک مرتبہ ذائقہ چکھ لیتا ہے تو اب اس کے نہ ملنے سے دکھ ہوتا ہے اور اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ سکھ ابتک لاپتہ ہے بلکہ بالفاظ دیگر زیادہ تر انسان دکھ پانے کی کوشش کررہے ہیں نہ کہ سکھ کی۔ کیونکہ جس کام میں ایک حصہ سکھ اور ننانوے درجہ دکھ ہو وہ سکھ حاصل کرنے کا کام نہیں کہا جاسکتا۔ افسوس کہ انسان بلا سوچے سمجھے اس دکھ دائی سکھ کے لئے جی توڑ کر کوشش کررہے ہیں اور سکھ کو ڈھونڈھتے ہوئے دکھ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ سکھ پانے کے لئے جو کچھ کوشش اور محنت کرتے ہیں سب مہا دکھ اور سخت عذاب سمجھتے ہیں۔ دن رات انھیں دکھ دائی کاموں کی شکایت کیا کرتے اور روتے رہتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ جس عمل کا رات دن ورد کیا جاتا ہے وہ عادت میں شامل ہوجاتا ہے۔ اگر ہم دن رات دکھ کے کاموں میں لگے رہتے ہیں تو ہمیشہ دکھی رہیں گے چاہے لمحہ دو لمحہ کو سکھ بھی مل جائے کیونکہ وہ سکھ اس دکھ کے مقابلہ میں کسی شمار میں نہیں آسکتا۔

مجھے سخت تعجب ہے کہ انسان ایسا کیوں کرتے ہیں کیونکہ سکھ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے دکھ میں پھنس جاتے ہیں۔ کیا دکھ سہنے سے سکھ مل سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کبھی نہیں! سکھ تو دکھ کے بالکل برعکس ہے۔ جو شخص سرتاپا دکھ میں ڈوبا ہوا اس کو سکھ کی امید رکھنا، دکھ کے پیچھے

دوڑکر آنند حاصل کرنا" این خیال است ومحال ست وجنون"۔ لوگ سکھ حاصل کرنے کے لئے دن رات محنت مشقت کرتے ہیں مگر اس محنت کو دکھ سمجھتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں سکھ پانے کے لئے اور پلّے پڑتا ہے دُکھ۔ لطف یہ کہ جب کسی سے پوچھا جائے کہ یہ محنت مشقت کیوں برداشت کرتے ہو، کیوں وہ کام کرتے ہو جس میں دکھ ملتا ہے، تو جواب ملتا ہے کہ سکھ کے لئے۔ ہائے کیسا انوکھا خیال اور نرالی منطق ہے، جیسا بیج ہوتا ہے ویسا ہی پھل ملتا ہے، جَو سے جَو اور گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مَیں نہیں سمجھ سکتی کہ دکھ میں دن رات مبتلا رہنے سے سکھ کی اُمید رکھنا کونسی دانائی ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے، جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے دن رات کوشش کی جارہی ہے وہ کیوں دستیاب نہیں ہوتی۔ دنیا کے عالم وعاقل فلاسفر اور ڈاکٹر جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اُس کو انجام پر ہی پہونچا کر دم لیتے ہیں، جس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں بالآخر حاصل ہی کرکے چھوڑتے ہیں۔ لیکن سکھ کے بارے میں کیوں ناکامیاب رہے۔ کیا مذکورہ بالا طریقے سکھ حاصل کرنیکے راستے نہیں ہیں؟ کیا مہاتماؤں نے بھی سکھ کے بھید کو نہیں پایا؟ کیا دنیا کے مہاپرشوں کی کوشش، اوتاروں کی تلقین اور رشی منیوں کی عمروں کی محنت سب رائیگاں گئی، اور سکھ کا راز نہ پایا؟ نہیں یہ بات نہیں ہے جس نے تلاش کیا اُس نے پایا، یہاں صرف سمجھ کا پھیر ہے، انسانوں نے ایک لمحہ بھی اس زندگی کے اعلیٰ مقصد کے لئے غور وخوض نہیں کیا۔ مہرشی پاتنجلی گوتم۔ کناد۔ یاگ ولک وغیرہ نے چھ شاستروں میں سکھ ہی کو اہمیت دی ہے۔ راج یوگ بھگتی جوگ۔ انہد شبد۔ سُرت شبد وغیرہ سب سکھ حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ زمانہ حال کے فلاسفر اور عالم روزمرہ نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں، سب سکھ ہی کے لئے۔ غرض دانا نادان، عقلمند بیوقوف غریب امیر، بادشاہ فقیر، رشی منی، اپنی سمجھ کے مطابق سکھ پانے کے لئے کوشاں ہیں، اور مدت مدید سے مہاتماؤں کی عمریں اسی کی تلاش میں صرف ہورہی ہیں۔ اوتار سکھ ہی دینے کو ہوتے ہیں، اور اس کے ہی پانے کی تعلیم وتلقین کرتے ہیں۔

پرماتما کی بچتر رچنا پر غور کرتے ہوئے مجھے دنیا کا ایک کام، انسان کا ایک فعل، برہمانڈ کا ایک ذرہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں انسان سکھ نہ بھوگتا ہو۔ یا نہ بھوگ سکتا ہو۔ پرماتما نے اپنی اپار دیا سے سکھ ایسی نعمت بے بہا کو ہر ایک کام، ہر ایک ذرہ اور ہر ایک لمحہ میں دیدیا ہے اور عقل سلیم عطا فرماکر پرماتما نے انسان کو خود مختار کردیا ہے کہ وہ اس نعمت غیر مترقبہ کو جس طرح چاہے

حاصل کرے کیونکہ جہاں ہر ایک چیز اور ہر ایک کام میں سکھ کا عنصر موجود ہے، ساتھ ہی ساتھ دُکھ کا بھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسانی عقل نے یہاں کیا کارگذاری دکھائی ہے اور لوگ اس سکھ کے لئے کیا کیا کر رہے ہیں۔

ایک طرف چور چوری کرتا ہے، جواری جوا کھیلتا ہے، سکھ کے لئے، کاذب جھوٹ بولتا ہے دغاباز دغا کرتا ہے سکھ کے لئے، تو دوسری طرف شاہ وشاہ بیدار رہتا ہے۔ جوئے سے بھاگتا ہے راست گو سچائی اور اپنے قول پر قائم رہتا ہے اور دغا و فریب سے بچتا ہے محض سکھ کے لئے اگر شرابی اور رند شراب پیتے، مذہب سے منہ پھیرتے اپنے فرض کو درست نہ سمجھ کر غلط دھرم اختیار کرتے ہیں، من مانی باتیں کرتے اور سکھ کی خاطر دنیا میں انگشت نما ہوتے ہیں تو دیندار پرہیزگار اپنے دین اور دھرم پر قائم رہتے، شرع کی پابندی کرتے، پرماتما سے ڈرتے اور اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ جہاں سکھ کی خاطر عورتیں پت برت دھرم قائم رکھتیں، شوہر پرستی کرتیں اور اس کے ساتھ ستی ہو جاتی ہیں وہاں سکھ ہی کے لئے، خاوندوں سے لڑتیں، ساس سسر اور تمام رشتہ داروں سے جھگڑتیں، گھروں سے نکلتیں اور آوارہ ہو کر سرشٹ پت برت دھرم کو خیرباد کہتی ہیں۔ بادشاہ سزا دیتا ہے، قید خانہ بھرتا ہے، پھانسی چڑھاتا ہے، یا کسی کی جان بخشی کرتا ہے، انعام دیتا ہے، مرتبہ بڑھاتا ہے، محض سکھ کے لئے۔ لوگ خیرات کرتے، رحم رحم کی صدا لگاتے اور پر اُپکار پر مرے مٹتے ہیں فقط سکھ کے لئے۔ بڑے بڑے معرکے ہوتے ہیں جن میں لکھوکھا بندگان خدا کا خون پانی کی طرح بہہ جاتا ہے، صرف سکھ کے نام پر، لوگ صلح کل چاہتے میل میل پکارتے اور ایکا و یگانگت کے وعظ کہتے ہیں، سکھ کی خاطر، لاتعداد جانور شکار کئے جاتے ہیں، لاکھوں مذبح کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں، سکھ ہی کے لئے۔ "اہنسا پرمو دھرما" کہتے ہوئے لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، چھان چھان کر پانی پیتے ہیں، گئوشالہ بنواتے ہیں، محافظ پنجر انجمنیں قائم کرتے ہیں، سب سکھ کے لئے۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے پر اور رنگ برنگی تیلیوں کے پر نوچے جاتے ہیں، سکھ کے لئے۔ لوگ چیونٹیوں کو چارہ اور چھوٹے پرندوں اور چڑیوں کو دانہ کھلاتے ہیں، سب سکھ کے لئے۔ کہیں ہاکی۔ فٹ بال۔ ٹینس، کرکٹ۔ شطرنج۔ تاش گنجفہ۔ چوسر۔ صدہا کھیل ہوتے ہیں۔ سب سکھ کے لئے۔ ناچ۔ گانا۔ طبلہ۔ ہارمونیم۔ تھیٹر۔ تماشہ اور طرح طرح کے سوانگ ہوتے ہیں۔ بعض خدا شناس جنگلوں میں بیٹھ کر رات دن خدا خدا کیا کرتے ہیں۔ کہیں لوگ دن بھر اوباشی کرتے ہیں، اور نقب زن رات کو نقب لگاتے ہیں، دیوار پھاندنے کی فکر میں

لگے رہتے ہیں۔ جو عقلمند اور فہیم ہیں رات دن جد و جہد کرتے، علم پڑھتے، عمل کرتے ہیں۔ حکیم۔ عالم۔ فلاسفر کہلاتے اور زمین میں گھسنے یا آسمان میں اڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو سکھ کے لئے۔ کاہل اور بیوقوف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے یا دن رات پڑے سوچا کرتے ہیں۔

سکھ کیا ہے؟ کیونکر مل سکتا ہے؟ اور اُس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ ذرا نہیں سوچا، برعکس اسکے مرگ ترشنا کی طرح سراب سمجھکر دوڑ پڑتے ہیں، جہاں بجز خاک پھانکنے کے پانی کی ایک بوند نہیں مل سکتی۔ اندراین کے پھل کی خوبصورتی دیکھکر اُس پر بلانتیجہ سوچے ہاتھ ڈال بیٹھتے ہیں۔ اور گو ایک معنی میں کچھ دیر کے لئے ایسے انسان سکھ بھی محسوس کر لیتے ہیں لیکن کبھی آسودہ نظر نہیں آتے بلکہ جس طرح گھی کی آہوتی سے آگ تیز ہوتی چلی جاتی ہے اُسی طرح اُن کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اور ایسے سکھ کو جس سے اطمینان بھی حاصل نہ ہو سکھ کہنا بھی واجب نہیں ہے۔ کیونکہ سکھ کسی چیز میں نہیں بلکہ اصلی گیان میں ہے، باہر نہیں اندر ہے۔ سکھ کی تلاش میں دوسری غلطی جو انسان کیا کرتے ہیں یہ ہے کہ ہر شخص اپنی موجودہ حالت کو گذشتہ حالت کے مقابلہ میں دکھی جانتا ہے، اور اوروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دُکھی مانتا ہے۔ وہ دن رات دکھ ہی دکھ کو سوچا کرتا ہے اور سکھ کا دھیان بھی نہیں کرتا۔ وہ ان باتوں کو جو اوروں کے نزدیک سکھ دایک ہیں اپنے لئے ایسا نہیں خیال کرتا۔ بلکہ اپنے چھوٹے موٹے تمام دکھوں کا مقابلہ کیا کرتا ہے۔ یہ ایک بڑی بھاری غلطی ہے اور اس خیال سے انسان نے مصیبت اپنے سر اپنے آپ مول لے لی ہے۔

ایک تین دن کا بھوکا بھکاری ایک کتے کو جس کے منہ میں ایک روٹی کا ٹکڑا ہے سُکھی سمجھتا ہے۔ لیکن ایک قیدی جو ابھی پیٹ بھر کر کھا چکا ہے، بدن ڈھانکنے کو بھی معمولی کپڑے موجود ہیں لیکن سپاہیوں کی زیر حراست ہے۔ اس ننگ دھڑنگ فاقہ مست فقیر کو دیکھ کر ہی دل میں کہہ رہا ہے "واہ کس آنند سے آنا و بیٹھا ہوا ہے۔ کاش میری بھی یہ حالت ہوتی"۔ قیدی ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے ایک پالکی نمودار ہوئی جس پر زردوزی کام کے پردے پڑے تھے اور کہار سنہری وردیاں پہنے چاندی کے عصا ہاتھوں میں لئے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے یہ ایک نواب صاحب کی سواری تھی جو حضرت نظام الدین اولیا کی زیارت کو جا رہے تھے۔ کیونکہ غریب عرصے سے بیمار چلے آتے ہیں۔ قیدی نے نواب صاحب کو اور نواب صاحب نے قیدی کو دیکھا۔ غریب قیدی کے جو کچھ خیالات ہوں وہ سب خیال کر سکتے ہیں، لیکن نواب صاحب کے چہرے پر حسرت کیوں برس رہی ہے؟ وہ قیدی کو تندرست دیکھکر اپنی دکھ بھری زندگی پر افسوس

کرتے ہیں" کاش میں ایسا تندرست ہوتا!" غور فرمائیے کہ نواب صاحب اپنی شاندار زندگی کو قیدی کی زندگی سے ہیچ سمجھتے ہیں۔ کون قیدی جو اپنی زندگی کو ایک فقیر کی زندگی سے بدتر سمجھتا تھا اور فقیر بھی کیا جو خود کو کتّے سے بُرا جانتا تھا! کیا یہ خیالات کا تعجب انگیز منظر نہیں ہے ابھی یہ سب اپنے اپنے خیالوں میں مست تھے کہ ایک بڑھیا آٹھ سات بچوں کو لیئے آنکلی، دوسری جانب سے سپہ سالار صاحب تشریف لائے۔ بڑھیا نے نواب صاحب کو دیکھکر آہ کی "کاش میں ان کی طرح مالدار ہوتی" اور سپہ سالار نے بڑھیا پر حسرت کی نظر کی" افسوس کہ لاولد ہوں ایک بھی بالک نہیں۔ یہ بڑھیا بڑی خوش قسمت اور سکھی ہے۔" سپہ سالار ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے، ساری دولت و ثروت، حکومت و تمکنت اُن کے خیال میں ہیچ تھی کہ وزیر صاحب تشریف فرما ہوئے۔ سپہ سالار کو اس طرح آزاد اور بیفکر سمجھکر دل میں کڑھنے لگے" افسوس کہ میری زندگی تشویش و فکر کی نذر ہو چکی۔ دن رات فکر، دن رات سوچ، ہر وقت کی حاضری ہر ساعت بندگی۔" خیر سلام و بندگی کے بعد دونوں بادشاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ مہم کا حال گوش گذار کریں۔ حاضر ہو کر دیکھا کہ جہاں پناہ عیش و عشرت میں ہیں، خوبصورت خوبصورت کنیزیں چاروں طرف موجود ہیں، چہل پہل ہو رہی ہے، طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہے، ستار و ساز بج رہا ہے، بے خبر ہو کر خود بدولت لطفِ دنیا اُٹھا رہے ہیں۔ سپہ سالار اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا، دل میں بیحد رنجیدہ ہوا کہ افسوس! ساری ذمہ واریاں، سارا کام، ساری آفت ہمارے ذمہ اور عیش و عشرت کے مالک یہ ہیں۔ مصیبت اور مشقت ہم کریں اور آرام یہ اُٹھائیں، ہتھیلی پر جان رکھکر میدان جنگ میں ہم جائیں، تمام ملک کی حفاظت ہم کریں اور راجہ یہ کہلائیں ہائے کیا تقدیر ہے۔!

جس طرح دو انسانوں کا ہم خیال ہونا مشکل ہے، اُسی طرح سُکھ کا ایک مرکز جاننے والے دو شخص بمشکل ہی ملیں گے۔ ورنہ سب نے سکھ کو الگ الگ ہی مانا ہے۔ گذشتہ حال سے یہ بات بخوبی روشن ہے

پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ سُکھ امیروں، رئیسوں، بادشاہوں اور شاہنشاہوں کے کے حصے میں آیا ہے، جو گرمی میں برفاب اور جاڑوں میں آتشدان کا آنند بھوگتے ہیں۔ جن کے لئے دنیا کی تمام نعمتیں موجود ہیں، جنھیں کوئی فکر دامنگیر نہیں۔ لیکن جہانگیر و شاہجہاں سے بادشاہ۔ نورجہاں اور ممتاز محل سی بیگم، ہریشچندر اور رامچندر سے راجہ سب کی سوانح عمریاں

دیکھ کر بالآخر یہی یقین ہوا کہ میرا پہلا خیال سراسر غلط تھا، یہ بھی دُکھ سے آزاد نہیں تھے۔ ایک مشہور بیگم کی قبر پر لکھا ہے ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبُلے

ایک امیر کی قبر پر منقوش ہے ؎

روتے ہی آئے تھے افسوس کہ روتے ہی چلے
آکے دنیا میں نہ اِک روز بھی آرام ملا

کیا یہ مالدار ہونے پر بھی سکھی تھے؟ ہرگز نہیں۔

میرا دوسرا خیال تھا کہ بچپن کا زمانہ بڑے عیش و آرام کا زمانہ ہوتا ہے، جب نہ کسی بات کی فکر ہوتی ہے نہ کسی چیز کا خیال اور بہت سی کتابوں میں بھی بچپن کے زمانہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ لیکن یوگ وشِشٹ کے مطالعہ کرنے سے یہ خیال بھی دور ہو گیا جب دیکھا کہ شری مہاراج وشِشٹ جی نے اس بچپن کے زمانہ کا کیا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اور کیونکر اس لاثانی زمانہ کی مٹی پلید کی ہے۔ اُنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بچپن درحقیقت ساری اوستھاؤں سے خراب ہے، نہ گیان ہوتا ہے نہ عقل و تمیز ہوتی ہے۔ پھر اگیانی کو آرام سکھ یا چین کہاں؟ اندھکار میں روشنی کہاں؟

اسی طرح ہر ایک انسان سکھ کے لئے علیحدہ ہی خیال رکھتا ہے۔ لیکن سچائی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ پس یہ اختلاف صاف بتا رہا ہے کہ لوگوں نے اصلی مقام نہیں پایا۔ تو کیا سچ مچ یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ رشیوں کی تمام کوششیں اور اوتاروں کی تلقین، ویدوں کے بچن، شاستروں کے اصول سب بے فائدہ ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جو ڈھونڈتے ہیں وہ پاتے ہیں۔ جو کوشش کرتے ہیں وہ حاصل کرتے ہیں۔ جنھوں نے اِن متبرک کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اُن پر عمل کیا ہے۔ جنھوں نے مہاتماؤں کے جیون چرتر اور اُن کی نصیحت پر غور کیا ہے وہ خود بھی کامیاب ہوئے اور دوسروں کے لئے بھی راستہ بتا گئے، کہ چلے آؤ، سکھ اور شانتی حاصل کرنے کا یہ سیدھا راستہ ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس پر پہاڑ کی سیدھی چڑھائی اور جھاڑ جھنکاڑ دیکھکر کمزور دل والے انسان کانپ اُٹھتے ہیں، اور بعض وقت اوّل اوّل ان کانٹوں میں انسانوں کو اُلجھنا بھی پڑتا ہے۔ لیکن جب اس راستہ پر قدم پڑ جاتے ہیں تو ایک دو منزل کے بعد صاف سڑک، ٹھنڈی اور دل خوش کن ہوا روح کو بھر دیتی ہے اور یقین آ جاتا ہے کہ اس راہ جانے سے ضرور آنند اور سکھ اور شانتی کا سرچشمہ مل جائے گا۔

یہ سب اختلافات لوگوں کی ناسمجھی سے ہیں۔ پیارے بھائی بہنو! کیا آپ نے کبھی اس مسئلہ پر غور کیا ہے اگر نہیں کیا ہے تو آئیے اور میرے ہمراہ زندگی کی سب سے عمدہ چیز پر غور کیجئے۔

جس طرح شیرینی کسی ایک چیز میں نہیں، بہت سی چیزوں میں کہی جا سکتی ہے۔اسی طرح سکھ بھی تمام چیزوں میں محسوس ہو سکتا ہے، اور جس طرح شہد اور شکر کی شیرینی میں کوئی فرق نہیں بتا سکتا اسی طرح مختلف سکھوں میں بھی کوئی فرق نہیں بیان کیا جا سکتا۔ بجز اس کے کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ، کسی کے ساتھ تلخی ملی ہوئی ہے اور کوئی خالص شیریں۔ جس طرح ذائقہ معلوم کرنے کے لئے زبان ہے اُسی طرح سکھ محسوس کرنے کے لئے خیال ہے۔ اور جیسا کہ میں دُکھ والے مضمون میں لکھ چکی ہوں سکھ ہو یا دکھ محض انسان کے خیالات کا نتیجہ ہے۔

پشاور میں ایک بہت کنگال بنیا تھا جو غریبی کا ہمیشہ شاکی رہا کرتا تھا، لیکن جب باوجود مصیبت اور لوٹ مار کے وہ بالکل کورا بچ رہا تو اپنی غریبی پر خوش ہوتا تھا۔ اُس کی یہ حالت بہت لوگوں نے دیکھی، کوئی اس پر غور کرے یا نہ کرے مگر میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ اگر وہ غریبی کو پہلے ہی سے ایسا سمجھتا تو اتنے دن دُکھی نہ رہتا۔

عام طور پر انسانوں کی زندگی دو طرح پر گذرتی ہے۔ سکھی یا دُکھی۔ دُکھ پر میں پہلے تحریر کر چکی ہوں اب یہ سوچنا ہے کہ سکھ کیا ہے اور کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

سکھ ایک پرماتما کا عطا کیا ہوا خیالی جذبہ ہے جس کے ذریعہ ہم خوش و خرم رہ سکتے ہیں۔ یہ انسان کے اندر ہے، اور ہر چیز میں ہر لمحہ میسر ہے۔ لیکن عام آدمیوں کا خیال بالکل اس کے برعکس ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اصلی آرام سے منزلوں دور ہیں۔ وہ خود اُلٹی راہ چل رہے ہیں اور اس لیے رہنما بالکل بے قصور ہیں۔ وہ سکھ کو باہر تلاش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ لوگوں نے سکھ کی دو قسمیں مان رکھی ہیں۔ ایک شریرک سکھ دوسرا آتمک سکھ یعنی آرام جسمانی و آرام روحانی اور گو روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں، پھر بھی بہت سے ایسے انسان ہیں جو محض جسمانی سکھ ہی کو سکھ جانتے ہیں اور اس کے لئے وہ آرام روحانی کو قربان کر دیتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو آرام روحانی کا خیال کرتے ہیں۔ آسائش جسمانی ہی کو آرام کل سمجھنے والے انسان غلطی کرتے ہیں اور سکھ کا منبع بھی مایا یعنی دنیا کے حاصل کرنے میں سمجھتے ہیں۔ اور آتما و پرماتما سے بالکل بے خبر ہیں جس کا پورن گیان ہی سکھ کا اصلی سرچشمہ ہے اور جس کے بغیر آتمک سکھ غیر ممکن ہے۔ مایا میں سکھ جاننے والے انسان دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک مایا کے غلام دوسرے مایا کے افسر۔

جسمانی سکھ کے فدائی جو مایا کے غلام ہیں اُن کی حالت بالکل ناسمجھ بچوں کی سی ہے۔ جو ہر ایک چیز کی ظاہری چمک دمک پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ ننھا بچہ جب سانپ کو چلتا دیکھتا ہے تو ایک دل خوش کن کھلونا سمجھ کر پکڑتا ہے۔ لیکن افسوس کہ سانپ کے زہر سے بے خبر ہے۔ جب بچے کسی بات کے غور کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور ہر ایک چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں یقین کر لیتے ہیں چاہے اصلیت کچھ ہی ہو۔ اسی طرح مایا کے غلام جسمانی سکھ کی ہوس میں مایا کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتے ہیں اور اصلیت تک پہونچنے کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ اِس لئے اُلٹا نتیجہ ہوگئے ہیں۔ بچے آسمان کو نیلی چھت۔ ستاروں کو ہیرے کا جڑاؤ جلد یقین کر لیتے ہیں بجائے اس کے کہ ان کی اصلیت کو سمجھیں۔ زمین کو ساکت اور چپٹی مان لیتے ہیں۔ وہ ذرا بھی نہیں جھجکتے چہ جائیکہ یہ اصلیت کے بالکل برخلاف ہے۔ اور اسی لئے یہ لوگ دکھی رہتے ہیں۔

دوسرے جو مایا پر افسر ہیں ان غلاموں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اُن کا یقین ہے کہ مایا پر قابو حاصل کرکے سکھ کا سرچشمہ دستیاب ہوگا۔ وہ جی توڑ کر کوشش کرتے ہیں اور بالآخر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ہوا۔ پانی۔ بجلی اور بھاپ وغیرہ سے صدہا کام لینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ انہی لوگوں نے قدرت پر قابو پایا ہے کہ سمندر اور آسمان اپنے لئے یکساں کر لیے ہیں۔ کہیں آواز کو قید کیا۔ کہیں صورت کو۔ میلوں دور بیٹھے بات چیت تو ہوتی ہی تھی۔ اب صورت بھی دیکھ لو۔ غرض ایک نہیں بلکہ ہزارہا نئی نئی ایجادیں کیں اور برابر کر رہے ہیں لیکن صورت حال بتا رہی ہے کہ سکھ سے وہ بھی دور ہیں۔ ہاں تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ جو لوگ آتما و پرماتما کے کامل علم و یقین پر سکھ کا انحصار رکھتے ہیں وہ ضرور سکھی ہیں۔ چاہے دنیا پرستوں کی آنکھوں میں بظاہر ویسے نہ معلوم ہوں لیکن آنکھ والے انسان تو ضرور مان لیں گے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پاتے وقت بھی آرام کلی حاصل تھا۔ سوامی دیانندجی آخری سفر کرتے ہوئے بھی شانت چت تھے۔ مہاراج بدھ بھگوان مجسم سکھ بن گئے اور سوامی رام تیرتھ جی بھی سکھی تھے۔

مہاتماؤں کا قول ہے کہ آسائش جسمانی کی غلامی کرنا آنند کو اور اچھے بھلے جسم کو روگی بنا دیتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ دوپہر کے وقت سورج تپ رہا تھا، گرمی سخت پڑ رہی تھی۔ کہ سری مہاراج اچیدانندجی تشریف لائے۔ وہی سرخ کمبل کا لبادہ جو جاڑوں میں زیب بدن تھا اب بھی جسم پر رونق دے رہا تھا۔ آنکر ایک چوکی پر بیٹھ گئے۔ مجھے سری مہاراج کو اس حالت

میں دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ اُن کو اس اُمس سے اس لبادہ میں سخت تکلیف معلوم دیتی ہوگی جھٹ ایک دستی پنکھا لیکر دوڑی اور زور زور سے جھلنے لگی۔ سوامی جی مجھے دیکھکر مسکرائے اور مخاطب ہو کر بولے "بیٹا میں بیمار نہیں ہوں، جن کو پنکھے کی بیماری ہوتی ہے انہی کو اس سے سکھ ملتا ہے۔ مجھے یہ بیماری نہیں ہے اور نہ تم اس بیماری کو ہونے دینا۔ پنکھا رکھ دو اور بیٹھ کر بات چیت کرو۔" پھر پتا جی کی طرف دیکھکر فرمایا "منش کو جہاں تک ہو سکے اپنے آپ روگ نہ لگانا چاہیئے نہیں تو ہمیشہ دُکھی رہیگا۔ اس وقت پنکھا ہے کل نہ ہوا، آج برف ہے کل نہ ہوئی پھر کیا ہوا یہ سب تھوڑے سے من کے بیگ (روانی) کو روکنے سے چُھٹ سکتے ہیں۔" آہا اس سچے اصول کو مَیں نے بھی بچارنا شروع کیا اور بالآخر جب اس کی صداقت ظہور میں آئی تو سچ مچ بہت سے خود پیدا کردہ روگوں سے نجات مل گئی۔

سچ بات یہی ہے کہ سکھ اور دکھ محسوس کرنے کا ذریعہ "خیال" ہے اور سکھ حاصل کرنے کی کنجی محض خیالات پر قابو پانا ہے۔ دنیوی چیزوں میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جس میں انسان ہمیشہ سکھ پا سکے۔ آج برف کا پانی پیکر خوش ہوتا ہے، جلسہ میں بیٹھا ہوا گانا سُن رہا ہے جس کی ٹٹیوں سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔ لیکن جیسے ہی سنتا ہے "بیوی بچے طاعون کا شکار ہو گئے" ہاتھ سے گلاس پھینک دیتا ہے، گانا یک لخت بند کر دیتا ہے، کہاں کی ٹٹی اور کیسی خوشبو، جلتی تپتی دوپہر میں چل پڑتا ہے۔ غور تو کیجئے وہ سکھ کہاں گیا، کیا محض خیال کا اثر نہ تھا۔ ایک گھڑی پہلے جنکے پاس بیٹھنا سکھ دایک تھا وہ اب پکڑے رہے ہیں بِٹھا رہے ہیں لیکن اب سب دشمن معلوم ہوتے ہیں۔ غرض سکھ شریرک ہو یا آتمک، خیال سب سے پہلی سیڑھی ہے جس پہ سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے اور اس سے گو مضمون ذرا بڑھ جائیگا لیکن میں چاہتی ہوں کہ کچھ مفصل لکھوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ سکھ چار ہیں:۔

چوپائی

پہلا سکھ نروگی کایا   دوجا سکھ ہاتھ میں مایا
تیجا سکھ سُپترا دھکاری   چوتھا سکھ کہے میں ناری

یعنی اول ہم تندرست ہوں شکیل ہوں، بہادر ہوں بلکہ ہم کو اور ہمارے لواحقین کو موت بالکل بھول جائے۔ دوئم، ہم مالدار ہوں، دنیا کی تمام دولت ہمارے قبضہ میں ہو۔ جہاں کی

ساری نعمتیں میسر ہوں۔ سوم ہمارے بال بچے بلکہ جملہ لواحقین سعادت مند ہوں، فرمانبردار ہوں، چہارم ہماری بیوی (یا شوہر) ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ غرض اسی طرح پر ہماری تمام خواہشیں پوری ہوں اور تب سکھ ہوگا ؎

جس کو جی چاہے وہ مہیا ہو زندگی کا مزہ اسی میں ہے

لیکن خواہشوں کو پورا کر کے سکھ حاصل کرنا، ایں خیال ست ومحال ست جنوں، انسان کی سب خواہشیں ہرگز پوری نہیں ہوسکتی ہیں، بلکہ خواہشیں جس قدر پوری ہوتی جاتی ہیں اُس سے دوگنی پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ شریر گھوڑا جس طرح لگام ڈھیلی کرنے اور اُس کو اُس کی مرضی کے مطابق چلنے دینے سے زیادہ شرارت کرتا ہے۔ اُسی طرح خواہشوں کا گھوڑا خواہشیں پوری کرنے سے کبھی نہیں سکھ دے سکتا ہے۔ ہاں لگام کھینچئے، ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیجیئے اُس کو اپنی مرضی کا مطیع کیجئے، مضبوطی سے سوار ہوجیئے اور پھر چاہے کوئی سا گھوڑا ہو آپ کو سکھ پہونچائیگا۔ یعنی سکھ کا دار و مدار خواہشوں پر ہے۔ خواہشیں روکنے سے مطیع ہوسکتی ہیں، اس کی لگام من یا خیال ہے۔ پس خیال پر قابو حاصل کیجئے۔ خواہشیں ترک ہوجائیں گی ہر چیز میں سکھ ہی نظر آئیگا جس کو آج تکلیف وہ سمجھ رہے ہو آرام دہ ہوجائیگا۔

یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اگر سکھ کا انحصار محض خیال ہی پر ہے تو لوگ کیوں اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اُنھوں نے اصلی سکھ ہی کو نہیں پہچانا ہے اور اندھیر میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ چھوٹے سے جگنو کی چمک یا ایک چراغ کی روشنی ہی دیکھ کر اچھل پڑتے ہیں۔ لیکن یہ روشنیاں سورج نہیں ہوسکتی ہیں اور نہ سورج کے پرکاش پر قائم ہی رہ سکتی ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ غلطی سے اس کو سکھ سمجھے ہوئے ہیں جو سراسر دکھ ہے۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی طرح اصلی اور نقلی سکھ میں تمیز پیدا ہو۔ جب سورج کی روشنی مل جائیگی جگنو کی حقیقت کھل جائیگی۔ اس وقت کون ایسا ہوگا جو اصلی کو چھوڑ کر نقلی کی طرف دوڑے گا ؎

سچا سکھ اک روپ ہے۔ متھیا روپ انت
متھیا روپ بہو روپ لکھ۔ بھولے سادھ اور سنت

اصلی چیز کی یہ پہچان ہے کہ وہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے لیکن نقلی چند روز بعد بگڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اصلی سکھ سچا آنند ہمیشہ میسر رہتا ہے، نقلی فوراً زائل ہوجاتا ہے۔ اصلی سکھ سدا بہار ہے

فرضی کو خزاں کا خوف ہے۔ اصلی کا نام گیان مئے سکھ اور نقلی کا نام اگیان مئے سکھ ہے۔ کامل گیان حاصل کر کے آتما اور پرماتما کو جان لینا اصلی اور گیان مئے سکھ ہے۔ اس کا عامل ہمیشہ آنند میں رہتا ہے۔

گیان مئے سکھ ہر شخص کو ہر وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگیان مئے سُکھ دنیا کے پدارتھوں پر منحصر ہے۔ اور اس لئے پہلا سکھ ہر انسان کے اختیار میں ہے اور دوسرے سکھ کے انسان تابع ہے۔ اگر رتبہ حاصل ہے سکھی ہے نہیں تو نہیں۔ اگر بال بچے ہیں تو آنند سے ہے نہیں تو دکھی ہے۔ دنیوی چیزیں بذات خود قائم نہیں بلکہ ناش وان ہیں۔ ایسی چیزوں میں اصلی سکھ تلاش کرنا جہالت ہے۔ لڑکا پیدا ہوا سکھ ہوا، شادی ہوئی، ہوا آئی آنند ہوا۔ بہت سی دولت ملی سکھ ہوا ناچ رنگ کھیل تماشے دیکھے، عمدہ عمدہ بھوجن کئے، آرام نصیب ہوا۔ اسی طرح کھانے پینے سونے جاگنے، نوکروں چاکروں، زیور لباس وغیرہ میں لوگ سکھ جانتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی قیام نہیں، پھر ان میں وہ سکھ کہاں میسر ہو سکتا ہے جو ہمیشہ رہے۔ اِن چیزوں کے زائل ہوتے ہی چوگنا دکھ نصیب ہوگا۔ لوگ اس کا تجربہ دن رات کرتے ہیں پھر بھی نہیں سوچتے ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ وہ تھوڑا بہت آتمک سکھ پر دھیان دیتے ہیں گو پوری حد تک نہیں پہونچتے لیکن افسوس کہ بعض ایسے ہیں جو آتمک سکھ کی بالکل پروا نہیں کرتے گو بعد کو پچھتاتے ہیں، ایسے شخص ہی چور۔ ٹھگ۔ بدمعاش۔ دغاباز۔ جھوٹے۔ فریبی جعلساز ہو جاتے ہیں، اور سکھ کے خیال میں مذموم فعل کر کے ایسے ہی پچھتاتے ہیں جیسے اندراین کے پھل کو کھا کر۔ اگر ایک شخص نے چوری سے روپیہ حاصل کیا، کیا وہ سکھی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، چاہیے روپیہ کو پا کر وہ خوش ہو لے لیکن اندراین کے پھل کی طرح کھاتے ہی رونے لگتا ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ خونیوں نے خود بخود اقبال جرم کیا ہے اور تب انھیں چین ملا ہے۔ اصلیت میں آتمک سکھ ہی سچا سکھ اور آتمک دکھ ہی سچا دکھ ہے۔ آتما کو دھوکا دینے اور خیال کو ہٹانے یا بہلانے کے لئے لوگ نشے کی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں، لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ وہ بات حاصل ہو جس سے سکھ کا چشمہ مل جائے اور آتما کو ہمیشہ آنند نصیب رہے۔ قتل کرنے سے پہلے قاتل کا خیال ہوتا ہے کہ قتل کر کے سکھ حاصل ہوگا لیکن نتیجہ برعکس ہوتا ہے، آخر اقبال جرم کر کے شانتی پاتا ہے۔ سکھ کے لئے جان کی بازی لگتا ہے۔ صرف ناسمجھی اور اگیان کی وجہ سے کیسا گراں سودا کرتا ہے۔ استریوں کے لئے گوسائیں جی فرماتے ہیں:۔

چھن سکھ لاگ جنم شٹ کوٹی دکھ نہ سمجھے تھی سم کو کھوٹی
پس ایک لمحہ کے غلط سکھ کے لئے ابدی سکھ کھو بیٹھنا کونسی دانائی ہے ؟

بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ بھائی بہن اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ سکھ دنیوی چیزوں میں نہیں ہے اور سمجھ لیں کہ شریک سکھ ہو یا آتمک۔ خیال ہی پہلی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ ہم اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ گذشتہ مثال پر غور کیجئے۔ بھوکے فقیر نے آرام کو روٹی میں سمجھا اور قیدی نے آزادی میں۔ کیونکہ دنیاداروں کا ایک یہی قاعدہ ہے کہ وہ سکھ اسی چیز میں زیادہ تر خیال کرتے ہیں جو ان کو حاصل نہیں ہے۔ اور اسی سے ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ جہاں کوئی چیز حاصل ہوئی اور اس میں سے سکھ کا خیال جاتا رہا۔ بیمار نواب نے سب باتوں سے ہٹکر سکھ صرف تندرستی ہی مانا۔ لیکن وزیر نے بادشاہ کی طرح ناچ ورنگ میں۔ اور یہ روزمرہ کا نظارہ ہے، کیا یہ تلون مزاجی ظاہر کرتی ہے کہ آرام کا صحیح مرکز مل گیا ہے ؟ چھوٹا بچہ اپنی ماں کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ماں کے دودھ میں دنیا بھر کا آرام محسوس کرتا ہے۔ لیکن بڑا ہونے پر ماں سے لڑتا ہے۔ کھیل کود لہو و لعب کو آرام جانتا ہے۔ بالغ ہونے پر بیاہ شادی میں دلچسپی ہوتی ہے، پھر لڑکے بالے ہونے میں آنند آتا ہے پھر روپیہ پیسہ میں آنند کا مسکن ہوتا ہے۔ غرض آنند کا مرکز ایک نہیں رہتا اور جب مرکز ہی ہاتھ نہیں لگا تو کوئی کوشش کیا خاک کرے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ لوگوں کی محنتیں برباد گئیں اور آرام نصیب نہ ہوا اگر بمبئی جانے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ بمبئی کیا ہے، کس طرف ہے، کہاں ہے تو وہ عمر بھر بھی بمبئی نہیں دیکھ سکتا۔

فرض کرو کہ سکھ دنیا کی سب اچھی اچھی چیزوں میں ہے لیکن نہیں، جن چیزوں کو آج ہم اچھا کہتے ہیں کل بری ہو سکتی ہیں۔ غذا تندرستی میں اچھی ہے لیکن بیماری میں اس سے نفرت ہو جاتی ہے روپیہ ہاتھ آتے وقت اچھا ہے لیکن چوری جاتے وقت برا۔ زیور لباس پہنتے وقت اچھا ہے لیکن ڈاکہ پڑتے وقت برا۔ لڑکے بالے پیدا ہوتے وقت اچھے لیکن مرتے وقت یا ناخلف ہو جانے پر برے اسی طرح دنیا کی تمام چیزیں ہیں، جو کبھی اچھی کبھی بری۔ یا ایک ہی وقت میں کسی کو سکھ دینے والی ہوتی ہیں اور کسی کو دکھ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چیزیں دیسی کی ویسی ہیں صرف خیالات کا اثر ہے۔ دنیا کی نمائش میں الجھ کر سکھ حاصل کرنا "خود غلط املا غلط انشا غلط" والا مضمون ہے۔ لیکن آدمی دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور دنیا ہے کہ اُن سے بھاگتی پھرتی ہے۔ سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کا قول ہے کہ جبتک انسان دنیا کے پیچھے بھاگتا ہے دُنیا اُس سے بھاگتی ہے۔ لیکن جب انسان دنیا سے بھاگتا ہے تو دنیا اُسکے

پیچھے دوڑتی ہے۔ پانی جب تک تلاطم میں ہے اس میں آدمی کی شکل نظر نہیں آتی، لیکن لہروں کے بند ہوتے ہی وہ آئینہ بن جاتا ہے۔ دنیوی سکھوں سے جو محض نقلی ہیں خیالات کے ذریعہ استغنا حاصل کرو۔ خواہشوں کی لہروں کو روکو اور پھر پانی آئینہ بن جائیگا۔ سکھ جب ہی حاصل ہوگا جب من کے تمام تلاطم مٹ جائیں گے۔ اور دُنیاوی پدارتھوں سے آزادی حاصل ہو جائے گی

تو کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ دنیا کی ہوا سے بچ کر سکھ کی تلاش آکاش میں اُڑ کر کرنی چاہیئے۔ یا پاتال میں گھُسکر سمندر کی گہرائی میں جاکر یا ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھکر؟ نہیں دنیا میں رہکر کوئی دنیا سے علیحدہ نہیں رہ سکتا جس طرح کنول پانی سے کبھی علیحدہ نہیں رہ سکتا۔ ہاں انھیں سے بچنے کے لئے کنول کے مانند ذاتی صفات پیدا کرنی چاہئیں۔ کنول کا پتہ جس طرح پانی میں رہ کر بھی پانی کو اپنے اوپر نہیں ٹھہرنے دیتا اسی طرح ہم بھی دنیا میں رہ کر دنیوی پدارتھوں سے الگ رہ سکتے ہیں۔

ہم کو دنیا کے تمام کام فرض سمجھکر کرتے رہنا چاہیئے جس میں نہ سکھ کی خواہش ہو نہ دکھ کا خوف، لڑکا پیدا ہوا محض فرض ادا کریں۔ سکھ کیسا، اگر وہ مرگیا تو فرض ادا کریں اور بس۔ دکھ ماننا کیا معنی، بیماری آئی، فرض ادا کریں، چنگے ہوکر شادیانے کیوں بجائیں۔ علیٰ ہذا القیاس تمام کام کرنا اپنا فرض سمجھیں اور ادائگی فرض ہی میں آرام خیال کریں۔ یہی دنیا میں رہنے کا قاعدہ ہے، اور شاستر کاروں نے یہی بتادیا ہے کہ کن باتوں کا کرنا ہمارا فرض ہے؟ او دوہ دنیا کی وہ تمام باتیں ہیں جن کے کرنے میں خوف، شرم۔ تشویش، وہم، پوشیدگی وغیرہ نہ ہو۔ دوسرے ہم کو سب پر دیا کرنی چاہیئے، اور سب سے سچی محبت رکھنی چاہیئے۔ انسان تو انسان حیوان اور زہریلے جانور تک محبت کرنے والوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پالتو شیر چیتوں کے علاوہ جنگلی شیر تک فقیروں کے پاؤں چومتے ہیں۔ سانپ بچھو مہادیو کا زیور ہیں اور شیر درگے کی سواری اور اسی طرح جب ہم خود اچھے فعلوں کے مرتکب بنیں گے تو ہمارے ارد گرد کی سب چیزوں میں اچھائی آجائے گی۔

اگلے رشیوں کے متبرک گرنتھ دیکھنے اور اُن پر کامل غور کرنے سے سکھ محض ایک خیالی جذبہ ہی نظر آتا ہے اور اس مسئلہ پر جس قدر زیادہ غور کیا جاتا ہے اسی قدر سکھ کی عظمت کم ہوتی جاتی ہے۔ اور سُکھ بذات خود سوائے خیال کے کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ جب ان مہاتماؤں کے قول پر زیادہ عمل ہو جاتا ہے تو صرف سکھ یا دکھ ہی نہیں بلکہ یہ تمام دنیا ہی محض خیالی ہو جاتی ہے

پھر دنیوی سکھ کا کیا ذکر۔ اور اس لئے اگر ہم اپنی تمام عمر کے کاموں میں تمام مرحلوں اقتادوں اور باتوں میں سکھ ہی کا خیال رکھیں، سب کو سکھ ہی سمجھیں تو سب سکھ وایک ہی ہو سکتے ہیں نام کو بھی دکھ نہ رہے کہ یہ محض خیالات کا پر تو ہے اور کچھ نہیں۔ ہمارا روزمرہ کا نظارہ شاہد ہے کہ ایک زخم پر جب دوسرا زیادہ گہرا زخم لگتا ہے تو پہلے کا خیال جاتا رہتا ہے۔ کیا پہلا زخم اچھا ہو گیا؟ نہیں اس طرف خیال نہیں رہا۔ صدہا انسان بے عزتی وغیرہ کے خوف سے خودکشی کر لیتے ہیں، کیا موت آرام دہ ہے؟ نہیں محض خیال ہے۔ بستر مرگ پر پڑا ہوا انسان جب یہ سنتا ہے کہ اُس کا پردیسی لڑکا جس کا اس کو اشتیاق تھا آ گیا ہے چہرہ کھل اُٹھتا ہے اور ایک دم خوش ہو جاتا ہے، کیا اُس کو تکلیف نہ رہی؟ نہیں صرف خیال بدل گیا۔ آئے دن سیکڑوں چوریاں ہوتی ہیں ہم کو کچھ سروکار نہیں، صدہا انسان مرتے ہیں ہم کو دکھ نہیں، غرض اسی طرح کے لاکھوں کام ہوتے ہیں لیکن ہم کو کچھ سروکار نہیں رہتا۔ لیکن کیا ایسا ہی خیال ہم اپنے عزیزوں رشتہ داروں یا اپنی ذات خاص پر رکھ سکتے ہیں؟ افسوس یہ اپنا اور پرایا ہی تو سکھ دکھ کا موجب ہے۔ اس پر ہی تو خیال کا انحصار ہے۔ ورنہ کال چکر تو ہمیشہ ایک سا چل رہا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے، آج روپیہ میرے پاس ہے کل دوسرے کے۔ سچ تو یہ ہے کہ خیالی دنیا کے سکھ دکھ محض خیال سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ اور کوئی طریقہ نہیں۔ دنیوی پدارتھوں میں سکھ بھوگنے والے ہمیشہ دُکھی رہتے ہیں، مثلاً:۔

(۱) حظِ جسمانی کی ہوس رکھنے والے انسان جو جائز یا ناجائز کا خیال نہیں رکھتے، دھرم ادھرم نہیں سوچتے شریعت اور طریقت پر غور نہیں کرتے۔ سکھ نہیں پاتے بلکہ اُلٹا دکھ سہتے ہیں جیسے چور۔ زانی۔ بدمعاش۔

(۲) آرام جسمانی کے طلبگار جو روپیہ پیسہ لڑکے بالے، عزت شہرت وغیرہ جائز طریقوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں کسی ایک کے مل جانے پر کچھ عرصہ کے لئے سکھی ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہزارہا دکھ کا شکار بنے رہتے ہیں۔ ہاں نمبر اول کے پنچ انسانوں سے کچھ اونچے ہوتے ہیں، کیونکہ اُن کو تھوڑا سا آتمک سکھ مل جاتا ہے۔

(۳) مایا پر قبضہ حاصل کر کے سکھ بھوگنے والے انسان گذشتہ دونوں قسم کے انسانوں سے بہتر ہیں کیونکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اُس سے اوروں کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اس سے وہ زیادہ سکھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آرام ابدی اُن کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔

(۴) تمام دنیوی سکھ محض خیال سمجھکر اپنے خیال کے ذریعہ ہر چیز میں سکھ محسوس کرنے والے انسان اُن سب سے بدرجہا بہتر اور افضل ہیں کیونکہ ان کے لئے دنیوی سکھ ہمیشہ موجود ہیں اور وہ اصلی سکھ کے نزدیک ہوتے جاتے ہیں؛ دنیوی چیزیں نہ اُن کو سکھ دے سکتی ہیں نہ دکھ۔ وہ سکھ دکھ کے خیال ہی سے مبرّا ہیں کیونکہ جس کو دن کی تمیز ہے اس کو رات کی بھی ہے، جو بہار سے خوش ہے اُسکو خزاں کا بھی ڈر ہے۔ ایسے ہی انسان پرم ہنس (परम हंस) کہلاتے ہیں۔ دوہا۔

من کے جیتے جیت ہے۔ من کے ہارے ہار
تلسی سکھ اور دکھ کا ۔ یہی جگت بیو ہار

لیکن وچار تو یہ ہے کہ انسان کا خیالوں پر اس قدر حاوی ہونا ممکن بھی ہے۔ ہاں ہے اور بلاشبہ ہے۔ کوشش شرط ہے، محنت کرنے سے سب کچھ مل جائیگا۔ آج ہی سے دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر غور کیجئے کامیابی نظر آنے لگے گی۔ ہمیشہ خیال رکھیئے کہ سکھ فرضی ہیں حقیقت میں کچھ نہیں۔ دکھ فرضی (کلپت) ہیں، اصلیت میں کچھ نہیں اور پھر سکھ دکھ کا خیال جاتا رہیگا۔ اگر انسان کسی سے محبت کم کرنا چاہے بلکہ نفرت پیدا کرنا چاہیئے تو اس کو لازم ہے کہ رات دن اُسکی بُرائی پر وچار کیا کرے۔ طبیعت کو خود بخود نفرت ہو جائیگی۔ ربڑی میں رات دن بُرائی کا خیال رکھیئے ربڑی سے نفرت ہو جائیگی۔ سوچنا چاہیئے کہ اگر چوری ہوگئی تو ہوگئی، فکر کس بات کا، چیز ٹوٹ گئی تو ٹوٹ گئی، روپیہ کا نقصان ہوگیا، ہوگیا۔ نوکری چھٹ گئی، عزیز مرگیا، رنج کیسا؟ زیور نہیں ہے نہیں سہی، خوبصورتی تندرستی عنقا ہے بلا سے۔ سر کے بال نہیں ہیں، غم نہیں۔ رات دن کام کرنا پڑتا ہے، کیا غم۔ کھانے کو روٹی نہ ملی نہ سہی۔ کوئی خبر گیراں نہیں ہے کیا پروا۔ ہم اِن باتوں میں دکھ مانکر اپنے سکھ کو کیوں کھو دیں۔ سکھ ہمارا حصہ ہے، دکھ نہیں تمام کام فرض سمجھکر ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔ دن رات کے لئے فکر مول لینا حماقت ہے۔ جو چیز چوری ہوگئی وہ ملنے سے رہی اور اگر ملی بھی تو پھر چوری ہو جانا ممکن ہے، پھر ایسی بات کے لئے فکر کیا؟ ٹوٹی ہوئی چیز کا جڑنا معلوم۔ روپیہ کا جاکر واپس آنا محال۔ مرا ہوا انسان زندہ ہونے سے رہا، خوبصورتی ہاتھ آتی نہیں۔ اڑکے بال پیدا نہیں کئے جاسکتے۔ پھر ان باتوں کے لئے رات دن کڑھنا، فکر کرنا سراسر دکھ مول لینا ہے تم ہمیشہ سکھ ہی کا خیال رکھو۔ دن رات کے تمام کاموں میں سکھ محسوس کرو اور بس سکھ حاصل ہے۔

اگر ابتدا میں یہ بات مشکل معلوم ہو تو یقین کرلو کہ پرماتما ہم کو پیار کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ وہ کرتا ہے ہمارے نفع کے لئے کرتا ہے جو پھل ہم کو مل رہا ہے۔ ہمارے کرموں کا بہترین معاوضہ ہے پرماتما



مہاتما گاندھی



ہز ایکسلینسی لارڈ ارون - وایسرائے ہند

نے اسی میں ہماری بہتری رکھی ہوگی۔ اور اسی طرح ہم خوش ہونا سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے سے نیچے درجے کے انسانوں کو دیکھ کر قانع اور شاکر بنو۔ اس طرح بھی سکھ حاصل ہوگا۔

ہمیں جَو کی روٹی میسّر ہے، بہتوں کو یہ بھی نہیں۔ ہم کو دردِ سر کی شکایت ہے، بہتیرے چارپائی سے لگ رہے ہیں، ہمارے لڑکے بالے نہیں ہیں، بہتیروں کے کوئی نہیں ہے، ہمارے پاس زیور کم ہے بہتیروں کے پاس بالکل نہیں ہے۔ ہم دن بھر کام کرتے ہیں، بہتیرے رات دن کام کرتے ہیں۔

کیا اس طرح کا خیال ہم کو سکھی نہیں بنا سکتا، ضرور بنا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے خیال پر قابو پانا سکھ حاصل کرنے کے لئے پہلی بات ہے۔

مذکورۂ بالا تحریر کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سکھ حاصل کرنے کے لئے ہمکو مفصلہ ذیل درجوں کو طے کرنا چاہیئے۔

(۱) اپنے خیالات کو سکھ سے بنا لینا یعنی دنیا کے ہر ایک کام میں سکھ کا خیال رکھنا

(۲) تمام کاموں کو فرض جاننا اور دھرم پالن کرتے ہوئے کئے جانا۔ نتیجہ پرماتما پر چھوڑ دینا یعنی ادائیگی فرض میں سکھ سمجھنا۔

(۳) دنیوی تعلقوں سے بے تعلق رہنا، آتما اور مایا کا گیان حاصل کرنا۔

(۴) خواہشوں کو کالعدم کر دینا۔

(۵) پرماتما کا سچا گیان حاصل کرنا۔

اور یہ پانچواں زینہ ہی سکھ کی معراج کا آخری زینہ ہے۔

مذکورہ بالا باتیں جو مہاتماؤں نے اپنے تجربے سے بتائی ہیں ہمارے لئے بمنزلہ شاہراہ ہیں اور اس لئے ہم کو لازم ہے کہ اپنے آپ کو اس لائق بنانے کے لئے اُن پر بلا چون وچرا، بغیر اعتراض عقیدتمندی سے عمل کرنا شروع کر دیں کیونکہ ہماری عقل اس لائق نہیں کہ ان میں نقص نکال سکے جس طرح ایک بچہ بلا اعتراض مولوی صاحب سے ابجد سیکھتا ہے اور پڑھکر خود بخود اُن باتوں کو سمجھ لیتا ہے جو ابتدا میں نہ سمجھ سکتا تھا وہی ہم کو لازم ہے۔ دلیل کرنے سے سوائے ذلیل ہونے کے کچھ نتیجہ نہ ہوگا۔

لندن کانفرنس اور مسئلہ سوراج

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب جرنلسٹ لاہور)

جیسا کہ ناظرین واقف ہیں ہندوستان میں کس قسم کی حکومت خود اختیاری قائم کی جائے اس کے متعلق غور کرنے کے لئے ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں سینٹ جیمز محل میں ہندوستانی و برطانوی مدبروں کی ایک اہم کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں برطانوی ہند کے ستاون دیسی ریاستوں کے سولہ اور اہل برطانیہ کے تیرہ مقتدر وکلا شامل ہوئے۔ یوں تو لندن میں آئے سال بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوتی چلی آتی ہیں مگر گول میز کانفرنس سب سے بے نظیر اور تاریخ ہند و برطانیہ میں اپنی قسم کی پہلی تھی۔ چنانچہ قیصر معظم نے بنفس نفیس اس کا افتتاح فرما کر اس کی شان و اہمیت کو مستحکم کر دیا۔ عملی کارروائی ۱۷۔ نومبر سے شروع ہو کر ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک رہی۔ برطانوی وکلا میں لیبر گورنمنٹ کے وزیر اعظم معہ پانچ دیگر وزراء کو تھے۔ جو مختلف مسائل حکومت کے بحث و مباحثہ میں راہنمائی کرتے رہے۔ مسٹر میکڈانلڈ کانفرنس کے صدر اعظم اور لارڈ سنکے (لارڈ چانسلر برطانیہ) نائب صدر منتخب ہوئے۔

ترکیبی نظام حکومت کا متفقہ مطالبہ

ہندوستان کے وکلا نے اپنے ایک جلسہ میں باہمدگر گفتگو سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ملک ہند کی طرف سے سیلف گورنمنٹ کا متفقہ مطالبہ کیا جائے جس میں راجگان ہند بھی برابر کے حصہ دار بنکر شامل ہو سکیں۔ اس مسئلہ کی وکالت سر تیج بہادر سپرو کے سپرد ہوئی۔ موصوف نے فصاحت و بلاغت اور منطقیانہ استدلال سے جو ابتدائی تقریر فرمائی اس کا سامعین کے دلوں پر نہایت گہرا اثر ہوا اور انگریز مدبران سلطنت کو بھی خراج تحسین و آفرین دینا پڑا۔ بعد میں راجگان ہند اور دیگر وکلائے ہند نے اپنی اپنی تقریروں میں سر تیج بہادر موصوف کی تائید کی۔ آخر کار یہ سوال طے پایا کہ ہندوستان کے واسطے ترکیبی نظام حکومت (Federation) ہی موزوں ہوگا۔ چنانچہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے واسطے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں سب سے بڑی اور ضروری کمیٹی مسائل حکومت ترکیبی Federal Relation Committee

پر غور کرنے کو مامور ہوئی۔ جس کے صدر برطانیہ کے ممتاز مقنن لارڈ سنکے تھے۔ آپ نے تمام مسائل زیر بحث کو بارہ عنوانوں میں منقسم کر کے غور و فکر کے لئے پیش کیا۔ بعد میں مختلف مسائل کی چھان بین مختلف کمیٹیوں کے سپرد ہوئی۔ کل نو کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔ مثلاً صوبہ برہما کی علیحدگی۔ صوبہ سرحدی کی ترکیب حکومت۔ صوبہ سندھ کی علیحدگی۔ ڈیفنس کمیٹی (معاملات محافظت ملک) قلیل التعداد جماعتوں کے جداگانہ فوائد کی نگہداشت۔ ملازمین سرکاری کی کمیٹی (سول سروس اور دیگر محکموں کے ملازمان اعلیٰ کے سوالات وغیرہ وغیرہ۔ جنھوں نے ہر ضروری مسئلہ کے نشیب و فراز پر بڑی ہوشیاری اور معاملہ فہمی سے غور کر کے اپنا فیصلہ ریزولیوشن کی صورت میں مرتب کیا، جسے صدر کمیٹی نے صدر اعظم بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مثلاً برہما کمیٹی نے تمام امور پر غور کر کے یہ طے کیا کہ صوبہ برہما کا ملک ہند سے علیحدہ ہونا مصلحت ہے۔ دوسری کمیٹی نے صوبہ سندھ کی علیحدگی کے حق میں فیصلہ دیا بشرطیکہ وہ مصارف حکومت کا زیربار ہو سکے، چنانچہ ماہروں کی ایک کمیٹی اس مسئلہ کے مالی پہلو پر غور کرے گی اگر اس نے فیصلہ موافق دیا تو سندھ کا صوبہ بمبئی سے علیحدہ مرتب ہوگا۔ تیسری کمیٹی نے یہ رائے دی کہ صوبہ سرحدی میں چیف کمشنر کے بجائے گورنر مامور ہو اور اس کا نظام حکومت دیگر آئینی صوبوں کے مانند ہو۔ ڈیفنس کمیٹی جس کے صدر لیبر گورنمنٹ کے رکن مسٹر ٹامس (وزیر داخلہ برطانیہ) تھے خاص اہمیت رکھتی ہے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ سپاہ ہند میں ہندوستانی افسروں کی بھرتی کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کا جنگی کالج قائم کیا جائے۔ اس کمیٹی نے زور دیا ہے کہ یہ کالج ہندوستان میں بلا مزید تاخیر قائم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اس وقت جو طلبا برطانیہ کے مختلف جنگی کالجوں میں تعلیم و تربیت پانے کو جاتے ہیں وہ بدستور سابق جاتے رہیں گے۔ دوران بحث میں صدر کمیٹی نے جو اندازہ پیش کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ۳۵ سال کے اندر افواج ہند میں ایک انگریز افسر بھی باقی نہ رہے گا بلکہ تمام فوج ہندوستانیوں کے ماتحت ہو جائیگی۔

اقلیتوں کا مسئلہ باقی تمام کمیٹیوں نے بھی اپنے فرائض باحسن وجوہ انجام دیکر سرخروئی حاصل کی البتہ چھوٹی جماعتوں کے حقوق و فوائد کی محافظت پر غور کرنے والی کمیٹی اپنے غرض کو کامیابی کے ساتھ انجام نہ دے سکی جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جو وطیرہ اس موقع پر اختیار کیا تھا اس سے اس پیچیدہ مسئلہ کے سلجھاؤ میں سب سے بڑی مشکل پیش آئی۔ جب گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا تو دردمندان ملک کو یہ فکر دامنگیر ہوگئی کہ ہندو مسلمانوں اور دیگر قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کا اہم مسئلہ حل ہو جائے۔ چنانچہ پچھلے سال کئی مرتبہ سرائے۔ بپٹرو کی صدارت میں

مشورہ ہوا جس میں سربرآوردہ مسلم لیڈر ہندو عیسائی اور نیچ ذاتوں کے نمایندے شریک ہوئے، قیل وقال تو بہت ہوئی مگر کمیٹی کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکی۔ پھر لندن میں جاکر ہندو مسلم وکلا نے بطور خود باہم گفتگو شروع کی، مگر مسلم لیڈران برابر مسٹر جناح کے مجوزہ چودہ مطالبات پر زور دیتے رہے وزیر اعظم بہادر نے اپنے ہاں ہندو مسلم اور دیگر لیڈروں کو دعوت دی اور اپنے سامنے سب کے بیانات سنے، مگر اس کا انجام بھی وہی ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ نہ نکلا۔ بعد میں موصوف کی صدارت میں مائنرٹی کمیٹی (Minoritees Committee) کا باقاعدہ جلسہ ہونا شروع ہوا لیکن وہ کوئی تسلی بخش سمجھوتہ مرتب نہ کر سکی۔ پنجاب و بنگال کے متعلق فیصلہ نہ ہوسکنے سے کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا پنجاب کے متعلق قائم مقامان کی تعداد میں صرف ایک کا فرق باقی رہ گیا تھا مگر اسی ذرا سے فرق کی وجہ سے کوئی متفقہ تجویز طے نہ ہوسکی۔ ماہ جنوری کے شروع میں بنگال، بہار، یو۔پی، اور پنجاب کے وطن پرست مسلمانوں نے وزیر اعظم بہادر اور سر تیج بہادر سپرو اور سر آغا خاں (لیڈر مسلم وکلا) کو اس مضمون کے تار دیئے کہ مسلمان جداگانہ نیابت کے جس کا مطالبہ لندن کانفرنس کے مسلم وکلا اپنی ساری قوم کی طرف سے پیش کر رہے تھے سخت مخالف ہیں۔ اس وجہ سے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ملک کے واسطے سودمند ثابت نہ ہونگے۔ اگر ماہ دسمبر میں جب ہندو اور مسلمان وکلا بطور خود اس امر پر بحث کر رہے تھے وطن پرست مسلمانان ہند جن میں مہاراجہ صاحب محمود آباد، سر علی امام، مسٹر حسن امام، ڈاکٹر انصاری، ملک برکت علی، سردار حبیب اللہ خاں وغیرہم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اعلان کر دیتے تو سر محمد شفیع اور اُن کے ہم خیال دوستوں کو اپنی قوم کے نام سے جداگانہ نیابت کے مطالبہ کا حوصلہ نہ پڑتا۔ مسٹر جناح کے چودہ مطالبات کا ماحصل یہ ہے کہ وسطی اہمیت (اسمبلی اور کونسل عالیہ) میں ایک تہائی مسلم نمایندے ہوں، اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو تہائی حصہ ملنا چاہیئے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت غالب ہے اس وجہ سے وہاں پر وہ سب سے فائق رہیں لیکن جہاں اقلیت ہے وہاں اُن کو تناسب آبادی سے بہت زیادہ حصہ دیا جائے صوبہ سندھ کو بمبئی سے الگ کرکے وہاں پر پنجاب جیسی حکومت رائج ہو۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں اصلاحات رائج کرکے گورنری صوبہ بنایا جائے۔ اس مطالبہ کے پس پشت یہ خیال نظر آتا ہے کہ پنجاب سندھ، اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آبادی کا غلبہ ہے اس وجہ سے بنگال سمیت چار صوبے مسلمانوں کے زیر اقتدار ہیں جیسے کہ باقی صوبوں (یو۔پی، بہار، آسام، ممالک متوسط، مدراس بمبئی) میں ہندوؤں کا غلبہ ہے۔ سر محمد اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے "مسلم سلطنت" کے قیام کا نصب العین پیش کیا ہے

جس سے مراد پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد کا ایک متحدہ رقبہ ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں اسلام کے نام لیوا افغانستان اور ایران واقع ہیں۔ غالباً سر محمد اقبال کا یہ خیال ہے کہ زمانۂ آئندہ میں جنوب وسط ایشیا میں ایک نہایت زبردست اسلامی سلطنت قائم ہو جائیگی ہندو یہ کہتے ہیں کہ "چت بھی ہماری اور پٹ بھی ہماری" کا اصول معقول نہیں ہے بلکہ ایک اصول کو تسلیم کرنا چاہیئے اگر "ہندو صوبوں" میں مسلمانوں کو تناسب تعداد سے زیادہ نیابت دیجائے تو "مسلم صوبوں" میں ہندوؤں کو اسی طرح نیابتی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ اس سے معقول اور کیا بات ہوسکتی ہے؟ مگر مسلم وکلا اسے تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہندو مستقبل کا لحاظ کرکے مخلوط حلقہ ہائے نیابت پر زور دیتے ہیں لیکن مسلم وکلا کو جداگانہ نیابت ہی پر اصرار ہے۔ ہندو لیڈروں نے کہا معاہدۂ لکھنؤ (۱۹۱۶ء) کے مطابق سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ جو مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں اور حامیوں کی باہمی رضامندی سے طے پایا تھا۔ مگر مسلم وکلائے نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا۔ بغرض انھیں وجوہ سے یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ وزیر اعظم بہادر اور دیگر مدبران برطانیہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہندو مسلمانوں کو باہمدگر رضامندی سے اپنے اختلافات رفع کرلینے چاہئیں۔ بعض لیڈروں نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اگر برطانیہ اپنے ارادے کا واضح اعلان کردے تو ہندو مسلم اختلاف آپ سے آپ مٹ جائے گا۔

یورپ کی اقلیتوں کا مسئلہ کس طرح حل ہوا؟

یہ امر غور طلب ہے کہ چھوٹی جماعتیں ہر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ یورپ میں ایسے ملک کئی ہیں جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے کے عیسائی رہتے ہیں یا نسلی اختلاف کے سبب سے بعض خاص گروہ پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کے حقوق کا مسئلہ کس طرح طے ہوا؟ اس کے جواب میں جمعیت بین الاقوام (Leage of Nations) کے دستور العمل کی تقلید بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ چند سال ہوئے کہ اس شاندار امن پسند جمعیت نے اقلیتوں کے مسئلہ کو سلجھانے کا پختہ ارادہ کرکے مختلف حکومتوں سے استصواب کیا۔ جب سب کی رایوں اور خیالات سے لیگ مطلع ہوگئی تو اس نے چند اساسی اصول منضبط کردیئے۔ جن کا لب لباب یہ ہے:

(۱) وہی جماعت جداگانہ حقوق اور ان کی محافظت کی مستحق ہے جس کی مردم شماری کل آبادی ملک کا پچیس فی صدی ہو۔

(۲) وہی قلیل گروہ خاص حقوق کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے جس کا اپنا لٹریچر، زبان اور مذہب اور تمدن مخصوص جداگانہ اہمیت رکھتا ہو۔

لندن میں جب ہندو مسلم مسئلہ پر حیص بیص ہو رہی تھی تو ایک مرتبہ مہاراجہ صاحب بیکانیر اور نواب صاحب بھوپال کو ثالث بنانے کی اور دوسری مرتبہ اس کل مسئلہ کو جمعیت الاقوام کے سپرد کرنے کی تجویز پیش ہوئی، ہندوؤں نے وزراء کو بھی ثالث بنا دینا چاہا مگر مسلمانوں نے ان باتوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کیا۔ آخر کار مائنر ٹی کمیٹی نے مجبوراً صرف یہ رائے ظاہر کرنے پر اکتفا کی کہ آئین حکومت میں اقلیتوں کے جداگانہ حقوق کی حفاظت جس طرح ممکن ہو کی جائے۔ یہاں پر اس امر کا ذکر غیر موزوں نہ ہوگا کہ ہندوستان کے عیسائی قومی جذبہ سے سراسر بیگانہ سمجھے جاتے ہیں۔ باعتبار مردم شماری تیسرے درجہ پر ہیں، انھوں نے اپنے جداگانہ حقوق کا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے بلکہ فلاح ملک اور بہبودی قوم کو سب سے مقدم سمجھا اور قریب قریب ہر امر میں ہندوؤں کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانا اس بات سے چشم پوشی محال ہے کہ ہندوستانی عیسائی بلحاظ تعلیم، شائستگی اور اسلوب معاشیات مٹھی بھر پارسیوں کو چھوڑ کر ملک ہند کی تمام جماعتوں پر فائق ہیں۔ سوشیل خرابیاں اور مذموم مراسم جتنے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پائے جاتے ہیں ان سے عیسائی بھائی محض ناآشنا ہیں۔

کانفرنس کی قرارداد ۱۳ جنوری تک تمام کمیٹیوں کی جداگانہ رپورٹیں وزیر اعظم بہادر کے یہاں پہونچ گئیں۔ اس کے بعد کانفرنس کا پورا اجلاس ہوا جس میں جملہ وکلا شامل ہوئے۔ سب رپورٹیں پیش ہوئیں چنانچہ ایک ریزولیوشن کی رو سے تمام رپورٹوں کے اصول اساسی واجب التسلیم قرار پائے۔ گو فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ سب سے ضروری تھی اس وجہ سے اس کی اہم قراردادوں پر متعدد وکلا نے اظہار رائے کیا، نمایندگان برطانیہ، راجگان اور وکلائے ہند نے معرکہ کی تقریریں کیں۔ دو تین روز کے مباحثوں کے بعد کانفرنس ختم ہوگئی، اور صدر اعظم بہادر نے ایک گھنٹے تک تقریر کی جس کے آخر میں موصوف نے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ حکومت ہند کا آئین کانفرنس کی قراردادوں کے مطابق مرتب ہوگا اور وزرائے برطانیہ ان کی قراردادوں کی دل وجان سے حمایت کریں گے۔ مسٹر میکڈانلڈ کے اعلان کے علاوہ ۲۶ جنوری کو پارلیمنٹ میں بھی کانفرنس کی کارروائیوں پر مباحثہ ہوا۔ صاحب وزیر اعظم نے ہندوستان میں ۱۸۶۱ء کے قانون کونسل ہائے ہند کے نفاذ اور اس کی رو سے نیابتی طریقہ حکومت کی بنیاد پڑنے کا ذکر کر کے مابعد کے قوانین اور اعلانات کی اجمالی کیفیت بیان کی اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات اور ۱۹۱۷ء کے تاریخی اعلان اور ۱۹۱۹ء کے جدید قانون اصلاحات ہند کے مقاصد پر مختصر بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ موجودہ کارروائی اور آنے والے زمانہ کی اصلاح حکومت اس ارتقا کا لازمی نتیجہ ہے۔ پھر کانفرنس کے خاتمہ پر جو اعلان آپ

کیا تھا اس کا اعادہ کرکے اہم امور کی توضیح کی اور اخیر میں فرمایا "ہم ہندوستان کی ساری آبادی کو دبا نہیں سکتے ہیں۔ اگر آپ بزور تلوار افراد ملک کو دبانے کے علاوہ ان کے جذبۂ قومیت وحریت کو بھی زیر کرنے کی ہمت رکھتے ہیں تو آپ گول میز کانفرنس کو ٹھکرا دیجئے۔ اگر آپ اپنے حسن تدبر اور ملک داری کی صلاحیت کا دیوالہ نکالکر دنیا کے سامنے اپنی ذلت و رسوائی کے خواہاں ہیں تو ہماری تجاویز کو مسترد کر دیجئے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف ملک ہند کا اعتبار اور دوستی حاصل کرکے اسے جمعیت اقوام برطانیہ کا خوش حال رکن دیکھنے کے متمنی ہیں اور اگر اس کے ساتھ ہی اہل ہند کی شکرگزاری اور تحسین حاصل کرنے کے آرزومند ہیں تو کانفرنس کی قراردادوں پر صاد کرکے وزرا کو آگے بڑھنے کی اجازت دیجئے۔"

پارلیمنٹ کا اتفاق رائے اس کے بعد کنسرویٹو پارٹی کے لیڈروں نے تقریریں کیں فقط مسٹر چرچل نے مخالفت کی جو پچھلے سال سے انگریز مخالفان ہند کے سرگروہ وکیل ہیں۔ مگر مسٹر بالڈون سابق وزیر اعظم برطانیہ نے جو کنسرویٹو پارٹی کے مسلمہ لیڈر اور آئندہ بھی جب کبھی یہ پارٹی برسر حکومت ہوگی تو برطانیہ کے وزیر اعظم ہونگے مسٹر چرچل کے خیالات کی تردید کرکے اپنی پارٹی کی طرف سے یہ بیان کیا: "اگر میں دوبارہ برسر اقتدار ہوا تو میں اپنی ساری قوت برطانیہ کے عہد اور اعلان کی رو سے کانفرنس کی تجاویز کو عملی صورت دینے میں صرف کرونگا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو چار مہینے بعد موجودہ وزارت شکست ہوکر پارلیمنٹ کا انتخاب عام بھی ہوا اور اس میں لیبر پارٹی ہار بھی جائے تو کنسرویٹو پارٹی گول میز کانفرنس کی قراردادوں کے مطابق ہندوستان میں حکومت خود اختیاری قائم کرانے کے متعلق ضروری قانون منظور کرائیگی۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ ترقی کا مخالف گروہ بھی اب ہمارے مطالبات کا حامی ہوگیا ہے۔ غرض اب جلد ہی حکومت ہند کی ذمہ داری کا بہت بڑا اور ضروری حصہ اہل ہند کے سپرد ہونیوالا ہے جس کی وجہ سے کچھ عرصہ میں ملک میں غیر ملکی اقتدار اور مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ وزیر ہند مسٹر ویجووڈ بن نے مسٹر چرچل کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ آپ نے فرمایا کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری نہ دینے سے برطانیہ پر عہد شکنی کا الزام عاید ہوتا ہے۔ جمہور کی خوشنودی اور حمایت کے بغیر کوئی حکومت نہیں چل سکتی۔ آپ نے فرمایا کہ گول میز کانفرنس کا شاندار کارنامہ اعتماد باہمی کی تجدید ہے۔ اسکی مساعی حسنہ سے اہل ہند اور برطانیہ کے درمیان باہمی وثوق اور باہمی اعتماد ازسرنو مستحکم ہو جائیگا۔ آپ نے صاف کہدیا ہے کہ جمہور کی اعانت کے بغیر کوئی حکومت نہیں چل سکتی اور اب اس اصول کو

تمام گروہوں نے قبول کر لیا ہے۔" وزیر ہند بہادر نے اپنی تقریر کا بہت بڑا حصہ مسٹر چرچل کی تردید کی نذر کیا ہے اور آن کے ہر اعتراض کا خوب دندان شکن جواب دیا ہے باقی جتنے ممبروں نے تقریریں کیں سب نے گول میز کانفرنس کی قراردادوں کو واجب تسلیم کیا۔ غرض اس مباحثہ سے برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کو سوراج عطا کرنے کی آمادگی ظاہر کر دی ہے

مجوزہ آئین حکومت گول میز کانفرنس کا مقصد آئین مرتب کرنا نہ تھا، جیسا کہ وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں فرمایا بلکہ اساسی اصول وضع کرنا تھا جو آئین حکومت کے ارکان مسلمہ ہونگے۔ چنانچہ سب سے بڑا اصول یہ مرتب ہوا ہے کہ نظام حکومت ترکیبی (Federal System) ہو جس میں انگریزی علاقہ کے تمام صوبجات و نیز دیسی ریاستیں شریک ہونگی۔ حکومت مرکزی پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگی۔ جس کے دو حصے ہونگے جیسے آجکل ہیں اور جو تمام ہندوستان کے واسطے قوانین مرتب کرے گی۔ اور انتظامی امور کے لئے قائم مقامان رعایا میں سے آٹھ نو وزرا مقرر ہونگے۔ حکومت کے اجزائے ترکیبی (صوبجات اور ریاستین) اپنے اندرونی انتظام میں خود مختار ہونگی۔ ان کے فرائض و اختیارات حکومت کے متعلق باضابطہ تفریق ہوگی۔ صوبجاتی حکومتیں پورے طور پر خود مختار ہونگی۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ فوجی اور تعلقات خارجی کے علاوہ اور تمام صیغہ جات حکومت اہل ہند کے سپرد ہونگے۔ مالیات کا صیغہ پیچیدہ ہے مگر بعض عارضی قیود کے ساتھ یہ بھی ہمارے ہاتھ میں رہے گا۔ فوجی مصارف کے لئے ایک خاص رقم مقرر ہو جائیگی۔ اسی طرح صیغہ خارجہ کا خرچ بھی رہیگا اور ان صیغوں کا اہتمام وائسرائے کے ہاتھ میں ہوگا اور اس میں بھی وزرا کا مشورہ لیا جایا کرے گا۔ اس وجہ سے مالی امور میں چند اہم اختیارات عارضی طور پر گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہیں گے۔ گورنر جنرل کو خاص خاص موقعوں کے واسطے خاص اختیارات بھی دیئے جائینگے مگر ایسے اختیارات ہر جمہوری حکومت میں بھی بادشاہ اور گورنر جنرل کو (جیسے کینیڈا جنوبی افریقہ وغیرہ) حاصل ہیں جن سے وہ حسب ضرورت کام لے سکتے ہیں۔ بہر نوع گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی آئندہ حکومت خود اختیاری کا یہ خاکہ تیار کیا ہے مگر ابھی بہت سے کام باقی ہیں جنھیں انجام دینے کے واسطے ایک خاص کمیٹی برطانیہ اور ہندوستان کے قائم مقاموں کی مقرر ہوگی جو تمام تفاصیل پر غور کر کے مسودہ اصلاحات حکومت کا مواد بہم پہنچائے گی۔ نمونہ کے طور پر لیجئے، فیڈرل گورنمنٹ کے اختیارات کیسے ہونگے؟ اور اسے کن مسائل پر اقتدار ہوگا؟ صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات اور فرائض کیا ہونگے؟ وسطی اور صوبجاتی کونسلوں میں کتنے اراکین ہونگے۔ فیڈرل پارلیمنٹ کے کتنے رکن ریاستوں کے قائم مقام ہونگے۔ حق رائے دہندگی کی کیا شرائط ہونگی۔ مالی ذمہ داریوں کا کس طرح سمجھوتہ ہوگا؟ اس کے تصفیہ کے واسطے ایک کمیٹی ہوگی۔ بلکہ

رنی کا کس قدر حصہ فوج اور محکمہ خارجہ کے لئے مخصوص ہوگا۔ غیر ملکوں کے ساتھ لین دین، گذشتہ جات کی ادائیگی کی کیا شکل ہوگی۔ آئندہ چند مہینوں میں ہر فرقہ کے ہندوستانی اور انگریز قائم مقام ملکران تمام مسائل کا فیصلہ کریں گے اور اس کے بعد نیا قانون مرتب ہوگا۔
گول میز کانفرنس سے طرح طرح کی بدگمانیاں منسوب کی گئی تھیں مگر حالات سے وہ سب ثابت ہوئیں اور حکومت خوداختیاری کا بنیادی اصول مسلّمہ ہونے کے ساتھ آئندہ کے واسطے عمدہ اور حوصلہ افزا صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اب اہل ملک کو دوراندیشی اور یک جہتی کا لحاظ رصلح وآشتی سے تمام پیچیدہ مسائل حل کرنے چاہئیں۔

اقوال بدھ

مہاتما بدھ کا قول ہے کہ جملہ انسانی افعال ان تین باتوں کے سبب بُرے ہوجاتے ہیں، اور اُن سے بری ہونے پر بھلے شمار کئے جاتے ہیں۔ پس ان کی نصیحت ہے کہ:۔

(۱) قتل نہ کرو بلکہ زندگی کا پاس و لحاظ رکھو۔

(۲) چوری اور ڈاکے کے مرتکب نہ ہو بلکہ ہر شخص کو اس کی محنت کے ثمرہ کا مالک ہونے دو۔

(۳) نجاست سے مجتنب رہکر پاکیزہ زندگی بسر کرو۔

(۴) جھوٹ نہ بولو، سچے بنو، احتیاط بلکہ خوبی اور دلی محبت سے سچ بولو۔

(۵) بُری خبریں اختراع نہ کرو۔ اور نہ اُنھیں دوبارہ زبان سے ادا کرو، اپنے ہمجنسوں کی نیکیوں پر نگاہ رکھو تاکہ خلوص کے ساتھ دشمنوں سے اُن کی حفاظت کرسکو۔

(۶) قسم نہ کھاؤ بلکہ شیریں زبانی اور سنجیدگی سے بات کرو۔

(۷) بکواس میں وقت ضائع نہ کرو، مطلب کی بات کہو یا چپ رہو۔

(۸) طمع اور حسد سے باز رہو اور دوسروں کی ترقی پر خوشی مناؤ۔

(۹) اپنے دل کو اپنے دشمنوں تک کی جانب سے نفرت وکینہ سے صاف رکھو، ہر جاندار کو محبت و شفقت کے ساتھ سینہ سے لگاؤ۔

(۱۰) جہالت سے اپنے دماغ کو صاف رکھو، حق کی تلاش میں بیقرار رہو۔ خصوصاً ضروری امور کے متعلق تاکہ تمہیں شک نہ ہو۔ شک تمکو بے پرواہ بنادیگا اور سہو گمراہ کردیگا جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اُس شاہراہ کو نہ پاسکوگے جسکی منزل "نروان" (نجات) ہے۔

یادِ رفتگاں

پنڈت موتی لال نہرو مرحوم

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

افسوس کہ ایک عرصہ کی علالت کے بعد پنڈت موتی لال نہرو صاحب ۶۔ فروری ۳۱ء کو ۶½ بجے صبح ستر سال کی عمر میں بمقام لکھنؤ اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے رحلت فرما گئے ہندوستانیوں کی عام اوسط عمر کو دیکھتے ہوئے پنڈت جی نے اچھی عمر پائی، مگر اُن کی زندگی کی باقاعدگی، اُن کی اولوالعزمی اور عملی سرگرمی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ خیال کرنا مشکل تھا کہ اُن کا پیمانۂ حیات اس قدر جلد لبریز ہو جائے گا۔ جون ۱۹۳۰ء میں جب اُنھیں دوبارہ جیل جانا پڑا تو خدا معلوم کیسی منحوس گھڑی تھی کہ قید میں اُن کی صحت ایسی بگڑ گئی کہ پھر نہ سُدھری۔ علالت کا آغاز جیل ہی میں ہوا اور اگرچہ گورنمنٹ نے اونھیں میعاد مقررہ سے پہلے ہی رہا کر دیا مگر اس پیرانہ سالی میں قید کی سختیاں پنڈت جی کے لئے بالآخر مہلک ثابت ہوئیں۔

پنڈت جی ماہ مئی ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد دہلی کے کوتوال تھے مگر پنڈت موتی لال اپنے پدر بزرگوار کی وفات کے بعد تین چار ماہ بعد یتیم ہی پیدا ہوئے۔ بہرحال بارہ سال کی عمر تک آپ مکتب ہی میں عربی و فارسی پڑھتے رہے۔ اس کے بعد دہلی سے کانپور آ کر گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں داخل ہوئے جہاں آپ نے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پڑھنا شروع کیا مگر گریجویٹ ہونے کے قبل ہی وہ کالج کو چھوڑ کر امتحان وکالت کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر اونھوں نے ۱۸۸۳ء میں کانپور ہی میں وکالت شروع کی۔ تین سال کے بعد وہ الہ آباد چلے گئے اور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ سرسوتی[1] اور لکشمی[2] میں بَیر ہے، مگر پنڈت جی کے سر پر اِن دونوں نے اپنا دستِ شفقت رکھا۔ ایک نے اُن کے نطق میں تاثیر دی اور دوسری نے اُن کے سامنے چاندی سونے کے ڈھیر لگا دیئے۔ پنڈت جی کی زندگی عدالت عالیہ کے

[1] علم کی دیوی [2] دولت کی دیوی

ایک کامیاب ترین وکیل کی شاہانہ زندگی تھی۔ وہ دولتمند بھی تھے اور عیش پسند بھی اور اُس وقت اُن کے ذاتی آرام و آسایش کے سامان دیکھکر کسی کو اس امر کا گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ وہ مستقبل میں ملک و قوم کے ایسے زبردست وکیل ثابت ہونگے جن کے کارنامے ملکی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کو وہ روشنی بخشیں گے جو پڑھنے والوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دے گی۔ پنڈت موتی لال صاحب بھی ابتدائی زندگی میں دیگر لیڈران ملک کی طرح ایک اعتدال پسند مدبر تھے۔ چنانچہ جو خطبہ اونھوں نے ۱۹۰۷ء کو الہ آباد میں بحیثیت صدر پراونشیل کانفرنس صوبۂ متحدہ ارشاد فرمایا تھا اُس میں وہی خیالات ہیں جو ابتک ماڈریٹ پارٹی کا طرۂ امتیاز بنے ہوئے ہیں۔ صوبۂ متحدہ میں لبرل پارٹی کا مستند و اہم اخبار "لیڈر" نیوز پیپرس لمیٹیڈ کی ملکیت ہے۔ اس کمپنی کے اولین چیرمین ہونے کا شرف بھی مرحوم ہی کو حاصل تھا۔ مگر حکومت ہند کی سرد مہریوں نے کتنے ہی ماڈریٹوں کو اکسٹرمیسٹ بنا دیا ہے۔ پنڈت جی بھی رفتہ رفتہ انھیں احساسات سے متاثر ہوتے گئے، اور ۱۹۱۷ء میں تحریک ہوم رول کے اجرا اور مسز بسینٹ کی اسیری پر یہاں تک نوبت پہونچی کہ اب تک گورنمنٹ پر جو دلی اعتقاد پنڈت صاحب کو تھا وہ ہمیشہ کے لئے متزلزل ہو گیا۔ چنانچہ اُسی سال جب لکھنؤ میں پراونشیل کانفرنس کا اجلاس ہوا اور پنڈت جی پھر اس کے صدر ہوئے تو آپ نے اپنی تقریر میں نئے نقطۂ خیال کا بخوبی اظہار کر دیا

مگر آپ کے دل میں ایک تڑپا دینے والی لگن پیدا کرنے کے لئے ابھی زیادہ گہری ٹھیس کی ضرورت تھی جو ۱۹۱۹ء میں رولٹ قوانین اور مظالم پنجاب کی متحدہ شکل میں رونما ہوئی۔ اس ٹھیس نے پنڈت جی کے دل میں ایک نہ مٹنے والی تڑپ پیدا کر دی جس نے اُن کو مرتے دم تک چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اسی نے اُن کو اپنی بقیہ زندگی، اپنا وسیع رسوخ اور اپنی ساری دولت وقف کر دینے پر مجبور کیا۔ اسی درد دل نے اُن کے نام کو امر اور اُن کی ذات کو زندہ جاوید بنا دیا۔

۱۹۱۹ء کے بعد ہی سے عملی حیثیت سے پنڈت جی کی ملکی خدمات کا شاندار دور شروع ہوا اور جدوجہد پنجاب کی کارگزاریوں کے اعتراف میں قوم نے اون کو ۱۹۱۹ء کی امرتسر کانگریس کا پریسیڈنٹ منتخب کیا۔ اس موقع پر مرحوم نے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کو ناکافی بتلاتے ہوئے بھی اُن کی تائید ہی کی۔ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ مہاتما جی کی زبردست روحانیت اور ملکی حالات سے متاثر ہو کر پنڈت جی بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اُنھوں نے وکالت بھی ترک کر دی اور آرام و آسایش کی زندگی کو بھی خیر باد کہا۔ ۱۹۲۱ء میں

گورنمنٹ نے کانگریس کا والنٹیر ہونا جرم قرار دیا اور ۶۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو پنڈت جی بھی اس جرم کے مرتکب ہوکر گرفتار اور سزایاب ہوئے۔ دمہ کا مرض آپ کو عرصہ سے لاحق تھا اور اس کے سبب سے انھیں دس سال پہلے بھی جیل میں بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر اس وقت صوبہ کی گورنمنٹ نے پنڈت جی کے لئے جیل خانہ میں خاص انتظامات کردیئے تھے۔

۱۹۲۲ء میں مہاتما جی کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد کانگریس کی جانب سے ملک میں ستیاگرہ کے آغاز کرنے کی مصلحت پر غور کرنے کے واسطے ایک کمیٹی کا تقرر ہوا جس کے ایک ممبر پنڈت صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ممبران نے مختلف مقامات کا دورہ کرکے نومبر ۱۹۲۲ء میں رپورٹ شائع کی جس میں ستیاگرہ کے سوال کو برطرف کرکے کونسلوں میں جانا مناسب بتلایا گیا۔ اسی سال گیا کانگریس میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کونسل کے موافق اور دوسری خلاف تھی۔ پنڈت جی اول الذکر یعنی سوراج پارٹی کے لیڈر تھے۔ چنانچہ آپ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوکر کام کرنے لگے۔ اور جب ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس نے بھی اس پارٹی کو تسلیم کرلیا تو پنڈت جی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر ہوگئے۔

دراصل ایک قابل ترین ہائی کورٹ ایڈوکیٹ کی حیثیت سے اُن کی نگاہ میں مجلس واضع قوانین کی ایک خاص اہمیت تھی جو بالآخر ۱۹۲۹ء میں آپ کے دل سے محو ہوئی۔ بہرحال اسمبلی میں آپ کی تقاریر بڑی معرکۃ الآرا ہوتی تھیں اور اُن سے اُن کی اولوالعزمی، قانونی قابلیت، حب الوطنی اور غیر معمولی اخلاقی جرأت کا برابر اظہار ہوا کرتا تھا۔ اُن کی تقاریر کا موضوع ہی حکومت خود اختیاری کا حصول تھا۔ قوی اور ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ساتھ اُن میں جذبات کی بھی وہ فراوانی ہوتی تھی جو دماغ کو منور کرنے کے علاوہ دل کو بھی متاثر و متحرک کئے بغیر نہ رہتی تھی۔

اگرچہ ۱۹۲۲ء کے بعد تحریک ترک موالات افسردہ ہوگئی تھی مگر سوراج کی چاہ تو لوگوں کے دلوں میں روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی جس کا اظہار ایک مستقل ارادہ کی صورت میں ۱۹۲۸ء کی کلکتہ کانگریس میں ہوا جو پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ جہاں یہ طے پایا کہ اگر حکومت کی جانب سے ایک سال کے اندر ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ نہ عطا ہو تو کامل آزادی کی کوشش شروع کردی جائے۔ پنڈت جی نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ "اگرچہ میں کامل آزادی کے حق میں ہوں مگر مکمل درجۂ نوآبادیات کے خلاف نہیں ہوں۔ بشرطیکہ وہ مجھکو اس کے قبل مل جائے کہ اس کی ساری دلکشی ہی جاتی رہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ جب کامل آزادی کی تحریک پھیلے گی اس وقت حکومت سمجھوتہ کے لئے تیار ہوگی۔" یہ پیشین گوئی اُن کے تجربہ اور تدبر، دانائی اور



پنڈت موتی لال نہرو

پیدایش سنہ ۱۸۶۱ع وفات سنہ ۱۹۳۱ع



منشي بشن نراين بهارگو مرحوم

صد اندیشی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن اِن کے دماغی کمال کا ناقابل تردید ثبوت ملکی آئین کا وہ مسودہ ہے جو نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ سابق وزیر ہند نے سنہ ۱۹۲۷ء میں ہندوستانیوں کو علانیہ چیلنج دیا تھا کہ وہ ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کی ایک متفقہ و متحدہ اسکیم پیش کریں۔ نہرو رپورٹ اُسی چیلنج کے جواب میں مرتب ہوئی تھی جو پہلے لکھنؤ میں اتفاق لئے سے اور بعدہٗ کانگریس مذکور کے موقع پر کثرت رائے سے منظور ہوئی تھی۔

پنڈت جی نے ایک مرتبہ وکالت چھوڑ کر پھر کبھی باقاعدہ پریکٹس نہیں کی لیکن وہ چیمبر پریکٹس کرتے رہے اور بعض اہم مقدمات میں پیروی بھی۔ اس مرتبہ جیل جانے کے قبل بھی وہ آگرہ کے مشہور مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے مگر اس شرط پر کہ محنتانہ کا تمام کانگریس کی نذر ہوگا وہ قدرتاً فیاض طبع اور فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ اودھر تو وہ اپنا سب کچھ ملک ہی کی نذر کر رہے تھے۔ چنانچہ ابھی پچھلے سال ہی کا ذکر ہے کہ اُنھوں نے اپنا ایک عالی شان محل آنند بھون جو اب "سوراج بھون" (الہ آباد) کے نام سے مشہور ہے کانگریس کو سنکلپ کر دیا۔ آپ کے پہلے بنگال میں مسٹر سی۔ آر۔ داس آنجہانی بھی اس قسم کی مثال قائم کر چکے تھے۔

سوشل اصلاحات سے بھی آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہی اول شخص تھے جنھوں نے اپنی برادری میں پردہ کے رواج کو توڑ دیا۔ تعلیم نسواں کے بھی وہ زبردست حامی تھے، اُنھوں نے ۱۸۹۹ء میں ولایت سے واپس آکر کوئی پراشچت کرنا بھی گوارا نہیں فرمایا تھا۔ مگر اس وقت تو ان کی تمامی توجہ سیاسی معاملات میں مرکوز تھی۔ اُن کے دل میں کس قدر ہمدردی تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے مرنے کے ایک روز قبل مہاتما گاندھی سے یہ درخواست کی تھی کہ جن گڑھوالی سپاہیوں کو لمبی سزائیں دی گئی ہیں اُن کے لواحقین کو امداد پہونچانے کا بندوبست کیا جائے

پنڈت صاحب کی اقبال مندی نے مرتے دم تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ چنانچہ یہ بھی محض حسن اتفاق تھا کہ وفات کے پہلے ملک کے متعدد سیاسی لیڈر رہا کر دیئے گئے اور سب کو اُن کی عیادت کا موقع ملا۔ دنیا کا بزرگ ترین شخص مہاتما گاندھی تو بہ نفس نفیس اُن کی لاش تک کے ساتھ موجود تھا جس نے اُن کی چتا پر اپنے دست مبارک سے چند لکڑیاں رکھکر اپنی دلی محبت کا ثبوت دیا۔

۶۔ فروری کو پنڈت جی کی لاش ایک قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر سے الہ آباد لائی گئی۔ اُن کی موت ایک قومی سپاہی کی موت تھی۔ اس لئے ان کے لئے اس جھنڈے سے بڑھکر کونسا کفن ہو سکتا تھا؟ ماتمی جلوس میں اتنے لوگ شامل تھے کہ سنگم کے بند پر ماگھ میلا سا لگا ہوا معلوم ہوتا

مرحوم کے ماتم میں سرکاری بھی شامل تھی اور رعایا بھی، عدالتیں بند ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی دوکانیں بند رکھیں۔ ہائیکورٹ الہ آباد میں یونین جیک نصف بلندی پر کردیا گیا۔ صاحب چیف جسٹس اور وکلا نے اپنی اپنی تقاریر میں مرحوم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے رنج و الم کا اظہار کیا۔ مسلمانوں نے اور الہ آباد یونیورسٹی کے عیسائی طلبا، و مدرسین نے تعزیتی جلسے کئے۔ الہ آباد کے علاوہ تمام دیگر مقامات میں بھی ہندو مسلمانوں نے پوری ہڑتال کی۔ ہز اکسیلنسی وائسرائے ہند نے بھی ماتم پرسی کا تار بھیجا۔

خدا کرے یہ یک جہتی کسی مستقبل قریب میں ہونیوالی صلح کا پیش خیمہ ثابت ہو اور اس طرح مرحوم کی وہ دلی تمنا پوری ہو جائے جو اُن کی زندگی میں نہ ہو سکی تھی۔

پنڈت موتی لال نہرو کے خیالات

مذہب اور سیاست

مذہب کا اعلیٰ اسپار خواہ کچھ ہو مگر آئے دن تو وہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں محض جنون و تعصب، تنگدلی و خودغرضی کی صورتوں میں ظاہر ہورہا ہے، اور اُن خوبیوں کو ناپید کر رہا ہے جنکی بنا پر ایک عمدہ سوسائٹی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

فی زمانہ مذہب ایک زبردست ترین نفاق انگیز قوت بنکر موالات آمیز قومی زندگی کی نشوونما کو روک رہا ہے، اُسنے صرف معاشرتی امور پر اپنا رجعت پسند اثر نہیں ڈالا بلکہ ساتھ ہی وہ اقتصادیات اور سیاسیات پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔

مذہب اور سیاست کے باہمی تعلق سے نہ تو مذہب کو نفع پہونچا ہے اور نہ سیاست کو۔ بلکہ تعلق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مذہب ذلیل ہو گیا اور سیاست ایک گہرے دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔ اب دونوں کی نجات کا باعث دونوں کی علحدگی ہی ہو سکتی ہے۔

تعلیم و ترقی کا مقصد

تعلیم و ترقی کا یہ مقصد ہو کہ انسان میں ایک ایسی مجموعی عقل کا ارتقا ہو جس سے نتیجہ یہ ہو کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے مل جلکر رہنا سیکھے اور اس امر کا احساس کرے کہ ہر حالت میں اسکا انفرادی فائدہ انسانوں کے مجموعی فائدہ میں مضمر ہے۔ (پنڈت موتی لال نہرو)

منشی بشن نراین مرحوم

(از منشی پریم چند)

منشی نولکشور کے ممتاز خاندان کا یہ آفتاب عین اُس وقت غروب ہوا جب وہ نصف النہار پر تھا منشی بشن نراین مرحوم کے وجود کا ایک ایک ذرہ رئیس تھا۔ رئیسوں کی خوبیاں سب تھیں، عیوب ایک بھی نہیں، مروت کے پتلے تھے۔ کسی سائل کو مایوس کرنا اُنھوں نے سیکھا ہی نہ تھا کسی دوست کی دلشکنی اُن کے امکان سے باہر تھی۔ ملازمین کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی مگر کبھی کسی کو نگاہِ تیز سے نہ دیکھا۔ غبن کے معاملے پیش نظر ہوئے۔ کم لیاقتی اور تساہلی کی شکایتیں روز ہی آتی رہتی تھیں، صریح بد دیانتی کے واقعے بھی بارہا سامنے آئے پر ہمیشہ درگذر کر جاتے تھے یہ خوبی اُن میں کمزوری کی حد تک تھی۔ اس سے بسا اوقات کاروبار کو نقصان پہونچتا تھا اور جن لوگوں کے سر پر ذمہ داری تھی اُنھیں خفیف ہونا پڑتا تھا۔

مرحوم کی عمر ابھی کچھ نہ تھی، لکھنؤ کا یہ علم دوست خاندان کوتاہ عمر واقع ہوا ہے۔ منشی پراگ نراین صاحب مرحوم نے ۴۲ سال کی عمر میں رحلت کی، اُن کے صاحبزادے نے کچھ اور تخفیف کر دی، ابھی چونتیسواں ہی سال تھا۔

میانہ قد، چکلی ہڈی اور دوہرے جسم کے وجیہ آدمی تھے، گندمی رنگ، رعب دار مونچھیں، بڑی بڑی آنکھوں میں شرافت اور عفو کی جھلک، وضع بالکل سادہ تھی۔ باہر نکلتے تو اچکن اور چست پاجامہ زیب جسم ہوتا، سر پر فلیٹ کیپ، گھر پر کرتہ اور دھوتی پہنتے تھے، حقہ اور پان کا شوق تھا۔

اُن کا دربار ہر خاص و عام کے لئے کھلا رہتا تھا، نہ کارڈ بھیجنے کی ضرورت، نہ اطلاع کرانے کی پابندی۔ دیوان خانہ کے سامنے برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ احباب اور کارکن، سائل اور ارباب غرض، سبھی آتے ہیں اور عرض مدعا کرکے چلے جاتے ہیں، سب سے یکساں خلق اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ مزاج میں رعونت کا نام نہیں، نخوت کی بو نہیں، تکلف کا شائبہ نہیں۔ افسوس!

وہ جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہوگئی۔

مزاج میں سخاوت بھری ہوئی تھی۔ وسائل سے کہیں زیادہ، دل کے غنی تھے، دولت کو لٹانے کی چیز سمجھتے تھے۔ اُن کے لئے اس سے بہت بڑی ریاست کی ضرورت تھی۔ اس تنگنائے میں اُن کا دست کرم اپنے جوہر نہ دکھا سکتا تھا۔ جیسے نپولین کو برقندازوں کی ایک ٹولی کا افسر بنا دیا گیا ہو، جیسے عربی گھوڑے کو احاطہ میں بند کر دیا گیا ہو۔

حوالیوں کے دست ہوس دراز دیکھتے تھے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔

طبیعت کی افتاد استغنا کی جانب واقع ہوئی تھی، درویشوں کے معجزوں پر اعتقاد کامل تھا، خود درویش نہ تھے، پر درویش صفت ضرور تھے۔ جہاں تک بے لوث رہنے اور سود و زیاں سے بے اثر رہنے کا تعلق ہے وہ درویشوں سے کہیں زیادہ درویش تھے۔ دنیا سے دل کبھی نہیں لگایا جب تک جئے بے لاگ جئے۔ نقصان ہوا تو پرواہ نہیں، فائدہ ہوا تو پرواہ نہیں۔ فائدہ ہوا تو ذرا مسکرائے، نقصان ہوا تو قہقہہ مار کر ہنسے۔ اور معرفت کسے کہتے ہیں؟ گیروے بانے اور جٹا میں فقر نہیں ہے فقر مزاج میں ہے۔

فقیروں کے معجزوں کی روایتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ خود بھی بڑے اعتقاد سے بیان کرتے تھے۔ کئی عارفوں سے اُنھیں کمال عقیدت تھی۔ اس حد تک کہ بعض اوقات اون کی سریع الاعتقادی پر حیرت ہوتی تھی۔ خوارق کی اُن کی نگاہ میں کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک صاحب کمال بیک وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی روایتیں وہ عین الیقین کی طرح مانتے اور بیان کرتے تھے۔ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو شک ہو سکتا ہے، یہ خیال شاید اُنھیں آتا ہی نہ تھا۔ یہ استغنا اسی درویش صفت ہونے کا نتیجہ نہ تھا، شاید یہی اُن کی زندگی کا سب سے گہرا پہلو تھا۔ خود بھی یوگ کرتے تھے اور اس میں اچھی مشق بہم پہونچائی تھی۔

شادی کم سنی ہی میں ہوگئی تھی، اُن کی موت کے دو ڈھائی سال پہلے ہی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ جس تن دہی اور محبت سے اُن کے معالجہ میں مصروف رہے وہ ایک درد انگیز نظارہ تھا، دنیوی جی خود دار معاملہ فہم اور جزرس تھیں منشی جی کی آزادروی اُن کے حیات میں حدود کی پابند رہی۔ اُن کی وفات اِس دلدادۂ وفا کے لئے کوچ کا پیغام تھی بمشکل سے سال بھر گذرا ہوگا کہ عوارض نے آگھیرا، دردِ باطن باہر نکل پڑا۔ ڈاکٹروں اور ویدوں پر اعتقاد نہ تھا ہومیوپیتھک علاج کے قائل تھے لکھنؤ میں منشی مہادیو پرشاد صاحب ایک غریب دوست رئیس ہیں، خدمت خلق کے لئے ہی انھوں نے

ہومیو پیتھک طریقِ علاج کا مطالعہ کیا ہے اور غربا شہر کی عرصہ سے بے غرض خدمت کر رہے ہیں منشی جی اُن کے دستِ شفا کے قائل تھے۔ اُن کا معالجہ شروع کیا۔ روز بروز صحت خراب ہوتی جاتی تھی، چہرہ زرد ہو گیا تھا، کئی ماہ کے بعد صحت ہوئی مگر صدمہ جانکاہ تھا چند ماہ کے بعد پھر بیمار ہوئے اور اب کے دنیا ہی سے رخصت ہو گئے۔ ۲۳۔ دسمبر کو مدراس گئے۔ اتنے لمبے سفر کے قایل ہرگز نہ تھے، مگر مٹی تو مدراس میں لکھی تھی، کشاں کشاں لے گئی۔

غصہ بہت کم آتا تھا، یا یوں کہیئے کہ ضبط بہت کر سکتے تھے، غصہ کی انتہائی صورت تھی نیچی آنکھیں اور مہر سکوت۔

شہرت سے انھیں نفرت تھی، جو اس تشہیر کے زمانہ میں غیر معمولی بات ہے۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال کے پابند تھے۔ کوئی سوسائٹی کوئی انجمن ایسی نہ تھی جسے ان کے ہاتھوں فیض نہ پہونچا ہو۔ جو کچھ دیتے تھے چپ چاپ دیتے تھے۔ مرنے کے بعد اب معلوم ہو رہا ہے کہ اُن کا دائرہ کرم کتنا وسیع تھا! پبلک لائف سے اُنھیں دلچسپی نہ تھی، مگر قومی تحریکوں کے مدّاح تھے۔ صحبتوں میں اپنے سیاسی خیالات کا بیباک اظہار کرتے تھے۔ اور سیاسی تحریکوں کی امداد کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ تقدیر نے اُنھیں ریاست کا امتیاز عطا کیا تھا، ہمارے دیاں جمہور کے ساتھ تھیں

روسا میں حکام جوئی اور خطاب طلبی کا مرض عام ہے۔ مرض کیوں کہو امتیاز کی ہوس کسے نہیں۔ طلبا امتحان میں اعزاز چاہتے ہیں، حکام کارگذاری میں، رُوسا شہرت میں۔ منشی جی کی بے نیاز طبیعت کے لئے شہرت اور خطاب میں کوئی کشش نہ تھی۔ یہاں تک کہ حکام کی ملاقات سے بھی گریز کرتے تھے۔

بعض ہستیوں کی طبعی خصوصیات واضح و نمایاں ہوتی ہیں، بعض کہیں پست ہوتی ہیں، اتنا پست کہ اُسے شرمناک کہہ سکتے ہیں، بعض کہیں بلند اتنا بلند کہ فخرِ روزگار۔ منشی جی کا مزاج ہموار تھا سبزہ زار کی طرح جس میں شگفتگی ہے مہربانی ہے، لطافت ہے، بلندی و پستی کا نام نہیں۔ اُن کی زندگی میں کیا چیز نمایاں تھی اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ وہ کسی طرح بھی قومی رجحانات کے انسان نہ تھے۔ بہ ظاہر میانہ روی ہی ان کا معیار تھا۔ الجھان سے بھاگتے تھے۔ معاملات دنیا میں غور و فکر کرنے کی پروا نہ تھی۔ اُن کے دیوان خانہ کے پیچھے ہی بک ڈپو ہے جہاں صدہا افراد کام کرتے ہیں، مگر شاید زندگی میں دو ایک بار سے زیادہ ڈپو میں قدم نہیں رکھا۔ وسیع علاقہ ہے۔ مگر شاید ہی کسی حصہ میں نگرانی کے خیال سے گئے ہوں۔ تفکرات اور مکروہات سے آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ مدد گاروں مشیروں کا اصرار

بیکار ہوتا تھا۔ اسی درویشانہ بے نیازی کو اُن کی امتیازی صفت کہہ لیجئے۔

شکار۔ اور گھڑدوڑ سے بہت شوق تھا، سال میں دو بار ہمالہ کی ترائی میں شکار کھیلنے ضرور جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بیماری کا افاقہ ہوتے ہی شکار کھیلنے گئے اور وہیں مرض پھر عود کر آیا۔ نشانہ بے خطا تھا گھڑدوڑ میں اس سے بھی زیادہ دلچسپی تھی۔ اچھے اچھے اصیل گھوڑے جمع کر رکھے تھے۔ مدراس کا مہلک سفر بھی گھڑدوڑ ہی کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا، وہاں ان گھوڑوں نے دھوم مچادی تھی، مگر بسترِ مرگ پر ان فتوحات سے کیا خوشی ہوتی۔

لکھنؤ کے عاشق تھے۔ معمولی رؤسا بھی گرمیوں میں پہاڑوں کی سیر کرتے ہیں۔ منشی جی مئی جون کی گرمیاں لکھنؤ ہی میں گذار دیتے تھے، کوہستانی دلچسپیوں سے انھیں تعلق نہ تھا۔ اُن کی میانہ روی ہر ایک قسم کے انتشار اور تگ و دو سے گھبراتی تھی۔ دولت کی ہوس نہ تھی۔ یوں ایک بار سٹہ کا شوق بھی ہوا مگر دولت اُن کے ہاتھوں میں آب در غربال تھی۔ ہوا خواہان دربار کی آنکھیں بچا کر جو شخص پہونچ جاتا۔ کچھ نہ کچھ لے کر ہی لوٹتا تھا۔

تجارت کی کساد بازاری کچھ عرصہ سے منتظموں کے لئے باعث تشویش ہو رہی تھی۔ تجویز ہوئی کہ ملازمین کی تنخواہ میں تخفیف کر دی جائے اس کا نقشہ تیار ہوا، آپس میں مباحثے ہوئے اور تجویز نے عملی صورت اختیار کی مگر منشی جی نے باوجود اصرار اُس پر دستخط نہ کئے اس کا نفاذ نہ ہوا۔ اُن کا قلم پرورش کرنے کے لئے تھا خون کرنے کے لئے نہیں۔

مرحوم کی یادگار دو صاحبزادے ہیں بڑے صاحبزادے کی عمر سولہ سال کی ہے، چھوٹے ابھی چوتھے پانچویں سال میں ہیں۔ تین صاحبزادیاں بھی ہیں، بڑی صاحبزادی کی شادی ہو چکی ہے، ماں کی شفقت سے پہلے ہی محروم ہو چکے تھے باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا۔

مگر اُن سے بھی زیادہ دردناک حالت آپ کی والدہ محترمہ کی ہے جن کا لال اُن کی گود سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔ خوش نصیب ہیں وہ جو نیکنام جیتے ہیں اور نیکنام مرتے ہیں۔ آج سارا شہر مرحوم کے لئے ماتم کر رہا ہے، اور دنیا ہم آہنگ ہو کر کہہ رہی ہے۔

مادرِ گیتی کا ایک لائق فرزند اُٹھ گیا

تنقید و مباحثہ

(۱)

تنقید کتب

متاع درد — از جناب ثاقب کانپوری۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۶؍
ملنے کا پتہ:۔ حضرت مصنف، خانقاہ شریف۔ کانپور

سید ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری موجودہ زمانہ کے ایک خوش فکر شاعر ہیں اور ملک کے اکثر رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ "متاع درد" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں نظمیں۔ غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ شروع میں جناب عندلیب شادانی ایم۔ اے کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے جس میں حضرت ثاقب کے کلام کی خوبیوں کو دلکش انداز میں ظاہر کیا گیا ہے، غزلوں کے اکثر اشعار کی تفصیلی تشریح اور نظموں پر مجموعی حیثیت سے رائے زنی کی گئی ہے۔ اسکے علاوہ مولانا آزاد سبحانی کی مختصر تقریظ اور خود حضرت ثاقب کے قلم کے لکھے ہوئے ذاتی حالات (مع تصویر) شامل ہیں۔

جناب ثاقب کا کلام خصوصاً غزلیات کے متعلق جو کچھ جناب عندلیب شادانی نے لکھا ہے اس سے ہم کو پورا اتفاق ہے۔

"میر صاحب اردو کے جیسے مسلم الثبوت اور گراں پایہ شاعر ہیں دنیا جانتی ہے اور ان کے بہتّر نشتروں کا چرچا بھی عام ہے۔ میر صاحب نے غزلوں کے چھ ضخیم دیوان چھوڑے ہیں۔ اس طرح گویا ان کے ہر دیوان میں نشتروں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں۔ پس آج اگر کسی کے مجموعہ غزلیات میں دس بیس شعر بھی ایسے نکل آئیں جنھیں مذاق سلیم نشتر تسلیم کرے تو یقیناً یہ اس نغز گفتار کے کمال فن کی آخری دلیل ہوگی۔ جناب ثاقب کے مختصر مجموعۂ کلام میں غزلوں کی تعداد کل چھہتّر ہے اس میں بھی اکثر غزلیں تین چار اور پانچ شعر کی ہیں مگر بایں ہمہ ناظرین کو جا بجا وہ بجلیاں کوندتی نظر آئیں گی جو محبت سرشت دلوں کے سرمایۂ شکیب کو خاکستر کئے بغیر

نہیں چھوڑ سکتیں۔"
امید ہے کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مجموعہ کی پورے طور پر قدر کریں گے۔

انتخاب سودا

مرتبہ سید ابو محمد ثاقب کانپوری۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
کراؤن سائز۔ ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

آجکل جبکہ فرصت دنیا سے معدوم ہو چکی ہے اور طالبان ادب اساتذہ کے ضخیم کلیات کا مطالعہ نہیں کر سکتے تو ان کے ذوق ادب کی تکمیل کے واسطے ضروری ہو گیا ہے کہ متقدمین و متاخرین اہل سخن کے کلام کا انتخاب مہیا کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ہے جس میں مرزا رفیع سودا کی غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب ہے۔ شروع میں مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کا وہ مشہور و معروف مضمون بطور مقدمہ ہے جس میں سودا کے کلام پر دلپذیر انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے رسالہ زمانہ میں چھپ چکا ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ قابل مؤلف نے اس مضمون کے ساتھ اس کا کوئی حوالہ دینا مناسب نہیں خیال فرمایا۔ ہمارے خیال میں اس مجموعۂ انتخاب میں بھی زیادہ وسعت نظر سے کام لینے کی ضرورت تھی اور بحیثیت مجموعی غزلوں کا انتخاب کم ہوا ہے۔

ہندو شعراء

مؤلفہ خواجہ عشرت لکھنوی (احاطہ خانساماں۔ لکھنؤ)
کراؤن سائز۔ ۱۹۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ہ

ہمارے قدیم دوست خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی مدت سے اردو زبان کی جو اہم خدمت انجام دے رہے ہیں وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ گمنام شاعروں اور دوسرے لوگوں کے حالات معلوم کرنے اور ان کو اہل ذوق سے روشناس کرانے میں آپ کو خاص دلچسپی حاصل ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب ابتک اردو زبان کی کئی نہایت مفید و سبق آموز کتابیں لکھ چکے ہیں چند سال پہلے آپ نے "تذکرہ آب بقا" کے نام سے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ شائع فرمایا تھا جسمیں ماضی و حال کے اردو شاعروں کے حالات درج ہیں۔ حال میں آپ نے یہ ایک اور تذکرہ شائع کیا ہے

جس میں نہ صرف اُن ہندو حضرات کے مختصر حالات اور معہ نمونہ کلام جمع کئے گئے ہیں جو زمانہ ماضی میں واد سخنوری دیتے تھے بلکہ موجودہ زمانہ کے شعراء کے حالات و کلام بھی شامل کر لئے گئے ہیں، بہرحال اس چھوٹے سے تذکرے میں آپ نے چار سو سے زیادہ شاعروں کے نام اور کلام وغیرہ درج کر دیئے ہیں۔ حالات قدرتاً بہت ہی اختصار سے لکھے گئے ہیں تاہم دلچسپی سے خالی نہیں۔

سوانح چاند بی بی

مؤلفہ سید احمد اللہ قادری۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ حجم ۰۰ صفحات۔ قیمت عا،

ملنے کا پتہ۔ جناب مؤلف۔ کوٹلہ اکبر جاہ۔ حیدرآباد دکن

ہندوستان میں جن شاہزادیوں نے رموز سلطنت و آئین مملکت میں نمایاں حصہ لیا ہے اُن میں احمد نگر کی ملکہ چاند بی بی کو ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ سید احمد اللہ صاحب خلف حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری نے نہایت محنت و تلاش اور تحقیق سے کام لیکر چاند بی بی کے سوانح حیات مرتب کئے ہیں اور خاندانی و ذاتی حالات، ریاست کا انتظام و انصرام، دشمنوں سے مقابلہ وغیرہ تمام کوائف مختلف مستند کتابوں سے اخذ کر کے حسن ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیئے ہیں۔ کتاب زیر تبصرہ میں جا بجا مفید حاشیہ بھی دیئے گئے ہیں اور آخر میں چاند بی بی کے اُن معاصرین کا حال درج ہے جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے، چاند بی بی کی تصویر بھی زیب کتاب ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ کتاب چاند بی بی کی ایک مکمل و جامع سوانحعمری کہی جا سکتی ہے۔ امید ہے کہ تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے۔

نظام شمسی و حضرت انسان

مصنفہ و مرتبہ پنڈت انند کرشن بی۔اے، سب جج گورداسپور۔ پنجاب۔ قیمت ایکروپیہ

مطبوعہ سناتن دھرم الیکٹرک پریس امرتسر

اِس کتاب میں قابل مصنف نے نہ صرف انسانی زندگی بلکہ کل کائنات و علم جوتش کے تعلقات پر علمی و فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور عقلی دلائل سے سیارگان کی تاثیرات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ اس کے مسائل تقدیر و تدبیر و تناسخ و ارتقا پر بھی علم جوتش کے نقطۂ خیال سے اچھی روشنی ڈالی ہے۔ مختلف سیارگان کے متعلق دلچسپ معلومات اور اون کے مختص اثرات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ وہ علم دوست، اُردو داں

حضرات جن کو علم و تتبع سے کچھ بھی دلچسپی ہے اس کتاب کو قابل قدر و مفید پائیں گے۔ اس کتاب میں چھپائی و نیز معیار زبان میں کافی گنجایش ترقی کی ہے ہم کو امید ہے کہ مصنف صاحب طبع ثانی میں خود ہی اصلاح کردیں گے۔

سیرت نبوی

مولفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ پاکٹ سائز ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۶ عہ

اس کتاب میں خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے پیغمبر اسلام کے سوانح حیات نہایت اختصار کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے لئے لکھے ہیں۔ زبان بہت سادہ ہے، اختصار کی یہ کیفیت ہے کہ ہر واقعہ کو چند سطروں میں بیان کردیا ہے۔ اور ایک صفحہ پر دائرہ کے اندر لکھا ہے اس کی ترتیب و زبان کا اندازہ کرنے کے لئے کتاب کا ایک صفحہ نقل کیا جاتا ہے:-

شادی کے بعد بارھواں سال

وہ میرا پڑوسی ہے

رسول اللہ نے بازار میں ایک شخص کو دیکھا کہ دو آدمی اس کو مار رہے ہیں، رسول اللہ فوراً پٹنے والے کی مدد کے لئے آگے بڑھے۔ مارنے والوں نے کہا، ہٹو! تم اس جھگڑے میں دخل نہ دو۔ فرمایا وہ میرا پڑوسی ہے میں ضرور اُسکی مدد کرونگا۔" صفحہ ۲۵

یہ ترتیب واقعی بہت دلچسپ ہے، ہر صفحے پر جو بیان ہے مکمل ہے۔ شروع میں مختصر دیباچہ اور مقامات مقدسہ کی بارہ عکسی تصویریں ہیں۔ تمام کتاب سبز رنگ سے چھاپی گئی ہے اور انگریزی وضع کی معمولی جلد ہے۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

مرتبہ مولوی عبدالعلیم احراری بی۔اے (جامعہ) رائل سائز ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ۸ عہ

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی

اس کتاب میں مشہور مستشرق ولہاوزن کے مضمون مندرجہ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" (طبع نہم) کے ایک حصہ کا ترجمہ کردیا گیا ہے جس میں صرف پیغمبر اسلام کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔

ان حالات کے بیان کرنے میں جہاں جہاں اصل مضمون نگار سے واقعات کے بیان میں غلطیاں ہوگئی ہیں مترجم کتاب نے اپنے حواشی میں ان کی تصحیح کردی ہے اور اس کی تصدیق میں جابجا حوالے بھی دیے ہیں۔ شروع میں بیس صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ ہے جس میں پیغمبر اسلام کے متعلق تمام مستشرقین کے خیالات اور اُن کے اعتراضات پر قابل قدر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون مذکورۂ بالا کا بامحاورہ وسلیس ترجمہ ہے۔

اس کتاب کی تالیف کی غرض یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے متعلق مغربی علماء کے خیالات وآرار اُردو داں اصحاب تک پہونچا دیے جائیں، اور ان کی سیرت پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کا جواب بھی دیدیا جائے تاکہ ناظرین کو غلط فہمی نہ ہونے پائے۔ یہ کتاب عام مسلمانوں کے لئے مفید ہے، خصوصاً علمائے دین کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ مغربی زبانوں سے عموماً ناواقف ہوتے ہیں۔

بعض رسالوں کے خاص نمبر

چند سال سے بعض معاصرین کرام ہر سال کے شروع میں اپنا ایک خاص نمبر سالنامہ یا سالگرہ نمبر کے نام سے شائع کرتے ہیں اور حتی الوسع اس نمبر کو دلچسپ ودلکش بنانے کی کوشش کرتے ہیں، ان نمبروں کی اشاعت کی خاص وجہ تجارتی مسابقت ہوتی ہے، بہرحال سال رواں کے جو خاص نمبر ہمیں موصول ہوئے ہیں ان پر مفصل تبصرہ تو ممکن نہیں ہے البتہ ایک سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) رہنمائے تعلیم (جوبلی نمبر) اردو رسائل میں سب سے پہلے رسالہ زمانہ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اُس نے اپنی پچیس سالہ خدمات کی یادگار میں فروری ۱۹۲۸ء میں "جوبلی نمبر" شائع کیا۔ یہ نمبر اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں کی بنا پر اس قدر مقبول ہوا کہ آجتک دور دور سے اسکی فرمائشیں آتی رہیں حالانکہ اس کی کوئی کاپی فروخت کیلئے باقی نہیں بچی۔ زمانہ کے بعد موقر معاصر عصمت دہلی نے "جوبلی نمبر" کے نام سے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا، مگر یہ نمبر بیس سال کے بعد ہی شائع کیا گیا تھا۔ اب جنوری ۱۹۳۱ء میں ہمعصر رہنمائے تعلیم لاہور نے اپنی پچیس سالہ جوبلی کے موقعہ پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ اس نمبر میں مضامین نظم ونثر کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے۔ ایک سو سے زیادہ تصاویر اور کارٹون ہیں۔ مضامین علمی۔ ادبی۔ اخلاقی، صنعتی وغیرہ ہر قسم کے ہیں اور انکو بلحاظ موضوع مختلف عنوانات کے ذیل میں شائع کیا گیا ہے، مثلاً تعلیمی مضامین علمی مضامین۔ آداب واخلاق۔ صنعت وحرفت وغیرہ۔ اکثر مضامین مستند ومشاہیر اہل قلم کے ہیں اور اپنے

اپنے موضوع پر بہترین کہے جا سکتے ہیں۔ تصاویر کی زیادہ تعداد صوبہ پنجاب کے سربرآوردہ اصحاب اور اُن اہل قلم کی تصویروں پر مشتمل ہے جن کے بلند پایہ مضامین جوبلی نمبر کی زینت ہیں۔ ظاہری صورت کو نظر فریب بنانے کے لئے اکثر صفحات بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں اور رنگین طبع کرائے گئے ہیں۔ سرورق رنگین و خوشنما۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ، اور اس نمبر کی قیمت صرف ۲؍ ہے جو اسکی خوبیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ ہم معاصر موصوف کو یہ کامیاب نمبر شائع کرنے پر تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور اسکی آئندہ ترقی کے لئے دست بدعا ہیں۔

(۲) **ہمایوں** لاہور (سالگرہ نمبر)۔ ہر سال کی طرح امسال بھی ہمایوں کا سالگرہ نمبر آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دلچسپ علمی و ادبی مقالات، افسانے، نظمیں اور غزلیں اس نمبر کی زینت ہیں۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ اور حجم ۱۲۰ صفحات ہے۔ متعدد تصاویر بھی ہیں، اور بحیثیت مجموعی یہ نمبر ایک کامیاب نمبر ہے۔

(۳) **نیرنگ دہلی** (نوروز نمبر) یہ ڈیڑھ سو صفحات کا ایک خوشنما رسالہ ہے جس میں تقریباً چالیس مضامین نثر و نظم ہیں۔ متعدد رنگین و سادہ تصاویر بھی ہیں اور بعض تصاویر کے متعلق نظمیں بھی ہیں۔ مضامین عام رسائل کی طرح ہر قسم کے ہیں، جن میں اکثر دلچسپ و مفید ہیں اور مشاہیر اہل قلم کے افکار تازہ کا نمونہ ہیں۔ اس نمبر کی قیمت ۱۴؍ ہے اور رسالہ کا سالانہ چندہ صرف دو روپیہ۔

(۴) **عالمگیر لاہور** (خاص نمبر) حسب معمول یہ نمبر بھی کامیابی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضامین کی تعداد ترلیسٹھ ہے۔ آٹھ رنگین اور متعدد سادہ تصاویر نیز اکثر صفحات کی رنگین چھپائی اور سرورق کی خوشنمائی نے اسکی ظاہری صورت کو بہت دلکش بنا دیا ہے۔ سائز $\frac{22 \times 18}{4}$ حجم تقریباً دو سو صفحات اور قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔

(۵) **چمنستان امرتسر** (سالنامہ)۔ چمنستان غالباً صوبہ پنجاب کا سب سے زیادہ سستا رسالہ ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ۱۲؍ ہے۔ بایں ہمہ اس کا یہ سالنامہ بہت عمدہ اور دلکش ہے بعض مضامین مفید و کارآمد بھی ہیں۔ متعدد رنگین و سادہ تصاویر اور سرورق کی خوشنمائی لائق دید ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ حجم تقریباً ایک سو صفحات قیمت ۸؍

تنقید و مباحثہ

(۲)

مباحثہ

کتاب عرب و ہند کے تعلقات

(از ڈاکٹر زبید احمد صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی،

رسالہ زمانہ بابت نومبر ۱۹۳۰ء میں کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" پر ایک فاضلانہ تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں سلیس اور دلکش پیرایہ میں نہایت خوبی و وضاحت کے ساتھ اس کتاب کے سب مضامین اور مباحث کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، اور مصنف کی کاوش و دماغ سوزی کی پوری داد دی گئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں چند کوتاہیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔

انسان ضعیف البنیان خطا و نسیان سے مرکب ہے اور غلطی و کوتاہی کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ لہذا کوئی انسانی تصنیف و تالیف خطا و غلطی سے پاک اور نقص و کوتاہی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن کتاب مذکور کی جو کوتاہیاں دکھائی گئی ہیں ان کی بابت کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ زمانہ کے وسیع حلقۂ اثر میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

فاضل تبصرہ نگار کا اعتراض ہے کہ مولانا محمد سلیمان ندوی نے غیر متعلق مسائل کے بارہ میں تازہ ترین تحقیقات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس سلسلہ میں مولانا کی تین غلطیاں ظاہر کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ آریہ قوم کا اصلی وطن اب وسط ایشیا نہیں بلکہ ہندوستانی ہفت آبہ ملک (سپت سندھ) سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ناگری حروف کے ماخذ کی بابت جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ اب پرانا ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اہل فنیشیا کا سامی ہونا ایک فرسودہ خیال ہے۔ موجودہ تحقیقات کی بناپر ان کا تعلق آریہ نسل سے ہے۔

میری گزارش یہ ہے کہ اول تو غیر متعلقہ مسائل کے بارہ میں اس قدر التزام کرنا کہ تازہ ترین تحقیقات سے بھی فائدہ اُٹھایا جائے کچھ زیادہ ضروری نہیں۔ دوسرے مولانا نے ان تینوں مسائل کی بابت انھیں نظریوں سے کام لیا ہے جو اب تک علمائے مستشرقین کے نزدیک قابل وثوق ہیں۔

اور جن کی ہنوز تردید نہیں ہو سکی ہے۔ آریہ قوم کے اصلی وطن کی بابت بعض ہندوستانی محققین کی جو رائے مسلّمہ نظریہ سے مختلف ہے اس نے ہنوز ایسی اہمیت حاصل نہیں کی ہے کہ اسے آجکل کا مسلّمہ نظریہ سمجھا جا سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسائیکلوپیڈیا کے آخری ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۹ء میں اس نظریہ کا ذکر ہوتا۔ اس میں بھی وہی پرانا نظریہ درج ہے۔ کیمبرج کی تاریخ ہند میں بھی جو کئی جلدوں میں آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے یہی نظریہ درج ہے۔ علاوہ بریں خود ہندوستانی محققین میں اختلاف رائے ہے۔ مثلاً مسٹر تلک کا نظریہ ہے کہ آریہ قوم کا مسکن اصلی منطقۂ منجمدہ شمالی ہے۔ ایسی صورت میں کس ہندوستانی محقق کے نظریہ کو ترجیح کیوں دی جائے؟ کیا اس محقق کے نظریہ کو جو ہندوستان کے ہفت آبہ ملک کو آریہ قوم کا اصلی وطن قرار دیتا ہے، دوسرے نظریوں پر محض اس وجہ سے ترجیح دی جائے کہ اس نے ہمارے ملک کے حق میں فیصلہ کیا ہے جس سے ہمارے دیس کی عظمت بڑھ گئی ہو؟ اگر ورڈیل نے بھی یہ خیال پیش کیا ہے تو بھی یہ ہنوز قابل قبول نہیں۔ کیونکہ اگرچہ ورڈیل ایک فاضل انگریز ہے مگر حلقۂ مستشرقین میں اسے کچھ زیادہ وقعت حاصل نہیں ہے۔ اس کی تصانیف رطب و یابس سے پر ہیں۔ چنانچہ الہ آباد یونیورسٹی کے ویدک فاضل پروفیسر جٹو پادھیائے نے ورڈیل کی ایک تازہ تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔

ناگری حروف کے متعلق بھی یہی گزارش ہے کہ ابھی تک بولر والا نظریہ برقرار و مستند ہے، ہم تارا پوری والا، بھنڈارکار، اور آر۔ شرما شاستری کے مقالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ انھوں نے بولر کے نظریہ سے اختلاف کیا ہے مگر ان کا نظریہ ہنوز مقبول نہیں ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا میں بولر کا نظریہ مستند مانا گیا ہے اور یہی کیمبرج کی شائع کردہ تاریخ ہند میں ہے۔

اہل فنیشیا یقینی طور پر سامی تھے، اور ان کی زبان السنۂ عالم کے سامی خاندان سے متعلق تھی نئی اور پرانی انسائیکلوپیڈیا میں یہی درج ہے۔ محض ایک ورڈل کے خیال سے نظریہ سابقہ جو فنیقی اور سامی زبانوں کے باہمی تعلقات نیز دیگر امور پر مبنی ہے۔ نہیں بدل سکتا۔ فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے "اگر اس سے مراد سامی نسل کے لوگ ہیں جس کی اولاد نے آنحضرت کا انوکھا مذہب قبول کر کے دنیا میں اسلام پھیلایا تھا تو یہ نادرست ہے۔" یہاں لفظ "انوکھا" کے استعمال سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قابل تبصرہ نگار نے ان کوتاہیوں کے بیان کرنے میں اس اسپرٹ سے کام نہیں لیا جس میں اصل کتاب اول سے آخر تک لکھی گئی ہے۔ مولانا نے محققانہ بے لوثی و غیر جانبداری سے عرب و ہند کے باہمی تعلقات بیان کئے ہیں۔ مگر فاضل تبصرہ نگار پر اس درجہ

آریہ ہندوؤں کی عصبیت غالب ہے کہ اُسے نہ یہ گوارا ہے کہ آریہ ہندو بیرون ہند سے آئے اور نہ یہ کہ ناگری حروف کسی سامی زبان کے حروف کے مرہون احسان ہیں بلکہ آریہ قوم کی اہمیت یہاں تک بڑھانا چاہتا ہے کہ فنیقی قوم کو بھی آریہ ہی شمار کرتا ہے۔

جب فنیقی قوم سامی نسل میں داخل ہے تو اُن کا اصلی وطن عرب تھا، کیونکہ سامی نسل کے اصلی وطن کے متعلق مشہور اور صحیح نظریہ یہی ہے کہ وہ عرب تھا۔ مولانا کا مطلب یہ کہنے سے کہ "وہ عرب تھے" یہ نہیں ہے کہ اُن کی اولاد نے آنحضرت کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اصلاً ونسلاً عرب تھے۔ آریہ نسل کے اصلی وطن کے متعلق جو نظریہ ابتک مسلم ہے اس کے مطابق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اہل یورپ بھی ایرین ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ اُن کی اولاد نے آتش پرستوں کا مذہب قبول کیا۔ آنحضرت کے زمانہ کے عرب وہ عرب ہیں جو اس وقت عرب میں رہتے تھے، اس کے مقابلہ میں بابلی و فنیقی وہ عرب قومیں تھیں جو آب سے سیکڑوں برس پہلے عرب خاص سے نکلکر دوسرے مقامات پر چلی گئی تھیں۔

بعض مسلم مصنفین عربی زبان کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ اُسے نہ صرف السنۂ سامیہ بلکہ تمام السنۂ عالم کی ماں مانتے ہیں چنانچہ مولانا خواجہ کمال الدین نے اپنی کتاب "ام الالسنہ" میں نہایت شد ومد کے ساتھ یہ دعوائے پیش کیا ہے، اور اُس کی تائید میں بے شمار انگریزی و دیگر زبانوں کے الفاظ کو عربی الاصل بتایا ہے۔ حال ہی میں مولانا سلیمان اشرف صاحب نے عربی کے فضائل پر المبین نام ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں بڑی حد تک عربی کو تمام زبانوں پر ترجیح دی ہے اس قسم کی کوششیں زیادہ تر مذہبی جذبات کے ماتحت ہوتی ہیں، لیکن عالم محقق غیر متعصبانہ تحقیقات کا خوگر ہوتا ہے۔ وہ مذہبی جذبات کے زیر اثر حقائق سے دور نہیں جا سکتا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے کئی عربی لفظوں کی بابت لکھا ہے کہ وہ ہندی الاصل ہیں، نہ صرف یہ بلکہ قرآن شریف میں بھی تین چار ہندی الاصل الفاظ کا استعمال ہونا بتایا ہے۔ اگر اس کتاب پر "ام الالسنہ" کے خیال کے لوگ تبصرہ کریں تو وہ لازماً مولانا کے اس بیان کی تردید کریں گے۔ اور حوالہ دیں گے کہ مولانا نے موجودہ محققین کی تحقیقات (یعنی ام الالسنہ اور المبین) سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ مگر کیا ان کا یہ اعتراض صحیح ہوگا؟ بالکل یہی حقیقت تبصرہ زیر بحث کے اعتراضوں کی ہے۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ صفحہ ۲ پر (صہ ۳۹ ہونا چاہیئے) ملک ہند کی حد بندی کی پہلی کوشش ابن حوقل سے منسوب کی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے سکندر کے ہمراہی حکمائے یونان

تے ایسا کیا۔ میں اس کے جواب میں مولانا کے اصل الفاظ دُہرانا چاہتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "یہ پہلا عرب سیاح اور جغرافیہ نویس تھا جس کی کتاب میں ہندوستان کی پوری لمبائی چوڑائی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔" مولانا نے ابن حوقل کو عربوں میں پہلا سیاح اور جغرافیہ نویس بتلایا ہے جس نے ہندوستان کی حدبندی بیان کی ہے۔ نہ کہ غیر عربوں میں بھی اسکو پہلا درجہ دیا ہے آخری اعتراض یہ ہے کہ "صفحہ ۲۵ پر مولانا تاریخ ہند کے علم برداروں سے تاکید کرتے ہیں۔ کہ وہ محمود سے پہلے کے افغانستان اور ہندوستان کے تعلقات پر تلاش و محنت سے مواد فراہم کریں۔ پھر اس سے اگلے پیرے میں یہ دعویٰ یوں پیش فرماتے ہیں کہ" اوپر کی تفصیل سے یہ اندازہ ہوگا کہ افغانستانی کوہستان کے دَروں سے مسلمانوں کی ہندوستانی راجاوں کے ساتھ قوت آزمائی محض مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ صدیوں کی قومی لڑائیوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہاں پر بھی معزز تبصرہ نگار نے سمجھنے میں جلدی کی۔ اور ماسبق و مالحق پر پوری طور سے غور نہیں کیا۔ مولانا کا اصل منشا یہ ہے کہ مسلم بادشاہان ہند کی جو تاریخ ہندوستانی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر پڑھائی جاتی ہے۔ اور اسی مقصد کو سامنے رکھکر اردو انگریزی میں تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ تعلقات یونان و ہند کے متعلق تو مورخین بال کی کھال نکالتے ہیں لیکن مسلمانوں کے واقعات تاریخ کے متعلق اسباب و علل کا سلسلہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے" یہی مورخ جب اسلام اور ہندوستان کی تاریخ کا آغاز کریں گے تو چند سطروں میں وحشی عربوں کا اور پھر (نعوذ باللہ) ایک سخت گیر پیغمبر کا اور اس کے جانشینوں کے بے پناہ حملوں کا ذکر کرکے صفحہ دو صفحہ میں عرب سے سیدھے غزنیں پہونچ جائیں گے۔ یہاں محمود کی فوج ہندوستان پر جہاد کرنے کے لئے تیار ملتی ہے اور اس کو لیکر وہ فوراً پنجاب سندھ اور گجرات پہنچ جاتے اور لوٹ مار کرکے اس کو واپس لے جاتے ہیں۔" اس موقع پر مولانا سوال کرتے ہیں کہ کیا ان سرحدی ملکوں میں باہم صلح و جنگ اور لڑائی اور میل کے تعلقات نہ تھے۔ اور ان کا سلسلہ ان سرحدی قبائل کے مسلمان ہونے سے پہلے قائم تھا یا نہیں؟ آخر ان امور کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ ہندوستان اور درۂ خیبر پار کے ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے چنانچہ مولانا نے چند مثالیں دی ہیں اور آگے چلکر لکھا ہے:-

"چوتھی صدی ہجری کے وسط میں محمود غزنوی نے غزنیں کے چاروں طرف کے ملکوں اور حکومتوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں اپنے بے پناہ حملوں سے مجبور کرکے اپنی چھوٹی سی موروثی

حکومت میں داخل کرکے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈال دی جن حکومتوں کو تباہ کرکے اپنی سلطنت قائم کی ان میں سے ہندوستان اور غور کے سوا باقی کل خالص مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں۔"

اس کے بعد مولانا اعتذاراً فرماتے ہیں کہ "یہ تاریخی تفصیلات میرے مضمون کے دائرہ سے باہر ہیں، اس لئے صرف سلسلہ کے لئے یہ چند سطریں لکھ کر تاریخ ہند کے علمبرداروں کی توجہ ادھر ملتفت کرتا ہوں کہ وہ محمود سے پہلے کے افغانستان اور ہندوستان کے تعلقات پر مواد فراہم کریں۔" آگے چلکر فرماتے ہیں کہ "اوپر کی تفصیل سے یہ اندازہ ہوگا کہ افغانی کوہستان کے دررّو نسے مسلمانوں کی ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ قوت آزمائی محض مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ صدیوں کی قومی لڑائیوں کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے۔"

مقام غور ہے کہ یہاں اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ اوپر کے فقرہ میں لفظ 'محض' قابل غور ہے مولانا یہ نہیں فرماتے کہ مسلمانوں کے ہندوستانی حملوں میں مذہبی جذبہ مطلقاً کارفرما تھا۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ان حملوں کا سبب مذہبی جذبہ کے علاوہ کچھ اور بھی تھا اور یہ محتاج ثبوت نہیں کیونکہ اگر محمود کو صرف اشاعت اسلام مقصود ہوتی تو اس نے دیگر اسلامی سلطنتوں کو کیوں تباہ کیا۔ تاریخ داں اصحاب جانتے ہیں کہ طاہریہ حکومت کو تباہ کرکے صفاریہ خاندان حکمران ہوا۔ اس کی تباہی پر سامانیہ، بویہیہ، زیادیہ وغیرہ حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان سب کو فنا کرکے محمود نے اپنی سلطنت قائم کی۔ کیا وہاں بھی مذہبی جذبہ کارفرما تھا؟

لائق تبصرہ نگار نے انسائیکلوپیڈیا سے افغانستان کی قبل از اسلام تاریخ کا جو ذکر کیا ہے وہ سراسر مولانا کی موافقت میں ہے۔ یعنی افغانستان کبھی ایران کے اکیمی نین (Achaenenian) بادشاہوں کے قبضہ میں چلا گیا تو کبھی چندر گپتا کی سلطنت سے ملحق ہوگیا۔ پھر ایک اور قوم اُٹھی تو اس نے فتح کرلیا۔ خود مسلمانوں کے زمانہ میں کیا ہوا؟ محمود غزنوی سے پہلے افغانستان ترکی شاہی اور ہندو شاہی قوتوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ محمود غزنوی کے بعد ایران و ہندوستان کے بادشاہ اس کی طرف دندان آز تیز کئے رہے۔ جس کا وار چلا اس نے اس پر قبضہ کرلیا۔ تیرھویں صدی میں یہ ایران کی طرح چنگیزی افواج کا جولانگاہ رہا۔ پھر اس پر تیمور قابض ہوا۔ پھر بابر کے قبضہ میں آگیا۔ اکبر کے زمانہ میں یہ ملک تین حصوں میں منقسم ہوگیا، صوبہ کابل ہندوستان کے ساتھ رہا۔ ہرات ایران میں مل گیا۔ بلخ پر ازبکیوں کا قبضہ ہوا۔ پھر آگے چلکر ایرانیوں نے قندھار بھی چھین لیا۔ شاہجہاں نے دوبارہ قندھار کے لئے اور ایک دفعہ بلخ کے لئے فوج کشی کی مگر ناکامی رہی۔ اورنگ زیب کو قندھار فتح کرنے کا جس قدر ارمان تھا وہ اُسکے

خطوط سے ظاہر ہے۔ صفویہ خاندان کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاکر افغانوں نے ایرانیوں کو شکست دی اور محمود افغانی نے ایران پر تسلط کرلیا۔ لیکن نادر شاہ نے افغانیوں کی سرکوبی کی۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ درانی کا افغانستان میں ستارہ چمکا اور اس نے کئی بار ہندوستان پر حملہ کیا۔

غرض ان تمام تفصیلات سے یہی ظاہر ہے کہ درۂ خیبر پار کے ملک اور ہندوستان کے درمیان رقابت ہمیشہ سے رہی ہے۔ اب رہا فاضل تبصرہ نگار کا یہ کہنا کہ افغانستان کے لوگ ہندو تھے ذرا غور طلب ہے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا افغانستان ہندوستان کا حصہ ہے یا نہیں۔ افغانستان تین ملکوں ایران توران و ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک ملک یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ بلاشرکت غیرے میرا ہی حصہ ہے۔ اس صورت میں جس کی لاٹھی اُسکی بھینس۔ یا یہ تینوں کا مشترک حصہ ہے۔ جیساکہ اکبر کے زمانہ میں تین حصوں میں منقسم ہوگیا تھا یا تیسری صورت یہ کہ کسی کا بھی حصہ نہیں خود مستقل ملک ہے۔ غرض ان تینوں صورتوں میں یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ افغانستان ہندوستان ہی کا حصہ تھا۔ جب یہ نہیں تو پھر یہاں کے رہنے والے ہندو (باشندۂ ہند کے مفہوم میں) کیونکر ہوسکتے ہیں۔ اگر مذہبی نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو وہاں ویدک ہندو دھرم رائج ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس کے خلاف مستشرقین کی تحقیقات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک مذہب زردشت کا گہوارہ رہا ہے۔ بیشک اسلام سے پہلے افغانستان میں بودھ مت تھا مگر کیا بودھ مت کی وجہ سے اہل افغانستان ہندو سمجھے جاسکتے ہیں؟ اسکا جواب اثبات میں ہے تو پھر اس زمانہ کے وسط ایشیا کے رہنے والوں کو بھی ہندو کیوں نہ سمجھا جائے کیونکہ وہاں بھی بودھ مت پھیل گیا تھا اور چین و جاپان کے بودھ مت رکھنے والے لوگ بھی ہندو کیوں نہ کہے جائیں؟ اور اگر اہل افغانستان و ہندو کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ آریہ قوم کے ہم نسل ہیں تو پھر اہل افغانستان ہی کے ساتھ کیا خصوصیت ہے تمام آریہ قومیں جو روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہیں ہندو ہیں۔

اگر بحث کی خاطر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اہل افغانستان ہندو ہی تھے تو کیا ہندو قوموں میں جغرافیائی اعتبار سے باہم رقابت ثابت نہیں ہوتی؟ کیا ہندوستان میں ہمیشہ ایک ہی سلطنت رہی ہے؟ مسعودی کے زمانۂ سیاحت میں ہندوستان میں کم از کم دو زبردست حکومتیں قائم تھیں ایک قنوج میں دوسری مالوہ میں؛ کیا ان دونوں میں رقابت نہ تھی؟ اور کیا حکومت برطانیہ سے پہلے ہندوستان کی مختلف راجگان و مہاراجگان کے درمیان کشمکش رقابت کبھی ختم نہیں ہوئی؟ اور کیا اب بھی بعض ریاستیں اس قسم کے جذبات سے خالی ہیں؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہو تو پھر لاناکی یہ رائے کہ ہندوستان اور درۂ خیبر پار کے ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے کسی طرح غلط نہیں ہے۔

آج سنگم بھی ترے غم میں لہو روتا ہے!

(از جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، بی۔اے)

سر پہ کھیلے جو وطن کے لئے سردار وہی　　خادمِ قوم وہی زبدۂ احرار وہی
جان قربان کرے ملک پہ ایثار وہی　　جس کی تقلید کرے خلق ہے کردار وہی
خادمِ قوم ہی مخدوم ہوا کرتے ہیں
قوم کی آن پہ وہ جان فدا کرتے ہیں

ہند رویا تھا نہ کیا ہجرِ تلک کے غم میں　　رحلتِ داس سے باقی نہ رہا دم دم میں
ملک تھا لاجپت۔ اجمل کے ابھی ماتم میں　　ایک گاندھی کا علمدار رہا تھا ہم میں
وہ بھی افسوس کہ اب ہم سے جدا ہوتا ہے!
آج سنگم بھی ترے غم میں لہو روتا ہے!

آج ماتم کدہ کیا صرف ہے آنند بھون　　مرغِ بسمل ہے ترے سوگ میں ہر اہلِ وطن
چاک ماتم میں نہیں کونسا ہے وہ دامن　　لارڈ اِروِن کو بھی اس صدمہ سے ہے رنج و محن
زندگی ہو تو یہ۔ اور موت ہو تو ایسی ہو
یار و اغیار کا دل جس کے لئے زخمی ہو

قید اور بند میں دن جن کے گزر جاتے ہیں　　وہی آزاد بندھی قوموں کو کر جاتے ہیں
وہ نہیں مرتے۔ نہ سمجھو کہ وہ مر جاتے ہیں　　سنگِ بنیاد وہ آزادی کا دھر جاتے ہیں

خدمتِ قوم میں جو رنج و الم سہتے ہیں •
وہ شہیدانِ وطن ہی تو امر رہتے ہیں

نشۂ حبِ وطن سر سے نہ تیرے اُترا ۔۔۔ تیرے کنبے سے بھرے جیل ترا دل نہ بجھا
جیل میں بھی نہ قدم باپ کا جس نے چھوڑا ۔۔۔ باپ تجھ ایسا ہو بیٹا ہو جو اہر ایسا

ایسے ہوتے ہیں سپوت۔ ایسے محبانِ وطن
ہیں یہی روحِ وطن، اور یہی جانِ وطن

تیرے برسوں کی مساعی کو تھی ملنی معراج ۔۔۔ تھا یہاں نقشِ عمل ہونے کو آغازِ سوراج
سفرِ خلد کا دن تو نے نکالا کیا آج ۔۔۔ صاف دل ہو گئے تھے۔ راہ پر آتے تھے مزاج

دل نہیں توڑتے دم عشق کا بھرنے والے
یوں گزر جاتے ہیں دنیا سے گزرنے والے

حریت کا وہ ترانا کوئی تجھ سے سیکھے ۔۔۔ کام میں علم کو لانا کوئی تجھ سے سیکھے
مر کے قوموں کو جِلانا کوئی تجھ سے سیکھے ۔۔۔ وطنیت کا فسانا کوئی تجھ سے سیکھے

آگ جو دل میں وطن کی تھی بجھائی نہ گئی
ہائے افسوس! صد افسوس کہ آئی نہ گئی!

تھے لیاقت کے تری "مالک تحریر" غلام ۔۔۔ حُبِ قومی و تدبر کا ہوا تجھ سے نام
کیوں نہ کل ہند میں ماتم سی مچا ہو کہرام ۔۔۔ غمزدہ کیوں نہ ترے ہجر میں ہو ملک تمام

بحر اور کوہ سے نکلیں گے بہت موتی۔ لال
دوسرا ہند میں پیدا ہو۔ تو ہو موتی لال

موتی لال نہرو

(از پنڈت آنند نراین ملاّ، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔)

موجزن ہونے لگا تھا جب ذرا دریائے قوم — کچھ اثر جب کر چلا تھا نشۂ صہبائے قوم
جب نظر آنے لگی تھی منزلِ فردائے قوم — اُٹھ گیا دنیا سے اپنا رہنما، اے وائے قوم

پھول جب کھلنے کو تھے صحنِ چمن ویراں ہوا
مہر اپنا جب صبح ہونے کو تھی پنہاں ہوا

ہم نے تیرے واسطے سجدے کئے، زاری بھی کی — دست بستہ التجائے رحمتِ باری بھی کی
دوستوں نے ہو سکی جو نازبرداری بھی کی — موت سے لڑنے کی تو نے آپ تیاری بھی کی

سب مگر بے سود۔ نیت آسماں کی اور تھی
مصلحت اُس کارسازِ دوجہاں کی اور تھی

اپنے خوں سے لکھ گیا تو سرخیِ عنوانِ قوم — دھو گیا اپنے عمل سے دفترِ عصیانِ قوم
آفریں صد آفریں۔ ہمت پہ تیری جانِ قوم — مٹ کے راہِ قوم میں پورا کیا پیمانِ قوم

جان دینی ملک پر مر کر ہمیں سکھلا گیا
موت میں بھی ایک شانِ زندگی دکھلا گیا

جب مرتّب ہوگا افسانہ ترا ہندوستاں — نامِ نہرو سرخ حرفوں میں رقم ہوگا وہاں
جہدِ آزادی کی دو جلدوں میں ہوگی داستاں — یعنی تیری اور جواہر کی سوانح عمریاں

کچھ تری باتیں ہیں کچھ تیرے پسر کا ذکر ہے
قوم کی تاریخ بھی تیرے ہی گھر کا ذکر ہے

ماؤں سے پوچھیں گے جب بچے وطن کے ہونہار — ہندِ نو کا کون تھا پہلا مدبّر باوقار؟
نقش کس کا اپنے سینوں میں بنائیں پائدار؟ — یک زباں ہو کر وہ لیں گی نام تیرا بار بار

مے رہیگی سب کے پیمانوں میں تیرے جام کی
مُہر ہوگی سکۂ قومی پہ تیرے نام کی

مثلِ تیرے اب رموزِ سلطنت سمجھے گا کون ہاتھ نبضِ قوم پر تیری طرح رکھے گا کون
نقدِ جوشِ دل عیارِ قوم پر پرکھے گا کون طاقتِ پر خواہشِ پرواز میں تولے گا کون
تو ہی اِک محرم تھا سب کے پردہ ہائے ساز کا
نغمہ سارا تھا تری گونجی ہوئی آواز کا

ملک میں ہیں اور بھی اہلِ خرد اہلِ دول لب پہ جن کے ہے ہمیشہ حبِّ قومی کی غزل
جو ادا کرتا ہے اون سے تجھکو ہے تیرا عمل قصۂ ایثار بھی تیرا ہے اِک ضرب المثل
فلسفہ کو فرد کے ایمانِ قومی کر دیا
یوں عمل پیرا ہوا گاندھی کو گاندھی کر دیا

تیری فطرت میں نہاں تھا کون سا ایسا گہر ہاتھ جس ذرہ پہ رکھا وہ ہوا رشکِ قمر
ہو گیا کھدر بھی تیرے جسم پر ملبوسِ زر عیب خوبی بنکے کھلتے تھے ترے انداز پر
اِک ادائے دلبری تھی فتنہ سامانی تری
ایک شانِ خسروی تھی چینِ پیشانی تری

یوں طبیعت میں تری کیا کیا اُبال آتا نہ تھا بحث میں کیا کیا تجھے غیظ وجلال آتا نہ تھا
ہاں مگر دل میں کبھی تیرے ملال آتا نہ تھا خاطرِ نازک کے آئینہ میں بال آتا نہ تھا
ایک ہی چھینٹے میں سب گردِ کدورت دھل گئی
اِک گھٹا آئی، گھری، گرجی، برس کر کھل گئی

کون کہتا ہے ہمیں اس سانحہ کا غم نہیں موت تیری اِک بلائے ناگہاں سے کم نہیں
عہدِ آزادی میں لیکن فرصتِ یک دم نہیں ہاں صفِ میداں کے شایاں محفلِ ماتم نہیں
اپنے سینوں میں ابھی جوشِ تقاضا ہے وہی
چشم پُرنم ہے مگر تابِ تمنا ہے وہی

عہدِ حبِ قوم کا باندھا ہے دل سے استوار اب تو آزادی مقدر میں ہے یا کنجِ مزار
آ رہے ہیں لفظ یہ اپنی زباں تک بار بار پڑھکے تیری لاش پر جاتے ہیں سوئے کارزار
شد فدا بر ملک تا نامِ وطن پاینده باد
مرد میرِ لشکرِ ما۔ میرِ لشکر زنده باد

کلامِ جوشؔ

(از جناب جوشؔ ملیح آبادی)

پامالی

آج ہنگامِ سیر اے ہمدم، آگیا ایک پھول زیرِ قدم
پھول، اور موت کے اٹھائے ناز! کچ سے اِک آئی دردناک آواز
ہائے کیا قہر تھی یہ پامالی
مَیں نے اِک زندگی کچل ڈالی

اسیری

آگ ہے صحنِ طائرِ آزاد خاک ہے طائرِ قفس کی لئے
ہمصفیرو! گلے کی ساخت کو بھی کیا اسیری بگاڑ دیتی ہے؟

قبر

نظر آئی اِک قبر کل رات مجھکو گزرتے ہوئے راستے کے کنارے
مچلنے لگے میری آنکھوں میں آنسو جھپکنے لگے آسماں پر ستارے

جینے کی دعا

اے ضعیفہ! یہ ماجرا کیا ہے مقبرے میں تجھے ہوا کیا ہے؟
سیکڑوں تربتیں ہیں پیشِ نظر خود بھی بیٹھی ہے ایک تربت پر
پھر بھی دیتی ہے رہروؤں کو صدا تم سو سو برس جیو بابا!!!

رموز و نکات

(از جناب ابوالفاضل راز چاندپوری)

(۱)

اے ساقیِ جاں نواز، تیرے قرباں! بخشندۂ سوز و ساز، تیرے قرباں!
مائل بہ سکوں ہے دیکھ قلبِ مضطر بس ہو چکی حدِ ناز، تیرے قرباں!

(۲)

ہر سمت نظر نواز بربادی ہے ویرانہ ہے یہ کوئی کہ آبادی ہے؟
کیا خوب، یہی ہے بزمِ نازِ ہستی! پابندیاں تو روحِ آزادی ہے!!

(۳)

لاریب کہ اُس سے ہے محبّت تجھکو فرقت اُس کی ہے اِک قیامت تجھکو
اِک بات میں پوچھتا ہوں تجھ سے لیکن انکارِ جہاں سے بھی ہے فرصت تجھکو؟

زہد و مے نوشی

(از مسٹر سری دھر پرشاد نگم ناشاد بی۔اے)

قطعہ

زہد سے بہتر ہے مے نوشی مری ہوش سے اچھی ہے بیہوشی مری
اپنے بیگانے نظر میں ایک ہیں سب سے اچھی خود فراموشی مری

رباعی

زہد و تقوے سے مے پرستی اچھی یادِ حق سے سیاہ مستی اچھی
جب ہوش و خرد سے ہو نہ کچھ بھی حاصل ناشاد تو پھر جنوں پرستی اچھی

قومی و ملکی جلسے

آل ایشیا خواتین کانفرنس

جنوری گزشتہ کے تیسرے ہفتہ میں لاہور میں آل ایشیا خواتین کانفرنس کا اجلاس نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی محرک مسز مارگریٹ کزنس تھیں جن کو ہندوستان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ خواتین ہند کے دلوں میں بھی قومی بیداری کے ساتھ ساتھ ایک عام اصلاحی جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اب قدیم رسم و رواج کی بیجا بندشوں سے آزاد ہو کر دنیا میں کھلے دل و دماغ کے ساتھ اپنی روحانی و جسمانی ترقیوں کے لئے بے قرار اور مشرق کی بہترین خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے میدان ترقی میں اپنی مغربی بہنوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہیں

اس جلسہ کی صدر اتفاق رائے سے مسز نیڈو صاحبہ منتخب ہوئی تھیں مگر وہ اس وقت جیل میں تھیں اس لئے حاضرین جلسہ کو اُن کے صدارتی خطبہ سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ جلسہ کی افتتاحی رسم رانی صاحبہ منڈی کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوئی جن کو ملک کی اصلاحی تحریکوں سے خاص دلچسپی ہے۔ حاضرین جلسہ کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ممالک غیر مثلاً یروشلم، عراق، فارس، جاوا، جاپان وغیرہ سے بھی معزز خواتین بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک جلسہ ہوئی تھیں جنھوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے ساتھ اپنی ملکی زبان ہی میں کانفرنس کی کامیابی کے متعلق اظہار خیالات کیا تھا۔

اس کے علاوہ تقریباً کل دنیا کی مشہور نسوانی انجمنوں نے کانفرنس مذکور کے لئے پیغامات ارسال کئے تھے جن کو کانفرنس کی سکریٹری مسز رفیع نے پڑھکر سنایا۔ کانفرنس میں چین، نیوزیلینڈ اور امریکہ تک کے لوگوں نے شرکت کی تھی۔

رانی صاحبہ منڈی نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ یہ کانفرنس براعظم ایشیا میں اپنی قسم کی اول کانفرنس ہے جس کا مقصد خواتین ایشیا کی ذہنی ترقی کی متحدہ کوشش کرنا اور بنی نوع انسان کی بہتری کی خاطر اُن خوبیوں کو تقویت دینا ہے جو مشرقی تہذیب کی جزو لاینفک ہیں۔ اسکے ساتھ ہی اُن تمام برائیوں کو نیست و نابود کر کے جو بحالت موجودہ پیدا ہو گئی ہیں، مغربی تہذیب کے

بہترین اوصاف کو جذب کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے مغرب کو دنیوی ترقی کی چوٹی پر پہونچا دیا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ مستورات ہند کو تبادلۂ خیالات کے ذریعہ دیگر ممالک کے تجربات سے بھی مستفید ہونا چاہیئے۔ آخر میں رانی صاحبہ نے اس بات پر زور دیا کہ اب اُن تمام دقیانوسی مراسم کو خیرباد کہدینا چاہیئے جو ہماری تمدنی زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رانی صاحبہ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت قابل قدر ہیں دنیا میں رہکر ہر شخص کے لئے دُنیوی و روحانی دونوں طرح کی ترقیاں لازمی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی مشرق و مغرب کے بہترین اوصاف سے متصف ہو۔

اِس کانفرنس میں چند نہایت مفید تجاویز پاس ہوئی ہیں۔ پہلی اور دوسری تجاویز میں ایشیا کے ہر لڑکے لڑکی کے لئے جبریہ ابتدائی تعلیم اور مذہبی تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ تیسری تجویز فروخت منشیات کی بندش کے متعلق پاس ہوئی ہے۔ چوتھی تجویز میں ایشیائی سلطنتوں سے ترقیِ صحت کے مسئلہ میں دلچسپی لینے اور دیسی طریقۂ علاج جاری کرنے کی سفارش کیگئی۔ پانچویں تجویز میں ایشیائی خواتین سے جذبۂ روحانیت کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ چھٹی تجویز میں کثرت ازدواج کی مذمت اور حقوق وراثت ورائے دہندگی اور طلاق کے متعلق شادی شدہ عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جانے کی حمایت کی گئی۔ ساتویں میں بچپن کی شادی کے انسداد کی سفارش ہے۔ آٹھویں تجویز ہر ملک میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے متعلق ہے۔ نویں میں لیگ اقوام کی حمایت ہے۔ دسویں تجویز میں قحبہ خانوں کے انسداد اور عمر رضامندی اٹھارہ سال قرار دیئے جانے کی سفارش کی گئی اور گیارھویں تجویز اس امر کے متعلق ہے کہ مزدور عورتوں کیلئے کام کے گھنٹوں، اور انکی علالت، پیرانہ سالی، زچگی وغیرہ کی حالتوں میں اعانت اور اُن کی رہایش وغیرہ کا مناسب انتظام کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے بیشتر مرد عورتوں دونوں کے لئے یکساں مفید ہیں۔ درحقیقت قوم کی مجموعی ترقی کے لئے اس قسم کی کانفرنسوں کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ جب کسی مسئلہ پر عام رائے کی مدد سے ایک موافق فضا تیار ہو جاتی ہے تو اس پر عملدرآمد میں بھی دیر نہیں لگتی۔ جو کچھ دیر ہوتی ہے وہ صرف مناسب فضا کی تیاری میں۔ اِس قسم کی کانفرنسوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تعصب و تنگ نظری کے جذبات دور ہو کر دلوں میں بلند خیالی و حق پرستی کے احساسات پیدا ہو جائیں گے جن کے بغیر کوئی قوم ترقی کے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر سکتی۔

(ا۔ ب)

علمی خبریں اور نوٹ

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) اور پنڈت برج کشن کول بیخبر صاحبان نے چھ سال کی محنت و جانفشانی کے بعد کشمیری شعرار کا ایک مبسوط تذکرہ بہار گلشن کشمیر مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ دو جلدوں میں ہے اور ہر ایک جلد کا حجم تقریباً پانچ سو صفحات ہے۔ اس تذکرہ میں دو سو چھپتر شعرائے ماضی و حال کے کلام کے نمونے فراہم کئے گئے ہیں، اور بعض نامور کشمیری شعرا کی تصاویر بھی دیگئی ہیں۔ اس کی پہلی جلد انڈین پریس الہ آباد میں زیر طبع ہے جو اُمید ہے کہ اپریل ۳۱ء تک شائع ہو جائیگی۔

چونکہ تذکرہ کی تدوین ایک قومی خدمت کی حیثیت سے ہو رہی ہے اس لئے جو کریم النفس اصحاب اس کے مصارف میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنا عطیہ دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن کے نام سرستی نواس ۱۵۱ البرٹ روڈ الہ آباد کے پتہ پر بھیجدیں۔

مولانا گرامی مرحوم فارسی زبان کے مستند شاعر تھے اور ان کا کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی مقبول عام ہو چکا ہے اب مولانا مرحوم کی بیگم صاحبہ نے ان کے کلام کو "کلیات گرامی" کے نام سے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ کلیات کی قیمت تخمیناً پانچ روپیہ ہوگی۔ جو اصحاب فارسی زبان سے ذوق رکھتے ہیں وہ بیگم صاحبہ مولانا گرامی۔ گرامی منزل۔ ہوشیارپور (پنجاب) کے پاس اپنی فرمایش بھیج سکتے ہیں۔ کلام گرامی کے قدردانوں سے مالی امداد کی بھی اپیل کی گئی ہے۔

مشہور و معروف فسانہ نگار منشی پریم چند کے کایا کلپ نامی ہندی ناول کی تنقید بہت عرصہ ہوا اس رسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس ناول کا خاص مقصد ہندو مسلم تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن میں رواداری و ہمواری پیدا کرنا ہے۔ پلاٹ کی دلکشی کے اعتبار سے یہ ناول چوگان ہستی سے بھی بہتر ہے۔ اب ہم کو یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ منشی صاحب نے اس کا اُردو ترجمہ بھی "پردۂ مجاز" کے نام سے مکمل کر لیا ہے۔ جو عنقریب ہی شائع ہونیوالا ہے۔

منشی صاحب کا ایک نیا ہندی ناول بھی (جس کا نام "غبن" ہے) زیر طبع ہے۔ اس کا حجم تقریباً

چار سو صفحات ہوگا۔ زمانۂ موجودہ کے اقتضا کے مطابق یہ ایک سوشل ناول ہے جسے منشی صاحب نے اُسی دلکش طریقہ پر تصنیف کیا ہے جو اُن کی تصانیف کا امتیازی پہلو ہے۔ آجکل پریم چند صاحب "کرم بھوم" نام سے ایک اور ہندی ناول بھی لکھ رہے ہیں۔

خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی مرحوم کو دُنیائے ادب میں جو شہرت ہو چکی ہے محتاج بیان نہیں۔ آپ نے اردو و فارسی نظم و نثر کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ آپ کا ایک دیوان شائع بھی ہو چکا ہے اب غزلیات کا ایک اور ضخیم مجموعہ تیار ہو رہا ہے آپکی ایک مفصل سوانح عمری بھی زیر تصنیف ہے۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ مولنا نور الحسن صاحب نیر کی مشہور و معروف لغت "نور اللغات" کی چوتھی اور آخری جلد (جو ک سے ے تک ہے) شائع ہو گئی ہے۔ اِس جلد کا حجم ۱۰۲۲ صفحات ہے اور قیمت چودہ روپیہ ہے اس لغت کو تیار کر کے نیر صاحب نے اُردو کی جو مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے اُس کا احسان مدت العمر تک رہیگا۔

مسٹر حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بی۔ اے "ادبی تنقید" کے متعلق ایک اہم کتاب لکھ رہے ہیں جو امید ہے آئندہ جولائی تک شائع ہو جائیگی۔ اسی موضوع پر حیدرآباد (دکن) سے بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مگر اس مد میں مزید تصانیف کی ضرورت ہے۔ ہندی میں حال ہی میں اس موضوع پر ایک قابلقدر کتاب بابو شیام سندر داس صاحب سکرٹری ناگری پرچارنی سبھا کی شائع ہوئی ہے ہمکو امید ہے کہ افسر صاحب کی تصنیف سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

تصاویر

اِس ماہ کی تصاویر میں سرورق کی رنگین تصویر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ چابکدست مصور نے حافظؒ کے مشہور شعر کے نازک تخیل کو جس کمال کے ساتھ قلمبند کر کے پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ سولھویں صدی عیسوی کی ایرانی طرز مصوری کے جو نادر نمونے ہدیۂ ناظرین ہیں انکا تعلق دراصل مصوری کے متعلق مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی کے قابل دید مضمون سے ہے جو زمانہ جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ہم نے یہ نمونے خاص اہتمام سے حاصل کئے ہیں اصل تصویریں برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں، اس سلسلے میں ہم نے اور بھی بہت سی نادر و نایاب تصویریں حاصل کی ہیں جو آئندہ نمبروں میں پیش ہونگی۔

اس نمبر کی باقی تصویریں حالات حاضرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ تمام ملک کی نگاہیں مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ انگلستان و ہندوستان کے اِن دونوں قائم مقاموں کی جو اہم ملاقاتیں آجکل دہلی میں ہو رہی ہیں خدا کرے اُن کا نتیجہ ملک و سلطنت دونوں کے لئے نیک ہی ثابت ہو۔

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم بی۔اے

نمبر ۳	مارچ سنہ ۱۹۳۱ء	جلد ۵۶

فہرست مضامین

تصاویر (۱) نورجہاں کی حسن تدبیر (رنگین) (۲) رانی نیادہ کانگڑا قلم کی مصوری کا نمونہ (۳) بوار سیل کے ایک قصبہ کا منظر

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

[illegible]

[illegible]

بال صفا

[illegible]

دودھ گھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لاہور

[illegible]

[illegible]

زمانہ

جلد ۵۶ — مارچ ۱۹۳۱ء — نمبر ۳

سرقہ و توارُد

از جناب حکیم ابو العلا ناطق لکھنوی

ہر زبان کے چند خصوصیات ہوتے ہیں اور ہر زبان کے ادب میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ دوسری زبانوں میں منتقل نہیں ہوسکتیں، اسی بنا پر یہ کہاوت مشہور ہوگئی ہے کہ "علم کی چوری نہیں ہوتی" کیونکہ سرقہ کے لئے مادّی نقطۂ نظر سے یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ انتقالِ مکانی ہو، اور علم اپنے مکان یعنی گنجینۂ سینہ سے اس طرح منتقل نہیں ہوتا کہ کوئی ناقل اُسے اپنی جگہ سے جدا کردے۔ اس لئے علم کے سرقہ میں صرف بدنیتی شرط ہے اور بدنیتی ایسی کہ جس میں اپنی نمائش ہو۔ اس ذاتی نمود کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناقل اپنے عیب کو منقول عنہ کے ساتھ ساتھ پنہاں رکھنا چاہتا ہے۔

دنیا میں ہر شاعر کم وبیش سرقہ کے الزام سے متہم ہوچکا ہے، کیونکہ وہی انتقال علم وخیال ہے جو مختلف پہلوؤں سے مختلف نام رکھتا ہے، سرقہ، اخذ، نقل، تقلید، ترجمہ۔ اخذ میں اگر مضمون بہتر نظم ہوجائے یا اس میں بہترین اضافہ ہوجائے یا کوئی اور خوبی ایسی پیدا کردی جائے جو اصل میں نہ ہو تو ایسا اخذ قابل تعریف ہے لیکن اگر کوئی مخالف اُسے بھی سرقہ کہہ دے تو کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے اُردو زبان کی ابتدا میں بکثرت اشعار ومضامین ترجمہ اور نقل کئے گئے۔ اس کا سلسلہ ولی گجراتی سے غالب و ناسخ تک رہا، قبل اس کے کہ سرقہ وترجمہ وغیرہ کی تفصیل وتمثیل پیش کی جاوے۔ انتقال علم وخیال پر چند خیالات ظاہر کرنا بیجا نہ ہوگا۔

عموماً نثر میں اور خصوصاً نظم میں چند صورتیں ایسی ہیں کہ سرقہ و ترجمہ ناممکن ہے۔ مثال میں صرف فارسی و اردو کے شعر پیش کرتا ہوں اسی پر دوسری زبانوں کا بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

(۱) حروف و الفاظ کی آواز و تلفظ سے اگر کوئی کیفیت یا محاکات پیدا ہو تو اُس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو تو بیکار رہے۔ مثلاً فردوسی کا یہ شعر:۔

زلفِ نقارہ آواز آمد بروں   کہ گردون دون ست دون است دوں

اس شعر کا مقصود اصلی یہ ہے کہ نقارے کی آواز منقوش کی جائے اور مفہوم شعر یہ ہے کہ نقارے کو آسمان سے تشبیہ دیکے آسمان کو ہیچ و ناچیز بنایا جائے۔ گو کہ تشبیہ کے لئے علامہ دوانی اور محقق طوسی نے یہ شرط لگائی ہے کہ مشبہ سے مشبہ بہ کو افضل ہونا چاہیئے اور درحقیقت نقارے سے آسمان کا افضل و اعلیٰ ہونا ظاہر و اظہر من الشمس ہے۔ مگر فردوسی کے خدائے سخن ہونے کے یہی اسباب ہوئے کہ ترکیب تشبیہ کو پنہاں کر کے نقارے کو گردوں سے بہتر دکھاتا اور نقارے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ کرے خواہ کوئی زبان کیوں نہ ہو، تو نہ یہ تخئیل آسکتی ہے نہ یہ محاکات ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ امیر خسرو کا مقصد تھا کہ ایک صاحب (جو ان کے مرشد کے پاس بیٹھے ہوئے گویا مکان کا قبالہ لکھوانا چاہتے تھے اور کھانا کھا لینے کے بعد بھی بیٹھے رہے) اُٹھ جائیں اور سمجھ جائیں کہ اُن سے تشریف لیجانے کی درخواست کی گئی ہے۔ حضرت نظام الدین کے اس سوال کے جواب میں کہ نوبت جو آدھی رات کی نوبت تھی "کیا کہتی ہے" امیر خسرو نے فی البدیہہ اپنے اس مقصد کی تصویر اور اُسکی محاکات ان الفاظ میں دکھائی۔

"نان کہ خوردی خانہ برو، نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو، خانہ برو، نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو، خانہ برو خانہ برو"

اب اگر اس کا ترجمہ کیا جائیگا تو یہ آواز پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ میں یہ حروف کہاں، اور یہ وزن کہاں۔

دوسری صورت ترجمہ نہ ہو سکنے کی یہ ہے کہ شعر کی تخئیل یا محاکات کا دار و مدار محاورات پر ہو، اور محاورے کا ترجمہ اول تو محاورے میں ہو نہیں سکتا دوسرے یہ کہ اگر ہو بھی تو محلِ استعمال میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً "پہلو زدن" فارسی میں محاورۃً ایسے موقع پر کہا جاتا ہے جب کسی چیز کو کسی چیز کے برابر لاکے اسے اُس سے بڑھا دینا مقصد ہوتا ہے، اس محاورے کو رضی سمرقندی ایسے موقع پر صرف کرتا ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

ستارہ ایست دُرِ گوشِ آن ہلال ابرو   ز روے حسن بہ خورشید می زند پہلو

میرا خیال یہ ہے کہ "میزند پہلو" کا ترجمہ اُردو نثر میں بھی نہیں ممکن، بھلا شعر میں ترجمۂ شعر کہاں ہو سکتا ہے

بلکہ صائب ایسا قادر الکلام اور مسلم الثبوت اُستاد وہ بھی اس محاورے کو اس طرح نہ کہہ سکا۔

زند پہلو بہ گردوں کو عصیانے کہ من دارم — بہ صد دریا نہ گردد پاک دامانے کہ من دارم

یا خواجہ دردؔ کے اس شعر میں محاورات ہی نے خوبیاں پیدا کی ہیں جو کہ ترجمہ میں ادا نہیں ہو سکتیں۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تیسری صورت یہ ہے کہ صنعت ایہام جس شعر میں کسی لفظ ذومعنی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ تو یہ مشکل ہے کہ اُس کے ترجمہ میں بھی ایسا ہی ذومعنی لفظ مل جائے اور وہ صنعت اور وہی خوبی پیدا ہو جائے صائبؔ کہتا ہے ؎

اہل کمال را لبِ اظہار خاموشی است — منت پذیر "ماہِ تمام" از ہلال نیست

پہلے مصرع میں یہ مضمون بطور دعوے ہے کہ صاحبانِ کمال کو اپنے کمال کے اظہار میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اُن کا خاموش رہنا خود لبِ اظہار ہے، دوسرے مصرع میں ثبوت مثالیہ پیش کرتا ہے کہ "ماہ ہلالی" جب تیس دن کا ہو کر مکمل ہو جاتا ہے تو پھر چاند دیکھنے یعنی ہلال کے نمودار ہونے کی احتیاج نہیں رہتی۔ اس شعر میں "ماہ تمام" کے دوسرے معنی "بدر" کے بھی ہیں اور خیال اُسی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں ایہام ہے اور اسی میں لطف ہے، ترجمہ کے بعد یہ خوبی کہاں۔ یا حضرت امیرؔ مینائی نے اسی طرح ایک ذومعنی لفظ استعمال کیا ہے ؎

کیا غم ہے خزاں میں جو نہیں طاقتِ پرواز — نکلیں گی جو "کلیاں" تو نکل آئیں گے پر بھی

چوتھی صورت یہ ہے کہ صرف ایک ہی لفظ کی تکرار مصرع میں ہو جو بظاہر مہمل ہو مگر استعمال کا خاص طریقہ مفہوم پیدا کر دے جیسا کہ سوزؔ کا یہ قطعہ ہے ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رُو — ارے رے رے ارے رے رے اَرے رے

تیسرے مصرع کے آخر میں "ریرو" اور پھر "رے رے" کا ریندھا دیکھنے میں تو نری "ریں ریں" ہے مگر ہر زبان میں ایسی آوازیں ہوتی ہیں جو معناً مہمل اور استعمالاً کسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ انھی سے محاکات ہو جاتی ہے۔ آبِ حیات نے اس سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ غش آیا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ غش آ گیا مگر فی الحقیقت یہ منشا اس کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اُس کیفیت کا چٹخارا ہے جو کسی قلبی لذت کو آواز کے ذریعے سے ظاہر کیا جائے غش کی محاکات "ارے رے رے رے رے رے" یعنی پہلا لفظ "ارے" پھر "رے رے" کی تکرار سے ہوتی ہے اور اس میں تین مرتبہ "ارے رے" مکرر ہے دونوں میں بہت

نازک فرق ہے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ حروف روابط یا علامات تشبیہ وغیرہ کسی لفظ سے اس طرح مربوط و چسپاں ہوجائیں کہ اُنکی تبدیلی سے محاکات برباد ہوجائے، ایسی حالت میں بھی ترجمہ بیکار ہوجاتا ہے، مثلاً لفظ "چندانکہ" علامت تشبیہ ہے اُمیدی رازی نے اس کو ایک شعر میں ایسا چسپاں کیا ہے کہ اگر اُردو میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو وہ کیفیت جو اصل شعر میں ہے پیدا نہیں ہوسکتی۔

کاش گردوں از سرم بیروں برد سودائے تو یا مرا صبرے دہد چندانکہ استغنائے تو

چھٹی صورت یہ ہے کہ شعر یا مصرع مجموعی حیثیت سے اس قدر سلیس و صاف اور زبان و ادب کی صفائی سے سہل ممتنع ہوجائے کہ اُس کا کیف و اثر اُسکی مجموعی حالت سے وابستہ ہو، ترجمہ میں اُس کی تاثیر ہرگز نہیں آسکتی۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال (عرفی) صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا (مومن) نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

بیگانہ آشنا نما تو (قدسی مشہدی) بیگانہ نمائے آشنا من

تو جان ہے ہماری اور جان ہی ہے سب کچھ (ذوق) ایمان کی کہیں گے ایمان ہی ہے سب کچھ

درآ درآ کہ ز تو کار من بجاں افتاد (انوری) عجب عجب کہ ترا یاد دوستاں آمد

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ (امیر) مجکو غصے پہ پیار آتا ہے

(عبد الرحیم خان خاناں)

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چنداست جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ساتویں صورت یہ ہے کہ نظم کا انتظام الفاظ مکرر کرکے اُلٹ پھیر سے ایسا کیا جائے کہ صرف تنظیم ہی شعر میں کیفیت شعری پیدا کردے۔ ترجمہ میں یہ اہتمام مشکل ہے۔

(نواب عاقل خاں رازی)

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

آٹھویں صورت یہ ہے کہ کوئی مثل مکمل نظم ہوجائے، ظاہر ہے کہ محاورہ و مثل کا ترجمہ دوسری زبان میں اور اُسی خوبی سے مشکل ہے۔

پیالہ در کفم و محتسب ز در گذشت (ناحق کرانی) رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے (ذوق) ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

(مصطفٰے علی خاں خوشدل)

بوسم من بے برگ و نوا برگ خارا تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پارا

نویں صورت یہ ہے کہ کسی ترکیب سے بہت سا مضمون تھوڑے سے الفاظ میں آجائے اور وہ ترکیبیں اُس زبان کے لئے مخصوص ہوں جیساکہ فارسی میں اضافتیں اور مختلف ترکیبیں جتنے مضمون کو سمیٹ لیتی ہیں کسی اور زبان خصوصًا اردو میں غیر ممکن ہے۔ اور فارسی شاعری کا جنگل معانی کے لحاظ سے جتنا گنجان ہے دنیا کی ہر زبان اتنے کم الفاظ میں اتنا مضمون پیش نہیں کرسکتی۔ عربی و سنسکرت میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ اکثر الفاظ اس قدر کثیر المعنی ہیں کہ ایک ایک لفظ کے بیسوں معانی ہیں، اور ایک ایک مفہوم کے لئے صدہا الفاظ ہیں، مگر یہ صورت دوسری ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی کی چھ صورتیں اور توصیفی کی چند صورتیں اور اسم فاعل کا اختصار اور مختلف مرکب ٹکڑے (جیسے نَو دولت۔ شیر دل وغیرہ) یہ سب مرکبات جو الفاظ کے لحاظ سے مختصر اور معانی کے اعتبار سے وسیع ہیں تمام زبانوں میں موجود نہیں ہیں۔ تلمیحات البتّہ اکثر زبانوں میں موجود ہیں مگر یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ بہرحال فارسی کے ایسے ایک شعر کا ترجمہ اردو وغیرہ کے ایک شعر میں نہیں ہوسکتا۔

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش (غالب) شہید انتظار جلوۂ خویش است گفتارش

(ترجمہ) ہکلانے سے یاقوت (لب) جس سے موتی برستے ہیں اُس (لعل لب) کی نبض والی رگ تڑپتی ہے (یا پھڑکتی یعنی جنبش کرتی اور کانپتی ہے) (گویا) اُس کی گفتگو خود اپنے جلوے کے انتظار میں شہید ہے۔ یہ صرف ترجمہ ہوا اس کے مناسبات اور لطائف لفظی و معنوی اس ترجمہ میں نہیں آئے یہ رنگ مرزا عبد القادر بیدل، جلال اسیر شوکت بخاری، غنی کشمیری، اور چند شاعروں کے یہاں زیادہ ہے

اِس نویں صورت کے علاوہ باقی تمام صورتیں حافظ کے کلام میں بکثرت ہیں اسی وجہ سے اُن کے اور اُن کے ہمرنگ شعرا کے یہاں سے چوری بہت کم ہوئی ہے۔

دسویں صورت یہ ہے کہ شعر میں کسی خاص ملک کا ذوق ہو اور دوسرے ملک میں وہ مذاق قابلِ تعریف نہیں ہے تو اس مضمون کے منتقل ہونے کی گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً فارسی کے اکثر اشعار میں "من آں مرغم" دیکھا گیا ہے، اردو میں اپنے آپ کو طائر تو کہہ سکتا ہے مگر مرغ یا مرغا نہیں کہہ سکتا یا مثلاً روزبہ شیرازی کا یہ شعر ؎

بہ ملک حسن بہ خوبی سر آمد است آں زلف کہ در نسب بہ دو جانب ز آفتاب رسد

سرقہ یا اخذ یا نقل یا ترجمہ یا تقلید زیادہ تر ان اشعار میں ممکن و آسان ہے جن میں کوئی مضمون معمولی الفاظ میں نظم کر دیا گیا ہو، اور جسکی خوبی کسی ایسی لطافت پر مبنی نہ ہو جس کا ذکر مذکورہ بالا دس صورتوں میں کیا گیا ہے۔ مضمون کے علاوہ انتقال کی دوسری صورت یہ ہے کہ مضمون سے مضمون پیدا کر لیا جائے۔ اس کو اخذ کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صرف تخئیل شعری منتقل کر لیجائے چوتھی صورت یہ ہے کہ اندازِ بیان لے لیا جائے، پانچویں صورت یہ ہے کہ اسلوب نظم سے ایک خاص رُخ جس شعر میں پیدا ہو کر شعر کو پرکیف و پُر لطف بنادے وہ رخ لے لیا جائے چھٹی صورت یہ ہو کہ لفظ بلفظ ترجمہ کر لیا جائے۔ ساتویں صورت یہ ہے کہ شعر کے اجزائے معنوی و لفظی میں سے کوئی جزو منتقل کر لیا جائے اور باقی اجزا خود اضافہ کرکے شعر مکمل کر لے کہ جس قسم کی تشبیہ یا استعارے سے شعر میں محاکات یا ندرت پیدا کی جائے اُس قسم کی چیز لیکر اُسی طرح کی لطافت شعر میں پیدا کرے۔ یہ تمام صورتیں مثالوں سے آیندہ واضح ہونگی، مگر مثالیں پیش کرنے سے پیشتر یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ تمام صورتیں اُسی وقت قابل اعتراض و نکتہ چینی ہیں جبکہ توارد نہ ہوا اور توارد کی یہ صورت ہے کہ ایک شاعر کو دوسرے شاعر کے شعر کا علم نہ ہو یا نہ رہے۔ اس کی یہ صورت ہے کہ خواہ شاعر نے شعر دیکھا یا سنا ہو مگر اپنا شعر کہتے وقت اُسے یاد نہ ہو کہ یہی یا ایسا ہی مضمون و خیال اور انداز و رُخ دوسرے شاعر کے حصّہ میں آچکا ہے، مگر ایسا شخص قابل اعتراض ٹھیرایا جاتا ہے کیونکہ یاد رکھنے کی ذمہ داری اُسی پر رہتی ہے جو یہ بھول گیا ہے کہ ماخوذ عنہ شعر وہ دیکھ یا سُن چکا ہے، اور جس شخص کا شعر شائع یا مشہور ہو گیا ہو اگر اُس سے بھی توارد ہو گا تو بھی شاعر مابعد شاعر ماقبل کا گناہگار اور نقادوں کے نزدیک قابل اعتراض ٹھیرایا جائیگا اور لاعلمی کا عذر قابل سماعت نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک شاعر کا علمی فرض ہے کہ شعرا کے کلام سے واقف ہو۔ اگرچہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شاعر تمام دنیا کے شعرا کا کلام دیکھے اور یاد رکھے مگر چونکہ یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ جب کوئی شعر شائع اور مشہور ہے تو اُس سے سرقہ کیا گیا ہو گا اس لئے صفائی ممکن نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر اس اتہام سے بری نہو سکا۔ لیکن اگر شاعر اپنے شعر میں کسی کی کوئی چیز اس طرح منتقل کرے کہ کسی اضافہ یا تبدیلی سے اس کا شعر بہتر ہو جائے یا کسی عیب کی اصلاح ہو جائے تو ایسا انتقال ہرگز قابل اعتراض نہیں بلکہ جائز ہے۔ اُردو زبان میں شاعری کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ فارسی اشعار کے بکثرت ترجمے کئے گئے۔ لہٰذا اگلے زمانے کے شعرا اس امر میں قابل اعتراض نہیں ہیں اور جس طرح اس زمانے کی بہت سی باتیں متروک ہو گئی ہیں یہ بات بھی ترک کر دی گئی ہے اور اب عیوب میں داخل ہے۔

سب سے بدتر صورت سرقہ کی یہ ہے کہ مضمون یا کوئی چیز لینے کے بعد بھی شعر اُس کے برابر نہ ہو سکے، بلکہ ترجمہ اگر ناقص ہو تو سرقہ کے برابر ہے۔ آتش نے ایک شعر میں سرقۂ شعری کی بُرائی کی ہے اور شاید روئے سخن ناسخ کی طرف ہے کیونکہ ناسخ ترجمے کیا کرتے تھے اور آتش کا یہ رنگ نہ تھا

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں (آتش) چکھی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

امیر خسرو نے محمد سلطان بن غیاث الدین بلبن کے شہید ہونے پر جو مرثیہ لکھا تھا اور جو اُن کی شہرت کا پہلا سبب ہوا اُس میں ایک شعر یہ ہے ؎

لبسکہ آبِ چشمِ خلقے شد رواں درچارسو پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

ناسخ کہتے ہیں :-

ایک ترbینی ہے دو آنکھیں مری اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

مسی آلودہ برلب رنگِ پان است (بیدل) تماشا کن تہِ آتش دخان است

مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے (ناسخ) تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

گویند کہ شب برسرِ بیمار گران است (ناصر علی) گر سرمہ بہ چشمِ تو گران است از آن است

بوریا جائے من و جائے تو نگر قالیں (علی حزیں) شیرِ قالین دگر و شیرِ نیستان است

اس شعر کا حوالہ دیکر ناسخ نے ایک شعر کہا ہے اور یہ آجتک جائز ہے ؎

فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر ہے یہی (ناسخ) شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

اصلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ناسخ و غالب دونوں یہ چاہتے تھے کہ فارسی کی روح کو اُردو قالب میں ڈھالیں، چنانچہ غالب کے اُردو دیوان میں بکثرت ایسے اشعار ہیں جن میں فارسی اشعار سے مضامین لئے گئے ہیں، اور جس شعر کا کوئی حصہ ہندوستان کے مذاق سے علیحدہ ہے اُس حصے کو بدل دیا ہے۔ اس ردو بدل نے غالب کی اردو شاعری میں اُردو کی ادبیت کے لحاظ سے ایک بدرنگی پیدا کر دی ہے، اور صدہا شعر ایسے ہیں جن میں خیال و تخئیل تو بہت بلند و نازک ہے مگر کیفیتِ شعری سے معرا ہیں۔ اس عیب کو غالب نے خود بھی محسوس کیا ہے اور کہا ہے ع

بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

غالب اس راز کو کیوں نہ سمجھے کہ زبان کی سلاست و صفائی اور حسنِ بیان شعر کی جان ہے اور سب سے بہتر شعر کی قسم جو سہل ممتنع ہے اُس میں زبان کی لطافت اور ادبی حُسن اُس کے کمال

کا جزو اعظم ہوتا ہے۔ شعر میں اگر صرف مضمون ہی مضمون ہو تو وہ شعر کی تعریف میں نہیں آتا جب تک محاکات اور تخئیل شعری نہ ہو۔ محاکات میں حصہ ادب اور شعبہ زبان لازمی ہے اور تخئیل شعری میں نصف حصہ زبان کا ضرور ہوتا ہے۔ آئندہ جو مثالیں انتقال مضمون کی پیش ہونگی اُن میں اس کا ثبوت کافی مل جائے گا۔

(حیدری تبریزی)

بچو ریزم اشک از دل آہ درد آلود می خیزد بلے چوں آب بر آتش بریزد دود می خیزد

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا (غالب) ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

فارسی اور اُردو کے یہ دونوں شعر اگر متحد الخیال ہوتے تو ترجمہ ہوتا مگر دونوں میں فرق ہے، حیدری کہتا ہے کہ جب آنسو گراتا ہوں تو دل سے نالہ نکلتا ہے اور کیوں نہ نکلے جب آگ پر پانی پڑیگا تو اُس میں دھواں ضرور اُٹھے گا۔ اِس شعر میں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ دل میں آگ ہے کیونکہ غزل کے شعر میں آتش شوق یا سوز عشق کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے مصرع میں جو بات ہے دوسرے میں اُس کی توجیہ و تفسیر ہے۔ غالب کے یہاں خیال و مضمون تو وہی ہے تخئیل شعری و ترکیب نظم میں فرق ہے جس سے شعر مکمل نہ ہو سکا۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ مصرع اولیٰ میں وہ مضمون ہے جو حیدری کے یہاں مصرعہ ثانی میں ہے یعنی آگ پر جب پانی پڑتا ہے یا جب آگ پانی میں بجھائی جاتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ غالب نے اس آواز کو ظاہر کرکے اُسے نالہ سے تشبیہ دی ہے اور حیدری نے دھواں کہکر اُسے نالہ کا مشبہ بہ بنایا ہے۔ یہ دونوں فرق کچھ ایسے اہم نہیں ہیں مگر تیسرا فرق یہ ہے کہ حیدری کے یہاں اشک ریزی کا اظہار ہے اور آتش عشق محذوف ہے اور غالب نے اشک ریزی کو بالکل ساقط کردیا ہے اور سوز غم کو محذوف رکھا ہے۔ سوز غم کے حذف میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اول تو "درماندگی" کے لفظ سے سوز غم کا اعلان ہوتا ہے دوسرے یہ کہ سوز غم کا استعارہ آگ سے کیا ہے اس لیے مستعار لہٗ کا ذکر ہونا ہی ضروری تھا، قطع نظر ان امور کے سوز غم عاشق کے لیئے ایک لازمی چیز ہے مذکور ہو خواہ مقدر، مگر غالب نے پانی کا جو ذکر کیا ہے تو پانی سے اشک کا استعارہ بہت بعید ہے، یہاں اُس تشبیہ کی ضرورت تھی جس میں مشبہ کا تذکرہ ضروری تھا یعنی اشک کا اس سے شعر ناقص رہ گیا، پہلے مصرع میں تین چیزیں ہیں آگ پانی اور صدا۔ مصرع ثانی میں آگ کے مقابل درماندگی ہے گو لفظاً تقابل صحیح نہیں ہے مگر معناً ہے کیونکہ درماندگی سے مراد سوز غم اور سوز غم

کی تشبیہ آگ سے ہے، خیر مضائقہ نہیں، اب رہا پانی اور صدا، صدا کے لئے نالہ بالکل ٹھیک ہے مگر پانی کے لئے کوئی چیز مصرعہ ثانی میں نہیں۔ بہرحال ایک نقص کے ساتھ حیدری کا مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے۔ اب خواہ یہ سرقہ ہو یا توارد ہو یا جو کچھ ہو۔

(ذوقی سمرقندی)

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذرے غالب (غالبا) ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شعر میں ذوقی کا مضمون بعینہ تو نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے ماخوذ ہے اور ذوقی کا شعر اس قدر مشہور ہے کہ توارد کا خیال گمان نیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں شعروں میں سے ہر شعر کی جان و روح یہ ہے کہ جب بندے کا خدا موجود ہے تو بندے کو ایسی بیکسی و کس مپرسی کی حالت میں نہ ہونا چاہیئے۔

میروم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن (بیدل) ہمچو عمر رفتہ یارب برنہ گردانی مرا

یعنی اپنے آپ سے میں گزرا جاتا ہوں اور یہ بھی اندیشہ رکھتا ہوں کہ کہیں پھر نہ اپنے آپ میں آجاؤں (لہذا) اے خدا جس طرح میری عمر رفتہ کو تو واپس نہ لائے گا مجھے بھی اپنے آپ میں واپس نہ لے جانا۔ یہ ترجمہ ایک شعر کا ہے اور ایک شعر میں نہیں آسکتا مگر اصل اصول اس شعر کی تخئیل کا یہ ہے کہ اپنے آپ سے گزروں اور پھر واپس نہ جاؤں۔ اس مفہوم کو غالب نے بھی ادا کیا ہے

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال (غالب) تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

خواجہ درد کا ایک فارسی شعر ہے جس کو دیکھ کے غالب کا شعر یاد آجاتا ہے۔

بہ ہیچ کار کتب خوانیت نمی آید (خواجہ درد) زجمع خاطر خود نسخۂ فراہم کن

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں (غالب) مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

ہر کس کہ زخم کاری ما را نظارہ کرد (فیاض لاہجی) تا حشر دست و بازوے او را دعا کند

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو (غالب) یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میکند وعدۂ دیدار بہ فردا امروز (راقم مشہدی) یار داند کہ امروز مرا فردا نیست

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے (غالب) کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

راقم مشہدی نے بھی فردا سے قیامت مراد لی ہے (مصرعۂ ثانی میں) ان دونوں شعروں میں مضمون و تخئیل بالکل متحد ہیں صرف لفظی فرق ہے، مشہدی کے یہاں "قیامت" مقدر ہے، غالب کے شعر میں

جزوِ اعظم ہوتا ہے۔ شعر میں اگر صرف مضمون ہی مضمون ہو تو وہ شعر کی تعریف میں نہیں آتا جب
ـ محاکات اور تخئیل شعری نہ ہو۔ محاکات میں حصہ ادب اور شعبہ زبان لازمی ہے اور تخئیل
عری میں نصف حصہ زبان کا ضرور ہوتا ہے۔ آئندہ جو مثالیں انتقال مضمون کی پیش ہونگی
ن میں اس کا ثبوت کافی مل جائے گا۔

(حیدری تبریزی)

چو ریزم اشک از دل آہ درد آلود می خیزد بلے چوں آب بر آتش بریزد دود می خیزد

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا (غالبؔ) ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

فارسی اور اُردو کے یہ دونوں شعر اگر متحد الخیال ہوتے تو ترجمہ ہوتا مگر دونوں میں فرق ہے،
یدری کہتا ہے کہ جب آنسو گراتا ہوں تو دل سے نالہ نکلتا ہے اور کیوں نہ نکلے جب آگ پر پانی
یگا تو اُس میں دھواں ضرور اُٹھے گا۔ اِس شعر میں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ دل میں آگ ہے کیونکہ غزل
ے شعر میں آتش شوق یا سوزِ عشق کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے مصرع میں جو بات ہے دوسرے
ں اُس کی توجیہ و تفسیر ہے۔ غالبؔ کے یہاں خیال و مضمون تو وہی ہے تخئیل شعری و ترکیب نظم
ں فرق ہے جس سے شعر مکمل نہ ہو سکا۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ مصرع اولیٰ میں وہ مضمون ہے جو حیدری کے یہاں مصرعہ ثانی میں ہے یعنی
ل پر جب پانی پڑتا ہے یا جب آگ پانی میں بجھائی جاتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا فرق یہ
ہے کہ غالبؔ نے اس آواز کو ظاہر کر کے اُسے نالہ سے تشبیہ دی ہے اور حیدری نے دھواں کہکر
سے نالہ کا مشبہ بہ بنایا ہے۔ یہ دونوں فرق کچھ ایسے اہم نہیں ہیں مگر تیسرا فرق یہ ہے کہ حیدری
ے یہاں اشک ریزی کا اظہار ہے اور آتش عشق محذوف ہے، غالبؔ نے اشک ریزی کو بالکل ساقط
ردیا ہے اور سوزِ غم کو محذوف رکھا ہے۔ سوزِ غم کے حذف میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اول تو
درماندگی" کے لفظ سے سوزِ غم کا اعلان ہوتا ہے دوسرے یہ کہ سوزِ غم کا استعارہ آگ سے کیا ہے
ں لیے مستعار لہٗ کا ذکر ہونا ہی ضروری تھا، قطع نظر ان امور کے سوزِ غم عاشق کے لئے ایک لازمی
یز ہے مذکور ہو خواہ مقدر، مگر غالبؔ نے پانی کا جو ذکر کیا ہے تو پانی سے اشک کا استعارہ بہت
ید ہے، یہاں اُس تشبیہ کی ضرورت تھی جس میں مشبہ کا تذکرہ ضروری تھا یعنی اشک کا اس سے
ر ناقص رہ گیا، پہلے مصرع میں تین چیزیں ہیں آگ پانی اور صدا۔ مصرع ثانی میں آگ کے مقابل
ماندگی ہے گو لفظاً تقابل صحیح نہیں ہے مگر معناً ہے کیونکہ درماندگی سے مراد سوزِ غم اور سوزِ غم

کی تشبیہ آگ سے ہے، خیر مضائقہ نہیں، اب رہا پانی اور صدا، صدا کے لئے نالہ بالکل ٹھیک ہے مگر پانی کے لئے کوئی چیز مصرعۂ ثانی میں نہیں۔ بہرحال ایک نقص کے ساتھ حیدری کا مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے۔ اب خواہ یہ سرقہ ہو یا توارد ہو یا جو کچھ ہو۔

(ذوقی سمرقندی)

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم   گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذرے غالب   (غالب)   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شعر میں ذوقی کا مضمون بعینہ تو نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے ماخوذ ہے اور ذوقی کا شعر اس قدر مشہور ہے کہ توارد کا خیال گمان نیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں شعروں میں سے ہر شعر کی جان و روح یہ ہے کہ جب بندے کا خدا موجود ہے تو بندے کو ایسی بیکسی و کس مپرسی کی حالت میں نہ ہونا چاہیئے۔

میروم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن   (بیدل)   ہمچو عمر رفتہ یارب بر نگردانی مرا

یعنی اپنے آپ سے میں گزرا جاتا ہوں اور یہ بھی اندیشہ رکھتا ہوں کہ کہیں پھر نہ اپنے آپ میں آجاؤں (لہذا) اے خدا جس طرح میری عمر رفتہ کو تو واپس نہ لائے گا مجھے بھی اپنے آپ میں واپس نہ لے جانا۔ یہ ترجمہ ایک شعر کا ہے اور ایک شعر میں نہیں آسکتا مگر اصل اصول اس شعر کی تخئیل کا یہ ہے کہ اپنے آپ سے گزروں اور پھر واپس نہ جاؤں۔ اِس مفہوم کو غالب نے بھی ادا کیا ہو

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال   (غالب)   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

خواجہ درد کا ایک فارسی شعر ہے جس کو دیکھ کے غالب کا شعر یاد آجاتا ہے۔

بہ ہیچ کار کتب خوانیت نمی آید   (خواجہ درد)   زجمعِ خاطر خود نسخۂ فراہم کن

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں   (غالب)   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

ہر کس کہ زخم کاریِ ما را نظارہ کرد   (فیاض لاہجی)   تا حشر دست و بازوے او را دعا کند

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو   (غالب)   یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میکند وعدۂ دیدار بہ فردا امروز   (راقم مشہدی)   یار دانستہ کہ امروزِ مرا فردا نیست

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے   (غالب)   کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

راقم مشہدی نے بھی فردا سے قیامت مراد لی ہے (مصرعۂ ثانی میں) ان دونوں شعروں میں مضمون و تخئیل بالکل متحد ہیں صرف لفظی فرق ہے، مشہدی کے یہاں "قیامت" مقدر ہے، غالب کے شعر میں

امر وزنہاں ہے اور دونوں نمایاں ہیں۔

تنہا نصیبِ من غم و دردِ حبیب نیست (زلالیؔ خوانساری) از ہیچ درد و غم دلِ ما بے نصیب نیست

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں (غالبؔ) تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

زلالی کہتا ہے کہ مجھے صرف معشوق ہی کا غم نہیں ہے، تمام دنیا کے رنج و غم میری قسمت میں لکھا غالبؔ کے شعر میں یہ ہے کہ تو اگر وفا بھی کرے تو کیا ہو سکتا ہے، تیرے ظلم و ستم کے علاوہ بھی ہم پر بہت سے ستم ہوئے۔ مفہوم ایک ہی ہے الفاظ و تخیل میں فرق ہے اور غالبؔ کے یہاں تلافی و وفا کا اضافہ ہے مگر شعر ہے زلالی کا مطلع ہے۔

در شراب چیزِ دیگر ریختی (شمس تبریز) بادہ تنہا نیست، ایں آمیختی

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ شراب صرف شراب نہیں ہے بلکہ اس میں تو نے (ساقی نے) کچھ اور بھی ملا دیا ہے

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام (غالبؔ) ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

غالبؔ کا مصرعۂ ثانی تو بالکل وہی ہے جو شمس تبریز نے کہا ہے مگر غالبؔ کا مصرعِ اولی کچھ اور کہتا ہے جس نے دونوں شعروں میں ایک عجیب و غریب اور قابلِ ذوق و التفات فرق پیدا کر دیا ہے غالبؔ کا شعر یہ ظاہر کر رہا ہے کہ کوئی چیز زہر کی قسم کی ملا دی ہے اور شمس تبریز ایک نہایت ہی لطیف بات کہہ رہے ہیں اُن کا مفہوم یہ ہے کہ شراب میں ایک ایسی کیفیت ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور کوئی کیف افزا چیز ملی ہوئی ہے، دونوں کے مذاق کی بلندی و پستی قابلِ غور ہے، اور "چیزِ دیگر" کا کنایہ اہلِ ذوق کے لئے مخصوص ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں مصرعۂ ثانی متحد اور مصرعۂ اولی مختلف ہے۔

اے کوشش رغبتم احول شدے چو چشم (طالبؔ آملی) تا ہرچہ گفتی از تو مکرر شنیدمے

بہرا ہوں مَیں تو چاہیئے دونا ہو التفات (غالبؔ) سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

طالب آملی کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ "کاش میرے کان احول ہوتے جس طرح بعض لوگوں کی آنکھیں اَحوَل ہوتی ہیں (احول چشم ایک چیز کو دو دیکھتا ہے) تاکہ جو کچھ تو کہتا میں مکرر سنتا (اور لذت سماعت مکرر حاصل ہوتی)" غالبؔ نے معشوق کی بات کو مکرر سننے کے لئے بہرا بن جانا اختیار کیا دونوں کا اختلاف مذاق و امتیاز مذاق محتاجِ شرح نہیں۔ اور یہ اتحاد ظاہر ہے کہ دونوں اپنے معشوق کی ہر بات کو مکرر سننا چاہتے ہیں۔

از ضعفِ دل مناں فریدوں ز بیکسی (فریدوں خراسانی) بیدار دل قوی کہ کسِ بیکساں خداست

بیدل نہ بیگانگیِ خلق سے غالب (غالب) کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

دونوں کی تخئیل متحد ہے اور رنج بھی ایک ہی ہے کیونکہ دونوں مقطعے ہیں مگر فریدون کے شعر میں ضعف و قوت کا مقابلہ ہے اور غالب نے بیگانگیِ خلق اور یگانگیِ خالق کا تقابل کیا ہے۔ مذاق کے لحاظ سے غالب کا شعر بہتر ہے۔

زخضر عمر فزون است عشق بازاں را (کم گو کشمیری) اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں (غالب) شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

مصرعۂ اول میں بہت تھوڑا سا فرق ہے کم گو نے طول عمر کے لئے خضر کو پیش کیا، غالب نے اجمال سے محاکات کا رنگ پیدا کیا ہے دونوں نے مطلع کہا ہے، لیکن کم گو کے یہاں ایطا ہے اور غالب کا مطلع بے عیب ہے۔

ستارہ ایست درِ گوشش آں ہلال ابرو (رضی سمرقندی) ز روے حسن بہ خورشید میزند پہلو

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا (غالب) کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

اس اتحاد کو اخذ کہہ سکتے ہیں کیونکہ دونوں میں مفہوم کا اختلاف ہے، رضی نے بندے کے موتی کو ستارہ بنا کے خورشید سے بلند کر دیا ہے، غالب نے اُسی موتی کو گلے کی چپاکلی میں گوہر فروش کا کوکب طالع دکھایا ہے۔ رضی نے "بخورشید میزند پہلو" سے ادب کے آفتاب کو شرف بخشا، غالب نے گوہر فروش کے اوج طالع میں جوہر پیدا کر دیا ہے۔ رضی نے "دُرِ گوش" کہہ کے سامعہ کو نور پہونچایا ہے، غالب نے "عقد گردن" سے آنکھوں کو منور کر دیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ دونوں میں کون ایک دوسرے سے کم یا زیادہ ہے۔

اخذ ایک ایسی وسیع اور باریک چیز ہے کہ جس کو اس کا سلیقہ ہے اُس کی نکتہ چینی کرنا بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ یوں تو سرقہ کے تمام اقسام میں ثبوت دشوار ہے، خصوصاً اخذ کی باریکی، ثبوت و دلائل کو دور ہی سے رد کر دیتی ہے۔

آرزو (سراج علی خاں) کے ایک شاگرد ثبات کا شعر ہے ؎

باآنکہ ہمہ عمر نہ رفتم ز درِ او پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے گھر بار کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور اُسی کے در پر پڑا رہتا ہوں، مگر از راہِ ناز مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ "آپ کا دولت خانہ؟"

غالب کا ایک شعر ہے ؎

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے (غالبؔ) یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
یہ ایک خیال ہے کہ اس کا خیال ثباتؔ کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر کوئی ثبوت و دلیل نہیں ہے
اسی طرح آصفی شیرازی کا ایک شعر ہے ؎

تو ہم در آئینہ حیراں زحسنِ خویشتنی — زمانہ ایست کہ ہر کس بہ خود گرفتار است
شکوۂ سنج رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے (غالبؔ) میرا زانو مونس، آئینہ تیرا آشنا

یعنی دونوں اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں، اور دونوں کا ایک ایک مونس و دمساز ہے، لہذا باہم دگر شکوہ نہیں کرسکتے، میرا زانو مونس ہے اور تیرا آئینہ آشنا ہے۔ اخذ اگر ہوسکتا ہے تو اس شعر میں بھی ہوسکتا ہے۔

(آذری طوسی اسفرائنی)

جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذری — شرمندہ از تو گشت کہ جانِ دگر نداشت
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی (غالبؔ) حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حاصل اس شعر کا بھی یہی ہے کہ اگر دوسری جان ہوتی تو اُسے نثار کرکے حق محبت ادا کرتے۔ اس بات پر شرمندہ ہونا عاشق کی غیرت وحمیت کا خاصہ ہے۔ اسی قسم کا غالبؔ نے ایک اور شعر کہا ہے جس پر یہی احتمال ہوتا ہے کہ ماخوذ ہے۔

ہم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو (غالبؔ) ہمیں دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا
نکہت گل رسا نہ پیغامے (ابوتراب ترابؔ) بیدماغی نہ داد ہیچ جواب

یا خضری لاری کا یہ مصرع۔ در بزم او کسے بہ بدی ہم نہ برد نام
اور غالبؔ کا یہ مصرع — ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
یا شیدائی دیوانہ کا یہ مصرع — با خضر کس نہ گفت کہ عمرت دراز باد
اور غالبؔ کا یہ مصرع — دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

بہرحال اِن مثالوں سے مجھے صرف سرقۂ غالبؔ کا اعلان منظور نہیں ہے بلکہ میں سرقہ یا توارد یا اخذ یا تقلید یا نقل و ترجمہ کے تنوعات دکھا کر ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ یہ عیوب جس طرح غیر مادی ہیں الزام بھی غیر مادی اور غیر مدلل ہے، لہذا چند وجوہ سے اس قصور کو عیوب شعر سے خارج کردینا چاہیئے، اور ان مختلف الاثر صورتوں کو سرقہ کے تحت میں لاکر کسی کی تشہیر کرنا زیبا نہیں ہے جیساکہ آجکل اس قسم کے مضامین بہ کثرت شائع ہورہے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ

کہ جس عیب سے دنیا میں کوئی شاعر خصوصاً متاخرین میں سے ایک بھی بچ نہیں سکتا اُس کو عیب ہی نہ کہنا چاہیئے اکثر مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ گو ہر انسان گناہگار ضرور ہوتا ہے مگر نیکی و بدی کا توازن اور اندازہ بھی ہوگا جس کی برائیاں وزن میں زیادہ ہونگی وہی قابل سزا و ملامت ٹھہرے گا۔ یہاں یہ ہے کہ الزام سرقہ ہر شاعر پر عائد ہو سکتا ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اتنے قیود ہیں کہ دنیا کی کسی شاعری میں اتنی جکڑبندیاں نہیں اس لیے عیوب و اغلاط اور نقائص کا کچھ شمار ہی نہیں۔ اُن سب پر طرّہ یہ کہ اور عیبوں سے اگر بچ گیا تو سرقہ کے الزام سے بری نہیں ہو سکتا تو شعر کہنا کیا ہوا کہ اٹھارہ ہزار عالموں کے عذاب میں گرفتار ہونا ہوا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مادہ نکتہ چینی اور تنگدلی کا ہے کسی اور ملک میں نہیں۔ یہاں ایسے نقادوں کے لئے اسلحہ کی فراوانی پیدا کرنا مظالم کا ایک مینہ برسانا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب سرقہ کا ملزم مشتبہ ہے اور توارد کا امکان کئی صورتوں سے ہے مثلاً شعر نہیں دیکھا یا دیکھا اور سنا تو مگر یاد نہیں رہا تو اس شبہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیئے۔

پانچویں وجہ ان سب سے بڑی یہ ہے کہ تمام دنیا کے اشعار کا علم ہونا اور پھر سب کو یاد رکھنا خصوصاً شعر کہنے کے وقت جبکہ شاعر ایک ایسے وجدان کی حالت میں ہوتا ہے جس کو انتہائی ہوشیاری اور انتہائی بے ہوشی کا بَین بَین کہنا چاہیئے۔ ناممکن اور قوتِ انسانی سے باہر ہے۔ اور شاعری جبکہ ایک ہی اصول پر اور ایک ہی منزل پر پہونچتی ہے تو پھر توارد نہ ہونا امر فطری کے خلاف ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ لاکھوں آدمی ایک ہدف پر اپنے اپنے تیر مختلف مقامات سے پھینکیں اور کوئی دو تیر بھی ایک نقطے پر نہ بیٹھیں۔ میرے خیال میں ناوکِ خیال کا متحد الوقوع ہوجانا ایک واقعۂ ناگزیر ہے۔ اب میں ایسے شعرا کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کا شمار متقدمین میں ہے کہ زمانہ سلف میں توارد کا احتمال اس قدر نہ تھا جس قدر اب ہے اور ہوتا جارہا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کے اشعار پیش کرونگا اُن کی ہستیاں اس قدر جلیل القدر ہیں کہ اُن پر سرقہ کا الزام لگانا خود ملزم بننا ہے دیکھیئے مولانا جامی کا یہ شعر مشہور ہے ؎

جانِ تنِ فرسودہ را باغمِ ہجراں گزاشت طاقتِ مہماں نداشت خانہ بہ مہماں گزاشت

اور اب انوری کا شعر پڑھیئے۔

مرا غذنگِ تو مہمانِ خانۂ بدن است کسیکہ خانہ بہ مہماں گزاشت جانِ من است

علی حزیں کا یہ مصرع مشہور ہے۔ بہ پستاں آمدن خونِ جگر را شیر می سازد
اور مولانا روم کا یہ مصرع کسکو یاد نہیں ہے۔ مدتے بایست تا خوں شیر شد
تشبیہی کاشی ایک لاجواب شاعر تھا اُس کا شعر ہے ؎

کفِ پا بہ ہر زمینے کہ رسد تو نازنیں را　　بہ لبِ خیال بوسم ہمہ عمر آں زمیں را

اور اسی مضمون کا شعر جو اس کا ماخوذ عنہ ہو سکتا ہے مولانا جامی آج سے چار سو برس پہلے کہہ چکے ہیں

چو نتوانم کہ بوسم لعلِ رخشش　　بہ ہر جا بگذرد بوسم زمیں را

حزیں کا ایک ہمعصر حیرتی تھا دونوں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

اے وائے بر اسیریِ صیاد رفتہ باشد (حزیں) در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد
ماند در زلفِ تو دل وائے بر آں صید اسیر (حیرتی) کہ بدام افتد و از خاطرِ صیاد رود

خواجہ عزیز الدین کشمیری ثم لکھنوی کو کون نہیں جانتا، فارسی زبان اور قادر الکلامی میں ہر ایرانی اُن کو جواب نہیں دے سکتا اُن کا ایک شعر نعت میں ضرب المثل ہے۔

دہد حقِ عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را　　بہ خاصاں شاہ می بخشد مئے نوشیدۂ خود را

مگر اُن سے دو سو سال پہلے آثر شفیعائی شیرازی جو کچھ کہہ گیا ہے وہ بھی سنیئے۔

دوستاں را کسوتِ تجرید پوشاند خدا　　شاہ می بخشد بہ خاصاں خلعتِ پوشیدہ را

بابا فغانی کی بابت تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وحشی، حکیم ثنائی، رکن مسیح، عرفی اور شفائی ایسے شعرا اُس کے متبع اور مقلد تھے اُنکا ایک مطلع ملاحظہ ہو ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اور اب خسرو کا بھی یہ شعر پڑھیئے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی تخم کا وہ درخت ہے ؎

در ادائے حسن بہ روئے تو چیزیست　　کہ آں را کس نمی داند چہ نام است

نظیری نیشاپوری کے تعارف کی ضرورت نہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست　　در دل ہوسے ہست ندانم کہ کدام است

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی جو کہ نظیری سے تقریباً دو سو برس پہلے تھے اُن کا یہ شعر ہے ؎

گہ شادم و گہ غمگیں از حال خودم غافل　　گہ گریم و گہ خندم چوں طفل بہ خواب اندر

ایسی ہزاروں مثالیں ہیں، اور صرف مضامین ہی نہیں بلکہ پورے پورے اشعار اور تمام و کمال غزلیں متوارد موجود ہیں مثلاً ایک غزل کی غزل جو خواجہ حافظ شیرازی کے بھی دیوان میں

ہے اور سلمان ساؤجی کے کلیات میں بھی لفظ بہ لفظ جلوہ فرما ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

زباغِ وصل تو یابد ریاضِ رضواں آب　　زتابِ ہجر تو وارد شرارِ دوزخ تاب

غرضکہ سرقہ کا الزام جب تک کہ ثبوت و دلیل کافی نہ ہو کسی پر لگانا نیک نفسی سے بعید ہے۔ خصوصاً ایسے اشخاص پر جو بالطبع جدت طراز ہوں اور جنھوں نے اُس سے بہتر صدہا شعر کہے ہوں۔

مذہب

مذہب دماغ میں قادرِ مطلق کی یاد تازہ کرکے مشکلات میں انسان کا رفیق ہوتا ہے، زمانۂ امارت میں انسان کے بیمانہ جذبات کو قابو میں رکھتا ہے۔ عالمِ حزن و یاس میں جب یگانے بیگانے ہو جاتے ہیں اور انسان موت کو حیات پر ترجیح دینے لگتا ہے تو مذہب کا زبردست ہاتھ ہی اس کو خودکشی سے بچاتا ہے۔

مذہب کی وساطت کے بغیر انسان توہمات کے بحرِ ناپیدا کنار کو عبور نہیں کر سکتا۔

حریص کی تشنگی کو مذہب کا امرت ہی بجھاتا ہے، اور اُس کو وہ عجیب دنیا نظر آتی ہے جہاں قناعت کے سکے کا چلن ہے اور اشرفیاں ٹھیکریوں کے مول بکتی ہیں۔

مذہب کا قوی ہاتھ انسان کو خیالی خطروں سے بچاتا اور حقیقی خطروں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔

مذہب وہ نرمل دھارا ہے جو حقیقت کے سمندر سے جا ملتی ہے اور جو شخص عقیدت کی کشتی میں سوار ہو کر اس پر سے گزرتا ہے وہ بھی بالآخر حقیقت کے سمندر تک پہونچ جاتا ہے۔

مذہب وہ آئینہ ہے جس میں انسان کو خود شناسی کے خط و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔

مذہب خود پسندی کی، جو تمام انسانی معائب کی جڑ ہے بیخکنی کر دیتا ہے۔

مذہب ہی ہم کو سچی محبت سکھاتا ہے جس کی قیمت ایک مملکت بھی ادا نہیں کر سکتی۔

مذہب کیا ہے؟ عین شاہدِ فطرت جس کی رعنائی عقلی آرائشوں سے بے نیاز ہے۔

ہاں! تو پھر مذہب کیا ہے؟ عین فطرت ہے، چند ٹھوس اور کھلی ہوئی حقیقتیں ہیں فضولیات سے مبرّا اور خرافات سے منزّہ۔

(محمود اسرائیلی)

امنِ عالم کی تیاری

(از جناب منوہرلال طالب بی، اے (آنرز) ایل ایل، بی - چکوال)

رسالہ "زمانہ" بابتہ ماہ دسمبر ۳۰ء کے مضمون "امن عالم" میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ موجودہ اقتصادی جدوجہد میں پرانی دنیا کی سب سے بڑی مملکت سلطنت برطانیہ اور نئی دنیا کی سب سے بڑی طاقت جمہوریہ آمریکہ ایک دوسرے کے سب سے بڑے حریف ہیں۔ آجکل آلات و قواعد جنگ وہ نہیں رہے جو کسی زمانہ میں ہوا کرتے تھے، اور وجوہات جنگ میں بھی لازمی طور پر تغیر ہو گیا ہے، اب لڑائیاں اقتصادی اور محض اقتصادی وجوہ سے ہوتی ہیں۔ جنگ یورپ (۱۹۱۴-۱۸ء) جیسے جنگ عالم کہنا بجا نہ ہوگا اس دعوے کی ناقابل تردید دلیل ہے، ان حالات میں یہ قیاس واہمہ نہیں ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی اقتصادی رقابت رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔ اور ممکن ہے دنیا میں ایک عظیم جنگ چھڑ جائے جس کے اوّلین مدّعی برطانیہ اور امریکہ ہوں۔

فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان وغیرہ بھی اس اقتصادی دوڑ میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لے رہے ہیں، اُن کے دلوں میں بھی اقتصادی رقابت کی آگ مشتعل ہے۔ جس کی بنا پر سیاسی رقابت اور پولیٹیکل بے اعتمادی کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ جو جذبات امریکہ اور برطانیہ کے سینوں میں ایک دوسرے کے خلاف متحرک ہیں وہی ان حریفان کار کے دلوں میں ایک تہلکہ برپا کر رہے ہیں لیکن وہ اپنی معاملہ فہمی اور فطری ہوشیاری کے باعث اُنھیں بے محل نمایاں کرنے کو تیار نہیں۔ ہاں مناسب موقع اور موافق ماحول کی تاک میں ہیں اور جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، یہ موقعہ اُنھیں اُن کے خیال سے آئندہ اینگلو امریکن جنگ میں ملے گا۔

روس کی تو بات ہی اور ہے اس نے سوشل اور اقتصادی انقلاب پیدا کر کے دنیا کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں۔ تمام "ملوکیت پرست" حکومتیں اُسے "خطرۂ عظیم" سمجھتی اور اس کے خلاف دورِ حاضرہ کے موثر ترین حربہ "پراپیگنڈا" کا بڑی شد و مد سے استعمال کر رہی ہیں۔ اور یہ کوئی غیر متوقع یا خلاف

قدرت بات نہیں، جہد للبقا ایک ہمہ گیر جذبہ ہے۔ موجودہ اشتراکی روس کی کامیابی ملوکیت پرستوں کے اقتدار بلکہ ان کی ہستی کے لئے پیغام اجل سے کم نہیں، پھر کیا تعجب ہے کہ وہ اُس کی نیستی کے درپے ہوں۔ اُس کی نیستی میں اُن کی ہستی، اُس کی بدنامی میں اُن کی نیک نامی، اور اُس کی ناکامی میں اُن کی کامیابی مضمر ہے۔ اس لئے روس اور تمام ملوکیت پرست دنیا مدمقابل ہیں، خدا جانے کب اور کس بات پر اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ملجائے۔

بہرکیف یہ ظاہر ہے کہ اس وقت "امن عالم" کی امید ایک خوش آیند آرزو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیا روز بروز ایک عظیم جنگِ عالم کے نزدیک اور امن عالم سے دور ہوتی جاتی ہے۔

رنگِ عالم دیکھ کر کہتا ہے پیر لم یزل محوِ حیرت ہوں کہ دنیا سے کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ چند سطور پڑھنے کے بعد آپ پر جنگ کے ذہنی وجوہ عیاں ہو گئے ہونگے۔ اب ہم مختصراً یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آیا یہ اقتصادی رقابت کی آگ دلوں ہی میں سلگ کر رہ جاتی ہے یا اُن حکومتوں کے عمال اور ارباب حل و عقد پر بھی اس کا کچھ اثر ہوتا ہے اور آیا ان کے اعمال سے اس اثر کا اثبات اور موازنہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغربی اقوام ہم ہیچ مکن ہندوستانیوں کی طرح نہیں جو اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت نہ رکھتی یا ضرورت نہ سمجھتی ہوں۔ وہ ہمیشہ وقت کو آگے سے ہو کر لیتی ہیں، آئندہ مصیبتوں کے لئے پیش از وقت تیاری شروع کرتی ہیں اور اس لئے کوئی مصیبت اُنھیں اچانک نہیں آگھیرتی۔ وہ شیوۂ تسلیم و رضا سے ناواقف اور آیۂ پیش دستی کے معتقد ہیں، اور اسی سبب سے وہ دنیا میں اس قدر ممتاز اور ذی اقتدار ہیں۔

جنگ یورپ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ فریقین نے بڑی بلند آہنگی سے دعاوی کئے کہ یہ جنگ دائمی امن و صلح کی خاطر لڑی جارہی ہے اور اسی جنگ سے "جنگ" کا خاتمہ ہو جائیگا۔ دنیا امن سے مانوس اور لڑائی سے مبرا ہو جائیگی، اور آئندہ نسلیں مسلسل امن و آرام کے باعث "جنگ" کے نام تک سے ناآشنا ہو جائینگی۔ اسی کے متعلق "انجمن اقوام" نے بھی کیا کام کیا؟ یہ ایک علیحدہ مضمون ہے۔ امن عالم یا جنگ عالم کی تاریخ میں یہ جنگ یورپ بھی جسمیں کم و بیش ....۱۰ آدمی مقتول اور ....۲ مجروح ہوئے، اور جن میں سے لاکھوں آدمی عمر بھر کے لئے ناکارہ ہوگئے، ایک یادگار رہیگی۔ دنیا کی تاریخ قبل جنگ و بعد جنگ ہر دو ازمنہ کے متعلق جدا جدا طرز پر لکھی جائیگی۔ یہ جنگ بمنزلہ ایک حدِ فاصل کے ہے جو ادھر اور اُدھر کے حالات میں تقابل پیدا کرکے انہیں زیادہ واضح اور قابل فہم بنا دیتی ہے۔ ۱۹۱۳ء تک کے حالات اور اعداد و شمار اس حد کے ایک طرف

رہنگیے اور بعد والے دوسری طرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اِس جنگ (جسے "خاتم الجنگ" کہا جاتا ہے) کے پہلے دنیا "امن عالم" کے زیادہ نزدیک تھی یا اس کے بعد۔ ہم سنہ ۱۹۱۳ء اور جنگ کے بعد والے سنین کے متعلق چند سربرآوردہ حکومتوں کی فوجی طاقت کے اعداد و شمار ناظرین کے سامنے رکھتے ہوئے اِس کا فیصلہ انھیں پر چھوڑتے ہیں۔

آج امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان دنیا کی پانچ بڑی طاقتیں ہیں، پس ہم دنیا کی طاقت کا اندازہ اُنھیں ممالک کی فوجی طاقت سے لگا سکتے ہیں۔ اس لئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار ان کے مجموعی فوجی اخراجات و فوجی تعداد کو مدنظر رکھکر درج کئے گئے ہیں۔ ہر ایک ملک کے اعداد و شمار جمع کرنا نہ صرف مشکل بلکہ بے سود بھی ہے کیونکہ باقی ممالک کی فوجی طاقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ان پانچوں سلطنتوں کی برّی فوج کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے:۔

سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۲۷ء	سنہ ۱۹۲۸ء
۱ ۷۵۳ ۰۰۰	۱ ۸۹۶ ۰۰۰	۱ ۸۶۵ ۰۰۰

یعنی جنگ سے پہلے کی نسبت سنہ ۱۹۲۸ء میں برّی افواج کی تعداد میں بقدر ۱۱۲۰۰۰ کے اضافہ ہوا اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ جنگ یورپ اور اس کے بعد کے زمانہ میں برّی افواج کی وہ اہمیت نہیں رہگئی جو اس سے پہلے تھی۔ اب تو لڑائیاں بحری، ہوائی اور سائنٹیفک جنگی طاقتوں کے ذریعہ لڑی جاتی ہیں۔ اس جنگ سے پہلے جرمنی کے سوا باقی سلطنتوں کی ہوائی طاقت ناقابل لحاظ تھی۔ دوران جنگ میں ضرورتاً اُنھوں نے بھی اس طاقت کی کچھ نہ کچھ تعمیر کی مگر جنگ نے ہوائی طاقت کی اہمیت دُنیا پر روشن کردی اس لئے اس سے فراغت پاتے ہی ساری "امن جو" طاقتیں اسی طرف متوجہ ہوئیں

قبل از جنگ جرمنی کی ہوائی طاقت بے نظیر تھی مگر شکست نے اُس طاقت کو بھی کسی قدر زائل کردیا تھا مگر پھر بھی جرمنی ناقابل لحاظ نہیں۔ اس لئے ذیل کے اعداد میں متذکرہ بالا سلطنتوں کے علاوہ جرمنی کے جنگی ہوائی جہاز بھی شامل ہیں:۔

سنہ ۱۹۲۳ء	سنہ ۱۹۲۵ء	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۷ء
۲ ۷۲۳	۴ ۰۹۹	۴ ۳۰۰	۴،۷۳۰

اِس شعبہ میں بھی دنیا کی جنگی طاقت نے نمایاں ترقی کی ہے جو چار سال کے قلیل عرصہ میں ۲۷۲۳ سے ۴،۷۳۰ یعنی دوگنی ہوگئی ہے۔

اب بحری طاقت کو لیجیئے۔ قبل از جنگ ہوائی جہازوں کے لئے مخصوص جہاز جنگی بیڑوں

میں شامل نہ رہتے تھے۔ اُن کی ضرورت اور اہمیت بعد کی باتیں ہیں۔ ان کی افزونی بھی قابل غور ہے:۔

	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۳۰ء
برطانیہ	۳۰ ۰۰۰ ٹن	۸۸ ۰۰۰ ٹن
جاپان	۱۵ ۰۰۰ "	۶۹ ۰۰۰ "

آبدوز جنگی کشتیوں کی ہلاکت آفرینیوں اور بہ حیثیت آلۂ حرب ان کی ہمہ گیر حشر خیزیوں سے کون انکار کرسکتا ہے؟ جرمن آبدوزوں نے ایام جنگ میں جو قیامت ڈھائی تھی وہ کس سے پوشیدہ ہے، آخر "سمندر کی واحد ملکہ" بھی ان شیطانی حملوں سے گھبرا اُٹھی تھی۔ مگر اُس وقت کی بات جانے دیجئے اور مہلت سے فائدہ اُٹھانے اور تجربات عارضی سے سبق سیکھنے والے لوگوں کی پرانی باتوں کو بالائے طاق رکھکر ذرا آبدوز کشتیوں کی تعداد کو بہ نظر غور ملاحظہ فرمائیے۔ یاد رہے کہ یہ کشتیاں موجودہ بحری بیڑوں کا موثر ترین اور اہم ترین اجزا ہوتی ہیں۔

	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۷ء
برطانیہ	۵۵ ۰۰۰ ٹن	۴۶ ۰۰۰ ٹن	۸۰ ۰۰۰ ٹن
امریکہ	۲۱ ۰۰۰ "	۸۰ ۰۰۰ "	۹۲ ۰۰۰ "
جاپان	۵ ۰۰۰ "	۳۷ ۰۰۰ "	۵۰ ۰۰۰ "
فرانس	۴۱ ۰۰۰ "	۳۸ ۰۰۰ "	۱۲۵ ۰۰۰ "
اٹلی	۱۶ ۰۰۰ "	۱۸ ۰۰۰ "	۴۸ ۰۰۰ "

آجکل ایک اور نئی وبا پھیل رہی ہے۔ باقاعدہ تنخواہ دار فوجیوں کے علاوہ تمام مہذب ممالک میں متعدد سوشیل و پولیٹیکل انجمنوں کی تعداد ترقی پر ہے اور اُن کے ممبر بھی بوقت ضرورت معمولی قواعد اور تربیت کے بعد باقاعدہ فوج کا کام دے سکتے ہیں۔ اس لئے انھیں بھی فوجی طاقت کا ایک حصہ سمجھنا چاہئیے۔ دراصل یہ ریزرو فوجی طاقت ہے اور اس کی تعداد میں بھی نمایاں ترقی ہورہی ہے:۔

	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۲۷ء	سنہ ۱۹۲۹ء
فرانس	.	۱۰۴۰ ۰۰۰	۱۱۰۰ ۰۰۰
برطانیہ	.	۵۰۰ ۰۰۰	۵۵۰ ۰۰۰
امریکہ	۳۳۰ ۰۰۰	۱۵۹۱ ۰۰۰	۱۷۲۷ ۰۰۰

	۱۹۱۳ء	۱۹۲۷ء	۱۹۲۹ء
اٹلی	.	۲۱۸ ۰۰۰	۲۵۹ ۰۰۰
جرمنی	.	۳۶۳۰ ۰۰۰	۵۰۰۰ ۰۰۰

اعداد و شمار بعض طبائع کے ناپسند ہوتے ہیں، اسی لئے ہم نے حتی الوسع نہایت اختصار سے کام لیا ہے، مگر یہ اعداد اپنی کہانی نہایت دلیری اور ایمانداری سے کہتے ہیں۔ ان سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کی موجودہ فوجی طاقت جنگ یورپ کے پہلے کی طاقت سے بہت زیادہ ہے جس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یہ سب باہمی اقتصادی رقابت اور بین الاقوامی بداعتمادی کا نتیجہ ہے۔ لیکن آخر اس دوڑ کی کوئی حد بھی تو ہوگی، اور وہ حد ایک جنگ عالم ہے، یہ اور بات ہے کہ مغرب میں بھی مہاتما گاندھی کا جادو چل جائے، اور وہاں کے مادہ پرست طبائع میں ایک انقلاب پیدا ہو کر یہ بلا دُنیا کے سر سے ٹل جائے، ورنہ بصورت دیگر واقعات حاضرہ تو ایک نہایت ہی ناخوشگوار مستقبل کی طرف انگشت نمائی کر رہے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا ابھی "امن عالم" کے لئے کافی تیاری نہیں ہوئی؟

خیرات

میں سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک فقیر نے آ کر میرے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، اُسکی آنکھیں سُرخ تھیں، آنسوؤں سے بھری ہوئیں، ہونٹ نیلے تھے، کپڑے پھٹے ہوئے۔ پاؤں پر زخم تھے جن سے لہو بہہ رہا تھا۔ افسوس، اس غم نصیب کو افلاس نے آہنی گرفت سے اپنے ہیبت ناک پنجوں میں پکڑ رکھا تھا۔

اُس نے اپنا زخمی ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر ایک سرد آہ بھری اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کچھ کھانے کو مانگا۔

مَیں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا، میں گھر سے کچھ لیکر بھی نہ چلا تھا اب بھی وہ فقیر اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے خیرات کا منتظر کھڑا تھا میں نے اُسکے زخمی سرد ہاتھ کو اپنے گرم ہاتھ میں لے لیا اور کہا، بھائی معاف کرو، اس وقت میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

فقیر نے پہلے تو اپنی مایوس آنکھوں سے میری طرف دیکھا، بعدہٗ اُسکے نیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، اُس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیلیا اور آہستہ سے کہا بھائی کوئی بات نہیں، میں اسکے لئے بھی شکرگذار ہوں یہ بھی ایک خیرات ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ فقیر مجھے خیرات دے گیا ہے

(چندن)

حکومت ہند کا مسئلہ

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب جرنلسٹ لاہور)

تصور حکومت میں انقلاب گذشتہ سو سال کے عرصہ میں انقلاب خیز ایجادات اور تعجب انگیز اکتشافات سے نظام معاشرت کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ گوناگوں ترقیوں سے ہمارے صدیوں کے گوناگو خیالات اور دیرینہ سال تصورات تہ و بالا ہوگئے ہیں۔ ہمارے افق عقلی نے بہی بہت کشادگی اختیار کرلی ہے۔ انقلاب زمانہ کا سب سے بڑا اثر نظام حکومت کی ترکیب و ترتیب میں نمایاں ہوا ہے۔ اب سے سو برس پیشتر شخصی حکمرانوں کا بول بالا تھا۔ ایک آدمی تاج و تخت پر متمکن تھا اور چند برگزیدہ حکمبردار امرا معاملات سلطنت انجام دیتے تھے۔ وہ سفید و سیاہ کے مختار تھے وہی حکومت کے ارباب بند و کشاد سمجھے جاتے تھے۔ حکمران فریق محکوم کی خواہشات اور ضروریات کا مطلق پاس ہی نہ کرتا تھا۔ مگر اب معاملہ دگرگوں ہے۔ اب متمدن اقوام کا نظام حکومت شخصی حکمرانوں کے وجود سے محض ناآشنا ہے، اب اختیارات فرمانروائی کا مرجع و مصدر جمہور کی خواہش ہے۔ کوئی قومی مہم افراد قوم کے نمایندوں کی رضامندی کے بغیر طے نہیں ہوسکتی۔ اب جمہوریت اور قومیت کا ڈنکا بج رہا ہے ترقی یافتہ قومیں حریت پر فدا اور آزادی پر نثار ہوتی ہیں۔ ابنائے وطن قومیت پر قربان ہوتے ہیں جو سینہ وطن پرستی کے جوش سے ناآشنا ہے وہ غداری کے مترادف شمار ہوتا ہے۔ ایک صدی کے دوران میں تصور حکمرانی کلیۃً درہم برہم ہوگیا ہے، مہذب قوموں کی تاریخ جدید انقلاب حکومت اور جنگ آزادی کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔

ملک ہند میں سو سال کے عجیب وغریب تغیرات مہذب دنیا کے عجیب وغریب واقعات کا سرزمین ہند پر اثر نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ گذشتہ سو برس کے مشہور اور قابل یادواقعات میں سب سے بڑا یہ واقعہ ہے کہ مغلوں، مرہٹوں اور سکھوں کی حکومت زوال پذیر ہوگئی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔ جس نے اپنے مخصوص قومی تصورات اور

اصول حکومت کے مطابق نظام حکومت مرتب کیا، امن وسکون قائم کرکے مغربی علوم کی اشاعت شروع کردی جس میں عیسائی مشنریوں نے ذیل حصہ لیا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے زمانہ ما بعد کے عظیم انقلاب کی تحریک ابتدائی اسی وسیلہ سے بہم پہونچی تھی۔ اہل مغرب سے میل جول رکھنے سے بھی بہت مفید انجام مرتب ہوا۔ ہندوستان کی معاشرت اور نیز خیالات میں انقلاب واصلاح انھیں اسباب کی بدولت ہوئی ہے۔

پہلا دور حکومت ملک میں اہل ہند کی شرکت غدر ۱۸۵۷ء کے بعد الیسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی، اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت چلا گیا۔ ۱۸۶۱ء میں قانون کونسل ہائے ہند پاس ہوا جس کی رو سے گورنر جنرل کی انتظامی کونسل میں بارہ زائد اراکین قوانین وضع کرنے کے واسطے ایزاد کرنے کا قاعدہ رائج ہوا اور ان میں آدھے ایسے تھے جو ہر قسم کے سرکاری عہدوں سے بیگانہ تھے، اور ان میں بیشتر ہندوستانی تھے۔ مدراس اور بمبئی میں بھی اسی قسم کی واضعان آئین وقوانین کی کونسلیں قائم ہوئیں جن میں چند ہندوستانی شامل کئے گئے، گویا اول مرتبہ یہ کوشش ہوئی کہ حسن انتظام ملک کے واسطے جو قوانین پاس کئے جائیں ان میں رعایا کی خواہش اور ضروریات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ لیکن ارباب حکومت عملاً اہل ہند کی منشا کا پاس نہ کرتے تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔

استحقاق انتخاب کی ابتدا انگریزی تعلیم کی ترقی کی بدولت روشن خیال گروہ میں قومی بیداری پیدا ہوئی جس کا ظہور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام وجود میں ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ بدلے ہوئے حالات کا لحاظ کرکے ۱۸۹۲ء میں دوسرا قانون کونسل ہائے ہند صادر ہوا جس کی رو سے زائد اراکین امپریل کونسل کی تعداد سولہ مقرر ہوئی۔ اس اصلاح کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ایوان تجارت، مختلف انجمنیں اور سرکردہ آدمی چند ہوشیار اور تجربہ کار آدمیوں کے نام تجویز کرتے تھے، جنھیں گورنر جنرل عموماً قبول کرکے امپریل کونسل کے وافر ممبروں میں شامل کر لیا کرتا تھا۔

پچاس برس تک تاج برطانیہ کے ماتحت رہ کر اہل ہند نے اس قدر ترقی کرلی کہ جس سے لارڈ منٹو اور جان مارلے وزیر ہند اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں دو قابل ہندوستانی کونسل ہند میں شامل کئے گئے، اور ۱۹۰۹ء میں قانون کونسل ہائے ہند پاس ہوا۔ سر ستیندر پرشاد سنہا (لارڈ سنہا مرحوم) حضور وائسرائے کی انتظامی کونسل میں شعبہ قانون کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس قانون کی رو سے اہل ہند کے نمایندوں کو بیش از بیش وسیع تر اختیارات عطا ہوئے۔ امپریل کونسل کے کل ساٹھ ممبر مامور ہوئے جن میں پینتیس ۳۵ نامزد اور پچیس ۲۵ منتخب تھے۔ ہر گروہ اور ہر طبقہ کے حقوق کی نیابت واجب ٹھہرائی گئی۔ نامزد میں انھیں عمال حکومت تھے اور سات اراکین میں ایک مسلمانان پنجاب اور ایک جاگیرداران پنجاب اور ایک ایوان تجارت

کا نمایندہ مقرر ہوتا تھا، باقی چار میں سے بعض خاص معاملات کے ماہر اور بعض چھوٹی جماعتوں کے نائب نامزد ہوتے تھے۔ اور چھبیس منتخب اراکین میں سے گیارہ صوبجاتی کونسلوں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے دو ممبر چار بڑے بڑے صوبوں کی طرف سے، اور باقی تین دیگر صوبوں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔ ایک ممبر ممالک متوسط کی ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کی جانب سے منتخب ہوتا تھا۔ چھ اراکین تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کی طرف سے امپیریل کونسل میں بھیجے جاتے تھے۔ پانچ ممبر پانچ صوبوں کے مسلمانوں کی نیابت کے واسطے اور دو ایوان تجارت بمبئی و کلکتہ کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔ ممبروں کو سوالات پوچھنے اور خاص معاملات کی نسبت ریزولیوشن پیش کرنے کا اختیار تھا۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات پہلے کی نسبت کہیں وسیع اور قابل قدر تھیں۔ حلقہ ہائے انتخاب میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ قرار پائے تھے، مگر قوم پرست اور کانگریس والے ان سے مطمئن نہ ہوئے۔

دور ثانی
نیابتی حکومت کا پہلا مرحلہ

اسی اثنا میں اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ شروع ہو گئی، جس کے شعلے تمام مہذب دنیا میں پہونچے۔ اس کے دوران میں اہل ہند نے انگریزی راج کے خلاف تمام شکایات در یابرد کر کے جس شاندار وفاداری کا عملی ثبوت بہم پہونچایا اور جن قابل ستایش قربانیوں سے کام لیا تھا اس کا ممبران و لیڈران برطانیہ پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ وزرائے برطانیہ نے اگست ۱۹۱۷ء میں ایک معرکۃ الآرا اعلان کیا جس کے رو سے انگریزی راج کا منتہائے مقصود ملک ہند میں بتدریج نیابتی حکومت قائم کرنا قرار دیا گیا۔ چند مہینے بعد مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے وائسرائے ہند کے ساتھ قومی لیڈروں کی رائیں اور خیالات معلوم کرنے کے ارادہ سے ملک ہند کے مختلف شہروں میں دورہ کیا اور متعدد اصحاب سے بے تکلفانہ گفتگو کی کہ کس قسم کی طرز حکومت اہل ہند کے نزدیک موزوں اور مفید ثابت ہو گی۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک جامع رپورٹ میں اصلاح یافتہ حکومت ہند کے اصول اولیہ شائع ہوئے۔ مگر ان کی نسبت ہندوستان کے قوم پرستوں میں سخت اختلاف رائے رونما ہو گیا اعتدال پسند لیڈر کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے۔ اواخر ۱۹۱۹ء میں قانون اصلاحات ہند پارلیمنٹ برطانیہ میں منظور ہو گیا اور اس کا عملی نفاذ ۱۹۲۱ء کے شروع سے ہوا۔ اس کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل تھیں:-

(۱) صوبجاتی اور وسطی کونسل ہائے وضع آئین و قوانین میں منتخب ممبروں کی تعداد غالب رکھی گئی (۲) ہر قسم کے قوانین بنانے یا اگلے قانون منسوخ کرنے کا انہیں اختیار دیا گیا۔
(۳) ہر وضع کا معتد بہ حصہ کونسلوں کی کثرت رائے پر چھوڑ دیا گیا۔

(۴) صوبجاتی اور وسطی گورنمنٹوں کے مسائل حکومت کی تشریح و تفریق کی گئی

(۵) صوبجاتی محکمہ ہائے حکومت کا بہت بڑا حصہ وزراء کے سپرد ہوا، جس کے سبب سے دوعملی مروج ہوگئی

(۶) گورنروں کی انتظامی کونسلوں میں ہندوستانی شریک کئے گئے۔

(۷) حضور وائسرائے کی انتظامی کونسل میں تین ہندوستانی مقرر ہوئے۔

(۸) وزیر ہند کی کونسل کے اراکین کے تقرر کی بابت یہ قرار پایا کہ نصف ایسے آدمی ہوں جنہیں ملک ہند کے معاملات اور حالات کا ذاتی تجربہ ہو۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی ممبروں کا شمار پہلے سے کچھ بڑھ گیا۔

ان اصلاحات کا بڑا نقص یہ ہے کہ کونسل ہائے وضع آئین میں منتخب ممبروں کی تعداد کے غلبہ کے ساتھ حکام کی ذمہ داری اصولاً نظر انداز کی گئی جس کی وجہ سے نیابتی اور جمہوری حکومت کی ترقی میں سخت رکاوٹ واقع ہوگئی ہے۔

دوسرا بڑا نقص یہ ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں کو جداگانہ حق نیابت دیا گیا، جس سے اہل ہند کے اتحاد باہمی اور قومیت کی ترقی میں سخت دشواری واقع ہوگئی ہے۔ دیگر عیوب کمتر درجہ کے ہیں۔ قطع نظر ان خامیوں کے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات بہت وسیع ہیں، اور ان کے وسیلہ سے ملک ہند میں جمہوری نیابتی حکومت کا ابتدائی مرحلہ قائم ہوگیا ہے، جس سے مستقبل کی اصلاح حکومت اور ترقی کے واسطے راستہ صاف ہونے کی امید ہے۔

دور سوم
کامل سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ قوم پرستوں کے انتہا پسند گروہ نے موجودہ اصلاحات کو ناکافی سمجھ کر مسترد کردیا۔ مگر اعتدال پسندوں نے ان کے ذریعہ ملک وقوم کی حالت سنوارنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد ازاں حکام کے طرز عمل سے جو مسٹر مانٹیگو کے نصب العین کے مباین تھا لبرل فریق کو بھی سخت مایوسی ہوئی جسے آئینی نقائص سے بہت استحکام ہو گیا۔ چنانچہ جب ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراجی گروہ کے لوگ اسمبلی اور صوبجاتی کونسلوں میں داخل ہوگئے، تو فروری ۱۹۲۴ء میں اسمبلی کے ہر فریق کے ہندو مسلم اور دیگر منتخب ممبروں نے کامل سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ پیش کیا۔ اعتدال پسند لبرل سوراجیوں کے ہمنوا ہوگئے۔ اس کے بعد ہر سال قوم پرست اسمبلی کے اجلاس دہلی میں اس کا مطالبہ کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے پارلیمنٹ میں علی الاعلان یہ بیان کیا کہ اگر قوم پرست ہندوستانی اتفاق رائے سے اصلاح حکومت کی تجاویز پیش کرینگے تو برٹش وزارت اس پر ہمدردی سے غور کریگی۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں اصلاحات کے تجربہ کی تحقیقات کرنے کو رائل کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا، اور انہیں دنوں کانگریس کی طرف سے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک مختصر کمیٹی نے

آئین حکومت مرتب کیا۔ اس کمیٹی میں دو مسلمان ایک سکھ اور تین ہندو تھے۔ مسلمانوں نے بعض وجوہات سے نہرو کمیٹی کی قرارداد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن مسلم لیگ کا نصب العین دربارہ سوراج تبدیل نہیں ہوا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لبرل فیڈریشن، آل انڈیا کرسچین کانفرنس اور دیگر تمام پولیٹیکل انجمنوں کا نصب العین بھی کامل سیلف گورنمنٹ قرار پا گیا، اور سب کے سب ایک زبان ہو کر اس کا مطالبہ کرتے چلے آتے ہیں، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا، کیونکہ اس میں اہل ہند کے نمائندے شریک نہیں کئے گئے تھے۔ اور یہ لارڈ ریڈنگ اور لارڈ برکن ہیڈ کی سخت ناعاقبت اندیشی تھی جس سے اہل ہند کے دلوں میں مدبران برطانیہ کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی۔ سائمن کمیشن نے دو سال کی تحقیقات اور غور و فکر کے بعد جون ۱۹۳۰ء میں اپنی تجاویز دربارۂ حکومت ہند مشتہر کر دیں جنھیں تمام گروہوں نے متفق اللفظ ہو کر مسترد کر دیا ہے۔ اس رپورٹ کی دو باتیں قابل ذکر ہیں:-

(۱) ترکیبی نظام حکومت کی قرارداد جس میں ریاست ہائے ہند حسب ضرورت شامل ہو سکتی ہیں۔

(۲) صوبوں میں حکومت خود اختیاری۔ مگر اس اسکیم کی سب سے بڑی قباحتیں یہ ہیں:-

(۱) وسطی گورنمنٹ کی عدم ذمہ داری (۲) سیاہ ہند یعنی اہل ہند کو اعلیٰ عہدے دیئے جانے کا کوئی ذکر نہ ہونا۔ (۳) تیسرے اس رپورٹ میں نوآبادیوں جیسی حکومت خود اختیاری کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔

مستقبل کے آئین حکومت کا پیچیدہ سوال گول میز کانفرنس کی تجویز

۱۹۲۴ء میں قوم پرستوں نے اسمبلی میں اس بات کا مطالبہ پیش کیا، کہ سیلف گورنمنٹ کا پیچیدہ سوال حل کرنے کے واسطے گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں گورنمنٹ اور جمہور ہند کے نمائندے باہمی تبادلہ خیالات سے جملہ مسائل حل کر لیں۔ مگر گورنمنٹ نے اس معقول تجویز کو قبول کرنے سے گریز کیا، اپریل ۱۹۲۵ء میں کرنل ویجوڈ لیبر ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ کے سامنے یہ تجویز از سر نو پیش کی کہ لارڈ ریڈنگ عنقریب انگلستان آئیں گے۔ مسٹر گاندھی اور مسٹر داس کو مدعو کر کے وزیر ہند سے معاملات ہند کی بابت مشورہ کیا جائے۔ اس کے تین دن بعد مسٹر جارج لانسبری نے نائب وزیر ہند (لارڈ ونٹرٹن) کو مخاطب کر کے کرنل ویجوڈ والی تجویز کو اس طرح پیش کیا کہ نہ صرف مہاتما گاندھی اور مسٹر داس ہی کو بلایا جائے بلکہ ملک ہند کے تمام گروہوں کے نمائندے بلا کر حکومت ہند کے ہر قسم کے مسائل پر بے تکلفانہ بحث کی جائے۔ اس کے جواب میں نائب وزیر ہند نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر ہندوستان کے لیڈر اتفاق رائے سے ایسا آئین حکومت مرتب کریں جس کی تائید گورنمنٹ ہند اور صوبجاتی

حکومتیں کریں، تو برٹش وزارت اس پر ہمدردی سے غور کریگی۔ لندن میں ہندی لیڈروں کو بلاکر گول میز کانفرنس منعقد کرنا دو وجوہات سے خلاف مصلحت قرار دیا (۱) حکومت ہند کی ساری ذمہ داری برٹش پارلیمنٹ نے گورنمنٹ ہند پر ڈال رکھی ہے۔ اس وجہ سے وہی ہر قسم کے معاملات طے کرنے کی مجاز ہے۔ (۲) اگر ہندی لیڈروں کو لارڈ ریڈنگ کے قیام انگلستان کے دوران میں مدعو کرکے براہ راست صلاح و مشورہ کیا جائے۔ تو اس سے گورنمنٹ کی ہتک ہوگی اور لارڈ ممدوح کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ سرجان سائمن نے گول میز کانفرنس کی جو تجویز اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء میں لیبر گورنمنٹ کے روبرو پیش کی تھی۔ وہ مسٹر لانسبری کی تجویز کا اعادہ تھا۔ مگر یہ جسارت اور مآل اندیشی لیبر گورنمنٹ کے ارکین کی تھی۔ جنہوں نے اسے قبول کرکے لارڈ اروِن کی وساطت سے اعلان کرادیا کہ انگریزی راج کا منتہائے مقصود نوآبادیوں جیسی حکومت خود اختیاری ہے۔ اور اسکے حصول کے وسائل اختیار کرنے کے واسطے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائیگی جس میں دوبدو بات چیت کرکے آئندہ نظام عمل طے ہوگا۔ نئی دہلی سے اعلان ہونے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر قوم پرست لیڈروں نے والسرائے بہادر اور گورنمنٹ برطانیہ کا اس اعلان اور گول میز کانفرنس کی تجویز کے واسطے شکریہ ادا کیا۔ اور اس میں شرکت کی آمادگی ظاہر کی۔ مگر بڑے دن سے پیشتر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال صاحب والسرائے سے ملے۔ اور اس بات کا وعدہ حاصل کرنا چاہا کہ گول میز کانفرنس میں سیلف گورنمنٹ کا سوال معرض بحث میں آئے۔ مگر اس پر ممدوح رضامند نہ ہوئے۔ کیونکہ از روئے آئین والسرائے برٹش وزرا اور نیز ملک معظم براہ راست کچھ نہیں کرسکتے۔ (کیونکہ مصدر اختیارات فرمانروائی پارلیمنٹ ہے، جس امر پر ممبران پارلیمنٹ کثرت رائے سے اتفاق کریں وہی مسلم و واجب ہے) اس پر اجلاس کانگریس منعقدہ لاہور میں کامل آزادی کا اعلان کیا گیا، اور مارچ گذشتہ میں خلاف ورزی قانون کا معرکہ وسیع پیمانہ پر شروع ہوگیا جس سے سرحد ملک میں شورش اور بدامنی پیدا ہوگئی۔ اور تجارت کی کساد بازاری سے اہل تجارت کو بھاری نقصان پہونچا۔ علاوہ ازیں خزانۂ عامرہ کو کروڑوں روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا جس سے حکومت نئے ٹیکس لگانے کو مجبور ہوئی۔ مصلحت اور تدبر کا یہ اقتضا تھا کہ گول میز کانفرنس کے انجام کا انتظار کیا جاتا۔ اگر ہمارا مقصد صلح و آشتی سے حاصل ہوجائے تو ہنگامہ برپا کرنا دانشمندی کے سراسر خلاف ہے۔

<u>مشاورتی کانفرنس لندن</u> حکومت ہند کے مستقبل کے آئین کا مسئلہ طے کرنے کے واسطے گول میز کانفرنس

کے اجلاس کا رسمی افتتاح ۱۲۔ نومبر کو ملک معظم کے دست مبارک سے ہوا۔ اس میں ستاون مختلف گروہوں کے اور سولہ راجگان ہند کے اور تیرہ اہل برطانیہ کے وکلا شامل تھے۔ افتتاح کے موقع پر وزرا و وکلاء نوآبادیہا بھی موجود تھے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ انھیں کانفرنس لندن کے مقاصد سے گہری دلچسپی ہے۔ ملک معظم کی رونق افروزی سے یہ ثابت ہے کہ یہ کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لندن میں اس سے پیشتر کئی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، مگر ملک معظم نے اپنی حضوری سے انھیں کبھی سرفراز نہیں فرمایا۔ یہ کانفرنس تعلقات برطانیہ و ہند کی تاریخ میں بالکل نرالی اور خاص تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے سامنے آئین حکومت ہند کے اصول اولیہ پر بحث ہوئی۔ اس وجہ سے یہ ایک شاندار تاریخی واقعہ ہے۔ کانگریس نے ۱۹۰۶ء میں اور مسلم لیگ نے ۱۹۱۵ء میں اور دیگر گروہوں نے اسی زمانہ میں اپنی پولیٹیکل تمناؤں کا نصب العین سیلف گورنمنٹ قرار دیا ہے۔ اور برٹش گورنمنٹ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے۔ لندن کانفرنس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ کس طریقہ سے ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ مروج ہو سکتی ہے۔

وکلائے ہند کا متفقہ مطالبہ

وزرائے برطانیہ نومبر ۱۹۲۹ء کے بعد کئی بار اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ کانفرنس میں جو مسئلہ چاہو بحث کے واسطے پیش کر سکتے ہو۔ چنانچہ راجگان و باشندگان ہند کے متعدد وکلائے لندن میں باہم گر صلاح سے یہ طے کر لیا کہ کامل سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ کانفرنس کے روبرو پیش کیا جائے۔ اسی فیصلہ کے مطابق ۱۷۔ نومبر کے اجلاس کامل میں سر تیج بہادر سپرو نے نہایت شاندار تقریر کی جس کی فصاحت و بلاغت کا ارکین کانفرنس کے دل پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ وزیر اعظم بہادر جو کانفرنس کے صدر ہیں۔ لارڈ چانسلر سینکے (نائب صدر کانفرنس) وزیر ہند لارڈ پیڈنگ اور تمام انگریز و ہندی نمایندگان نے سر تیج بہادر کو خوشی خوشی مبارکباد دی۔ موصوف کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ:۔

"ہم لندن میں اس مقصد سے فراہم ہوئے ہیں کہ تعلقات ہند و برطانیہ کی تاریخ کے باب جدید کا جلی حروف سے آغاز کریں۔ اضطراب او بے چینی کا شکار ہندوستان فکر و تردد سے کانفرنس کی کارروائی دیکھتا ہے۔ یہاں پر نہ صرف اہل ہند ہی کے لیڈروں کی معاملہ فہمی کا امتحان ہوگا بلکہ مدبران برطانیہ کے حسن تدبر کی بھی آزمایش ہوگی۔ ہمارے ہموطنوں نے لعنت ملامت اور طعن و تشنیع سے ہمیں رخصت اور ہمیں غدار ملک وغیرہ ناموں سے یاد کیا، مگر میرا منشا یہ ہے کہ یہاں پر بے تکلفانہ گفتگو سے ان پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کر دکھائیں جن کی رو سے لندن کانفرنس سراسر فضول قرار

دی جاتی ہے۔ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ملک ہند میں حیرت انگیز تبدیلیاں وقوع میں آچکی ہیں تحریک خلاف ورزی قانون دتشویشناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ جب انگریز ہماری زبان سے لفظ کامل سیلف گورنمنٹ سنتے ہیں تو حیرت سے اس کے معنی پوچھتے ہیں۔ لیکن جب ۱۸۶۷ء میں کینیڈا کو ۱۹۰۰ء میں آسٹریلیا کو اور ۱۹۰۹ء میں جنوبی افریقہ کو سیلف گورنمنٹ عطا کی گئی تھی تو کیا اس کے بارہ میں اس قسم کا کوئی سوال پوچھا گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اہل ہند نے اب یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ملک ہند کا نظام حکومت کینیڈا کے مانند بنایا جائے اور وہ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے ہم رتبہ شمار ہو۔ ہم اپنے یہاں ایسی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں جو جمہور کے سامنے اپنی کارگزاریوں کی جوابدہ ہو۔ اس فیڈریشن یعنی نظام ترکیبی حکومت کی تفصیل پر بعد ازاں بحث ہوگی جس سے گورنمنٹ ہند کا مراسلہ ناآشنا ہے۔ مگر ہمارے سامنے یہ سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ مشکلات ضرور ہیں امن وسکون، تجارت، مالیات اور انگریز باشندگان ہند کے مفاد کے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل ہیں لیکن ان سب کا سلجھاؤ ناممکن نہیں ہے۔ معاملات حکمرانی میں جو غلطیاں انگریز عمال حکومت سے سرزد ہوتی ہیں، ہندوستانی وزراء ان سے زیادہ خطرناک غلط کاریوں کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ ہم انگریز تاجران ہند کو ان کے سرمایہ سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اگر وہ اپنے مفاد کی حفاظت کے واسطے تجاویز پیش کریں، تو ہم ان پر خوشی خوشی غور کریں گے۔ برطانیہ کے ساہوکار غیر ملکوں کو خوشی خوشی قرضہ دیتے ہیں، کیا کبھی چھوٹی حکومتوں کی ساکھ کا سوال اُٹھایا گیا؟ اگر نہیں اُٹھایا، تو ہندوستان کے اعتبار کے بارہ میں یہ سوال کیوں پیدا ہوگا؟ سپاہ کے اہتمام کا مسئلہ واقعی بڑا نازک اور پیچیدہ ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملک ہند میں ملٹری کالج قائم کر کے ہمیں قابل فوجی افسر تیار کرنے کا موقع دیا جائے۔ گورہ سپاہ اگر مناسب ہو تو والسرائے کے زیر اہتمام رہے۔ اور ہم مصارف کی رقم خاص مہیا کرنے کو آمادہ ہیں۔ اگر سول سروس کے انگریز، لائق ہندوستانیوں کے ماتحت کام کرنے سے گریز نہیں کرتے، جیسا کہ لارڈ ریڈنگ خوب جانتے ہیں، تو انگریز فوجی افسر ہندوستانیوں کے ماتحت کام کرنے میں اپنی کسر شان کیوں سمجھنے لگے۔ ہم سب ایک بادشاہ کی رعایا اور مجموعہ اقوام کے اراکین میں، اس وجہ سے اعلیٰ و ادنیٰ کا خیال ان مسائل کے حل میں حائل نہیں ہونا چاہیئے اگر نسلی تعصبات کو راہ دی گئی تو ملک ہند میں امن وسکون ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر صوبوں میں کامل حکومت خود اختیاری رائج کی گئی، اور وسطی حکومت جوں کی توں رہی تو یہ آئین ایک ہی ہفتے میں بیکار ثابت ہوگا۔ اس وجہ سے دانائی اور معاملہ فہمی سے آئین مرتب کرنا چاہیئے

چسپے اہل ہند چلانے میں پوری کوشش سے کام کریں گے۔ اب ہندوستان کے واسطے۔۔۔
خاموش بیٹھنا محال ہے۔ سب سے مقدم بات یہ ہے کہ آئین حکومت کی ترتیب میں بدلے ہوئے
نقطۂ نگاہ سے کام لینا چاہیئے۔"

سر تیج بہادر سپرو کی منطق بھری فصاحت نے سب کے دل کو موہ لیا۔ اور سامعین نے خوشی خوشی داد تحسین دی۔

ترکیبی نظام حکومت کی متفقہ تائید و ضمانت

اس کے بعد مہاراجہ بہادر بیکانیر نے ایک مدبرانہ تقریر میں کامل سیلف گورنمنٹ کی سرگرمی سے تائید وحمایت کی۔ تین دن تک بحث ہوتی رہی۔ غرض ہر ایک وکیل نے سوراج کا مطالبہ کیا، اور فیڈریشن حکومت کو مستقبل کا نصب العین قرار دیا۔ مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں اس امر کا مسرت سے اعتراف کیا کہ راجگان ہند کے نمایندوں کے طرز عمل سے تمام اندیشے دور ہوگئے ہیں اور آئین حکومت کا مسئلہ آسان ہوگیا۔ انگریز وکلا نے بھی اس امر کا اقبال کیا۔ لارڈ ریڈنگ نے فرمایا کہ راجگان ہند کے وکلا کے اظہار رائے سے کانفرنس کے انعقاد سے پہلے کی صورت حالات بالکل تہ و بالا ہوگئی ہے۔ جتنے انگریز تقریر کرنے کو اُٹھے سب نے فیڈریشن کی حمایت کی۔ کانفرنس لندن کے کامل اجلاس کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے، کہ اہل ہند کے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔ کمیشن کی قراردادوں کا لارڈ پیل (کنسرویٹو وکیل) اور لارڈ ریڈنگ (لبرل گروہ کے نمایندہ) ہی نے ذکر کیا۔ ہندی وکلا نے متفق الرائے ہوکر اس کا نام تک نہیں لیا۔ اور سب نے سوراج کا مطالبہ کیا۔ البتہ مسٹر جناح نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا "سائمن کمیشن ایک مہمل رپورٹ ہے، اور گورنمنٹ ہند کا ردی کا پرچہ ہے"۔ گویا سر تیج بہادر سپرو اور دیگر وکلائے ہند نے چھوٹتے ہی کامل سیلف گورنمنٹ (سوراج) کا مسئلہ بحث کے واسطے پیش کر دیا۔ بعد ازاں ۳۲ وکلا کی ایک خاص کمیٹی اس مقصد سے مقرر ہوئی وہ فیڈریشن کے متعلقہ مسائل پر بحث کرے۔ ہوتے ہوتے اواخر نومبر کی خبروں کے مطابق کانفرنس کے اراکین فیڈرل کمیٹی کے ممبر قرار پائے تاکہ اس اہم اور پیچیدہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ہر ممکن طریقے ... کیا جائے۔ کانفرنس کے برٹش وزرا اور نیز اخبارات برطانیہ نے جو روش اختیار کی ہے اس سے ہم کوئی شکوہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا رویہ معاندانہ نہیں بلکہ ایسا ہمدردانہ ہے جس سے دوستی اور خیر کا ثبوت ملتا ہے۔

حکومت ترکیبی کے پیچیدہ مسائل

کانفرنس کے نائب صدر برطانیہ کے لارڈ چانسلر لارڈ سینکی ممتاز ماہر قانون آپ نے کمیٹی کے روبرو تقریر کرتے ہوئے ۲۰ نومبر کو یہ بیان کیا۔ ہندوستان

ہے۔ برما اور بمبئی سے صوبۂ سندھ کی علیحدگی یا صوبہ سرحد شمال مغرب کی اصلاحات کا سوال مقدم نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مسئلہ فیڈریشن کا اصول اولیہ ہے۔ فیڈریشن کے اجزائے ترکیبی کیا ہونے چاہئیں؟ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ تمام ریاستوں کا ایک علیحدہ جتھا ہو اور برطانوی ہندوستان کا الگ، پھر دونوں باہم متحد ہو جائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ برطانوی ہند کی فیڈریشن قائم کی جائے جس میں ریاستیں علیحدہ علیحدہ شامل ہوں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایسا فیڈریشن ہو جس کے اجزا صوبجات اور ریاستہائے ہند الگ الگ ہوں" اس مسئلہ کی پیچیدہ اصولی مشکلات ہیں۔ اس وقت حکومت ہند مطلق العنان ہے، گو صوبجاتی گورنمنٹیں اس کے ماتحت ہیں، مگر فیڈریشن کا شائبہ بھی ان میں نہیں ہے۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ ریاستیں باہم کر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کے درمیان کوئی ارتباط نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ برطانوی ہند اور ریاستہائے ملک کے درمیان کوئی خاص آئینی راہ و رسم نہیں ہے، گویا فیڈریشن کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے نئے سر سے سارے مسئلہ کا حل ہوگا لارڈ موصوف نے کمیٹی کے غور و فکر کے واسطے فیڈریشن سے متعلقہ مسائل حسب ذیل عنوانات میں مرتب کئے ہیں:۔

(۱) فیڈریشن کے اجزائے ترکیبی کیسے ہونے چاہئیں (۲) فیڈریشن پارلیمنٹ کس قسم کی ہو اور اس کے کتنے حصے ہوں گے؟ (۳) فیڈرل پارلیمنٹ کے اختیارات فرمانروائی کیسے ہوں (۴) فیڈرل پارلیمنٹ کے ممبروں کا شمار کیا ہوگا۔ اگر پارلیمنٹ دو حصوں پر مشتمل ہو، تو ہر ایک کے کتنے کتنے ممبر ہونگے؟ اور ہر ایک صوبہ یا ریاست کے کتنے نمائندے ہونے چاہئیں؟ (۵) برطانوی ہند اور ریاستہائے ہند کے نمایندے کس طرح منتخب ہونگے؟ (۶) فیڈرل مجلس وزرا کی ترکیب اور اختیارات اور ذمہ داری حکمرانی کی کیا ماہیت ہوگی؟ (۷) صوبجاتی پارلیمنٹوں کے اختیارات کیسے ہوں گے؟ صوبجاتی وزرا کے اختیارات اور ذمہ داریاں اور نیز مجالس وزرا کی ترکیب کیسی ہوگی؟ (۸و۹) چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا مشارکت عمل کس طرح حاصل کیا جائے گا؟ (۱۰) سپریم کورٹ کیسی ہوگی اور اس کے حلقۂ اثر کے حدود کیا ہونگے؟ (۱۱) سپاہ برائے حفاظت حکومت (۱۲) فیڈرل اور صوبجاتی وزرا کا تاج برطانیہ سے آئینی تعلق کیسا ہوگا؟ ان سوالات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ کونفرنس لندن کیسے مہتم بالشان مسائل حکومت سے دوچار ہے جن کی نزاکت اور پیچیدگی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ آئین حکومت ہند کی ترکیب و ترتیب کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مشکلات پیچیدہ ہیں، لیکن استقلال، بالغ نظری

اور حسن تدبر سے یہ دقتیں حل ہو جائیں گی۔"

مذکورہ بالا عنوانات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ فیڈرل کمیٹی یعنی ارکان کانفرنس جامع اور عظیم سوالات حل کرنے کے درپے ہے، جو نظامِ حکومت کے اصول اولیہ پر حاوی ہیں۔ ان سوالات کا مقصد اعلیٰ ترین تدبر اور بہترین حکمت و دانش کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب تک برطانیہ اور ہندوستان کے چوٹی کے آدمی اس گورکھ دھندے کو سلجھانے کی کوشش نہ کریں گے اس وقت تک یہ نازک مسائل آسانی سے حل ہو جانے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس وقت سر تیج بہادر سپرو، سر رام سوامی آئر، رائٹ آنریبل شاستری، سر سیتلواد، مسٹر جناح، مہاراجہ بہادر بیکانیر والور وغیرہم کی مبارک کوششوں سے بہت سی پیچیدگیاں سلجھ گئی ہیں۔

نظام حکومت کے حرکۃ الآرا مسائل

فیڈریشن کے متعلقہ مسائل کا لب لباب لارڈ سینکے نے مرتب کر کے کانفرنس کے غور و فکر کے واسطے پیش کر دیا ہے۔ مگر علاوہ بریں مالیہ اور قرضۂ خارجی اور تعلقات خارجی اور گورہ سپاہ اور سرحد شمال مغرب کے متعلق بھی کئی نازک مسائل حل طلب ہیں۔ ان سے کمتر درجے کے سوالات مختلف صوبوں کی حدود کی ترمیم اور حق رائے دہندگی کا مسئلہ ہے۔ قلیل جماعتوں کے حقوق کی محافظت اور یورپین باشندگان ہند کے سرمایہ کی حفاظت کی پیش بندی سے بھی کئی مشکلات رونما ہوں گی لیکن سب سے بڑی دشواری ہندو مسلم کشیدگی ہے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کو ہندوؤں پر بھروسہ نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی مساوات، عدل پرستی، اور رواداری کا ان کا جو تصور ہے وہ بھی نہایت عجیب و غریب ہے۔ جسے راقم کے نزدیک شرع اسلامی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لندن میں مسلم نمایندوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے چاہے یہ ان ناعاقبت اندیش حضرات کی دانشمندی کا کرشمہ ہو جو ملک ہند کو سوراج عطا کرنے کے دل و جان سے مخالف ہیں خواہ یہ مسلمانوں کے کسی بے بنیاد وسوسہ سے ظہور میں آیا ہو، لیکن بہی خواہان ملک کو قسم قسم کے اندیشے لاحق ہو گئے ہیں۔ مسلمانان پنجاب اور بنگال میں باقی غیر مسلم گروہوں سے تعداد میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ان صوبوں میں اپنی اکثریت پر زور دیتے اور ہندوؤں کو خاص حقوق دینے سے گریز کرتے ہیں، مگر باقی صوبوں میں جہاں مسلمانوں کا شمار بہت قلیل ہے، وہاں پر ان کے واسطے خاص حقوق کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ انصاف اور تدبر دونوں کے خلاف ہے۔ تمام صوبجات میں ایک ہی اصول پر عمل ہونا چاہیئے اس سے بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ فضول ہٹ دھرمی سے یہ گورکھ دھندا کبھی نہیں سلجھ سکتا۔ اور کوئی کانفرنس خواہ لندن میں ہو یا ہندوستان

میں جب تک باہمی مناقشے طے نہ ہوجائیں اُس وقت تک آخری مقصود کا حصول آسان نہ ہوگا۔

نوآبادیوں کی حکومت خود اختیاری کا نمونہ

چوبیس سال سے کانگریس نوآبادیوں جیسی حکومت خود اختیاری یعنی سوراج کا مطالبہ کرتی چلی آئی ہے۔ قوم پرست اپنی تقریروں میں ملک کینیڈا ایسی حکومت خود اختیاری کا ترکیبی نظام (Federation) ملک ہند کے واسطے طلب کرتے ہیں اب چونکہ فیڈرل طرز حکومت ہندوستان کے واسطے عملاً مرتب ہورہی ہے۔ اس وجہ سے اس کا ذکر اجمالی امر ضروری ہے۔

کینیڈا کا رقبہ سلطنت ہند کے رقبہ سے دُگنا ہے اور ایک کروڑ کے قریب آبادی ہے۔ ۱۸۶۷ء میں کینیڈا کو حکومت خود اختیاری عطا کی گئی تھی۔ ایک قانون کی رو سے چار صوبے حکومت عالیہ کے ماتحت متحد ہوئے۔ اس کا اصول برطانیہ کے مشابہ قرار پایا۔ مگر آئین میں ایسی گنجائش رکھی گئی تاکہ بعد ازاں دیگر علاقہ جات اور قسمتیں بھی اسی آئین حکومت میں شریک ہوجائیں، چنانچہ اب حکومت کینیڈا کا فیڈرل آئین نوآبادیات پر حاوی ہے۔ پارلیمنٹ کے دو حصے ہیں۔ ایک سینٹ ہے دوسرا دارالعوام کہلاتا ہے۔ انتظامِ ملک، مجلس وزرا کے ہاتھ میں ہے، شاہ برطانیہ کی طرف سے گورنر جنرل سب سے اعلیٰ حاکم سمجھا جاتا ہے جس کو مخصوص اختیارات حاصل ہیں، مگر وہ ہر امر میں وزرا کی صلاح سے کاربند ہوتا ہے۔ آئین میں کینیڈا کی حکومت ترکیبی اور صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات کی خوب تشریح کی گئی ہے جیسا کہ قانون اصلاحات ۱۹۱۹ء میں وسطی اور صوبجاتی گورنمنٹوں کے مسائل و معاملات حکومت کی توضیح و تفریق کر دی گئی ہے۔ حکومت کینیڈا از روئے آئین حسب ذیل (۲۹) مسائل کے اہتمام کی ذمہ دار ہے:-

قومی قرضہ اور ملکیت، صنعت و تجارت، ٹیکس یا دیگر ذرائع سے آمدنی حاصل کرنا۔ قومی ساکھ پر قرضہ اُٹھانا۔ ڈاک خانہ و تار، مردم شماری اور شمار و اعداد، سپاہ بحروبر۔ عمال حکومت کے مشاہرے اور الاؤنس مقرر کرنا، بندرگاہوں اور ساحلی مقاموں میں لائٹ ہوس لگانا، اور دیگر تدابیر کرنا، جہاز اور جہازرانی، کوارنٹین اور بحری ہسپتال، سمندر میں اور نیز اندرون ملک میں ماہی پروری، دریاؤں جھیلوں اور سمندروں کے وسیلہ سے آمدورفت، سکہ اور ٹکسال، بنک اور نوٹ، سیونگ بنک اوزان اور پیمانے، پرامیسری اور تبادلہ کی ہنڈیاں، مبادلۂ قانونی، دیوالہ، اختراع و ایجاد، کاپی رائٹ اصل باشندوں کے مفاد کی حفاظت، اغیار کو حقوق شہریت عطا کرنا، شادی اور طلاق، ضابطۂ فوجداری، جیل خانے۔

صوبہ کی حکومت کے معاملات ذیل میں مذکور ہیں جو سولہ ہیں:-

وقتاً فوقتاً آئین صوبہ کی ترمیم، اندرونی مصارف کے واسطے ٹیکس اور محصول عائد کرنا، صوبہ کی ساکھ پر قرضہ اٹھانا، حکومت صوبہ کے عہدوں کا تعین اور عمال کے مشاہرے، بھتے وغیرہ، صوبہ کی سرکاری زمین اور جنگل وغیرہ کی فروخت اور اہتمام، تادیبی جیل خانے، ہسپتال اور پاگل خانے وغیرہ قائم کرنا، صوبہ کے اندر میونسپل کمیٹیاں قائم کرنا، دوکانوں، سیلونوں، سراؤں اور شراب خانوں اور نیلام گھروں پر صوبہ کے مصارف کے واسطے محصول لگانا اور لائسنس جاری کرنا، مقامی تجارت یا مسافروں کی سہولت کے واسطے جہاز چلانے کی اجازت دینا، صوبجاتی مقاصد سے کمپنیاں قائم کرنا، شادی بیاہ کی رجسٹری کا انتظام، عدل گستری، صوبجاتی جائداد نزول اور سول مائٹ کے مسائل، دیوانی عدالتیں اور ضابطہ دیوانی، قوانین صوبہ کی تعمیل میں سزائے جرمانہ یا قید یا تعزیری وغیرہ، مقامی اور پرائیویٹ معاملات صوبہ کا اہتمام۔

تمام صوبے حکومت کنیڈا کے محکوم ہیں، اور از روئے اصول ترکیبی حکومت اور پارلیمنٹ تمام علاقہ کینیڈا پر حکمراں ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے آئین حکومت ہند میں صوبجاتی اور مرکزی حکومتوں کے اختیارات کی تقسیم کی گئی ہے۔ مثلاً ریلوے، تار وڈاک خانہ، انکم ٹیکس، محصولات بحروبر، سکہ وٹکسال، سول سروس، سپاہ بحروبر وہوا، وغیرہ پر گورنمنٹ ہند حکمراں ہے۔ مستقبل کے ترکیبی نظام حکومت کے واسطے مروجہ طریقہ حکومت میں کافی مسالہ موجود ہے، جس سے فیڈرل حکومت بآسانی مرتب ہوسکتی ہے۔

آئین حکومت کا ایک نمونہ — حکومت ہند کے مستقبل کے واسطے کئی قسم کے آئین مرتب کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے مسز بیسنٹ اور بعض اور لیڈروں نے ایک آئین مرتب کرکے برطانیہ کے انگریز خیرخواہوں کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ پارلیمنٹ میں پیش کریں۔ اس کے بعد نہرو کمیٹی نے جامع آئین مرتب کیا، علاوہ بریں کئی انگریزوں اور ہندوستانی مدبروں نے بھی اپنے اپنے خیال کے مطابق آئین سازی کی کوشش کی ہے۔ تازہ ترین آئین ریاست میسور کے سابق دیوان سرایم۔ وشویشرنے انڈین سوشل ریفارمر کے ایڈیٹر مسٹر نٹراجن کے مشورہ سے تیار کرکے ممبران گول میز کانفرنس کے پاس بھیجا ہے اس کا لب لباب ذیل میں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے:-

اس اسکیم کا مقصد فوری سیلف گورنمنٹ ہے، اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ دس سال کے اندر اندر وسطی گورنمنٹ کے تمام شعبہ جات وزراء کے سپرد کئے جائیں گے، اور یہ بھی انتظام کیا گیا ہے کہ جو ریاست چاہے ابھی فیڈریشن میں شامل ہوجائے اور جو چاہے بعد میں شریک ہوسکتی ہے۔ وسطی اور صوبجاتی حکومتوں کے وزرا کو اپنی اپنی پارلیمنٹوں کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیے۔ اور وسطی وصوبجاتی اجزائے ترکیبی کے اختیارات

کی جامع توضیح ہونی چاہیئے۔ فیڈرل گورنمنٹ کا تمام ملک پر مساوی اختیار ہونا چاہیئے۔ سپاہ اور ریاستہائے ہند پر اسے پورا اختیار رہے۔ وسطی پارلیمنٹ کے دو حصے ہوں۔ ملک معظم کا نائب گورنر جنرل حکومت ہند کا حاکم اعلیٰ ہو۔ دار النیابت (اسمبلی) کے ۲۴۰ اور سینٹ (کونسل عالیہ) کے ایک سو ممبر منتخب ہوں۔ دس لاکھ آدمیوں کا ایک ممبر ہونا چاہیئے۔ ریاستوں کے نمایندے ۲۳ فیصدی ہوں جو آل انڈیا معاملات کی بحث میں شریک ہوسکتے ہیں۔ انھیں پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ مشاہرہ اور فری پاس ملنا چاہیئے۔ گورنر جنرل کی مجلس وزارت دار النیابت کے اراکین کی ترکیب سے بننا چاہیئے، ان کے مشاہرے تین چار ہزار روپے ماہوار ہوں، جو ان کے سالانہ الاونس بحیثیت اراکین پارلیمنٹ کے علاوہ ہونگے۔

فیڈرل گورنمنٹ کا سکہ و ٹکسال، مالیہ، سپاہ بحر و بر، محصولات بحر و بر، افیون، نمک، ریلوے، تار و ڈاک خانہ، ترک وطن و عطائے حقوق شہریت، ریاستوں اور صوبوں کے درمیانی مسائل، صنعت و تجارت وغیرہ اور نیز آل انڈیا سوشیل معاملات وغیرہ پر اختیار کلی ہے۔ ایک سپریم کورٹ ہو جو مسائل متعلقہ آئین کا فیصلہ کرے۔ علاوہ ازیں وہ صوبجاتی اور ریاستی ہائی کورٹوں کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی بھی سماعت کریگا۔ صوبوں میں گورنر، وزرا اور لوکل کونسل برائے وضع آئین و قوانین ہو، اس کے ممبروں کا شمار دو ڈھائی سو ہو۔ اور اس کا نام اسمبلی قرار دیا جائے۔ قانون اصلاحات ۱۹۱۹ء میں صوبجاتی مسائل کی تشریح جامع موجود ہے۔ سپاہ اور برٹش فوائد اور قلیل جماعتوں کے مفاد کی حفاظت امر ضروری ہے۔

موجودہ گورنمنٹ ہند، اس کی جائداد اور قرضہ جات وغیرہ جملہ ذمہ داریاں مجلس وزرا کے حوالہ ہونا چاہیئے۔

بہر حال یہ ضرور ہے کہ کاغذ پر آئین حکومت مرتب کرنا آسان ہے، مگر اسے ایسا بنانا کہ جس سے اس کی تعمیل میں روزانہ کی تمام دقتیں رفع ہو جائیں اور بات ہے۔ یہ مسائل بہت جامع اور پیچیدہ ہیں مگر مشکلے نیست کہ آساں نشود۔ اور اب جبکہ کانگریس بھی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے جا رہی ہے ہم کو توقع ہوتی ہے کہ تمام مرحلے باہمی مشورہ اور تعاون سے بخیر و خوبی حل ہو جائیں گے۔ ہم کو امید ہے کہ مسلم نمایندے بھی وطن پرستی کے جذبہ سے متاثر ہو کر تدبر و معاملہ فہمی سے کام لیں گے، اور گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو آئندہ اپریل یا مئی میں ہندوستان میں منعقد ہوگا ہمارے ملکی مطالبات کی تعمیل و تکمیل کا پورا سامان اکٹھا ہو جائے گا۔

چائے[۱]

(از رائے بہادر پنڈت شیونرائن شمیم)

یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ دنیا میں چائے کا استعمال روز بروز کس قدر ترقی پر ہے۔ اس کا استعمال بھی مختلف ممالک میں مختلف طریقوں پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ برما کے شمالی حصہ میں شان نامی قوم کے لوگ چائے کو جوش دیکر نہیں پیتے بلکہ اُس سے ایک قسم کا مربہ بنا کر استعمال کرتے ہیں[۲]۔ تبت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور مربہ بنانے میں اور کتنی ہی چیزوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔ کشمیری چائے کے بڑے شائق ہوتے ہیں[۳]۔ یہ لوگ صبح کو سبز یا سیاہ چائے میں شکر ملا کر اُسے بطور قہوہ استعمال کرتے ہیں اور شام کو دودھ یا بالائی اور نمک کی آمیزش کے ساتھ۔ پشاور اور افغانستان میں سبز چینی چائے کا جوشاندہ شکر کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے۔ جس کی خوشبو نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ جاپان میں محض چائے کے جوشاندہ کو بغیر نمک یا شکر کے پیتے ہیں چین میں بھی کچھ ایسا ہی رواج ہے، بلکہ یہاں تو ہر ایک گھر میں چائے کا ایک دیگچہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور چائے کا پانی ہی بجائے معمولی پانی کے پیا جاتا ہے۔ روس میں سماوار[۴] نامی برتن میں چائے بنائی جاتی ہے جس میں نمک یا شکر کے بجائے لیمو کا عرق ڈالا جاتا ہے۔ امریکن اور یوروپین لوگ چائے میں دودھ اور شکر ملاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو چائے گھر گھر کی چیز ہو گئی ہے جس سے دیہات تک بالکل مستثنیٰ نہیں کیے جا سکتے۔ اور اس کا استعمال بھی مختلف معلومہ طریقوں پر ہو رہا ہے جس کے لکھنے کی حاجت نہیں۔

چائے کا اصلی نام "تھی فرا" (Thea fera) تھا مگر اب یہ دنیا کے مختلف ممالک میں جداگانہ نام سے موسوم ہو گئی ہے پہلے اس کی کاشت چین میں ہوتی تھی، وہاں دو قسم کی چائے تیار کی جاتی تھی۔ ایک سیاہ چائے جو فوکین کے پہاڑوں میں پیدا ہوتی ہے جو یاسمن کے پتوں سے خوشبودار بنائی جاتی ہے، اور دوسری سبز چائے جو اُس ملک کے دیگر حصص میں پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں چائے کی کاشت جس طرح

---

۱ ماخوذ از اسٹیٹ ریلوے میگزین۔ ۲ ہم نے برما کے سفر میں ایک مندر کے میلہ کے موقعہ پر چائے کی سبز پتیوں کا اچار بھی چکھا تھا جو ہمیں پسند نہیں آیا تھا۔ (شمیم) ۳ ہم نے ایک مرتبہ ایک کشمیری کے پاس چائے نامہ نامی ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا تھا جسکے کچھ بند نقل کرکے ایک رسالہ میں اشاعت کیلئے روانہ کر دیئے تھے۔ (شمیم) ۴ سماوار کا استعمال کشمیر میں بھی ہوتا ہے۔ (شمیم)

سے شروع ہوئی اس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ابتداءً سیام کے لوگوں اور شان قوم نے آسام پر کئی حملے کئے۔ اور بعد کو اہل برما نے (جس میں شان قوم کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے) منی پور، کچار، اور آسام کو فتح کر لیا اور پھر آسام میں چاے کی کاشت شروع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شان قوم جو برما کے بالائی حصے میں بود و باش رکھتی ہے، قدیم الایام سے چاے بنائی رہتی ہے کیونکہ وہاں دریائے اراودی کے کنارو پر چاے کے دو قسم کے پودے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ولایت میں شور مچا کہ خود ہندوستان میں چاے کیوں نہیں پیدا کی جاتی اور چاے کے بارہ میں اس غرض سے تلاش شروع ہوئی کہ چاے چین سے نہ منگانی پڑے تو ایک یوروپین ماہر علم فلاحت نے گھومتے پھرتے ہوئے آسام میں چاے کے پودے کا پتہ لگایا۔ بعدہٗ اس کی کاشت کے لئے کبھی کوہ ہمالیہ کا دامن تجویز ہوتا رہا اور کبھی بہار کا صوبہ۔

دوسری طرف ۱۸۳۵ء میں کینٹن (چین) سے چاے کے بیج منگوائے جا کر بنگال بھیجے گئے اور اُن کے بونے کا کام کرنیل کڈ کے سپرد ہوا۔ اُس نے اپنے باغ میں پودے لگائے اگرچہ اُس کو اپنے اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ کلکتہ کی نواح چاے کی کاشت کے لئے مناسب جگہ نہ تھی، ساتھ ہی آسام کے کمشنر نے بھی اس امر کا دعویٰ کیا تھا کہ اُس نے یہ تحقیق کر لیا ہے کہ چاے آسام میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ان دونوں کی جانب سے کچھ بے پرواہ سی معلوم ہوتی تھی۔ گورنر جنرل تک رپورٹیں ہوئیں، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاے کا اجارہ کمپنی مذکور سے لے لیا گیا۔ وقتی گورنر جنرل لارڈ بنٹنگ نے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ چاے کی کاشت کے بارہ میں اپنی رائے سے مطلع کرے۔ آخر کمیٹی نے یہ رائے دی کہ کماؤں کی پہاڑیوں میں چینی چاے کی کاشت شروع کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک صاحب تخم چاے کی فراہمی کے لئے چین بھیجے گئے مگر اُن کو وہاں سے وہی پرانی بات کہکر واپس بلا لیا گیا کہ اصلی چاے کا پودا آسام میں مل گیا ہے۔ زاں بعد ۱۸۳۶ء میں ایک کمیشن کی تقرری پھر ہوئی اور اُس کی رپورٹ کے مطابق آخری فیصلہ یہ ہوا کہ چاے کی کاشت آسام ہی میں کی جائے مگر بیج چین کا ہو۔

اس کمیشن کے دو سال قبل چین کے بیج سے چاے تیار کی گئی تھی، اور تجارت کی غرض سے چند من چاے نمونہ کے طور پر ۱۸۳۵ء میں ولایت روانہ بھی کی گئی تھی، مگر جس کمپنی نے یہ تجارتی کام لینے ہاتھ میں لیا تھا اُس کو بجائے نفع کے نقصان ہی اُٹھانا پڑا حتّیٰ کہ اس کمپنی کے حصے تک بکنا بند ہو گئے۔

یہ سب کچھ ہوا مگر بالآخر چاے کی کاشت کا کام جاری ہی ہوا، اگرچہ تجربہ نے ثابت کر دیا تھا کہ ہمالیہ کے دامن کی زمین چاے کی کاشت کے لیے بہترین مقام ہے تاہم یہ بھی معلوم ہوا کہ آسام میں آسام ہی کے پودے بہتر پھیلتے ہیں، اور چینی تخم کی کاشت سے اُس قدر منافع کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ اسکے

بعد چار کی کاشت کا کام اس سرگرمی سے جاری ہوا کہ وہ آسام ہی تک محدود نہ رہ کر تقریباً کل ہندوستان میں پھیل گیا۔ تفصیل ذیل سے معلوم ہوگا کہ چار کی کاشت کب اور کہاں شروع ہوئی:-

(۱) صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ۔ چار کی کمپنی بنانے کی تجویز ۱۸۳۶ء میں ہوئی تھی مگر اُسکی کاشت کا کام ہمالیہ کے باغات میں ۱۸۴۲ء میں شروع ہوا جس کے لئے چار کے ماہرین فن چین سے بُلائے گئے تھے۔ باضابطہ چار کی کمپنی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی۔

(۲) دارجیلنگ کام کی ابتدا ۱۸۴۱ء میں تو ہوگئی تھی مگر واقعی کام ۱۸۵۰ء کے قبل جاری نہیں ہوا۔

(۳) ٹراونکور کام کی ابتدا ۱۸۴۳ء میں ہوئی مگر پورے طور پر ۱۸۴۲ء میں جاری ہوا

(۴) چٹاگانگ چھوٹا ناگپور۔ یہاں ۱۸۴۳ء سے کام شروع ہوا مگر پورے طور پر ۱۸۶۲ء میں۔

(۵) اوٹاکمانڈ (نیلگری) ۱۸۶۱ء سے کام شروع ہوا۔

(۶) جل پیگڑی اِس ضلع میں کرنل منی نے ۱۸۷۰ء سے کام شروع کیا۔ رفتہ رفتہ چائے کے باغات کا سلسلہ دریائے تسٹا کے شرقی و غربی سواحل کی جانب پھیلتا ہوا آسام کی سرحد تک پہونچ گیا۔

(۷) کانگڑہ (پنجاب) سنہ نامعلوم۔

ان کے علاوہ میسور میں بھی چار کی کاشت بکثرت ہوتی ہے، اور وہاں سے وہ دیگر ممالک کو بھی بھیجی جاتی ہے۔

ملک میں چار کی کثیر پیداوار کے ساتھ ہی اُس کی تجارت کو بھی گونہ فروغ ہوا ہے اور فی زمانہ یہ حالت ہے کہ ہندوستان اور لنکا کی چار دنیا کا تقریباً نصف مطالبہ پورا کر رہی ہے۔ اب چین کی کوئی پوچھ باقی نہیں رہی۔

دل سے نکال ڈالے سب ارماں وصال کے
اب پھینک آئیں سینہ سے کیا دل نکال کے

ہر بام طور، وادیِ ایمن ہر ایک صحن
جلوے کہاں نہیں تری برقِ جمال کے

اُٹھواؤ میز سے مے وساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اِک بزرگ پُرانے خیال کے

(الحجاز) (ریاضؔ)

پنڈت موتی لال نہرو بیکنٹھ باشی

(از مرزا فرحت اللہ بیگ بی۔ اے)

یہ تو سب جانتے ہیں کہ زبان میں ضرب المثل اُسی وقت قائم ہوتی ہے جب سینکڑوں دفعہ تجربہ کر کے، ہزاروں دفعہ کھٹکھٹا کر اور لاکھوں دفعہ ٹھونک بجا کر اس کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا ہے کہ اس میں رسنے کے لئے کوئی درز تو نہیں ہے۔ اور جب اس طرح یہ پکی ثابت ہوتی ہے، تو پھر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو کر اس کا جزو بن جاتی ہے۔ اِس نظر سے دیکھا جائے تو مثلیں ہمارے خیالات کا خلاصہ، ہماری یادداشتوں کا عطر اور ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اپنے طرزِ عمل سے کسی ایک مثل کو بھی توڑ دے تو سمجھ لو کہ اس نے کمال کیا۔ اور ایک ایسا مستثنےٰ قائم کر دیا جس کا قائم کرنا نہ صرف مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

ہماری زبان میں فارسی کا ایک شعر ضرب المثل ہو کر آیا ہے، اور اب اُردو میں اس طرح استعمال ہوتا ہے گویا یہ ہماری ہی زبان کا شعر ہے۔ اس شعر کا مضمون دو ملکوں یعنی ایران اور ہندوستان کے تجربوں سے لیا گیا ہے۔ شعر یہ ہے:۔

زر می طلبی سخن درین است　　　گر جاں طلبی مضائقہ نیست

پہلے اس ضرب المثل کو اپنے کسی دوست پر آزمائیے، دیکھیئے من جرب المجرب حلت بہ الندامہ (جس نے آزمائے ہوئے کو آزمایا وہ نادم ہوا) کی صورت پیش آ کر آپ کا ہاتھ پھیلانا خالی جاتا ہے یا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپے کا ہاتھ سے نکلنا واقعی دل کے سینے سے نکلنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ادھر کسی نے کچھ مانگا اور ادھر خیال آیا کہ "اے ہے، اور جو اس نے یہ روپیہ واپس نہ کیا تو کیا ہوگا۔ اگر زیادہ تقاضا کیا تو دوستی میں فرق آئیگا، اگر دعویٰ کر دیا تو دنیا کیا کہے گی بہتر یہی ہے کہ اس وقت کوئی بہانہ کر دو، رُکھائی سہی آئندہ کے جھگڑوں سے تو نجات ملے گی۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی"۔ اگر کوئی بلا مانگے کچھ دے جائے اور دے بھی اس طرح کہ خود کھک ہو جائے تو سمجھو کہ اس نے اس ضرب المثل کا مستثنےٰ قائم کر دیا ہے کوئی اللہ کا بندہ جو سی۔ آر داس یا موتی لال نہرو

کی طرح ملک اور قوم کے لئے لاکھوں روپے کی وکالت چھوڑ کر ساری عمر کی کمائی جمع پونجی اور دھن دولت وقف کرکے کھدر کی دھوتی باندھ الگ جا کھڑا ہو۔ اور یہ کہہ کر کہ "اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا ڈر کریں۔" میدان عمل میں اُتر آئے۔ ہاں، ایسے ہی لوگ ہیں جو کچھ کر جاتے ہیں، ایسے ہی افراد ہیں جو ضرب الامثال کو غلط ثابت کر دیتے ہیں اور ایسے ہی "مرد" ہیں جن کے نام دنیا میں رہ جاتے ہیں، ورنہ غل مچانے کو تو ہم بھی غل مچاتے ہیں اور تم بھی غل مچاتے ہو۔ ملک اور قوم کے نعرے ہم بھی مارتے ہیں اور تم بھی مارتے ہو، لیکن ایسی قربانی اور ایثار کے لئے نہ ہم تیار ہیں اور نہ شاید تم تیار ہو۔ جیل خانہ جانا کوئی بڑا کام نہیں ہے، اس سے ملک کے کسی تعمیری کام کو مدد نہیں ملتی، اس سے نام ضرور بڑھتا ہے لیکن ملک کو کوئی مستقل فائدہ نہیں پہنچتا، یہ دودھ کا اُبال ہے کہ آیا اور ختم ہو گیا۔ اور تھوڑا بہت دودھ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

موتی لال نہرو جیسی مثالیں ہندوستان تو ایک طرف ساری دنیا میں بھی بہت کم ملیں گی، جنھوں نے ملک کی خدمت نہ صرف ہاتھ پاؤں اور زبان وقلم سے کی ہو بلکہ جو کچھ رکھا دھرا پاس تھا وہ سارے کا سارا اپنے دیس کے نذر کر دیا۔ اور پھر پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا ہو کہ بھئی اب اس روپے کو تم کس کام میں لاؤ گے۔ اور اسکا ہمیں حساب بھی سمجھاؤ گے یا نہیں۔

جو دھن دیا اُس سے پھر کام کیا کہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا

ظاہر ہے کہ ہمیں کیا اور میری رائے کیا، لیکن میں تو یہی کہتا ہوں اور ہمیشہ یہی کہوں گا کہ موتی لال نہرو کا جواب نہ ہندوستان میں کوئی تھا اور نہ مدتوں تک ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔

اگر دکھاوے کے لئے کوئی قربانی کرتا ہے تو اُسی وقت سے اُس کے چہرے پر پھٹکار برسنی شروع ہو جاتی ہے اور اُس کی خصلت اُس کے منہ سے ظاہر ہونے لگتی ہے۔ برخلاف اس کے جب کوئی سچے دل سے کوئی ایثار کرتا ہے تو اُس کی نیک نیتی کا اثر فوراً ہی اسکی صورت سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے موتی لال نہرو کو پہلے اور اب دیکھا ہے وہ اس چیز کا اندازہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے اجلاس پر انگریزی کپڑے پہن پہن کر شکلیں بنا بنا کر اور حجت پر حجت لا کر بولنے میں انکی زبان میں وہ اثر نہ تھا جو کھدر کے سادہ لباس میں مسکرا مسکرا کر کچھ دینے میں تھا۔ وہاں وہ زبان کے زور سے سب کو دبانا چاہتے تھے اور یہاں ان کی حالت ایک بزرگ خاندان کی معلوم ہوتی تھی جو اپنے بچوں اور بھائیوں کو پیار اور نصیحت کر رہا ہے۔ وہاں ان کے علم وقانون دانی کا زور تھا اور یہاں ان کے ایثار نفس کا۔ وہاں وہ ججوں کو مشکل سے قائل کر سکتے تھے اور یہاں ساری مجلس

انکی ہر "ہاں" پر "ہاں" اور "نہیں" پر "نہیں" کرتی تھی۔ وہاں سمجھتے تھے کہ یہ کچھ لے کر بحث کر رہے ہیں اور یہاں جانتے تھے کہ یہ سب کچھ دیکر ہماری رہبری کر رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ہائیکورٹ کی بحثیں خواہ کیسی ہی زوردار کیوں نہوں درد سے خالی اور قانونی پیچیدگیوں سے بھری ہوتی تھیں اور کانگریس کے پلیٹ فارم پر ان کی صاف گوئی بلا کسی حجت اور منطقی دلیل کے بھی ان کے الفاظ میں درد اور درد کے ساتھ اثر پیدا کر دیتی تھی۔ وہ اپنوں کو اپنوں کی طرح اور غیروں کو غیروں کی طرح سمجھاتے تھے اس لئے اس حالت میں بھی اگر کسی ایسے شخص سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تھا جو سیدھی سیدھی باتوں پر منطقی دلائل کو ترجیح دیتا ہے۔ تو پھر ان میں وہی ہائیکورٹ والی بات پیدا ہو جاتی تھی۔ اور وہ مجتول حجتیں قائم کر کے اور نتیجہ سے نتیجہ نکال کر بڑے بڑوں کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ لیجسلیٹو کونسل میں انھوں نے جو تقریریں کی ہیں وہ میرے اس بیان کی زندہ مثالیں ہیں۔ وہ اپنے مباحث میں اینٹ پر اینٹ چنتے چلے گئے ہیں اور تھوڑی سی دیر میں ایسی مضبوط دیوار کھڑی کر دی ہے جس میں نہ کوئی رخنہ رہا ہے اور نہ جس کا کوئی کونا کسی بھلے آدمی کی کدال گرا سکتی ہے۔

پنڈت مالویہ بھی خوب بولتے ہیں اور گھنٹوں بولے جاتے ہیں لیکن اُن کے بیان میں نہ وہ تسلسل ہے اور نہ وہ جوڑ جو موتی لال نہرو کی تقریروں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ محمد علی مرحوم بھی بولتے تھے اور خوب بولتے تھے لیکن اُن کی تقریر میں نہ وہ اثر تھا اور نہ وہ درد۔ جو موتی لال نہرو کی تقریر میں موجود تھا۔ پنڈت جی آنجہانی کی تقریر ہو یا تحریر سننے والا سنتا ہے اور سُنے چلا جاتا ہے۔ پڑھنے والا پڑھتا ہے اور پڑھے چلا جاتا ہے۔ کیونکہ نہ ان کے فقروں میں پیچیدگی ہے۔ اور نہ الفاظ کی بہتات ضرورت سے زیادہ جوش ہے اور نہ افسردگی۔ نہ بیجا ظرافت ہے اور نہ خشکی۔ بات یہ ہے کہ اگر کسی جوہر قابل کو عدالت کا میدان مل جاتا ہے تو پھر تقریر میں اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کا ہر استدلال اینٹ ہوتا ہے اور اس کا ہر جوڑ سونے کا مضبوط ٹانکا۔

کہتے ہیں کہ بیٹے کی تربیت باپ کیا کرتا ہے۔ موتی لال نہرو کے معاملہ میں یہ تربیت برعکس ہوئی۔ یہاں بیٹے نے باپ کو پالیٹکس کی تعلیم دی۔ جواہر لال صاحب نہرو نے کیمبرج میں تعلیم پائی وہیں پالیٹکس کا مرض ان کو لاحق ہوا اور اس مرض کے جراثیم نے اس وقت زور پکڑا جب انھوں نے ہندوستان کا چکر کاٹا۔ یہاں آکر انھوں نے رفتہ رفتہ باپ کو بھی اپنے راستہ پر لا ڈالا۔ باپ آخر باپ تھے جہاندیدہ اور گرم و سرد زمانہ چشیدہ۔ اُنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں دنیا کو بتا دیا کہ ملک کی خدمت کیونکر کرتے ہیں۔ اور قوم کے لئے قربانی کرنا کس چیز کا نام ہے۔ موتی لال مر گئے،



در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست
انوار سہیلی کے ایک قصہ کا منظر
سنہ ۱۶۱۰ع (عہد مغلیہ) کے مصوری کا نمونہ



راز و نیاز
راجپوت (کانگڑا قلم) مصوری کا نمونہ

سب ہی کو آخر مرنا ہے۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو بتا گئے اور آئندہ نسلوں کے لئے نمونہ چھوڑ گئے کہ اگر ملک اور قوم کے لئے کچھ کرنا ہے تو اس طرح کرو نہیں تو بیٹھے تماشہ دیکھا کرو، دو دلی سے اس میدان میں اگر قدم رکھا تو نہ صرف اپنے آپ کو تباہ کرلوگے بلکہ اس کے ساتھ ملک کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکا دوگے۔

ہندوستان کے موجودہ لیڈروں میں تعمیری کام جیسا موتی لال کر سکتے تھے شاید ہی اور کوئی کر سکتا ہو۔ بہرحال اب جتنے لیڈر بھی ہیں ان میں ایسے بہت ہیں جن کو کدال بجانی تو خوب آتی ہے، پر اینٹ پر اینٹ رکھنا نہیں جانتے۔ اس کے لئے ابتک ہر پھر کر ہمیشہ موتی لال نہرو ہی پر سب کی نظر جاتی تھی، اور جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی گتھی پڑ جاتی تھی تو اس کا سلجھانا انھی کے سر دھر دیا جاتا تھا۔ آج تک جتنی سیاسی کارروائیاں ہوئی ہیں اُن سب کو دیکھ لو کہ تعمیری کام کا خاکہ سوائے موتی لال کے اور کس نے ڈالا ہے اور ویران شدہ عمارتوں کا ملبہ ہٹا کر جدید عمارت کا نقشہ کس نے بنایا ہے۔

جب صورت حال یہ تھی تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اُنھوں نے علٰحدہ کوئی پارٹی قائم کرکے اس کی رہنمائی کیوں نہیں کی۔ خود اس سوال کا جواب اس مرنے والے کی عزت کو نگاہوں میں دوبالا کر دیتا ہے۔ جب چھوٹے چھوٹے لیڈر پارٹیاں قائم کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں تو موتی لال جیسے شخص کے لئے یہ کونسا مشکل کام تھا، مگر اُنھوں نے "یکے بگیر و محکم بگیر" پر عمل کیا، ان کو اپنے کام سے کام تھا۔ ان کو اس سے غرض نہ تھی کہ وہ کس پارٹی میں رہ کر یہ کام کر رہے ہیں، اُنھوں نے ابتدا ہی سے جس کا ہاتھ پکڑا اس کا مرتے دم تک ساتھ دیا۔ وہ تلوار کی دھار تھے کہ کام وہ کرتی ہے اور نام تلوار کا ہوتا ہے۔ شہرت اور نام آوری کا وہ خوب مزا چکھ چکے تھے اس لئے نہ ان کو اس کی ضرورت تھی اور نہ شوق۔ ان کو اس کی پروا نہ تھی کہ کوئی اُنھیں کیا کہتا ہے، اور ان کے کام کی کیا قدر کرتا ہے۔ وہ بڑا دل لائے تھے اور بڑے دل والوں کی طرح کام کرتے تھے۔ اگر یہ نہ ہو تو بڑا آدمی ہی کیا ہوا، اور ہم میں اور اُس میں کیا فرق رہا۔

موتی لال مر گئے، تمام ہندوستان ان کے لئے رو رہا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اب ان کی جگہ کون لیتا ہے، اور افسردہ دل اور آتش بجاں لیڈروں میں حد فاصل کون بنتا ہے۔ اگر کسی نے دس بیس کے فرق سے بھی ان کا کام سنبھال لیا تو سمجھو کہ غنیمت اور بہت غنیمت ہے۔ ورنہ یہاں تو ایسا قحط الرجال ہے کہ ع جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

اب رہے وہ خود تو اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ اگر وطن کی خدمت کا کوئی اجر ہے تو جس طرح دم

یہاں اچھے رہے وہاں بھی اچھے ہی رہیں گے۔ وہ یہاں بھی "آنند بھون" میں رہے اور وہاں بھی "آنند بھون" ہی میں رہیں گے۔ بیکنٹھ ایسے ہی لوگوں کے لئے بنا ہے نہ ہم جیسے لوگوں کے لئے کہ خود تو کچھ کام نہ کریں اور دوسرے کے کاموں میں کیڑے نکالیں۔ موتی لال نہرو جیسے لوگوں کے مرنے کو مرنا تھوڑی کہتے ہیں۔

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند

مرتے تو وہ لوگ ہیں کہ ادھر ان کا دم نکلا اور ادھر لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ:-

مرگئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود

اگر کچھ ہمت ہے تو میدان میں آؤ، اور اپنے عمل سے دنیا کو بتا دو کہ موتی لال جی مرگئے تو کیا ہرج ہے یہ لو دوسرے موتی لال موجود ہیں۔ قصہ مختصر ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ

یارو دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

نوید انقلاب

غرورِ حسن و نازِ دلبری دیکھ تماشائے بتانِ آذری دیکھ
رگ گل خونِ بلبل سے ہے رنگیں فریب حسن کی غارت گری دیکھ
قفس میں طاقت پرواز کھودی گرفتاروں کی بے بال و پری دیکھ
خدا کے بندے اور بت کی غلامی مسلمانوں کی شانِ کافری دیکھ
جواں ہوتا ہے پھر یہ عالم پیر بدلتا ہے زمانہ داوری دیکھ
اُفق خونِ شہیداں سے ہے گلرنگ بہارِ گنبدِ نیلوفری دیکھ
فرشتے عرش سے لاتے ہیں قندیل زمیں پر نور کی جلوہ گری دیکھ
طبق گردوں کے اُلٹے جارہے ہیں نیا ڈھلتا ہے چرخ چنبری دیکھ
مری آنکھوں کے پردوں میں سماجا جمال نو کی داماں گستری دیکھ
اُسے آئینہ دکھلایا یہ کہہ کر
کہ اس شیشہ میں اُتری ہے پری دیکھ

(چمنستان) (اسلم جیراجپوری)

مُباحثہ

اُردو کے اسم فاعل ترکیبی

(از جناب سلیم جعفر صاحب)

تجربہ اور مشاہدہ شہادت دیتے ہیں کہ اسم فاعل اُردو وہ محبوبہ محملِ نشین ہے جس کے شیدا اس کی تلاش میں گنگا جمنا کی شاداب ترائیاں اور وادیاں چھوڑ کر صحرائے عرب اور بیابان لوط میں خاک چھاننے نکل جاتے ہیں۔ اصل مرکز سے دُور نکل جانے کے باعث اکثر اُنھیں حرمان و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ شاہدِ معنی سے ہمکنار ہونے کے عوض بسا اوقات وہ ایک بھول بھلیاں میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ عمر بھر چکر لگایا کرتے ہیں اور باہر نہیں نکلتے۔ گمراہی اور سرگردانی کا اصلی سبب یہ ہے کہ فکرِ رسا و چشم حقیقت بیں دست گیری نہیں کرتیں۔ قیاس و گمان باطل شمع ہدایت بن جاتا ہے۔ اور صریح و بدیہی امور کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ اگر کوئی تقلید کورانہ کے پھندے سے نکل بھی گیا تو وہ اپنے مفروضات و ظنات کو اصول ناقابلِ تردید تصور کرتا ہے۔

اُردو کے اسم فاعل ترکیبی اور آبادیِ ہند کا ایک ہی حال ہے جس طرح یہاں کے باشندے اقوام عرب و فارس و ہند کی یادگار ہیں، اُسی طرح اقلیم اسمِ فاعل ترکیبی میں تینوں کے عناصر جلوہ گر ہیں۔ اور اس قدر مدت سے کہ ان کی حقیقت سمجھنے کے لئے بہت ہی کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ فارسی اور اُردو کے اسم فاعل ترکیبی کا منبع ایک ہی ہے۔ اور مدت سے فارسی پر اصول لسانیات جو رنگ چڑھا رہے ہیں اُن سے بیشتر اصحاب بے خبر ہیں۔ اور معدودے چند کی تعداد کثیر کی رسائی ان کتابوں تک نہیں جو توتیائے چشم کا کام دیتی ہیں۔ معترض کہے گا کہ میں زعم باطل میں کیچڑ اُچھال رہا ہوں جو بڑی بڑی ہستیوں کے دامنوں پر پڑ رہی ہے، مگر حاشا و کلا شوقِ اظہارِ تجر یا خود بینی سبب جسارت نہیں۔ میرا ناقص مطالعہ جہاں تک مجھے لے گیا اس کی بنا پر میں نے دلیری کی ہے۔ وہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر صداقت کے بارگاہ میں اتنا کہنے کی جرأت تو کرے کہ کیا ایسے بزرگوں کا شمار صرف انگلیوں ہی پر نہیں کیا جا سکتا جو یہ جانتے ہوں کہ "پستان" ایک مرکب لفظ ہے جس کے اجزا पय (دودھ) اور स्थान (مقام) ہیں اور جزو اول کا

حرف آخر حذف ہوگیا۔ اور ڈاکٹر اسٹینگاس کے سے محقق کا بھی جو اپنی تالیف میں اکثر سنسکرت کی طرف
اشارہ کرتا ہے ذہن اس جانب متبادر نہوا۔ کتنے ایسے بزرگ ہیں جو جانتے ہیں کہ "سپید" اور "کوہ بد" کا حرف
ٹکرا पात्र کی مسخ شدہ صورت ہے اور اس کا ثبوت آل ساسان اور اس سے بھی قدیم عہد کی تاریخ بہم
پہونچاتی ہے کتنے مولوی اور مولانا ہیں جواب یہ نہیں پڑھاتے کہ ' کے پہلے اگر ب آئے تو وہ تی سے بدل جاتا
ہے اور جانتے ہیں کہ یہ ت دراصل سنسکرت کا سابقہ नि ہے۔ اس سابقہ کے بعد کا لفظ چونکہ अ سے شروع
ہوتا ہے اس لئے ह بدل کر य ہوگئی اور بیفگن کو بطور مثال پیش کرکے اپنے شاگردوں کو یہ اصول سمجھاتے
اور بتاتے ہیں کہ یہ سابقہ مادہ کے معنی میں وضاحت و شدت پیدا کرتا ہے۔ چند روز ہوئے کہ ایک قواعد اردو
نظر سے گذری جناب مصنف نے "نگنا" کی تحقیق کی ہے کہ اس میں "گنا" فارسی کے "گونہ" سے نکلا ہے،
دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جناب موصوف یہ یک جست ایران کیوں جا پہونچے اور سنسکرت کے गुण + नि
کی طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی۔ اگر وہ اردو کا سلسلہ سنسکرت جدید یا ویدک سنسکرت سے ملانا پسند نہیں
فرماتے تو کیا اس زبان سے بھی ملانا پسند نہیں کرتے جس کا نام ڈاکٹر گریرسن نے سنسکرت قدیم رکھا ہے
دراصل ایک عرصہ سے ہماری تعلیم "پردیس پریمی" چلی آتی ہے۔ ہمارا طائرِ خیال اس فضا میں قوت پرواز
دکھاتا ہے جو انوری و خاقانی وغیرہ کے تخیل نے پیدا کی، اور اس کی قوت روحانی کا منبع سبع معلقات
کے مصنفوں کی سحر آفرینیاں ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی ان دلکش میدانوں اور سرجیون پہاڑوں کی
طرف جانکلتا ہے، جن میں کوئلیں کوکتی، پپیہے پیہو پیہو پکارتے، مور جھنگارتے، ہرن چوکڑیاں بھرتے
شیر دھاڑتے اور ہاتھی جھومتے ہیں۔ رسال اور تمال حسینان بدمست کی طرح بے تابانہ ایک دوسرے
سے ہم آغوش ہوتے، اور بمب کے گچھے ماہرویانِ پری پیکر کے لبِ لعلیں کی یاد دلاتے ہیں۔ مولسری
کی بھینی بھینی خوشبو دماغوں کو معطر کرتی ہے۔ قدرت نے کوسوں سبز مخمل کا فرش بچھا دیا ہے اور یکرنگی
سے اکتا جانے والوں کے لئے بے انتہا نیرنگی کے سامان مہیا کردیے ہیں۔

ایسی بدیسی آب و ہوا میں پرورش پانے والے اگر اپنے گھر سے بےخبر ہوں تو تعجب نہیں مگر حیرت
اس پر ہے کہ جب کبھی کسی سے ذرا سا بھی وطن پرستی کا اظہار ہوا اور یہ چیں بجبیں نظر آئے۔ الفاظ کی
تذکیر و تانیث، محاورات و الفاظ کی شستگی و چستی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو باعث پریشانی
ہے۔ لیکن اسم فاعل ترکیبی ان میں سب سے بڑا گنہگار ہے۔ جب دیکھو تب یہ ایک نیا روپ بھر سامنے
آجاتا ہے۔ اور یہ مبہوت ہو جاتے ہیں۔ وہ اس غولِ بیابانی کی نسبت صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس کی تعمیر
میں صرف دو عنصر شامل ہیں اور مخصص اسلاف کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کے ہیولے کو جو شکل چاہیں دیں۔

اور اگر اختلاف اس کی جرأت کریں تو گردن زدنی ہیں۔ یہ ان اصول کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جنھوں نے اپنی چابک دستی سے اس کے نقش و نگار میں دلفریبی پیدا کی۔ ان کی آنکھوں پر صرف وہ عینکیں چڑھی ہوئی ہیں جن کی مدد سے یہ لفظوں کی استعمالی حیثیت دیکھ سکتے ہیں اور جن کے شیشوں کی طاقت اتنی نہیں کہ وہ اہل زبان کی وہ نفسیاتی کیفیت دکھا سکیں جس نے الفاظ کی قطع و برید کرکے انھیں دل کش بنا دیا۔

اسم فاعل ترکیبی کی نسبت یہ پردیس پریمی بس اتنا ہی ماننے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں کہ اس کی تخمیر میں دو عنصر شامل ہیں۔ کبھی ان کا خیال اس طرف نہیں جاتا کہ طبع سہولت پسند نے لفظوں کی مٹی کیوں کر پلید کی ہے۔ وہ اسم صفت یا اسم صفت اور اسم ذات سے ملا کر جو اسم فاعل ترکیبی بنائے گئے ہیں ان میں اکثر پہلے جزو پر آفت آئی ہے مثلاً کھٹ مٹھا۔ کل چڑی۔ کل جبھا، لیکن سب سے زیادہ تختۂ مشق اعداد بنے ہیں اور ان میں بھی سہ حرفی اعداد پر خصوصیت سے ستم ڈھایا گیا ہے۔ بے انتہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں "ایک" کی مخفف صورت "اک" استعمال ہوئی ہے۔ یکجہ۔ اکلوتا۔ اکیلا۔ اکتالیس ہی پر اس کا حصر نہیں۔ دو میں اگرچہ اختصار کی گنجائش نہ تھی لیکن یہ بھی کہیں نہ کہیں زد میں آ ہی گیا۔ دوتارا۔ دوپٹہ۔ دولڑی۔ دوچھتا اس کی مثالیں ہیں۔ یہاں اسے اس طرح ادا کرتے ہیں گویا و ہے ہی نہیں۔ تگنا۔ تراہا۔ تہتر میں تین کی صرف تَ باقی رہ گئی۔ چار بدل کر چو رہا ہے۔ چوگوشی۔ اور چوپائے میں بلباس چو نمودار ہوا۔ پچ رنگ۔ پچ محلا۔ پچ ہتھا اور پچ میل میں پانچ نے پچ کی صورت اختیار کی ست بجا۔ ستوانسا۔ اٹھنی۔ اٹھوارہ بنانے کے لئے سات اور آٹھ خراد لسان پر چڑھا کر ست اور اٹھ بنا دئے گئے۔

پھر ہمارے یہ محافظانِ زبان ایک اور حیرت انگیز اصول کے تحت کام کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کسی گنوار اَن پڑھ کو خوشی خوشی اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ ایک لفظ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر قوم کے سامنے سند رواج عطا کرنے کی غرض سے پیش کر دے وہ Sappers and miners کے عوض سفر مینا بولے۔ Subpoena کو سفینہ کہے۔ Tripod سے تپائی بنائے، ہندی فارسی یا ہندی عربی لفظ ملا کر اُٹھائی گیرا۔ جیب کترا، تالاب، چھپر قناتیا، فوق البھڑک، سب کو اردو میں داخل کرے جائز ہے۔ لیکن ادھر کسی پڑھے لکھے سمجھدار نے کوئی لفظ گھڑا نہیں اور ادھر وہ بگڑے نہیں۔ خواہ وہ لفظ اس نے کتنے ہی غور و خوض کے بعد تراشنے اور قبول عام کے لئے پیش کرنے کی جرأت کیوں نہ کی ہو۔ اگر ڈاکٹر صدیقی "تماہی" کو زبان میں داخل کرنا چاہیں تو ان کی خطا معاف نہیں کی جا سکتی اور وہ

مورد الزام ہیں۔ لیکن بدھو، چمن، نتھن سب کو اختیار ہے کہ وہ دل چلا، دل لگی، توڑے دار بولیں اور مدعیان علم و فضل سے کہیں کہ اس ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کو قبول کیجئے۔ اور اس کو قبول کرنا آپ کا فرض ہے۔ مزہ یہ ہے کہ ان کے اس حکم کی خندہ پیشانی سے تعمیل بھی کی جاتی ہے۔ مان لیا کہ جن لوگوں نے "تماہی" کو رواج دینا چاہا وہ تخریب زبان کے درپے ہیں لیکن اس شخص کی نسبت کیا خیال ہے جس نے "چھ ماہی" وضع کیا اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو غالب مرحوم[1] کو اس کی کیا سزا دیجاتی کہ انھوں نے اسے معمولی بول چال سے نکال کر میدانِ شعر و سخن میں داخل کر دیا۔

آج کل غالب مرحوم کو برا کہنا بھی اظہار کمال کا ذریعہ بن گیا ہے، اس لئے شاید بعض اہل کمال کہیں زبان کا نام لینا ہی غلطی ہے۔ لیکن یہاں نہ تو غالب سے واسطہ ہے اور نہ کسی اور سے غرض۔ سوال فقط یہ ہے کہ یہ لفظ جزو زبان ہے یا نہیں، اور اس کی ساخت میں ان اصولوں میں سے ایک اصول سے کام لیا گیا یا نہیں جو زبان کے اصول مسلمہ ہیں۔ کیا یہ لفظ (دو، تماہی) समास (مرکبات) کی اس قسم کی مثال نہیں جو سنسکرت اور ہندی میں द्विगु (بقول مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو "مرکب اعدادی" کہلاتا ہے، اور ایک اسم عدد اور اسم ذات ملا کر بنایا جاتا ہے۔ اردو میں "تراہا" آتا ہے یا نہیں اور نہیں آتا تو دہلی میں "بیرم خاں یا بہرام خاں کا تراہا" کہاں سے آگیا۔ یہ بھی مانا کہ یہ کسی جاہل کی جہالت کی زندہ مثالیں ہیں لیکن دانا و عاقل کیوں جاہل و غافل کے دام جہالت میں گرفتار ہو گئے کیا ان کی روش سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عالم و فاضل وہ موم کی ناک ہیں جسے جاہل جس طرف چاہیں موڑ دیں۔ کیا فقدان شعور کا مرتبہ شعور سے بالاتر ہے؟

مجھے یقین ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر بعض اصحاب بہت ہی برافروختہ ہونگے اور تکلفِ طبع نازک مائل تردید کریگا، میں اعتراض کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوں لیکن التماس یہ ہے کہ جوشِ غیظ و غضب میں شبدیزِ قلم کو ابتذال و تضحیک کی دلدل میں پھنسنے سے روکا جائے اور صرف ان اصول کی غلطی کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی جائے جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ خدمت ادب کا یہی ایک صحیح طریقہ ہے۔

---

[1] رسم ہے مردہ کی "چھ ماہی" ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور "چھ ماہی" ہو سال میں دوبار (غالب)

تنقید کتب

تاریخ نثر اردو

(از مولوی محمد اظہار الحسن، بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

ادبی حلقوں میں مولانا احسن صاحب مارہروی کا نام نیا نہیں، قدیم اسکول کی شاعری کے اعتبار سے ان کا شمار اساتذہ میں ہے۔ مرزا داغ ایسے شفیق استاد کے فیض صحبت نے اس جوہر قابل کی صلاحیتوں کو چمکا دیا تھا۔ ان کی دقت نظر اور تحقیق ادبی کے متعدد نمونے منظر عام پر آچکے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ کی قابل قدر تالیف "کلیات ولی" انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ "تاریخ نثر اُردو" آپ کا تازہ ترین کارنامہ اور ۱۹۳۰ء کا بہترین ادبی تحفہ ہے۔ یقیناً یہ ایسی تصنیف ہے جو ان کے نام کو غیر فانی بنا دے گی اور آئندہ مورخین اردو کے لئے احسن صاحب کی کاوشوں سے مستفیض ہونا ناگزیر ہو گا۔ ہمیں مسرت ہے کہ احسن صاحب کی یہ سعی باسباب ظاہر بھی مشکور رہی، اعلیٰحضرت نظام دکن نے نہ صرف اس کا انتساب اپنے اسم گرامی کے ساتھ منظور فرمایا بلکہ مصنف کے لئے مبلغ پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی تاحیات جاری فرمایا۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کی سیر المصنفین نقش اول ہونے کے اعتبار سے کتنی ہی نامکمل کیوں نہ ہو لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے ادب اردو میں ایک نئی شاہراہ کھول دی چنانچہ اس کے شائع ہوتے ہی متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، ارباب نثر اردو، اور تاریخ ادب اُردو۔ تاریخ نثر اردو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو اگرچہ بقول جناب مرتب اب سے چھ سال قبل ترتیب پا چکی تھی مگر شائع اب ہوئی ہے۔ اُردو شعرا کے ایک دو نہیں بیسیوں تذکرے موجود ہیں۔ مگر سیر المصنفین کے قبل نثر کی کوئی تاریخ نہیں ملتی۔ آج بھی اس موضوع پر شائع شدہ کتابیں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ ان سب میں دکن میں اُردو اور پنجاب میں اردو اپنی اپنی جگہ نہایت عمدہ تصانیف میں لیکن ان کی حیثیت کم و بیش مقامی ہے۔ ارباب نثر اردو کوئی

---

[1] مرتبہ جناب احسن مارہروی حجم تقریباً ... صفحات، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ طباعت وکتابت دیدہ زیب، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس، قیمت مجلد باختلاف کاغذ ۵ اور ۶، ملنے کا پتہ جناب مرتب بنگلہ نمبرہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مبسوط تالیف نہیں بلکہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ سیر المصنفین کی جلد اول جس کا مواد تحقیق و تفتیش کا محتاج تھا جدید معلومات کی روشنی میں اس قدر مفید نہیں رہی جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیاب کتاب شاید مسٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو کا اردو ایڈیشن مترجمہ مرزا محمد عسکری ہے، جس کی بڑی خوبی سائنٹیفک انداز ترتیب اور بے لاگ طرز بیان ہے اور اس میں محققانہ تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض مواقع پر مصنف کے قلم کو لغزش بھی ہوئی ہے پھر بھی بحیثیت مجموعی نہایت خوب ہے۔

تاریخ نثر اُردو کی ترتیب کے وقت یہ سب کتابیں احسن صاحب کے پیش نظر رہی ہونگی، اور اُنھوں نے یقیناً اِن سب سے فائدہ بھی اُٹھایا ہوگا لیکن اس کا اسلوب قطعی جدید ہے۔ احسن صاحب نے اُردو نثر کو حسب ذیل ۱۶ شعبوں میں تقسیم کیا ہے:-

۱۔ عام تصانیف	سنہ ۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۰ء	۹۔ میلاد شریف	سنہ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء
۲۔ کاغذات دفاتر سلطنت	سنہ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء	۱۰۔ تحریر النسوان	سنہ ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء
۳۔ اخبار	سنہ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء	۱۱۔ ناول، ڈراما، ناٹک	سنہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء
۴۔ قانونی تراجم	سنہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء	۱۲۔ مختصر افسانے	سنہ ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۰ء
۵۔ تقریظ و تنقید	سنہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء	۱۳۔ فرضی تخیلات	سنہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء
۶۔ خطوط	سنہ ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء	۱۴۔ رقعہ جات دعوت و نوید	سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء
۷۔ تقریر	سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء	۱۵۔ مذاق و ظرافت	سنہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۴ء
۸۔ ماہوار رسائل	سنہ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء	۱۶۔ اشتہار	سنہ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء

جلد اول میں جو اس وقت میرے سامنے ہے اول چھ شعبوں کا ذکر ہے، بقیہ شعبوں کے نمونے دوسری جلد میں جو زیر طبع ہے درج ہونگے۔

جلد اول کے شروع میں جناب مرتب کا ایک "معروضہ" ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس تحقیق ناقص کے متعلق کسی مخالف رائے کے قائم کرنے میں عجلت مناسب نہیں۔ دونوں حصوں کو دیکھ کر مکمل رائے زنی فرمائی جائے۔" یہ معروضہ نقاد کا قلم پکڑے لیتا ہے۔ لیکن تنقید ایک ناگوار ادبی فرض ہے یا تو تبصرہ ہی سے اجتناب کیا جائے یا محاسن کے ساتھ معائب پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ ہاں بیجا تعریض اور فضول اعتراضات سے پرہیز لازمی ہے۔ چنانچہ اس مختصر تنقید میں ہم یہی اصول مدنظر رکھیں گے۔ ابھی دوسری جلد شایع نہیں ہوئی ہے اس لئے احسن صاحب کو موقع ہے کہ وہ جملہ نقادوں کے مشورں کو جانچ

اور پرکھ کر اگر مناسب سمجھیں تو فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔"معروضہ" کے بعد مختلف فہرستیں درج کی گئی ہیں۔ ایک مجمل فہرست، دوسری مفصل فہرست، اور پھر ہر شعبہ کے متعلق تصانیف و مصنفین کی علحدہ فہرستیں ہیں۔ نمونہ (۱) کی فہرست میں ہر تصنیف کے متعلق یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ قلمی ہے یا مطبوعہ اور کہاں موجود ہے۔ جس سے ناظرینِ کتاب کے علاوہ آئندہ مورخینِ اُردو کے لئے بڑی آسانی ہوگی۔ صرف ایک کمی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کتاب میں انڈکس شامل نہیں ہے۔ غالباً دوسری جلد میں اس کی تلافی کر دی جائیگی۔ ایک بات اور بھی ضروری ہے کہ مفصل فہرست میں نمونہ عبارت اور سنہِ تحریر کے ساتھ مصنف اور مطبع کا نام بھی ہونا مناسب تھا۔

فہرستوں کے بعد جناب مرتب کا لکھا ہوا اڑتیس صفحات کا مختصر مگر دلچسپ مقدمہ ہے جس کا کچھ حصہ تحقیق اللسان سے متعلق ہے اور کچھ تاریخی ہے، آخر میں "اس کتاب کی حقیقت" بیان کی گئی ہے۔ مقدمہ کو بعض خاص خاص عنوانات یہ ہیں (۱) اُردو کی ابتدا نظم سے ہوئی یا نثر سے، مولنا کو شمس العلما آزاد کے اس فقرہ سے کہ "یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنی سیکھے" الجھن پیدا ہوگئی ہے مگر آزاد کا مطلب وہی ہے جو خود احسن صاحب نے بیان کیا ہے یعنی "اُردو نثر کی کوئی مستقل اور پوری کتاب نظم سے پہلے مرتب نہیں ہوئی، اردو کے الفاظ ضرور موجود تھے جو کم و بیش روزمرہ کی گفتگو میں شامل تھے"۔ (۲) آغاز زبان (۳) لفظ اُردو کی تحقیق اور زبان اردو کی خصوصیت۔ اس کے تحت میں احسن صاحب نے "برادران ہنود میں ایک علم دوست اور تحقیق زبان کے شایق" کا یہ خیال پیش کیا ہے کہ "اردو کو لشکر سے منسوب کرنے کے عوض اردشیر یا اردبیل (قدیم شاہانِ ایران) کا مشتق سمجھا جائے تو زیادہ قرینِ قیاس ہے"۔ لیکن اس خیال کی کوئی دلیل سوائے تجنیس خطی کے نہیں ہے۔ (۴) اُردو الفاظ کی بنیادیں (۵) نئی زبان کس طرح بنتی ہے (۶) زبان کی افزایش (۷) اردو کا پہلا مروج۔ یعنی آزاد کی تحقیقات کے مطابق یہ سہرا حضرت امیر خسرو کے سر باندھا گیا ہے۔ (۸) شمالی ہند میں اردو زبان کیوں دیر میں مروج ہوئی؟ اس سوال کا جواب احسن صاحب نے قدرے تفصیل سے دیا ہے، اور اس کا سبب محمد تغلق کی اس حکمت عملی کو ٹھہرایا گیا ہے جس کی رو سے اس نے دہلی چھوڑ کر دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تھا۔ ادھر حسن گنگو نے اپنی سلطنت میں فارسی کی جگہ ملکی زبان کو رواج دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کی گود میں اُردو کی پرورش ہوئی۔ (۹) اُردو کے متعدد نام۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس ذیل میں یہ بھی بتایا جاتا کہ لفظ "اُردو" زبان کے معنوں میں کس زمانہ سے مستعمل ہوا۔ (۱۰) نثر اردو کی تصانیف کا آغاز۔ یہ باب در اصل تمام کتاب کا نچوڑ ہے، جس میں شمس العلما آزاد کی تحقیقات سے ایک قدم آگے

بڑھاکر نثر اُردو کے آغاز کا سال ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) کو قرار دیا ہے ۔جبکہ حضرت سیّد محمد حسینی گیسو دراز کے مبارک ہاتھوں سے اُردو میں تصنیف و تالیف کی بنیاد پڑی۔ (۱۱) موجودہ اُردو کی ابتدا وغیرہ وغیرہ

مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں نثر اردو کے مختلف شعبوں کے نمونے میں ہر شعبہ کے متعلق متعدد دور قائم کئے گئے ہیں اور نمونہ (۱) میں ہر ایک دور کا فاصلہ باعتبار زمانہ ایک صدی قائم کیا گیا ہے ۔البتہ جہاں کہیں اسلوبِ بیان کی روش دورانِ صدی ہی میں تبدیل ہوگئی ہے وہاں دور بھی بدل دیا گیا ہے ۔اس میں یہ قباحت ضرور ہے کہ تقسیم ادوار باعتبار زمانہ ہونے کے باعث بعض اوقات ایک سے زیادہ ادوار میں اندازِ نگارش میں کوئی خاص تغیر معلوم نہیں ہوتا، مثلاً عام تصانیف کے دور اول اور دوم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے ۔ہر شعبہ کے تحت میں بہت کافی نمونے ہر عہد اور ہر طبقہ اور سوسائٹی کی تحریرات سے اخذ کرکے پیش کئے گئے ہیں ۔چنانچہ عام تصانیف کے ایک سو چونسٹھ، کاغذات دفاتر سلطنت کے بائیس، اخبارات کے چھتیس، قانونی تراجم کے پندرہ، تقریظ و تنقید کے سولہ اور خطوط کے چھیاسٹھ نمونے اس جلد میں درج ہیں ۔بعض بعض نمونوں کے متعلق جناب مرتب نے تبصرہ و کیفیت کے عنوان سے بحث بھی کی ہے ۔لیکن افسوس ہے کہ کثر جگہ یہ بحث تشنہ ہے، اور بعض ایسے نمونوں کے متعلق بھی نہیں ہے جہاں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔اگر احسن صاحب ہر تصنیف اور مصنف کے متعلق تھوڑی سی معلومات بھی یکجا کر دیتے تو کتاب بہت زیادہ مفید ہوجاتی ۔اگرچہ تصنیف کے وقت اور کتاب کی ضخامت میں معتدبہ اضافہ ہوجاتا تاہم یہ ضرور عرض کرونگا کہ احسن صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اختلاف کی بہت کم گنجایش ہے ان تمام تحریرات میں تنقید کے اصلی پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ان کی رائیں ذوق سلیم اصابت فکر اور وقت نظر کی آئینہ دار ہیں لیکن کہیں کہیں لغزش بھی ہوگئی ہے مثلاً مولانا شوکت علی کو "بابائے خلافت" کہنا، خواجہ حسن نظامی کے متعلق جو رائے پیش کی گئی ہے اس پر غالباً بہت کچھ چہ میگوئیاں ہونگی لیکن دیانتدارانہ اختلاف شاید مشکل ہو۔ ہر دور کے آخر میں جو تبصرہ ہے وہ نسبتاً بہتر اور کسی قدر مفصل ہے ۔تبصرہ و کیفیت کے علاوہ ہر دور کے بعض مخصوص الفاظ اور ان کے موجودہ مترادفات کو بھی جمع کر دیا گیا ہے ۔

بصورتِ موجودہ اس کتاب کو "تاریخ نثر اردو" کہنا شاید صحیح نہ ہوگا البتہ اس کا تاریخی نام "نمونۂ منثورات" ضرور درست ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اِس کی ترتیب و تدوین میں قابل مصنف کو بہت کافی کدوکاوش اور محنت و جستجو کرنی پڑی ہوگی ،جس قدر مواد اس واحد تالیف میں پیش کیا گیا ہے

شاید وہ اِس موضوع کے متعلق تمام کتابوں میں ملا کر بھی نہیں ہے۔اِس سے پہلے عام طور پر نثر اردو کے محض ادبی پہلو سے بحث کی جاتی تھی اور کسی اہل قلم نے اس جامعیت اور وسیع النظری سے کام نہ لیا تھا کہ اُس کی کتاب زبان کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہوتی ۔جو مواد احسن صاحب نے جمع کر دیا ہے وہ آیندہ لکھنے والوں کے لئے بے انتہا مفید ہوگا۔ اور اس بنیاد پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کی جاسکیں گی۔لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ زبان کے ارتقائی نشو و نما کے نمونے تو ہیں، لیکن ان پر بحث یا تو قطعی نہیں کی گئی ہے یا اگر کیگئی ہے تو بہت تشنہ ہے۔ احسن صاحب کو خود اس کا اعتراف ہے، فرماتے ہیں:۔

"مجھے اس کا اعتراف ہے، کہ دوسرے مصنفین کی طرح مَیں نے اِس کتاب میں زبان اُردو کے متعلق اتنی تفصیل و تشریح سے بحث نہیں کی جس کو مکمل تاریخ کہا جاسکے۔نیز اس مقدمے میں اُردو کے ارتقائی مدارج کو ترتیب وار ظاہر نہیں کیا ہے اس اختصار و اجمال کی وجہ یہ ہے کہ اصل کتاب میں وہ جملہ مواد موجود ہے جس کو پڑھکر ایک معمولی مبصر زبان اردو کے تمام ضروری حالات سے واقف ہو سکتا ہے۔"

نثر کی نوعی تقسیم کے متعلق اگرچہ جناب مرتب کا قائم کیا ہوا پہلا شعبہ "عام تصنیف و تالیف" کافی وسیع ہے اور اُس میں ہر قسم کی کتابوں کے نمونے درج کئے جاسکتے ہیں بلکہ شاید سب قسم کی کتابوں کے نمونے شامل کئے جاسکیں۔تاہم نامناسب نہ ہوتا اگر بعض اہم عنوانات علٰحدہ قائم کئے جاتے مثلاً (۱) سیرت نگاری (۲) مضامین (۳) تراجم۔ (۱) سیرت نگاری کا رواج اُردو میں زیادہ پُرانا نہیں لیکن اس تھوڑے ہی عرصہ میں بعض ایسی کتابیں شائع ہوگئی ہیں جو یقیناً دوسری زبانوں کے لئے بھی فخر کا باعث ہو سکتی ہیں۔سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، حیات جاوید، حیات سعدی، یادگار غالب، نظام الملک طوسی البرامکہ، البیرونی، وقار حیات، تذکرہ، آپ بیتی، سیرۃ المحمود اور حیات جلیل، یہ سب اور اسی قسم کی بہت سی دیگر کتابوں کی موجودگی یقیناً ایک علٰحدہ عنوان کی مستحق ہے۔اِن میں سے بعض تصنیفات کے نمونے کتاب زیر نظر میں ملتے ہیں لیکن بہتر ہوتا اگر ان کی ترتیب جداگانہ سلسلہ میں مربوط ہوتی غالباً سیرت نگاری کی اہمیت رقعہ جات دعوت و توید سے کم نہیں ہے

(۲) مضمون نویسی بھی خطوط نویسی کی طرح اصناف ادب میں سے ایک اہم صنف ہے۔مضامین مختلف موضوعات پر لکھے جاتے ہیں، اور جس طرح اصناف نظم میں غزل سب سے آسان اور سب سے مشکل صنف ہے۔ اسی طرح مضمون نویسی بھی اصناف نثر میں سب سے مشکل اور سب سے آسان صنف ہے

مضامین جہاں مضمون نگار کے مختلف خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں وہاں ان سے صاحب مضمون کے طرز تحریر اور قوت بیان کا صحیح اندازہ بھی ہوتا ہے۔ علمی دنیا میں اشاعت خیالات کا ذریعہ مضامین ہی ہوتے ہیں۔ ان کے توسل سے لوگوں نے اصلاح قوم کا کام لیا ہے۔ دوسرے اکثر مشاہیر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یادگار کوئی مستقل تصنیف نہیں ہوتی بلکہ وہ محض متفرق مضامین ہی لکھتے ہیں جن کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ انگریزی علم ادب میں بیسیوں مجموعی مشاہیر کے مضامین ملتے ہیں اُردو میں بھی یہ روش عام ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ نیرنگ خیال، خیالات عزیز، صبح وطن، مضامین شرر سی پارۂ دل، چٹکیاں اور گدگدیاں، فلسفیانہ مضامین، نگارستان، افادات مہدی، پس پردہ، اور محشر خیال وغیرہ متعدد مجموعے اس قسم کے شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے اکثر کے نمونے کتاب زیر تنقید میں پیش کئے گئے ہیں لیکن بعض مشاہیر اہل قلم کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

(۳) ہر زبان کا ادب دو قسم کی کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے طبعزاد اور تراجم۔ بالخصوص اردو زبان بڑی حد تک تراجم کی ممنون احسان ہے۔ زبان کے اول مدارج میں اکثر مذہبی رسایل اردو میں ترجمہ ہوئے اور دور آخر میں ترجموں نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جامعۂ عثمانیہ کے قیام نے اُردو کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ انجمن ترقی اُردو اور دارالترجمہ کے اراکین کی کاوشوں نے اُردو کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ شایستہ زبانوں کی صف میں بیٹھنے کی جرأت کر سکے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل اردو نثر محض قصہ کہانیوں پر مشتمل تھی یا چند مذہبی تصنیفات کا وجود پایا جاتا تھا۔ دارالترجمہ اور جامعۂ عثمانیہ نے اب اس کو صحیح معنوں میں علمی زبان بنا دیا ہے فلسفہ، سائنس، معاشیات، ہیئت، تاریخ، جغرافیہ ادب، سیاسیات، ناول، طب، قانون، تعلیم وغیرہ علوم و فنون کی بیسوں کتابیں دوسری بالخصوص مغربی زبانوں سے ترجمہ کی گئیں جن سے ہم تقریباً جملہ علوم اُردو زبان میں سیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں کے مشاہیر مصنفین اردو داں طبقہ سے روشناس ہو چکے ہیں۔ ہومر، ڈینٹے، گیٹے، ارسطو، افلاطون مل، بیکن، ہیوم، کینٹ، اسپنسر، گبن، شیکسپیئر، ملٹن، ورڈزورتھ، ٹینی سن، آرتھر کانن ڈائل، ہارڈی برنارڈ شا، ایچ۔ جی ویلز، اناطول فرانس، خالدہ ادیب خانم، نامق کمال بے، تلسی داس، کالی داس، چانکیہ بھکم چندر چٹرجی، ٹیگور، دت، بوس اور بیسوں دیگر مشاہیر کے افکار آج خود ہماری زبان میں ہمارے پیش نظر ہیں۔ دراصل اس زمانہ سے اردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جس کی اہمیت کو کوئی مورخ زبان نظرانداز نہیں کر سکتا۔ جناب احسن نے چند نمونے حیدرآبادی تراجم کے پیش کئے ہیں اور پھر یہ کہکر چھوڑ دیا ہے:-

"دارالترجمہ حیدرآباد سے بالالتزام اور مسلسل نئے علوم و فنون کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوتی رہتی ہیں

ان میں دو چار مثالیں یہاں لکھ دی گئی ہیں جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان تراجم کی زبان سمجھنے کے لئے جبتک کہ اصل فن سے واقفیت اور طبیعت کو لگاؤ نہ ہوگا عام اُردو والوں کو اتنی ہی دقت کا سامنا رہیگا جس قدر کہ دو صدی قبل کی اردو زبان سمجھنے میں اس زمانہ کے اُردو والوں کو ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اسلوب بیان کو سہل اور قریب الفہم بنانے کی خاص کوشش مدنظر رہے گی"۔

یہ بات کچھ اردو ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا یہی حال ہے۔ عام ناظرین علوم و فنون کے متعلق کتابوں کو واقعی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ طبیعت کو اس خاص علم سے لگاؤ نہ ہو۔ مثال کے طور پر دیکھ لیجئے کہ ایک عام انگریزی داں شخص ڈاکٹری کی کتابیں نہیں سمجھ سکتا۔ عوام کے لئے اصطلاحات کا استعمال ہمت شکن ہوا کرتا ہے لیکن اس سے مفر نہیں ہے۔ یوں بھی مختلف علوم و فنون کی کتابیں عام ناظرین کے لئے تصنیف نہیں کی جاتیں، وہ ان لوگوں کے لئے ہی ہوتی ہیں جو اس مخصوص فن سے دلچسپی رکھتے ہوں، ہاں اس میں شک نہیں کہ اسلوب بیان کو حتی الامکان سہل اور سریع الفہم بنانے کی کوشش ہونا چاہیئے۔ بہر حال عوام کے لئے بعید الفہم ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس سے ان تراجم کی اہمیت اور وقعت میں کوئی کمی ہو سکے۔ یقیناً اس قسم کی کوششیں ایک علحدہ باب کی مستحق ہیں۔

کتاب خلطِ مبحث کے عیب سے بھی خالی نہیں ہے۔ عام تصانیف کے دورِ چہارم میں ترتیب قائم نہیں رہ سکی جس کی وجہ مواد کا بیک وقت مہیا نہ ہونا ہے۔ قانونی تراجم کا ایک علحدہ باب ہے پھر بھی عام تصانیف کے دورِ پنجم میں مجمع القوانین سنہ ۱۷۹۳ء مطبوعہ سنہ ۱۸۴۲ء اور ہدایت نامۂ مالگزاری سنہ ۱۸۰۳ء کے نمونے صفحہ ۹۳ و صفحہ ۹۹ پر درج ہیں جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ناولوں کے نمونے بھی عام تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں پیش کئے گئے ہیں جو شاید ڈراما، ناٹک اور مختصر افسانوں کے پہلو بہ پہلو اچھے معلوم ہوتے۔ ناول نویسوں کے انتخاب میں بھی احسن صاحب نے ذوق نظر کا کوئی عمدہ ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔ راشد الخیری اُردو میں ٹریجڈی کے ماہر ہیں اور شاید موزوں طور پر "مصورِ غم" کے لقب سے ملقب کئے جاتے ہیں لیکن کتاب زیرِ نظر میں ان کے کسی ناول کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کے مشہور ناول نویس مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی سجاد حسین کے ناولوں کے نمونے بھی نہیں ہیں۔ اُردو ناولوں میں صرف دو کیرکٹر (کردار) ایسے ہیں جنھیں حیات دوام کا خلعت نصیب ہوا ہے۔ ایک آزاد اور دوسرے بہرام۔ فسانہ آزاد مبصرین کے نزدیک اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ آزاد کا سا جیتا جاگتا کیرکٹر کسی اُردو ناول نویس کو میسر نہ ہوا۔ اسی طرح جو قبول عام نیلی چھتری کو حاصل ہوا وہ کسی اور اُردو ناول کے حصہ میں نہ آیا۔ مولوی ظفر عمر نے نیلی چھتری تصنیف کر کے اُردو ناول نویسی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سراغ رسانی کے ناولوں کی ابتدا اسی سے ہوئی

اور متعدد ناول اِس کی تقلید میں لکھے گئے لیکن استاد اول سے کوئی سبقت نہ لے جاسکا۔ معلوم نہیں اِن سب کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شرر کے ناولوں میں سے "شوقین ملکہ" کا اقتباس پیش کیا گیا ہے حالانکہ موصوف کے اکثر ناول اس سے بہتر ہیں، معلوم ہوتا ہے جناب مرتب نے ناول کا مطالعہ تضیع اوقات سمجھا۔

نمونہ ۱۲ دفاتر سلطنت کے بعض کاغذات کے اقتباسات پر مشتمل ہے، اِس میں حکومت ہند اور حکومت حیدرآباد کے بعض محکمہ جات کے کاغذات مثلاً تجاویز، احکامات، سمن، عرائض، اطلاعنامجات اور مراسلات وغیرہ کے نمونے درج ہیں۔ عام ناظرین کو غالباً اس باب سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ بعض مراسلات سے مصنف اور تصنیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اعلیٰ حضرت نظام کے فرامین مبارک بھی اُردو ہی میں جاری ہوتے ہیں مگر احسن صاحب نے کسی فرمان شاہی کی نقل کو اس تصنیف میں شامل نہیں کیا۔

نمونہ ۱۳ اخبارات سے متعلق ہے۔ اس کو چار ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلا دور ۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۵۷ء ہے جس میں چھ نمونے ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۲ء تک ہے، اس میں پانچ نمونے ہیں۔ تیسرا دور ۱۸۸۲ء سے لیکر ۱۹۰۰ء تک ہے جس میں تین نمونے ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۰۱ء سے لیکر اس وقت تک قایم کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں اکیس نمونے مندرج ہیں۔ آخر میں ہر دور کے چند اخبارات کے نام معہ مقام اشاعت درج کئے گئے ہیں تاکہ اندراج یکجائی سے تلاش و جستجو کی زحمت کم ہوجائے۔ یہ فہرست اکیسو چون اخبارات کی ہے۔ افسوس ہے کہ بعض قدیم اخبارات کے نمونے دستیاب نہیں ہوسکے۔ شمس العلما آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا "دہلی اخبار" جو اُردو کا پہلا اخبار تھا اس کا نمونہ اگر مل سکتا تو تاریخی لحاظ سے نہایت گراں بہا ہوتا۔ تاہم اخبارات کے ذیل میں بعض نہایت کارآمد، مفید اور دلچسپ اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً نظام گورنمنٹ کی گشتی چٹھی جس میں "جملہ عہدہ داران، ملازمان صیغۂ عدالت و وکلا و مختار کاران و عامۂ رعایائے سرکار عالی" کو اطلاع دی گئی ہے کہ "آیندہ جملہ عدالتی دفتروں میں اُردو زبان کے ذریعہ خط و کتابت ہوگی" ص۱۹۱ یا اشتہار ضبطی ملک اودھ مصدرہ امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند کا جو ساتویں تاریخ فروری ۱۸۵۶ء کو مشتہر ہوا" کا اُردو ترجمہ ص۲۹۷ نہایت بیش قیمت اور دلچسپ معلومات کا حامل ہے اور تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اخبارات کے متعلق ایک بات یہ ضرور قابل گذارش ہے کہ بعض جگہ زمانہ تحریر میں صرف سنہ لکھا ہے حالانکہ تاریخ بھی درج کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ اخبار کے دو حصہ ہوتے ہیں

ایک میں ایڈیٹوریل اور دوسرے میں خبریں اور مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اگر اس ضمن میں یہ بتایا جاتا کہ ایڈیٹوریل لکھنے کا رواج کب سے شروع ہوا اور کیا کیا تغیرات اِس میں ہوئے، نیز جو نمونے درج ہیں وہ ایڈیٹوریل مقالات کے اقتباسات ہیں یا نامہ نگاروں کے مضامین کے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور اگر دونوں کے اقتباسات پہلو بہ پہلو درج ہوتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔

اخبارات کے بعد قانونی تراجم کے نمونوں کا نمبر ہے، یہ دو ادوار پر منقسم ہیں۔ پہلا دور سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک قائم کیا گیا ہے حالانکہ خود کتاب زیرِ تنقید میں سنہ ۱۷۹۳ء اور سنہ ۱۸۰۳ء کی قانونی کتب کی اقتباسات عام تصنیف و تالیف کے تحت مندرج ہیں۔ دوسرا دور سنہ ۱۹۰۰ء سے لیکر زمانۂ حال تک ہے پہلے دور کے بارہ اور دوسرے دور کے تین نمونے کتاب زیرِ نظر میں درج ہیں۔

پانچواں نمبر تقریظ و تنقید کا ہے، اس کے دو دَور قائم کئے گئے ہیں۔ دورِ اول سنہ ۱۸۴۲ء سے سنہ ۱۸۹۲ء تک اور دورِ دوم سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک قائم کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مرتب نے اِس صنفِ نثر کی جانب بہت کم توجہ مبذول فرمائی ہے۔ زندہ زبانوں کے لئے صحیح تقریظ و تنقید کی جس قدر ضرورت ہے وہ ظاہر ہے۔ شاہراہِ ادب تک صحیح رہنمائی کے لئے نقاد کا وجود ناگزیر ہے۔ مصنفین کی حوصلہ افزائی اور ان کی اصلاح کا واحد ذریعہ صحیح تنقید ہی ہوسکتی ہے۔ انگریزی ادیبوں میں ایک معقول تعداد ایسے مشاہیر کی ہمیشہ رہی ہے جو صرف تنقید ہی لکھتے ہیں۔ گوہر تو بہر حال گوہر ہی ہوتا ہے لیکن اُس کی صحیح قدر و قیمت صرف جوہری کی شناخت پر منحصر ہے۔ یادگارِ غالب لکھے جانے سے پہلے بھی غالبؔ غالبؔ ہی تھے اور اس کے بعد بھی غالب ہی رہے۔ لیکن اول الذکر سے پہلے غالبؔ کی قدر و قیمت کتنے شخص آشنا تھے؟ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمہ کے شائع ہونے کے بعد تو غالبؔ محض شاعر ہی نہیں رہے بلکہ قومی ہیرو اور ملہم بن گئے اور آج غالبؔ جس عدیم المثال عظمت و شہرت کے واحد حقدار ہیں اس کا وجود حالیؔ اور بجنوری کا رہینِ منت ہے۔ اُردو میں شاید یہ پہلی کوششیں تھیں جو اس قدر بار آور ہوئیں ورنہ ہمیشہ سے تقریظ و تنقید کی مٹی پلید رہی ہے۔ اول اول تو تقریظ اس طریقہ پر لکھی جاتی تھی کہ اگر کتاب اور صاحب کتاب کا نام بدل دیا جائے تو وہی تقریظ ہر کتاب اور ہر مصنف کے لئے موزوں ہو جائیگی۔ منشی غلام غوث بیخبر کی انشا بہارِ بے خزاں کی مشہور تقریظ اس قسم کی تقریظ کا بہترین نمونہ ہے۔ ابھی تک صحیح تنقید کا مذاق ہمارے ادیبوں میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ بالعموم تنقید، تنقید نہیں ہوتی بلکہ تنقیص یا تحسین ہوتی ہے، اور بحیثیت فن تو غالباً ڈاکٹر زور کے علاوہ کسی اور ادیب نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی ہے۔ کچھ عرصہ سے انگریزی کی تقلید میں مقدمہ نگاری کا رواج اُردو میں بھی شروع ہو گیا ہے اور اب جس قدر مشہور شاعروں کے

دیوان اور اساتذۂ قدیم کی پرانی کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کے ساتھ بغیر کسی استثنا کے مقدمہ ضرور ہوتا ہے جس میں علاوہ مصنف کے ذاتی حالات کے کتاب کی تنقید بھی شامل ہوتی ہے جو کتاب کے مطالعہ سے قبل اُس کے لئے زمین تیار کر دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے بعد انجمن ترقی اردو کے مشہور ناظمِ اعزازی مولوی عبدالحق بی۔اے نے سب سے بڑھکر شہرت حاصل کی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تحریرات تنقید عالیہ کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں۔ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی، مولوی عبدالماجد دریابادی، پنڈت برج نراین چکبست، مولوی اقبال احمد سہیل اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمے بھی بہت مشہور ہو گئے ہیں۔ اور یقیناً ادب اردو میں مستقل گراں بہا اضافوں کی حیثیت رکھتے ہیں افسوس ہے کہ احسن صاحب نے ان جملہ مقدمات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دور اول میں مرزا غالب، صہبائی اور قربان علی بیگ سالک کی تحریرات کے پانچ اقتباس درج کئے ہیں۔ دور دوم میں زمانۂ حال کے بعض ایڈیٹروں یا مضمون نگاروں کی تنقیدوں کے نمونے لکھے ہیں۔ تعجب ہے کہ احسن صاحب نے سرتیج بہادر سپرو کے دیباچۂ صبح وطن "مصنفۂ چکبست کا اقتباس تو پیش کر دیا مگر خود چکبست کی صبح وطن کو نظر انداز کر دیا حالانکہ چکبست کو بحیثیت نثر نگار کے جو کچھ شہرت حاصل ہوئی وہ صرف تنقید نویسی کی وجہ سے حاصل ہوئی شمس العلما آزاد کی تحریرات میں سے غالباً آب حیات کا انتخاب موزوں ہوتا لیکن نمونہ دیباچۂ نیرنگِ خیال کا پیش کیا گیا ہے جس میں یقیناً تنقید کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ سجاد انصاری مرحوم زمانۂ حال کے ایک ہونہار اور باکمال ادیب تھے جن کی ذات سے اردو کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، طنزیہ تنقید لکھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا مگر تاریخ نثر اردو کے صفحات ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ اور تو اور مولانا شبلی اور مولانا حالی تک کا ذکر اس ضمن میں نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اردو مصنفین میں یہ دونوں حضرات پہلے بزرگ تھے جنھوں نے صحیح تنقید سے شائقین ادب اردو کے کان آشنا کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا ذکر نہ کرنا تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ آزاد نے آب حیات کے اول ایڈیشن میں مومن کو نظر انداز کر دیا تھا ہمیں امید ہے۔ آیندہ ایڈیشن میں احسن صاحب اس بحث کی جانب خاص توجہ کریں گے اور موجودہ فرو گذاشتوں کی تلافی کر دی جائیگی۔

نمونہ (۶) میں چھیاسٹھ مکاتیب مشاہیر شعرا و علما و اطبا و مدبران ملک کے درج ہیں۔ یہ نمونہ بھی دو ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا دور سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک بائیس مکتوبات پر مشتمل ہے۔ دوسرا دور سنہ ۱۹۰۱ء سے اس وقت تک ہے۔ اس کے تحت چوالیس مکاتیب ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ دلچسپ ترین ہے۔ جب سے اردو میں خطوط نویسی کا رواج شروع ہوا ہے اس وقت سے لیکر اب تک تقریباً ہر مشہور ادیب کے خطوط کے نمونے

جمع کر دئے گئے ہیں، اِن میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جو ذاتی معاملات سے متعلق ہیں اور ان کی اشاعت کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی۔

احسن صاحب شاعر ہیں، ان کی نثر میں بھی شاعری کا کافی اثر نمایاں ہے۔ اُن کی زبان شگفتہ اور انداز بیان دلچسپ ہوتا ہے۔ بطور نمونہ ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

"محمود کے حملے دھواں دھار بادل یا گھٹا ٹوپ آندھیوں کی طرح تھے جس نے گویا ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو کر چکر لگائے اور چلتا ہوا۔ البتہ شہاب الدین غوری نے پرتھی راج (متوفی ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء) کو شکست دینے کے بعد ہندوستان میں قدم جمائے اور ایسے جمائے کہ ۶، ۷ صدیوں تک رات دن کی گردشیں اس کی ڈالی ہوئی بنیاد کو ٹا ٹا کیسا جنبش تک نہ دے سکیں۔ اسی فتح مندی کے بعد سرزمین اردو (لشکر) میں ایک نئی زبان کی تخم پاشی کا سامان شروع ہوا۔ ترکوں اور مغلوں نے عربی ترکی اور عجمی الفاظ کے دانے ہندوستان کے چٹیل میدان میں بکھیرے اور ہندوستان کے پتھریلے بنجر نے مقناطیس بنکر ان بکھرے ہوئے دانوں کو تنکوں کی طرح کھینچنا شروع کیا۔ یعنی ان تمام لفظوں کو بھاشا نے اپنے وسیع اور کشادہ دامن میں پناہ دی اور اسی کے ساتھ تلنگو۔ تامل۔ برجی۔ اپالی۔ قنوجی اڑیا، مرٹیا۔ گجراتی۔ ملتانی۔ بنگالی غرض کہ تمام ملکی اور ہمسایہ زبانیں مل جل کر اردو کے بیج کو سینچنے لگیں"

الغرض بصورت مجموعی یہ کتاب مفید اور دلچسپ ہے۔ ان معمولی کوتاہیوں کے اظہار سے جو اس ریویو میں مذکور ہوئیں کتاب کی وقعت میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ "تاریخ نثر اردو" خوش مذاق ناظرین کی میز کی زینت کا باعث ہوگی اور ہمیں امید ہے کہ قدر دانانِ اردو اس کو ہاتھوں ہاتھ لینگے

ستارہ (لاہور) تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ۴۰ صفحات - سالانہ چندہ ۶ء

یہ ماہوار رسالہ مسٹر ایشور ناتھ ورما کی ادارت میں جنوری ۳۱ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے، رسالہ کے جاری کرنے کا مقصد ڈراما، سینما۔ ریڈیو۔ موسیقی۔ مصوری وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانا ہے۔ سرورق پر ڈاکٹر سی۔ وی۔ رامن کی تصویر ہے جنکو امسال نوبل پرائز ملا ہے۔ پہلا نمبر ایک حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب نظر آتا ہے۔ آیندہ نمبروں کے لئے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ اس سے زیادہ دلچسپ اور مفید مضامین پر مشتمل ہونگے۔

اس نمبر میں ایک آرٹ کی تصویر ہے اور انگریزی اصول پر بعض مضامین نگار حضرات کی تصویریں عنوان مضمون کے ساتھ شائع کی گئی ہیں،

فخر قوم پنڈت موتی لال نہرو

(از منشی جگت موہن لال رواں ایم۔اے، ایل۔ایل بی)

یوں تو اک روز ہر انسان کو مرنا ہے یہاں — موت پر تیری حیاتِ ابدی بھی قرباں
تیری تعریف یہ ہے تو تھا مکمل انساں — پوجنے آئیگی دنیا ترے قدموں کے نشاں

ہند کو وجہ جنوں ہے غمِ تازہ تیرا
قوم کے دوش پہ نکلا ہے جنازہ تیرا

لب پہ جادو تھا، نگاہوں میں تری سحرِ حلال — فتح کرتی تھی ارادوں کا ترے استقبال
جان کی نذرِ وفا تو نے، کہاں کا زر و مال — درس ایثار ہے دنیا کے لئے تیری مثال

تیری پیری نے جوانی کو سرافراز کیا
عیشِ ماضی کو ترے ترک نے ممتاز کیا

تیری سطوت میں پیامِ وفا دیتی تھی — خودسری خودغرضی سب کی بھلا دیتی تھی
جب طبیعت تری کچھ زور دکھا دیتی تھی — ایک آندھی تھی کہ تنکوں کو اڑا دیتی تھی

کبھی خالی نہیں جاتا تھا نشانا تیرا
تک کے رہ جاتا تھا منہ دشمنِ دانا تیرا

سچ یہ ہے قوم کا تو جب سے ہوا راہ نما — کارواں بڑھ کے قریبِ سرِ منزل پہونچا
صدق و ایثار وہ گاندھی کا ترا ذہنِ رسا — اِنھیں دونوں نے بدل دی تھی زمانے کی ہوا

اک نہ ہونے سے ترے قوم کا دل ٹوٹ نہ جائے
ہاتھ سے دامنِ اُمید کہیں چھوٹ نہ جائے

کشتیٔ قوم کو ساحل پہ لگانے والے — ملک کی ہمتِ خفتہ کو جگانے والے
ہندِ مظلوم کی بگڑی کے بنانے والے — صرفِ پیکار میں چھوڑ کے جانے والے

مائلِ حرفِ شکایت دلِ مغموم نہیں
ہم پہ کیا گذرے گی تجھ بن تجھے معلوم نہیں

نالۂ غم

(از پروفیسر سید محمد ضامن علی، ایم۔ اے (صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی)

میں اب دل کو نثارِ بانیٔ بیداد کرتا ہوں
بڑی دولت تھی جسکو عشق میں برباد کرتا ہوں

چمن کے ہجر میں یہ نالہ و فریاد کرتا ہوں
زباں جل جائے گر میں شکوۂ صیاد کرتا ہوں

قوی ایمان ہوتا ہے تمہاری بیوفائی سے
کہ جب تم بھول جاتے ہو خدا کو یاد کرتا ہوں

مرے ضبطِ فغاں سے ہے یہ سب ہنگامہ آرائی
جہاں خاموش ہو جاتا ہے جب فریاد کرتا ہوں

خفا ہوتے ہو کیوں، شکوے ہیں میرے سر بسر جھوٹے
تمہیں بیداد کیا معلوم میں بیداد کرتا ہوں

شکستہ ساز ہوں گو بزم میں ہوں عیش و عشرت کی
ہر اک دل پر گراں ہوتا ہوں جب فریاد کرتا ہوں

دلِ ویراں میں دیتا ہوں جگہ ارمان و حسرت کو
میں آبادی کے پردے میں اسے برباد کرتا ہوں

ہوا میں وہ اُڑاتے ہیں ہماری خاک یہ کہکر
کہ اب تو نام ہے اس کا کہ میں برباد کرتا ہوں

پہاڑ ایسی جو ضامن کاٹتا ہوں رات فرقت کی
تو کچھ اُس وقت قدرِ محنتِ فرہاد کرتا ہوں

رباعیات محروم

(منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

دنیا میں ہوئی نہ تجھ کو تسکیں حاصل
کوسوں تجھ سے رہا سکونِ کامل
کیونکر ہو علاج تیری بیتابی کا
لے جاؤں تجھے کدھر کو آخر اے دل!

رزاق سے سب ہیں رزق پانیوالے
مہمان اس کے ہیں آنے جانیوالے
نازاں نہ ہو اور کو کھلا کر انساں
اک خوانِ کرم سے سب ہیں کھانیوالے

محبتؔ[1]

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

(از حضرت منور لکھنوی)

(۱)

گزر کر آسماں رس رفعتوں پر کوہساروں کی
ہواؤں کی طرح لہرو نیہ چل کر رودباروں کی
اُتر کر ڈوب کر چشموں کے اندر تہ نشیں ہو کر
بزیر تربت احباب رفتہ جاگزیں ہو کر
قیامت خیز طوفانوں کی دشواری کو طے کر کے
نشیب آثار چٹانوں کی دشواری کو طے کر کے
دفور شوق سے کرتی ہوئی طے منزل صحرا
محبت ہر طرح کر لے گی اپنا راستا پیدا

(۲)

جہاں قدرت نے اتنی بھی نہیں رکھی ہے گنجایش
گزر ہو جائے اک ننھے سے جگنو کا بآسایش
جہاں پیدا ہے تنگی سے دلِ انساں میں حیرانی
نہ اک مکھی بھی پر پھیلا سکے جسمیں بآسانی
نہ داخل ہو سکے اِک پشۂ ناچیز بھی جس میں
سمائی ہو نہیں سکتی کسی ذی روح کی جسمیں
محبت آ کے اپنے واسطے کر لے گی جا پیدا
محبت ہر طرح کر لے گی اپنا راستا پیدا

(۳)

نہ ہو اقرار شاید تم کو اس کے زور و قوت کا
اسے سمجھو مرقع خواہ طفلانہ نزاکت کا
کرو نفرت سے عائد خواہ الزامِ فرار اس پر
کہ رکھو بزدلی کا اتہامِ ناگوار اس پر
اگر محبوب اس کا لاکھ پردوں میں چھپا ہو گا
اگر پہرے پہ پہرا رات دن اس پر لگا ہوگا

---

[1] ایک انگریزی نظم (The Great adventure) کا قریب لفظی ترجمہ۔ (منور)

محبت کو نہ ڈر کچھ تیغ کا خدشہ نہ خنجر کا
محبت ہر طرح کرلے گی اپنا راستا پیدا

(۴)

گماں اکثر کا ہے تدبیر کرسکتی ہے پست اسکو　　کہ ہو جاتی ہے قید و بند سے حاصل شکست اسکو
خیال اکثر کا ہے آنکھیں نہیں ہوتیں محبت کی　　عطا قدرت ہی سے نعمت نہیں اسکو بصارت کی
کرد جو دل میں آئے تنگ کرنے کے لئے اُسکو　　نہ دو رستہ ذرا بھی تم گزرنے کے لئے اُسکو
مگر بینا کہو تم خواہ اس کو خواہ نابینا
محبت ہر طرح کرلے گی اپنا راستا پیدا

(۵)

عتابِ آسماں شاید اسیرِ دام ہو جائے　　تمہاری تربیت سے ہے یہ ممکن رام ہو جائے
یہ ممکن ہے کہ ققنس پر تمہارا رعب چھا جائے　　یہ ممکن ہے کہ بیچارہ تمہارے بس میں آجائے
بٹھا دو خواہ بھوکی شیرنی پر اقتدار اپنا　　تمہاری منتوں سے چھوڑ دے شاید شکار اپنا
محبت کو نہیں کوئی کبھی مغلوب کرسکتا
محبت ہر طرح کرلے گی اپنا راستا پیدا

رباعیّات

(از منشی تلوک چند محروم بی اے)

گر ظلمتِ وہم نے تجھے گھیرا ہے　　تاریک مثالِ شب تری دنیا ہے
کر اُس کے خیال سے دل اپنا روشن　　خالق جو مہر و ماہ و انجم کا ہے

اے روشنیِ شعور دینے والے　　ذرّوں کو ضیائے طور دینے والے
دیدار طلب ہے میری چشمِ حیراں　　اے شمس و قمر کو نور دینے والے

پھولوں کے ورق ہیں دفترِ بے معنی　　اجرامِ فلک ہیں پیکرِ بے معنی
پڑ جاتی ہے نام سے ترے جاں اسمیں　　ورنہ یہ جہاں ہے دفترِ بے معنی

لطفِ سخن

(از حضرت ابو العلا ناطق لکھنوی)

مجھ سے افسردہ نہ اے جوشِ بہاراں ہونا
کیف میں بھول گیا چاک گریباں ہونا

کم سے کم فرض ہے ذرے کو بیاباں ہونا
جرم ہے عشق میں انسان کا انساں ہونا

فصلِ گل میں نئے داغوں کا نمایاں ہونا
پھر بھی رنگِ گلستاں بہ گلستاں ہونا

جب بکھر جاتی ہے زلف اور نکھر جاتی ہے
مجھکو جمعیتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

ذرہ ذرہ ہے تجلی سے اڑائے ہوئے آنکھ
کس قیامت کی نمائش ہے یہ پنہاں ہونا

زیورِ نور بنایا گیا ظلمت کے لئے
پہلے کافر تو ہو بعد اُس کے مسلماں ہونا

دُور میں تجھ سے ابھی نور کے ذرے ہر سو
اے مری خاک ذرا اور پریشاں ہونا

حسرتِ دید نے آئینہ بنایا دل کو
عین نظارہ ہے نظارے کا ارماں ہونا

کتنا ہوتا ہے نمایاں سخنِ ناطق سے
مثلِ معنے ترا ہر لفظ میں پنہاں ہونا

(از جناب بیخود موہانی ایم۔اے)

تو پردہ اگر چہرۂ زیبا سے اُٹھا دے
قدرت ازل و حشر کو اک ساتھ صدا دے

کچھ حد بھی ہے اس ناز کی للہ بتا دے
کہتا ہے کہ مَیں صبر تجھے دوں تو خدا دے

دیدی ہے خدائی تجھے اب تو ہی بتا دے
کیا دے مجھے پھر تجکو وفا بھی جو خدا دے

صدقے ترے اے چارہ گر اب مجکو جلا دے
جینے کی دوا ہو چکی مرنے کی دوا دے

مجکو مرے اعمال سے محجوب نہ رکھا
اے نارِ جہنم تجھے اللہ جزا دے

مٹتا ہے ابھی پرسشِ اعمال کا جھگڑا
سب کو نگہِ ناز سے دیوانہ بنا دے

الجھی نگہِ قہر سے بڑھکر نگہِ یاس
اب جس سے بھی کچھ بن پڑے اب جسکو خدا دے

جنت میں مجھے بھیج کہ دوزخ میں مجھے ڈال
جنت کو سزا دے کہ جہنم کو جزا دے

دینا ہے تو کیا مجھکو خدائی نہیں درکار
دینا ہے تو میرے بتِ کافر کو خدا دے

دیکھے کوئی محرومیِ صیاد کہاں تک
اے برق نشیمن کو مرے آگ لگا دے

اے اُڑتے ہوئے رنگ یہ آہٹ ہے اُسی کی
دے دل کو ندا عمرِ گذشتہ کو صدا دے

پابندِ رضا دل ہے مرا ورنہ مری آہ
اِک جلوہ گہِ ناز کے پردوں کو اُٹھا دے

جسمیں شبِ اسریٰ ہوئیں محبوب سے باتیں
تجھ کو بھی اِک دن وہی آواز سنا دے

(از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق ڈپٹی کلکٹر پنشنر الہ آباد)

وہی نالہ وہی شیون وہی طرزِ فغاں پھر ہو
زبانِ شمعِ سوزاں سے مصیبت کا بیاں پھر ہو

اُٹھا دو پردۂ ظلمت تو اِک جلوہ عیاں پھر ہو
کسی کی جستجو ہو اور تلاشِ لامکاں پھر ہو

اس آزادی سے کیا حاصل جو کھٹکے سب کی آنکھوں میں
وہی کنجِ قفس ہو، ہم ہوں، اور ضبطِ فغاں پھر ہو

کفِ افسوس کب تک تم ملوگے رقصِ بسمل پر
اُٹھاؤ ہاتھ میں خنجر کہ اُس کا امتحاں پھر ہو

یہ خامی شمعِ سوزاں ہی ۔ ترے ہی سوزِ پنہاں کی
جلے تو سر سے پا تک اور اُس پر بھی دھواں پھر ہو

ارے او محوِ غفلت کچھ سبق لے دورِ گردوں سے
کسے معلوم، کیسا انقلابِ آسماں پھر ہو

یہ کیسا بارِ احساں ہے یہ کیسی دلنوازی ہے
کہ بختِ نارسا میرا لضیب دشمناں پھر ہو

ادا سرکش ۔ فلک دشمن ۔ تمہاری تیغ بھی برہم
ٹھکانا کشتۂ الفت کا کہیئے تو کہاں پھر ہو

کہو اے شوق بہکی بہکی باتیں آج ہیں کیسی
خمارِ بادۂ سرجوش سے کیا سرگراں پھر ہو؟

(از جناب ثاقب کانپوری)

وہ ترا حسن کو خود بین و خود آرا کرنا
وہ مرا بیخودیٔ شوق میں دیکھا کرنا

دار پر چڑھ کے ترے حسن کو رسوا کرنا
خام تھا عشق میں منصور کا دعوےٰ کرنا

کتنا بے سود ہے یہ خوفِ مکافاتِ عمل
عیشِ امروز میں اندیشۂ فردا کرنا

کہیں مٹ جائے نہ اس دہر سے تقلیدِ وفا
دل سے تم شکوہ نہ اربابِ وفا کا کرنا

اِسی صورت سے ہے ممکن کہ ہو تکمیلِ حیات
خونِ دل خونِ جگر صرفِ تمنا کرنا

آؤ سن لو مری بربادیِ دل کی روداد
مجھے منظور ہے اب شرحِ تمنا کرنا

عجب افسانۂ عبرت ہے یہ سعیٔ ناکام
مرے جذبات کا خود ہی مجھے رسوا کرنا

اللہ اللہ یہ مجبوریٔ پاسِ الفت
حشر میں بھی نہ مرا خون کا دعویٰ کرنا

ہو مبارک تمہیں اس موسمِ گل میں ثاقب
دل کے ہر ذرّے کو ہم وسعتِ صحرا کرنا

(جناب بسمل الہ آبادی)

میری کشتی کا آسرا ہی نہیں   ناخدا ہے مگر خدا ہی نہیں
ہم سمجھتے تھے آشنا ہیں سب   وقت پر کوئی آشنا ہی نہیں
ہر جگہ دیکھو ہر طرف دیکھو   اُس کے جلوے کی انتہا ہی نہیں
پھر رہی ہے نگاہ میں منزل   کس طرح پہنچوں رہنما ہی نہیں
ایسے بھی لوگ ہیں خدائی میں   دل سے جو قائل خدا ہی نہیں
برق نے اس طرح تباہ کیا   آشیاں جیسے اپنا تھا ہی نہیں
بزم قاتل میں سب کی پرسش ہے   کوئی بسمل کو پوچھتا ہی نہیں

(جناب فروغ علوی کاکوروی)

اک نخل نو دمیدہ سر جوئبار ہوں   لیکن رہین گردش لیل و نہار ہوں
خط عبودیت ہے جبین نیاز میں   گو جرم کچھ نہیں ہے مگر شرمسار ہوں
اللہ رے کس مپرسیٔ وارفتگان شوق   ہوں گلشن جہاں میں مگر ایک خار ہوں
اے وہ کہ مبتلائے الم جس نے کر دیا   اب بھی تری نگاہ کا اُمیدوار ہوں
ہمت تو دیکھئے کہ قفس میں چمن سے دور   سر در ہوائے آمد فصل بہار ہوں
ناچیز جان مجھکو نہ اے آسماں کہ میں   خرمن کو دم میں پھونک جو دے وہ شرار ہوں
جب خود ہی کارساز ہے دانا، تو اے فروغ   بیکار کیوں سوال کروں شرمسار ہوں

(جناب ساغر - دیال باغ)

کہیں مستوں کے دل میں کعبہ و بتخانہ آتا ہے   جب آتا ہے خیال ساقی و میخانہ آتا ہے
زباں پر ذکر دیدار مسرت بار رہتا ہے   نگاہوں میں سرور جلوۂ جانانہ آتا ہے
بھڑک اُٹھتا ہے شعلہ اس سراپائے محبت کا   فدا ہونیکو اس پر جب کوئی پروانہ آتا ہے
سفر میں منزلیں اکثر نشاں اگلوں کا دیتی ہیں   گماں بستی کا ہوتا ہے جہاں ویرانہ آتا ہے
خوشی سے اپنی رسوائی گوارا اسکو ہوتی ہے   گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے
خبر ہے آجکل مجنوں کو لیلیٰ پیار کرتی ہے   یہ سنکر جو کوئی آتا ہے مجنونانہ آتا ہے
بس اک ساقی کے دم سے میکدہ آباد ہے ساغر   وگرنہ کون انساں جانب میخانہ آتا ہے

تصاویر

(نور جہاں کی حسن تدبیر)

اس ماہ کی رنگین تصویر ہندوستان کی مشہور و معروف ملکہ نورجہاں کی حسن تدبیر کے متعلق ہے۔ ۱۶۲۵ء کے قریب زمانے میں جہانگیر کو کابل کی ایک مہم پر جاتے ہوئے مہابت خاں نے راستہ ہی میں قید کر لیا تھا، اسکی چہیتی بیگم نورجہاں کو جب یہ خبر پہونچی کہ جہانگیر کا اس خطرے سے جانبر ہونا مشکل ہے اور فوج کشی کی حالت میں بادشاہ کے قتل ہو جانیکا پورا اندیشہ ہے تو وہ ایک مختصر سی فوج لیکر آگرہ سے روانہ ہوئی مگر اپنی سپاہ کو پہاڑیوں میں پوشیدہ کر کے خود تن تنہا جہانگیر کے پاس جا پہونچی۔ شروع میں باغیوں نے بیگم کے تن تنہا آنیکے کو کچھ زیادہ اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھا اور نورجہاں پر کسی قسم کا شک نہیں کیا۔ بعد چندے ایک روز موقع پا کر سیر و تفریح کے بہانہ سے نورجہاں اور جہانگیر ہاتھی پر سوار ہوئے اور مہاوت کو کسی حیلے سے پشت کی طرف جانے کا حکم دیا، اور نورجہاں خود اُسکی جگہ پر بیٹھ کر ہاتھی کو ایر اپیرا دیکے اور انکس کو اپنی پوری قوت سے ہاتھ میں لیکر اُس کو دریا میں ڈال دیا۔ مہابت خاں کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو حیران ہو گیا، اُسنے تعاقب کرنا چاہا مگر تعاقب کرنیوالے باغی دیکھتے کے دیکھتے رہگئے اور یہ دونوں اپنی فوج میں آملے۔ چابکدست مصوّر نے اس واقعہ کو جس کامیابی سے قلمبند کیا ہے وہ قابل داد ہے۔

دوسری تصویریں ہندوستانی مصوری کے دلکش سلسلہ مضامین سے تعلق رکھتی ہیں جو زمانہ کے گذشتہ نمبروں میں شائع ہوئے ہیں، ایک تصویر میں کانگڑا قلم کی مصوری کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، اور حسن و عشق کے ساز و نیاز کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ تیسری تصویر ۱۶۱۰ء کے عہد مغلیہ کی مصوری کا نمونہ ہے اور انوار سہیلی کے ایک قصہ سے متعلق ہے جسمیں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ایک سیاح ایک درویش کی ملاقات کو دُور دراز کا سفر کر کے آیا ہے مگر یہ سنکر کہ وہ درویش بادشاہی دربار میں گیا ہے سیاح کو اپنی محنت سفر کے رائگاں ہونے پر افسوس ہوتا ہے، مگر تھوڑی دیر میں اُسکی غلط فہمی دُور ہو گئی کیونکہ درویش عدالت قضا میں اسلیئے گیا تھا کہ کوتوال نے غلطی سے ایک بیگناہ شخص کو سرقہ کا مجرم سمجھکر اُسکے ہاتھ کٹوانے کا انتظام کیا تھا حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھا چنانچہ عدالت کی اس غلط فہمی کو عین موقع اور وقت پر پہونچکر رفع کرنیکی غرض سے درویش قاضی کی عدالت میں گیا تھا، وہاں سے واپسی پر روشن ضمیر درویش کو سیاح کی اندرونی بدگمانی کا حال معلوم ہو گیا تو اُسنے سیاح کو سمجھایا کہ خلق اللہ کی خدمت ہی بہترین عبادت ہے اور اسی عبادت کے سلسلے میں وہ عہدیداران سرکاری سے ملاقات کا سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

تصویر میں مفروضہ مجرم کے ہاتھ کاٹنے کی تیاری کا منظر دکھایا گیا ہے، درویش قاضی سے اسکی رہائی کی سفارش کر رہا ہے۔ اس قصہ کے تمام جزئیات جس خوبی و چابکدستی سے نمایاں کئے گئے ہیں اُس سے ہندوستان کی قدیم مصوری پر نہایت دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔

ہمکو افسوس ہے، کہ فسادات کانپور کے باعث اس پرچہ کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہو گئی، اور بعض تصاویر کی اشاعت بھی ملتوی کرنا پڑی

۱۰۱۰ / صفحہ

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے

نمبر ۴	اپریل سنہ ۱۹۳۱ء	جلد ۵۶

فہرست مضامین

تصاویر تصویر شیر محمد قوال (عہد مغلیہ کی مصوری کا نمونہ) علاقہ قلو پطرہ۔ ہام پی کے کھنڈروں کا عام منظر۔ جین مندر اور دریائے گنگ بہدرا کا منظر۔ رگھو ناتھ جی اور وٹھل سوامی کے مندر

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا



تصویر شیر محمد قوّال
سترھویں صدی - عہد مغلیہ - کے مصوری کا نمونہ
عمل محمد نادر سمرقندی



نامور ملکہ مصر قلوپطرہ اپنی عظیم الشان کشتی پر
دریاے نیل کی سیر کررہی ہے

زمانہ

جلد ۵۶ — اپریل ۱۹۳۲ء — نمبر ۴

ہندوستانی زبان کا ارتقا

اور

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کے مقاصد

از آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔
چیف جسٹس ہائیکورٹ الہ آباد

ہندوستانی اکیڈمی کی دوسری ادبی کانفرنس میں جو الہ آباد میں ۴ و ۵۔ اپریل ۳۲ء کو منعقد ہوئی تھی، یہ قابل قدر اور لائق غور مضمون افتتاحی خطبہ کی حیثیت سے پڑھا گیا تھا:۔

کسی ملک کی زبان بے ضابطہ طور پر خود رو بنائی نہیں جا سکتی، بلکہ اس کو کسی اصول، اور کسی قاعدہ کے تحت میں ہونا چاہیئے۔ اگر کسی قوم کے افراد کو اس کی خواہش کے مطابق تقریر و تحریر کی آزادی دے دی جائے تو اس سے نظام میں فرق آنے کا اندیشہ ہوتا ہے، پھر اس سے مذاق سلیم بھی مجروح ہوتا ہے۔ اس لیئے ایک مستند مرکز کا ہونا ضروری ہے جو اختلاف آرا کی صورت میں فیصلہ کن ہوگا۔ جو الفاظ اور جملوں کے جائز استعمال کے متعلق قواعد منضبط کرے گا۔ جس کے سپرد نوزائیدہ زبان کی دیکھ بھال ہوگی اور بے ضابطگیوں اور زبان کی غلطیوں کی روک تھام اس کا فرض ہوگا وہ اس کو بھی تجویز کرے گا کہ غیر زبانوں کے مختلف النوعیت محاورات الفاظ وغیرہ اپنی زبان میں کیونکر اور کس جگہ قبول کیئے جائیں۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسے مستند ادارۂ علمیہ، ادبیہ کی ضرورت آج سے بہت پہلے کیوں محسوس نہیں کی گئی۔ جب تک اس قسم کی مرکزی جماعت نگراں نہ ہوگی اس وقت تک تقریر یا تحریر کی زبان پر نہ تو قابو حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی اصول کی پابندی کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زبان ہی اظہار خیالات کا ذریعہ ہے لیکن جو خیالات کسی کے دل میں جاگزیں ہوں

وہ صحت کے ساتھ بلاکم وکاست بجنسہ اس طرح ادا کئے جائیں کہ پوری طرح ٹھیک ٹھیک سمجھ لئے جائیں اس لیے لازم ہے کہ اس کی تشکیل حکیمانہ اصول پر کی جائے مجموعہ اصول ولغت و قواعد کے مختلف ضوابط کی ترتیب، عام الفاظ کی تحقیق حقیقی معنی کا تسلیم کرنا اور ان کا لغت میں اندراج ادارۂ ادبیہ کا خاص کام ہوگا۔ اس مسئلہ پر شدومد کے ساتھ زور دیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مختلف نوعیتیں رکھنے والی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن یہ کوئی متنازعہ فیہ امر نہیں بے شک انواع و اقسام کی زبانیں ملک کے مختلف حصوں میں رائج ہیں لیکن یہ قدرتی اسباب کے ثمر ہیں، دوسرے ممالک میں بھی یہی صورت ہے لیکن وہاں بھی یہی طریقۂ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ دل میں جب یہ خیال ہوتا ہے کہ ہندوستان کی حیثیت ایک کثیرالوسعت براعظم کی ہے جس کا رقبہ باستثنائے روس تمام یورپ کا مساوی ہے تو یہ امر عیاں ہوجاتا ہے کہ غالباً اس ملک میں تخالف زبان مقابلتاً یورپ سے زیادہ نہیں لیکن اس کو ایک فوقیت یہ حاصل ہے کہ ہندوستان برطانیہ کے آتے ہی واحد اثر میں آگیا اور اس میں اتحادِ زبان کا عمل جاری ہوگیا۔ خاص ہندوستان کی عام زبان جو اب ہندوستانی کے نام سے موسوم ہے تمام ملک کی متفقہ زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ شان خط کے سوال کو جس میں یہ زبانیں لکھی جاتی ہیں قطع نظر کرنے کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ ہندوستان میں رہنے والوں کا بڑا طبقہ اس کو بولتا ہے اور اس وسیع براعظم کے بڑے حصے میں لوگ اس کو سمجھتے ہیں۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کی روزافزوں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور اسی نسبت سے سرحد افغانستان کے شمالی و مغربی گوشہ سے لیکر رنگون اور برہما کے جنوب و مشرق تک پھیل گئی ہے۔

اس معاملہ کا نمایاں پہلو رسم خط کے ناگوار تصفیے سے کہ زبان کس شان خط میں لکھی جائے بہت کچھ تاریک ہوگیا۔ رسم خط کا جھگڑا کہ یہ اردو ہو یا ناگری ہو مقابلتاً زبان سے زیادہ سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ شان خط کا معاملہ بہت زیادہ اہم نہیں بلکہ اس کا بہت زیادہ انحصار انفرادی طور پر رغبت طبع پر ہے، اگرچہ بعض وقت اس کو سیاسی وجوہ پر بھی مبنی کرتے ہیں، لیکن کسی خاص رسم خط کا انتخاب کر لینا بالکل اختیاری امر ہے۔ خاص قسم کا خط ایجاد کیا جا سکتا ہے۔ آزادانہ طور پر دوسری زبان سے اس کو مستعار لے سکتے ہیں اور فوراً تبدیل کر سکتے ہیں یا عمداً ترک کر سکتے ہیں اس قسم کی تبدیلیاں دنیا کے ہر حصے میں ہو چکی ہیں۔ ٹرکی کے علاوہ دیگر ممالک میں تغیرات کی رفتار تدریجی رہی ہے مگر اس کو قریب قریب فراموش کر دیا گیا ہے۔ مختلف زبانوں کے طریقۂ تحریر میں

جو تغیرات وقتاً فوقتاً وقوع پذیر ہوئے ہیں اُن کو ایک جا جمع کرنے کے بعد کسی رسم خط کے مصنوعی ہونے کے مسئلہ کی قدر و قیمت کا آسانی سے موازنہ ہو سکتا ہے۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ ملک میکسکو کی تحریر نیچے سے اوپر کو لکھی جاتی ہے، ملک چین کی تحریر کو عمودی کالم (یعنی کھڑی سطر) میں ترتیب دیتے ہیں اور اوپر سے نیچے کی طرف پڑھتے ہیں۔ سامی زبانیں داہنے جانب سے بائیں جانب کو لکھی جاتی ہیں۔ سنسکرت اور اس سے مشتق زبانیں اُلٹی جانب سے داہنے ہاتھ کی طرف لکھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ سنسکرت جب خروشتی حروف میں لکھی جاتی تھی داہنی طرف سے بائیں طرف کو ہوتی تھی۔ ایک زمانے میں یونانی زبان بائیں جانب سے شروع ہو کر داہنے جانب اور پھر داہنے جانب سے بائیں جانب اس طرح معرض تحریر میں آتی تھی جس طرح بیل سے کھیت میں ہل جوتا جاتا ہے یعنی یکے بعد دیگرے داہنے طرف سے بائیں طرف بائیں طرف سے داہنے طرف لکھی جاتی تھی۔ اگر ایک سطر داہنے جانب سے بائیں جانب کو لکھی گئی تو دوسری سطر اولی کے اختتام سے متصل بائیں جانب سے شروع کر کے داہنے جانب کو لکھی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں یہ طریقۂ تحریر بدل گیا اور تمام صفحے پر صرف بائیں جانب سے شروع کر کے لکھتے ہیں یہ بیّن مثال اس امر کی ہے کہ کسی خاص قسم کے رسم خط کی پسند اور اُس میں ترمیم کرنا یا اس کو ترک کر دینا بالکل اختیاری فعل ہے۔

یہ ممکن ہے کہ اہل ہند کے لئے ایک مشترکہ رسم خط قایم کرنے اور تمام قضیوں کو ختم کرنے کی غرض سے مختلف الآرا ماہرین سیاست بھی متفق ہو کر ہندستان کی ملکی زبانوں کے لئے رومی حروف تہجی کو سرکاری رسم خط تسلیم کر لیں۔ یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ چند نسلوں کے بعد جب بنی نوع انسان کو بچوں کی تعلیم میں محنت اور وقت بچانے کا احساس موجودہ زمانہ سے زیادہ ہو اور اس ضرورت کو بھی مان لیا جائے کہ دنیا کے تمام ممالک میں واحد حروف تہجی کا استعمال کیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی بین الاقوامی معاہدہ کی رو سے صوتی حروف تہجی کا جدید قاعدہ جو حکیمانہ تشریح اصوات پر مبنی ہو اور اس کے اظہار صحیح کا کم و بیش وہی طریقہ ہو جو موجودہ فن اختصار نویسی میں رائج ہے استعمال کیا جائے۔ اسپرانتو کو تمام اہل دنیا کی زبان بنانے کے مقابلہ میں یہ طریقہ زیادہ قابل عمل ثابت ہوگا۔

ہم لوگوں کو اس قسم کے سیاسی قضیوں میں پڑ کر تضیع اوقات کی ضرورت نہیں، غالباً مستقبل خود اپنا انتظام کر لیگا لیکن ایسی زبان جس کو انسان بولتے یا سمجھتے ہیں نہ تو مصنوعی طور پر وضع

کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا تعین اختیاری طور پر ہو سکتا ہے۔

زبان اظہار خیالات و تخیل کا ذریعہ ہے، اس میں شک نہیں کہ زبان سے ایک لفظ ادا کئے بغیر بھی دوسرے ذرائع سے اظہار خیالات کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً علامات و اشارات کے ذریعہ سے اظہار کیا جا سکتا ہے۔ انسان اور حیوانوں کے مابین قوت نطق ہی ما بہ الامتیاز ہے جو انسان کی رفعت کو حیوان مطلق کی سطح سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ بنا دیتی ہے۔ بہر نوع تقریر آواز کی مقرر راگنیوں کا مجموعہ ہے جس کے ذریعہ سے باہمی گفت و شنید ہو سکتی ہے۔

زبان کے ابتدا کا سراغ خطرہ کے انتباہ کی ضرورت سے ملتا ہے۔ حتیٰ کہ وحشیوں میں بھی اس کا عمل غیر منزہ حالت میں موجود ہے۔ ہر شخص کو روزانہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ جانور ایک دوسرے کو کس طرح خطرات سے مطلع کرتے ہیں یا اپنے رنج، مسرت کا اظہار خاص قسم کی آوازیں جو ہر نوع حیوانات کے لئے علحدہ ہے کرتے ہیں۔ یقیناً جانور بھی اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کرتے ہیں اور ہر نوع حیوان کی مخصوص زبان ہوتی ہے۔

کسی خاص خیال کی ادائگی کے لئے ایک آواز تدریجاً ہوگی، مختلف آوازوں کے مجموعے سے جس کو بالعموم تسلیم کر لیا گیا ہو رفتہ رفتہ ذخیرہ الفاظ میں ترقی ہوتی رہی یہ خیال کرنا کہ کوئی جماعت یا طبقہ زبان پیدا کر سکتا ہے غلطی ہوگی۔ زبان نے خود ترقی کی ہے۔ جو لوگ گفتگو کرتے تھے یا جن کو گفتگو کرنے والا سمجھا جاتا تھا اُن کی مثال سے زبان کی مسلسل ترقی اور اُس کی آخری تکمیل پر اثر پڑا۔ والدین کے بولے ہوئے الفاظ کو سُنکر لڑکے پھر اُنھیں الفاظ کو دُہراتے ہیں اور جب عقل اور تمیز کو پہونچتے ہیں تو وہ اس کو اپنی اولادوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں ایک نسل کی اولاد کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر مادر السنہ کا رواج وسعت پذیر ہوگا۔

زبان اختراع نہیں کی جاتی یہ وجود میں آتی ہے اور ترقی کرتی ہے اس میں ہمیشہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں جہاں اس کو تحریر کی صورت میں محفوظ کر لیا جاتا ہے وہاں بھی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں، ارتقا کی رفتار تیز بھی ہو سکتی ہے اور سست بھی، یہ بہت سی باتوں پر مبنی ہے۔ اس کے بیشمار اسباب کا عمل ایک ساتھ ہوتا ہے اس لیے ہر ملک میں اس کی ترقی کی صورت جداگانہ ہوتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بہاؤ کی یہ روانی ہمیشہ جاری رہیگی۔

اس مسلسل تشکیل کی تنظیم چند مقررہ اصول و ضوابط کے ماتحت ہوتی رہتی ہے، جو اقوام کے باہمی روابط اور گرد و پیش کے ماحول کی تبدیلیوں سے متعلق ہیں۔ ایسا انقلاب عظیم جو کچھ زمانہ

گذرنے کے بعد کسی رقبہ مخصوص کی مروجہ زبان میں پیدا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ موجودہ زبان اور ایک صدی ماقبل کی زبان سے مقابلہ کے بعد ظاہر ہوگا۔ زبان کے بڑے مجموعات میں سے جن میں ماہرین السنہ نے دنیا کی زبانوں کی تفصیل کی ہے ہم کسی ایک زبان کو منتخب کر لیں اور اُسی مجموعے پر نظر ڈالیں جن کے اجزا کا ایک ہی مادر السنہ کی اولاد ہونا تاریخی زمانہ کے اندر تصور کر لیا جائے خواہ کوئی تواریخی شہادت نہ بھی موجود ہو تب بھی جو تغیر صدیوں کے گذرنے کے بعد واقع ہوا ہے اس قدر نمایاں ہوگا کہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بعینہ اسی طرح جیسے کہ ایک لڑکا اپنی ماں کی زبان سیکھنے کی ابتدا کرتا ہے اور بزرگوں سے سنکر الفاظ اخذ کرتا ہے مگر وہ ان الفاظ کو پوری طرح نقل نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایک نئی زبان دوسری زبانوں سے جو اس سے قدیم تر ہیں اور قرب وجوار کے ممالک میں رائج ہیں الفاظ حاصل کرتی ہے مگر حاصل شدہ الفاظ میں ترمیم ہو جاتی ہے۔ لڑکا سوسائٹی میں پرورش پاتا ہے وہ سوسائٹی سے علیحدہ ہو کر کوئی عمل نہیں کر سکتا جو کچھ ذخیرۂ الفاظ دوسروں سے نقل کر کے فراہم کرتا ہے آہستہ آہستہ اس سوسائٹی کی مروجہ زبان میں ضم ہو جاتا ہے۔ لیکن جغرافیائی علیحدگی کی وجہ سے ہر ملک خود مستغنی ہے اور وہاں کے ملکی افراد کے لئے ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ اس طور سے بیرونی اثرات کے باوجود بھی اُس ملک کی زبان انداز خاص سے ترقی کرتی ہے اگرچہ اس کے نشو ونما پر خارجی وجوہ کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بیرونی اثرات کا درجہ اسی قدر زیادہ ہوگا جس قدر باہمی ملاپ اور قربت کا اثر زیادہ ہوگا۔ جدید علوم و فنون کی معلومات جس کے ادا کرنے کے لئے نئے الفاظ ایجاد کرنے پڑتے ہیں اس سے نہ صرف زبان کی ترقی ہوتی ہے بلکہ الفاظ، فقرات، محاورات بھی دوسری زبانوں سے مستعار لئے جاتے ہیں تاکہ قدیم خیالات جدید وضع سے ادا کئے جائیں

یہ امر قطعی واضح ہو جاتا ہے کہ انگلستان کا اس ملک سے سیاسی تعلق قائم ہوتے ہی انگریزی زبان نے ہندستان پر بہت بڑا اثر حاصل کر لیا۔ ہر شخص پر ظاہر ہے کہ ہندستان کی زبانوں میں انگریزی زبان سے جس کی تعلیم اسکول اور کالجوں میں ہوتی ہے بخط راست قربت پذیر ہوتے ہی بہت کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ انگریزی محاورات، ضرب الامثال، انگریزی انداز انشا اور مختلف النوع طریقہائے اظہار خیالات کو بلا تکلف مستعار لیکر عام طور پر اختیار کر لئے گئے۔ اس کی بالکل وہی صورت ہے جیسے لاطینی ادب روۃ الکبرٰے کے تمام ممالک میں اثر انداز ہو گیا یا جیسے عربوں کے زیر اثر ممالک میں عربی زبان پھیل گئی۔ ہندستان کی زبانوں نے جو کچھ انگریزی علم و ادب سے

حاصل کیا اُس کی وہ ہمیشہ شکر گذار رہیگی۔ انگریزی ادب کی بہترین تصنیفات ترجمہ کی صورت میں نقل ہورہی ہیں جس سے ہمارے اہل ملک پر انگریزی خیالات و تمدن کا حسن منکشف ہوجائیگا۔

انگریزی زبان کے زبانِ دنیا ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے اندر جس میں اس زبان نے ترقی کی صاحبان علم و فراست کی اعلیٰ ادبی تحریرات نے اس کو مالا مال کردیا۔ اب یہ ایک زبردست ادبی زبان ہے جو شعرا، ناثرین، مورخین، مضامین نگار، ڈراما نویس مصنفین ناول، ناقدین اور اخبار نویس وغیرہ کی بے شمار اعلیٰ تحریرات سے لبریز ہے۔ گذشتہ صدیوں میں جو علمی اور ادبی تحقیقاتیں ہوئی ہیں وہ سب اس زبان میں شامل ہیں۔ اس زبان کے ذریعہ سے جدید ایجادات اور انکشافات جو کچھ ہورہے ہیں وہ خود مغرب کو حیرت میں ڈالتے ہیں تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مختلف ممالک کی آئینی تواریخ اور اُن کی سیاسی ترقی کے حصول علم کا یہ تنہا ذریعہ ہے اس سے اخلاقی اور صنعتی انقلابات کا بھی جو بیرونی ممالک میں رونما ہوئے صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ زبان انگریزی کا مطالعہ جس کو تمام عالم میں رسوخ حاصل ہے ہندستان کے لئے نہایت فائدہ بخش ثابت ہوا۔ وسیع ذرائع کے بغیر ہم لوگ کبھی اُمید ہی نہیں کرسکتے تھے کہ اپنی زبان میں تمام علمی تحقیقات جو دنیا کے ہر گوشہ میں ہورہی ہے شامل کریں گے انگریزی تعلیم سے محروم رہکر ہم مغربی تہذیب و خیال سے آگاہ نہیں ہوسکتے تھے۔

ہندستان نے مغربی علم حاصل کرنے میں نمایاں طور پر بہت بڑی ترقی کی ہے اور اب ہم فخر کرسکتے ہیں کہ ہم میں بھی ایسے اہل علم موجود ہیں جن کو بین الاقوامی عزت حاصل ہے اگر موجودہ ذخیرہ علمی ادبی اور صنعتی خاص ہماری مادری زبان میں ہوتا جس سے عوام کو نفع حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تو یقیناً ہماری ترقی کی وسعت بہت زیادہ ہوتی، اور اس سے زیادہ ترقی کرچکے ہوتے۔ مسلّمہ طور پر ہندوستان تعلیم و صنعت میں ترقی کر رہا ہے لیکن اس معذوری کی وجہ سے کہ زبانِ تعلیم غیرملکی ہے ترقی کی رفتار یورپی، امریکی ممالک، جاپان کے مقابلہ میں بہت آہستہ ہے۔ جب تک ہم لوگ ان ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش ترقی نہیں کریں گے ہم لوگ اور بھی پیچھے ہوتے جائیں گے۔

علم آجکل کسی خاص قوم یا ملک کی تنہا ملکیت نہیں، اب یہ ایک ایسی شے ہے جس میں بین الاقوامی استحقاق پیدا ہوگیا ہے۔ وہ تمام جدید انکشافات جو ظہور میں آتے ہیں ہر ملک کے تعلیم یافتہ اشخاص کی مشترکہ ملکیت ہوجاتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے دنیا کے ذخیرۂ عظیم میں

جو دنیا کا مشترکہ سرمایہ ہے اور جس پر سب کا حق ہے بہر نوع نہ تو مشرق اور نہ مغرب علم پر اپنا تنہا دعوے کر سکتے ہیں۔ موجودہ ذخیرہ تمام ممالک عالم کے اہل علم کی محنت سے ہزارہا سال کے زمانہ جس میں انسان نے تہذیب و تمدن نے ترقی کی فراہم ہوا ہے جس قدر دنیا نے روحانی اور خیالی طرز زندگی سے گزر کر مادی اور علمی پہلو اختیار کیا ہے اسی قدر علم کا مرکز رفتہ رفتہ مشرق سے مغرب میں منتقل ہو گیا جو مغرب سے رفتہ رفتہ یورپ اور امریکہ کی طرف چلا گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ایشیا عام علوم کا مرکز تھا مگر اب ایشیا یورپ کا معتقد اور یورپ کے تہذیب و تمدن کو اختیار کرنے کا شایق ہے۔

مغربی فنون، علوم اور صنعتی مضامین پر کتابوں کا فقدان سب سے بڑی دقت ہے جو ہندستانی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کے راستہ میں ہماری سد راہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صنف خاص کی اصلاح کا پہلا زینہ یہ ہے کہ ضروری مستند کتابیں فراہم کر کے ہندستان کے لئے قابل حصول بنا دی جائیں۔ یورپ کی کتابوں کے نہ صرف تراجم بلکہ اُن کی اصلی زبان میں کتابیں جب تک ملک کو دستیاب نہ ہونگی توم تعلیمی ترقی نہیں کر سکتی۔ جاپان کی درخشاں مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اس کی شاندار کامیابی جدید تعلیمی حکمت عملی کا جو گذشتہ نصف صدی میں روبکار لائی گئی نتیجہ ہے جس کے ذریعہ سے علمی اور صنعتی تصانیف مغرب کو پوری آزادی کے ساتھ جاپانی زبان میں نقل کر کے اپنا بنا لیا گیا اس سے علم و تعلیم کا معیار تھوڑے عرصہ میں بہت بلند ہو گیا۔ ہندستان میں ضرورت ہے کہ ملک کے ہر صوبے میں دار الترجمہ اہل صوبہ کی سعی اور حکومت کی مالی امداد سے قایم کیا جائے۔ اس پر کثیر التعداد علماء مختلف علوم و فنون پر قابل قدر کتابیں تصنیف کریں۔

ہندستانی اکیڈیمی قائم کر کے جس سے بڑی ضرورت پوری ہوتی ہے حکومت صوبۂ متحدہ نے اہل ملک کو مرہونِ منت کر دیا ہے قلیل مدت میں اکیڈیمی نے بیش بہا خدمات انجام دیئے اور لوگوں میں ہندستانی زبان کے حصول کا شوق پیدا کر دیا ہے

اکیڈیمی کی منشا ایک مشترکہ زبان کی ترویج ہے جو عام فہم الفاظ اختیار کرے مشکل اور غیر مانوس الفاظ کو خواہ سنسکرت، عربی، فارسی زبان کے ہوں ترک کر دے اس کی یہی کوشش ہے کہ مشرقی درسیات کے متعلق وہ الفاظ جو روزمرہ کا کام نہیں دیتے ترک کر کے ان کی جگہ عام فہم الفاظ کو جو ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں رواج دے۔ مجھ کو اعتماد ہے کہ ہندستانی

اکیڈیمی رفتہ رفتہ اس صوبے کی مختلف زبانوں کو متحد کردے گی۔ اگرچہ دو مختلف رسم خط عرصہ تک باقی رہیں گے۔ لیکن مشترکہ زبان قائم کرنے کا موقعہ حاصل کرنے کی جانب اُس کی مسلسل ترقی جاری ہے۔

اس صوبہ میں دو قسم کے رسم خط کی بدقسمتی سے اکیڈیمی کے مفید کاموں میں تعویق یا رکاوٹ واقع نہیں ہوئی جب کہ اُس نے تمام واقعات کا خوشی سے مقابلہ کرتے ہوئے اس صوبہ کی عام فہم زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ آسان ہندستانی زبان اکیڈیمی کی دفتری زبان ہے۔ شانہ بشانہ دونوں قسموں کے مرقوم خطوط کو باہم قائم رہنے کی اجازت ہے۔ اکیڈیمی کے دونوں شعبے یعنی ہندی اور اُردو کے محکموں نے کامل ہم آہنگی اور تعاون سے کام کیا ہے۔ اس نے دو متضاد شعبوں کی ایک مقصد کے لئے بغیر تصادم یا اختلاف اتحاد سے کام کرنے کی پُر شوکت مثال قائم کردی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو مختلف اور جداگانہ ہستیاں جبکہ اُن کے کاموں کی تشریح کردی گئی ہو اور اُن دونوں میں ہم آہنگی بھی ہو کس طور سے متوازی راستوں پر واحد منزل کی طرف پیش قدمی کرسکتی ہیں۔ اکیڈیمی کی کامیابی کا سہرا اس کے قابل صدر سر تیج بہادر سپرو کے سی ایس۔ آئی کی غیر جانبداری اور نصفت شعاری کے سر ہے۔ اور اس کے سکریٹری ڈاکٹر تارا چند ایم۔ اے (ڈی فل) کا پُر خلوص شغف اور محنت شاقہ ہے، یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اکیڈیمی کے لئے اعلیٰ عہدہ داروں کا اجتماع اس سے بہتر ہو نہیں سکتا تھا۔ اردو اور ہندی کے دونوں شعبوں کے ساتھ کامل منصف فراخی کا برتاؤ کیا جاتا ہے، جس کے وہ ممنون ہیں اور اس ادارۂ ادبیہ کی یہ سب سے بڑی قوت ہے۔

سکریٹری کی قیادت میں اکیڈیمی نہایت اچھا کام کررہی ہے۔ سکریٹری اکیڈیمی کے روز افزوں اور وقت طلب کاموں میں اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ صرف کرتے ہیں۔ اکیڈیمی نے اپنے اہل علم جماعت کی مدد سے بہت زیادہ مستحسن خدمات انجام دیے ہیں، لیکن طباعت میں تعویق کی وجہ سے پبلک کے سامنے مکمل طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے ان کاموں کی قدر و قیمت کا اب تک پورے طور سے اندازہ نہیں کیا جاسکا۔ اکیڈیمی نے گزشتہ بارہ ماہ میں جو کام کئے ہیں اُن کی تفصیل آنریری سکریٹری کی رپورٹ سے معلوم ہوگی اس کا اعادہ میرے دائرۂ فرض میں داخل نہیں۔ اکیڈیمی کی مختلف سرگرمیوں کی تفصیل آپ کو رپورٹ میں ملے گی جس سے آپ کو اکیڈیمی کے فرائض اور خدمات جو اُس کو انجام دینی ہیں واضح طور پر معلوم ہوگی۔ اراکین مجلس

عاملہ کو احساس ہے کہ ابتدائی مراحل میں جو ان کو سالانہ مالی امداد گورنمنٹ سے ملتی ہے اُسی پر اُن کو قناعت کرنی ہوگی اس عطیہ کے حدود کے اندر ذمہ دار اصحاب نے اس امر کی پوری سعی کی ہے کہ روپیہ کا مفید و بہتر مصرف بنایا جائے اور اکیاڈمی مستحکم بنیاد پر قائم کردیجائے جب اکیڈیمی کے انجام دیئے ہوئے کاموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائیگا تو مجھکو یقین ہے کہ مقامی مجلس واضع قوانین کے سامنے ہماری اپیل مزید فیاضانہ عطیہ کے متعلق رائگاں نہیں جائیگی۔

سردست اکیڈیمی کو ایک ایسی موزوں عمارت کی ضرورت ہے جو اس کی ضرورت اور مخصوص طریقہ استعمال کا لحاظ کرکے تعمیر کی گئی ہو۔ کرایہ کی عمارت جو بالکل ہی دوسری غرض کے لئے بنائی گئی ہے محض عارضی طور پر مصرف میں آسکتی ہے جس کو غیر قابل اطمینان طور پر اکیڈیمی کی ضروریات کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ جب تک اکیڈیمی کی علٰحدہ ذاتی عمارت اس کے منصب و شان کے قابل نہ ہوجائے جو اس کے تمدن کا مستقل مستقر اور ادبی فضا کا مرکز ہو ہم کو اُسی عارضی انتظام پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ اکیڈیمی کے لئے مستقل عمارت کا ہوجانا اُس کے جلد اور مسلسل ترقی کی یقینی ضمانت ہوگی۔ اعتماد حاصل کرنا اور مستقل عمارت کی حوصلہ افزائی اکیڈیمی کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں ایک نیت ایک خیال کا جذبۂ بیداری روز بروز بڑھ رہا ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ اظہار خیال کے لئے مشترک آلہ وجود میں آگیا۔ مختلف لسانی تقسیمات کے باوجود بھی ایک بڑھتا ہوا رجحان ہے جو ترقی کرکے ہم کو ایک روز زندہ قوت بنا دے گا۔ ہندستان کی مختلف النوع زبانوں کو متفق کرنے میں کامیاب ہوگا غیر مانوس اور قلیل الاستعمال الفاظ ترک کرنے کے اصول پر ہندستانی اکیڈیمی جو کام کررہی ہے حقیقت میں وہ صوبے کے لئے ایک مشترک زبان کی تیاری ہے۔ انگریزی زبان و ادب سے قربت کے باعث ہندستانی زبانیں لازمی طور پر انگریزی زبان کا اثر قبول کرینگی اور جو خیالات ہندستانی زبانوں کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان کے زیر اثر آجائیں گے اِسلئے ہملوگوں کو چاہیے کہ موجودہ موقع سے کامل فائدہ اُٹھاکر اپنے ادب میں ان تمام باتوں کو جو انگلستان ہم کو سکھاتا ہے ضم کرلیں اور ایسی زبان میں ضم کریں جس کی اکثریت عام طور پر مقبول ہو اور جو عام طور پر بنہایت آسانی سے سمجھی جاتی ہو بلا لحاظ رسم خط ضرورت ہے کہ مغربی علوم کی نقل مسلسل ہماری زبان میں ہوتی

[redacted]

ہے۔ اگر مغربی زبانوں کے ذخیرے سے ہندستانی زبان مرفہ الحال ہو جائے تو تمام زبانوںکا مشترکہ فائدہ ہوگا کیونکہ وہ یوروپی زبان کے مقابلہ میں ہندستانی سے زیادہ مشابہ ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہندستانی اکیڈیمی بہت بڑی خدمت کر رہی ہے جس کے پورے اثرات کو صرف آیندہ نسلیں محسوس کرینگی۔

یہ امر تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندستان سے جو ممالک بہت قریب واقع ہیں ان کا اثر کافی طور پر قوی ہوگا۔ انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ایک عام بیداری حتیٰ کہ پسماندہ ایشیا میں بھی مشترکی تخیل کی یکسانیت کا نیا خیال پیدا ہے بین الاقوامی تعلقات سرعت سے قایم ہو رہے ہیں اور جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ بین الملل رسل و رسائل اور باہمی آمد و رفت میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے۔ ہمارے ملک کے رہنے والے بیرونِ ملک سفر کرتے ہیں اور ہمسایہ ممالک میں جاتے ہیں اس سے تجارتی اور تعلیمی اور باہمی تجارت میں ترقی کرنے کی سہولتوں کے کافی مواقع ملتے رہتے ہیں اس قسم کے باہمی واسطوں سے ہندوستان کی زبان پر آہستہ آہستہ مگر مسلسل انداز سے ضرور اثر پڑے گا۔ ان تمام ممالک کے روز افزوں رسل و ترسیل کی افزائش سے نئے الفاظ اور جدید طریقۂ اظہار خیالات جو ان ممالک میں رائج ہیں ہم کو حاصل ہونگے جس کا اثر ہندوستان کی زبان پر فاصلہ اور بُعد کے اعتبار سے ہوگا بعض ممالک سے ہندستان نسلی اتحاد اشتراک خون، رشتہ داری یا ایک جدی ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ توقع کرنا ایک فطرتی امر ہے کہ اچھے تعلقات پیدا ہونگے اور ان ممالک کی باہمی صحبت زیادہ پرخلوص ہوگی جبکہ تجارت کرنے والوں کا بڑا گروہ، سیاح، آیندورَوندگی اس طرف سے اُس طرف نقل و حرکت ہوگی ان ملکوں کا اثر دوسروں پر ضرور پڑے گا۔ اور جو ممالک ایک سیاسی اثر کے دائرۂ واحد میں ہیں ایک دوسرے کی طرف قریب ہونے پر مائل ہونگے اس طرح باہمی یگانگی کی طرف رجحان ہوگا اس لئے بلا تامل پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ ہندستان کی آیندہ مشترکہ زبان اُن ممالک کے اثر سے جن سے قریب تر تعلق ہوگا موافقت کریگی۔

ان اعلیٰ مقاصد کو ذہن نشین رکھتے ہوئے ہندستانی زبانوں کے مختلف الانواع ہونے سے مایوس ہونا فضول ہے اور نہ اس لئے شکستہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے کہ اس صوبے کی مروجہ زبانوں میں چند اختلافات ہیں اور نہ رسم خط کے مختلف ہونے پر جس کو بعض طبقات نے اختیار کیا ہے بلا ضرورت زور دینا چاہیئے۔ ہماری تمام ترسعی ہندستانی ادب کو بجائے

مجموعی مالا مال کرنے کی ہونی چاہیئے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنے کا کام مقابلتاً آسان اور سہل الحصول ہوگا بلا خیال کہ کس رسم خط کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے گی۔ ہندستان کے لوگوں کی تعلیم سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ ہم کو توقع کرنی چاہیئے کہ رقابت کے جذبات زائل ہوجائیں گے اور مختلف زبانوں کے موجدین جس زبان کو وہ پسند کرتے ہیں اس کو ترقی دیتے ہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرینگے اور دوسروں نے جو ترقی کی ہے اُس کو دیکھ کر مشتبہ نہ ہونگے اور ہر ایک کا مشترکہ واحد مقصد ہوگا کہ علم انسانی کے ذخیرہ میں ہندستان کے حصے کو ایسی سطح پر پہونچادیں جو اُس کے قدیم تمدن و تہذیب کے شایانِ شان ہو اور جس سے یہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے زمرہ میں موزوں فخر اور جائز احساس عظمت کے ساتھ اپنا سر بلند کر سکے۔

اقوالِ شیکسپیئر

تمہاری عقل خود تمہاری رہنما ہے۔

وہ دل جو نیکیوں سے معمور ہے کھرا سونا ہے۔

ایماندار شخص اپنی صفائی خود ہی دے سکتا ہے، جبکہ بدنیت شخص ایسا نہیں کرسکتا۔

کم گو اشخاص بہترین اشخاص ہوا کرتے ہیں۔

ماضی اور مستقبل کے زمانے بہترین معلوم ہوتے ہیں اور زمانۂ حال بدترین۔

صلح میں فتح کی خاصیت مضمر ہے۔

تکلیف سے راحت کا ظہور ہوتا ہے۔

دوستی میں بھی ایک خوشامد کا پہلو ہے۔

خود پرستی اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جیسا کہ خود فراموشی۔

سارے جرائم کا منبع دل ہے۔

ہر شخص کی زندگی کی داستان ایک تاریخ کی اہمیت رکھتی ہے۔

اردو شعراء کے تذکرے

(ازجناب مسلم کاکوروی)

اگرچہ قدیم اردو شعراء کے تھوڑے بہت حالات ان کتابوں میں ملتے ہیں جو اُن کے زمانہ میں تصنیف یا تالیف ہوئیں۔ کیونکہ صاحب کتاب عموماً کتاب تیار ہونے پر خود اپنے مختصر حالات تحریر کر دیتا تھا اور اپنے سوا اگر کسی مقام پر کسی معاصر کا ذکر آجاتا تو اس کے مختصر سوانح حیات کے علاوہ اس کے کمالات علمی پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری تصور کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح ہم مختلف کتب سے کسی شخص کے حالات جمع کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں، اور جب کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا تو مجبوراً یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

فارسی میں تذکرہ نویسی کا رواج قدیم زمانے سے ہے، لیکن ہم کو ۱۱۶۵ھ سے قبل تصنیف شدہ کتابوں میں کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جو خاص اسی موضوع (تذکرہ شعرائے اردو) پر لکھی گئی ہو۔ غالباً اس کا بڑا سبب اہل علم کی بے اعتنائی ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی جس نے تذکرہ نویسوں کو اُردو شعراء کے تذکرے اُردو ہی میں لکھنے سے مانع رکھا، اور اسی وجہ سے جملہ تذکرے فارسی میں تحریر کئے گئے۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ تک اُردو شعراء یا ریختہ گویوں کا تذکرہ لکھنا ہی ناقابل التفات سمجھا گیا ہو۔ ۱۱۶۵ھ میں میر نے اس قید کو توڑا اور اپنا مشہور تذکرہ نکات الشعراء تحریر فرمایا۔

اس مختصر مضمون میں ہم مختلف تذکروں، اُن کے مؤلفین کے نام اور سنہ تالیف لکھنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اُردو شعراء کے کس قدر تذکرے ہیں جن سے استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نکات الشعراء میر تقی میر نے ۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا، یہ اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جس کو انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دیا ہے۔

(۲) مخزنِ نکات۔ محمد قیام الدین قائم نے ۱۱۶۸ھ میں تالیف کیا۔ اس تذکرہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قائم نے میر کے نکات الشعراء سے مدد نہیں لی چنانچہ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ،۔

"مخفی و محتجب نماند کہ تا الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نگردیدہ و باین زمان ہیچ انسانے از ملعرائے شوق افزائے سخنوراں این فن سطرے تالیف نرسانیدہ"

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ قائم نے شعرا کا انتخاب اور اُن کے حالات فقط راویوں سے سنکر لکھے ہیں بلکہ ان کے زیرِ نظر مختلف بیاضیں تھیں جن سے اس کی ترتیب میں مدد لی تھی یہ بھی انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوگیا ہے۔

(۳) تذکرۂ بے نظیر۔ میر عبدالوہاب افتخار اورنگ آبادی اس کے مؤلف ہیں۔ یہ ۱۱۷۲ھ میں تالیف ہوا تھا، اگرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے لیکن اکثر ایسے شعرا کا بھی ذکر ہے جو ریختہ میں طبع آزمائی کرتے تھے

(۴) تذکرۂ گردیزی۔ یہ تذکرہ فتح علی گردیزی نے ۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا تھا۔

(۵) چمنستانِ شعرا۔ منشی لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کی تالیف ہے جن کو علامہ آزاد بلگرامی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ یہ ۱۱۷۵ھ میں تالیف ہوا تھا جس کی ترتیب میں میر تقی میر، قائم چاند پوری اور فتح علی گردیزی کے تذکروں سے مدد لی گئی ہے، ممکن ہے کہ انھوں نے افتخار کے تذکرہ بے نظیر (۱۱۷۲ھ) سے بھی مدد لی ہو۔ یہ تذکرہ بہ نسبت دیگر تذکروں کے بہتر اور قابل ترجیح ہے۔ اس سے بہت سے ایسے شعرا کے حالات معلوم ہوتے ہیں جن کا دوسرے تذکروں سے پتہ نہیں چلتا۔ اُنھوں نے شعرا کے کلام کا انتخاب بھی بڑی محنت سے کیا ہے جو قابل داد ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کو نایاب میں شائع کیا ہے کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا ثانی کسی دوسرے کتب خانہ میں نہیں ہے۔

(۶) تذکرۂ شعرا۔ مولفہٗ حضرت میر حسن دہلوی۔ بقول شیروانی صاحب یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان تالیف ہوا تھا۔ نواب صدر یار جنگ نے ایڈٹ کرکے مطبع مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا ہے۔

(۷) تذکرہ گلزار ابراہیم۔ ۱۱۹۵ھ اور ۱۱۹۶ھ کے درمیان تالیف ہوا۔

(۸) گلشن ہند۔ مولفہٗ مرزا علی لطف۔ ۱۲۱۵ھ میں تالیف ہوا۔ یہ پہلا تذکرہ ہے جو اُردو میں لکھا گیا ورنہ اس وقت تک جملہ تذکرے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ شبلی مرحوم نے اس کو ایڈٹ کیا اور مولوی عبداللہ خاں مرحوم (حیدرآباد دکن) کی کوششوں سے شائع ہوا۔

(۹) نشترِ عشق۔ اس کے مرتب حسین قلی خاں عظیم آبادی تھے۔ سن تالیف ۱۲۳۳ھ ہے۔

(۱۰) دریائے اعظم۔ مولانا آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ میر محمد خاں اعظم الدولہ سرور نے یہ تذکرہ لکھا اور حضرت ذوق نے تاریخ کہی دریائے اعظم سے ۱۲۳۶ھ نکلتے ہیں۔

(۱۱) گلشنِ بیخار۔ یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۵۰ھ میں تالیف کیا اور نولکشور پریس

سے چھپ کر شائع ہوا۔

(۱۲) تذکرۂ سخن شعرا۔ مولفہ مولوی عبدالغفور خاں نساخ ۱۲۸۱ھ میں تالیف ہوا اور نولکشور پریس نے شائع کیا۔

(۱۳) گلستان بیخزاں عرف نغمۂ عندلیب۔ حکیم سید قطب الدین باطن اکبرآبادی نے ۱۲۹۱ھ میں تالیف کیا۔

(۱۴) تذکرہ جلوۂ خضر۔ اس تذکرہ کے مؤلف مولوی سید فرزند علی صفیر بلگرامی تھے۔ نورالانوار پریس آرہ (بہار) نے دو جلدوں میں شائع کیا۔

(۱۵) تذکرۂ مصحفی۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی کی تالیف ہے۔

(۱۶) طبقات الشعرا، ڈاکٹر فیلن اور مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۷ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔

(۱۷) گلزار سخن۔ مؤلفہ بابو جگناتھ پرشاد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سی پی۔ نولکشور پریس نے شائع کیا۔

(۱۸) بزم سخن۔ نواب علی حسن خاں نے تالیف کیا، اگرچہ مختصر ہے مگر اشعار کا انتخاب عمدہ کیا گیا ہے۔

(۱۹) طور کلیم۔ یہ تذکرہ مولوی سید نورالحسن صاحب کلیم فرزند اکبر جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کا تالیف کردہ ہے۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں تالیف ہوا اور مطبع مفید عام آگرہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں ۱۲۹ شعرا کا تذکرہ مع انتخاب کلام درج ہے۔

(۲۰) بزم سخن۔ اس تذکرہ کے مؤلف سید علی حسن خاں صاحب خلف نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم ہیں۔ اس میں ایک سو بیس شعرا کے حالات مع انتخاب کلام درج ہے۔ طور کلیم کی طرح اسے بھی مطبع مفید عام آگرہ نے شائع کیا ہے۔ سن تالیف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء ہے۔

یہ دونوں تذکرے تقریباً ایک ہی وقت میں لکھے گئے، سن اشاعت میں فقط ایک سال کا فرق ہے۔ ہاں بعض شعرا ایسے ہیں جو ایک تذکرہ میں ملتے ہیں اور دوسرے میں نہیں۔ مثلاً طور کلیم میں ایسے فقط تین شاعروں کا تذکرہ ہے جن کا تخلص آشفتہ تھا، برخلاف اس کے بزم سخن میں ایسے چھ شاعروں کا حال درج ہے جو آشفتہ تخلص کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تذکرہ بزم سخن نے طور کلیم سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے چنانچہ وہ صفحہ ۵ پر آزردہ کے متعلق فرماتے ہیں :-

"آزردہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول مولانا مفتی صدرالدین خاں بہادر صدرالصدور دہلی و استاد حضرت پدر والا گر نامہ نگار محامد جمیلہ اش ہیچو ماہ نیم ماہ و مہر نیم روز غازہ شہرت بر رو دارد محتاج بیان نیست در طور کلیم حضرت سمین برادر زید مجدہم ترجمہ خاطرہ اش مفصلاً ضبط فرمودہ دریں جا برہمیں التفات میرود۔"

اگرچہ بزم سخن کو نقش ثانی کہنا چاہیئے پھر بھی طور کلیم کے ۱۲۹ شعرا کے مقابلہ میں اس میں فقط ایک سو بیس شعرا کے حالات درج ہیں۔ حالانکہ اس میں اس سے کہیں زائد شعرا کے حالات درج ہونے چاہیئے تھے۔ بزم سخن میں یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ غیر معروف شعرا کے وہ اشعار پیش کئے گئے ہیں جو طور کلیم میں موجود نہیں۔

(۲۱) تذکرہ شعرائے اُردو۔ آبحیات میں آزاد مرحوم نے لکھا ہے کہ سودا نے ایک اُردو کا تذکرہ لکھا تھا لیکن نایاب ہے، اسی طرح حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ بھی کمیاب ہے۔

(۲۲) آب حیات۔ مؤلفہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔ بہت مشہور تذکرہ ہے

(۲۳) گلِ رعنا۔ مولفہ مولوی عبدالحیٰ مرحوم، مشہور تذکرہ ہے۔

(۲۴) خمخانۂ جاوید۔ لالہ سری رام ایم۔ اے بڑی محنت سے اُردو شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ تالیف کر رہے تھے، مگر موت کے زبردست ہاتھ نے قلم ہاتھ سے چھین لیا، چار جلدیں شائع کر چکے تھے کہ ۱۹۳۰ء میں پیام مرگ آیا موصوف نے اس کام کے لئے ایک کثیر رقم چھوڑی ہے، اور تذکرہ کی تالیف پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے سپرد کر گئے ہیں۔ غالباً مشکل سے کوئی اُردو شاعر ہوگا جس کا کلام ان کے پاس قلمی یا مطبوعہ شکل میں موجود نہ ہو۔ انھوں نے اپنے جملہ نوادر قلمی جواہر ریزے ایثار اور بلند ہمتی سے کام لیکر بنارس ہندو یونیورسٹی کو دیدیے ہیں۔

(۲۵) تذکرۃ الشعرا۔ مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی اس کے مرتب ہیں، اُردوئے معلیٰ میں قسط وار شائع ہوا۔ مطبع فیض عام علیگڈھ سے ۱۹۱۲ء میں چھپکر شائع ہوا۔

(۲۶) شعرا لہند۔ مؤلفہ مولوی عبدالسلام ندوی۔ مشہور تذکرہ ہے۔

(۲۷) تاریخ ادب اُردو۔ مسٹر رام بابو سکسینہ نے اس کو انگریزی میں تالیف کیا، اور مسٹر حسن عسکری بی۔ اے نے اردو کا جامہ پہنایا۔ نولکشور پریس سے شائع ہوا۔

مندرجہ بالا مکمل تذکروں کے علاوہ جلیس ماضی وانیس حال یہ دو نو تذکرے خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے مرتب کئے ہیں جو مضامین کی شکل میں مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان

تذکروں میں خواجہ صاحب نے اُن شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے یا باہر سے آکر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر ٹاسی کے چند خطبات کا ترجمہ نواب مسعود جنگ بہادر نے رسالۂ اردو (۱۹۲۸ء) میں شائع کرایا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت فاخر الہ آبادی کے پاس بھی ایک تذکرہ تھا۔ معلوم نہیں اب کس کے پاس ہے۔ ادیب و مخزن (سابق) اور زمانہ میں مختلف اردو شعرا کے حالات وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ آجکل حیدر آباد کے رسائل مکتبہ اور تجلّی خاص طور پر دکھنی شعرا کے حالات شائع کر رہے ہیں۔ شمالی ہند کے رسائل میں زمانہ، نیرنگ خیال اور مخزن (دور جدید) میں بھی کبھی کبھی شعرائے اردو کے تذکرے شائع ہوتے ہیں۔ خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے "ہندو شعرا" کا ایک مختصر تذکرہ مرتب کرکے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ مولوی عبد الباری آسی نے تذکرۂ خواتین (مطبوعہ نول کشور پریس) اور خندۂ گل (مطبوعہ نگار پریس) حال میں تالیف کئے ہیں۔ تمکین کاظمی صاحب نے بھی ریختی گو شعراء کا ایک تذکرہ طبع کرایا ہے۔

حریم (لکھنؤ)

تقطیع ۲۰×۲۶/۸، ۸۸ صفحات، سالانہ چندہ للعہ، طالبات سے ۳ روپے،

ہندوستانی عورتوں کے تحصیل علم کی جانب متوجہ ہونے کے ساتھ ہی ایسے رسائل و جرائد کا اجرا بھی لازمی تھا جو عورتوں کی تعلیم و تربیت، اُن کے حقوق وغیرہ کے متعلق ان کی رہنمائی کریں چنانچہ اِس وقت ملک میں چند رسالے ان ضرورتوں کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ صوبہ متحدہ میں حرم (بیلی بھیت) کے بند ہونے کے بعد حریم کا جاری ہونا اور موجودہ زمانہ کے بلند معیار صحافت کے ساتھ جاری ہونا اہل نظر کی قدردانی کا مستحق ہے۔ ابھی اس کے صرف دو نمبر (جنوری اور فروری) شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان دونوں نمبروں میں مفید و دلچسپ مضامین کا ہونا اُمید افزا ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت، اصلاح رسوم، صنعت و دستکاری، امور خانہ داری کے علاوہ "لغات النساء" (عورتوں کے بعض مخصوص الفاظ مثلاً "نوج" "اوئی" کی تشریح) اور سبق آموز فکاہی مضامین اپنے اپنے رنگ میں بہت عمدہ ہیں۔ نثر کے ساتھ نظم بھی ہے اور ضرورت وقت کے لحاظ سے ہر ماہ متعدد تصاویر بھی ہوتی ہیں سرورق رنگین و دیدہ زیب ہے۔ یہ رسالہ آنسہ جمال کی ادارت اور جناب نسیم انہونوی کی ملکیت میں شائع ہوتا ہے۔

انقلابِ دہلی

(از جناب مولٰنا نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں)

بننا بگڑنا دہلی کی قسمت میں لکھا ہے، خدا جانے وہ کتنی مرتبہ بگڑی اور کتنی دفعہ بنی، تاریخ کی کتابیں تو ان انقلابات کے ذکر سے بھری پڑی ہیں لیکن اُردو ادب کے صفحات میں بھی ان کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ نادر شاہی حملے سے دہلی کی بربادی پر سودا نے جو مرثیہ لکھا آج بھی وہ اُردو شاعری کی دنیا میں مشہور ہے۔ دہلی کے جلیل القدر بادشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے بیٹوں اعظم اور معظم کی خانہ جنگی کا نوحہ جو آج سے سوا دو سو سال قبل جبکہ اردو شاعری بلکہ اردو زبان کی شیر خوارگی کا عالم تھا لکھا گیا تھا اور جو سید جعفر زٹلی جیسے ہنسوڑ شاعر کے دل پر چوٹ لگنے کا نتیجہ ہے آج تک یادگار ہے۔ اس نوحہ کے اشعار جو قدیم اُردو کا نمونہ ہیں حسب ذیل ہیں:-

کہاں اب پایئے ایسے شہنشاہ — مکمل کامل و اکمل دل آگاہ
رکت کے آنسوؤں جگ روؤتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سوؤتا ہے
صدائے توپ و بندوق است ہر سو — ببر اسباب و صندوق است ہر سو
دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے — بچہ در گور سر کھٹیا دھری ہے
کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سو — جھٹا جھٹ و پٹا پھٹ ہست ہر سو
بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است — اوچل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں اعظم وزیں سوئے معظم — جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو یا ہم
بہ بنیم تا خدا از کیست راضی — بخواند نامہ بر نام کہ قاضی

سب سے آخری ضرب جو دہلی پر پڑی وہ ۱۸۵۷ء کی زد تھی، دہلی کی یہ بربادی ایسی نہ تھی کہ اُس وقت کے شعرا خاموش بیٹھتے۔ غدر کی مصیبت جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی اُنھوں نے ان واقعات کے بیان کرنے میں خوب خوب زور قلم دکھایا ہے۔ مرزا غالب نے تو اپنے روزمرہ کے خطوط میں بھی جا بجا یہی دکھڑا رویا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں" قصہ مختصر شہر

صحرا ہو گیا۔" ایک خط میں فرماتے ہیں "یہاں اغنیا وامرا کی ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں، اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے۔" ایک دوسرے خط میں تحریر ہے "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا، دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا۔" غالب نے نظم کے ذریعہ سے بھی ان جذبات کا کچھ کم اظہار نہیں کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ذیل کے قطعہ بند اشعار میں بھی مرزا نے لٹی کھسٹی دہلی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے:-

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس　　یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے　　یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

غالب کے سوا اس عہد کے دوسرے شعرا سے بھی خاموش نہ بیٹھا گیا، آزردہ۔ داغ۔ حالی، سالک۔ افسردہ۔ شیفتہ۔ صابر۔ ظہیر۔ عیش۔ مجروح جیسے مشاہیر شعرا کے علاوہ ایسے لوگوں نے بھی بدنصیب اور اُجڑی بجڑی دہلی کے مرثیے لکھے کہ شعر گوئی جن کا مشغلہ نہ تھا اور جن سے اس مرثیہ کے سوا دوسرا کلام یادگار نہیں۔ اور تو اور تشنہ جیسے آزاد منش شاعر بھی جنھیں بقول شخصے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا اس طرح پکار اُٹھے ؎

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا　　مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آ کے لوٹ لیا

شیفتہ نے شہر آشوب کے علاوہ اپنے دیوان میں بھی دلی کی بربادی کا مختلف اشعار میں ذکر کیا ہے، ان کا ایک شعر ہے ؎

ویرانے کے مانند کہیں دل نہیں لگتا　　ہر چند کہ ہے شیفتہ دلی وطن اپنا

۱۸۵۷ء کے عبرتناک واقعہ کو تقریباً پون صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس لئے آج بہتر سال کے بعد ان تمام نظموں کو جو اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جمع کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی چھیالیس شاعروں کی چونسٹھ نظمیں کمال جستجو سے دستیاب ہوئیں جن کو راقم الحروف نے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا ہے جو انقلاب دہلی کے نام سے زیر طبع ہے۔

یہ نظمیں شعرا کے تخلص کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف تہجی درج کی گئی ہیں۔ جن شعرا کا سن ولادت و وفات اور کچھ حال معلوم ہو سکا ہے وہ بھی لکھ دیا گیا ہے، ان شعرا میں دو ہندو شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے دہلی کے اُجڑنے کا ماتم مسلمانوں سے کم نہیں کیا ہے۔ منشی پرمیشاد

ظاہر دہلی میں اسلامی سلطنت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے بادشاہانِ اسلام کو اس طرح روئے ہیں ؎

بار منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا   کس کے سر پہ نہیں احسان شہانِ دہلی

منشی رام پرشاد ظاہر نے دہلی کے شاہان اسلام کی نسبت اپنا یہ خیال جس وقت ظاہر کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس حکومت کا وہ چراغ بھی جو برائے نام قلعہ کے اندر ٹمٹما رہا تھا گل ہو چکا تھا اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر نے جو کچھ کہا اس میں خوشامد یا چاپلوسی کا شائبہ ہے بلکہ فی الحقیقت اس نے ایک واقعہ کو نظم کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو موجودہ زمانے کے بعض متعصب مصنف جس رنگ میں پیش کرتے ہیں، اور جو رنگ ہمارے نوجوانوں کے قلوب کی صاف وشفاف تختیوں پر نفاق ورشقاق کے نقوش مرتسم کرتا ہے وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ایک اور واقعہ سے بھی س بات کا پتہ چلتا ہے کہ پچھلے مسلمان بادشاہوں پر جبر و تعدی وغیر رواداری کا جو الزام لگایا باتا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ حالت اس کے برعکس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں فوجوں بں جب بغاوت شروع ہوئی تو ہر ملت ومذہب کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنیوں میں آگ لگا کر لی کے معزول بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ہندو سپاہی بجائے اس کے کہ کسی ندو راجہ کی طرف متوجہ ہوتے غریب بے بس بہادر شاہ کی جے پکارنے لگے۔

ان نظموں پر نظر ڈالنے سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دہلی پر خون کے آنسو صرف دہلی لوں ہی نے نہیں بہائے ہیں۔ بلکہ دوسرے مقامات کے لوگ بھی اس کی بربادی سے متاثر ے جیسا کہ بجنور، پانی پت اور لکھنؤ کے شعرا کے نوحے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ لطف لکھنوی ، دہلی کے عالمگیر ماتم کا اظہار اپنے لفظوں میں اس طرح کیا ہے ؎

اٹھ گیا لطف محبت نہ رہا دل کو قرار   کون ہے جس کو نہ پہونچا ہو تکانِ دہلی

دہلی والوں کے رنج و ملال کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، ایک دہلوی شاعر راقم نے شدتِ غم ہنگ آ کر طنزاً یہ لکھ دیا کہ دہلی مٹ گئی اچھا ہوا اور صرف اسی مضمون کو ایک مطلع میں کر چپ سادھ لی، فرماتے ہیں ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام ونشانِ دہلی   کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

کے شعرا نے جہاں عزت، آبرو، مال، دولت، سلطنت، حکومت، محل دو محلوں کی لوٹ رنا رویا ہے، اسی کے ساتھ اپنی زبان کی بربادی کی کچھ کم مرثیہ خوانی نہیں کی ہے۔ شاید ہی

کوئی نوحہ ایسا نکلے گا جس میں دلی کی پیاری زبان کے بگڑنے کا افسوس نہ کیا گیا ہو۔ ایک شاعر نے فرمایا ہے ؎

میری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی　　دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

شاطر دہلوی کا شعر ہے :۔ ؎

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں　　دل پہ آتا ہے نظر زخم زبانِ دہلی

ظہیر دہلوی نے کس درد سے کہا ہے ؎

رہ گئے کہنے کو کچھ ہیں فسانے باقی　　اب نہ دلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

زبان کے ساتھ اہلِ علم و فن کا ماتم بھی کچھ کم نہیں کیا ہے، ایک مرثیئے کا شعر ہے ؎

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے　　مذاقِ شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

مولانا حالی نے بالکل سچ فرمایا ہے ؎

جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق　　آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس　　قدریاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

"دنیا بامید قائم ہے" یہ ایک پُرانا مقولہ ہے، فی الواقع اُمید ہی وہ چیز ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس بندھاتی ہے، اس کے خیال سے مردنی زندگی سے بدل جاتی ہے۔ دلی کے ستم رسیدہ شعرا کو بھی مایوسی میں اُمید کی جھلک نظر آتی تھی اور اُن کے دل سے یہ آوازیں نکلتی تھیں ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد و کھلادے　　الٰہی پھر اِسے حسب مراد و کھلادے

ایک فارسی نوحے میں اس طرح دعا مانگی گئی ہے ؎

بازش از لطف و کرم آباد کن　　ساکنانش را خدایا شاد کن

حکیم آغا جان عیش کا دعائیہ شعر ہے ؎

الٰہی کردے پھر آباد و باغِ دہلی کو　　کر اپنے فضل سے روشن چراغ دہلی کو

۱۹۱۱ء میں جبکہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، ان دعاؤں کی قبولیت کا وقت آیا، اور انگریزی حکومت نے ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت کو چھوڑ کر کلکتے میں جو نیا گھر بسایا تھا اعلیٰ حضرت ملک معظم جارج پنجم کی زبان کی ایک گردش نے اُس کو اُجاڑ کر دلی کو بھاگ لگا دیئے۔ نئی حکومت نے نئی دہلی بسائی اور فلک ناعاقبت

لاکھوں روپیہ صرف کرکے تیار کردیں۔ جن کی افتتاحی رسم اسی سال فروری میں ادا ہوئی ہے۔ ان عمارتوں میں نائب السلطنت گورنر جنرل ہند کے رہنے کا مکان بھی ہے۔ ہندوستان کی مرکزی مجلس وضع قوانین کا ایوان بھی ہے، نئی دہلی میں ہندوستان کا نیا نظام حکومت جس کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر رکھی جانے والی ہے رونما ہوگا۔ اور نئی دہلی کی تعمیر ہندوستان کے لئے مبارک ثابت ہوگی۔ اور نظام حکومت کا یہ نیا انقلاب اُن مصیبتوں کو جو پچھلے انقلابوں میں نازل ہو چکی ہیں بھلا دے گا۔ یہ ہے انقلاب دہلی کی مختصر داستان اور بس۔

لٹریچر کا قرض

"بنی نوع انسان پر جس قدر قرض لٹریچر کا ہے اتنا اور کسی شے کا نہیں ہے۔ تمدن، سلطنتیں، قومیں، ملک مرجانے والی چیزیں ہیں لیکن انکا لٹریچر سدا زندہ رہتا ہے اور اسی آئینہ میں لوگ اُن کے چہرے دیکھ سکتے ہیں۔ روبس پیئر انقلاب فرانس کا ایک خاص ایکٹر تھا آج اسکی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہیں لیکن کارلائل نے اُسے زندہ جاوید بنا دیا ارجن کی ہم تعریف کرتے ہیں، دریودھن کی مذمت، اسکی وجہ کیا ہے صرف یہ کہ دیاس ہیں یہ حکم دیتا ہے۔ قدیم ہندوستان کی کہانیاں پڑھکر ہم اپنے بستر مرگ سے بھی اُٹھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں یہ ہمپر لٹریچر کا قرض ہے لیکن اس قرض کی ادائگی کا کیا طریقہ ہے؟ — پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم شاعر بننے کا خبط چھوڑ دیں، آجکل ہر ایک شخص شاعر بننا چاہتا ہے، کوئل بولی اور ہم قلم دوات لیکر بیٹھ گئے۔ نوجوانوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اگر اپنے آپ کو شاعر سمجھتے ہیں تو سمجھیں لیکن کم از کم ایکسال تک نظمیں کہیں شائع نہ کرائیں ایکسال کے بعد بھی اگر انکو اپنی نظمیں پسند ہوں تو پھر اُن کو اجازت ہے۔ — دوسرا طریقہ لٹریچر کے قرض کی ادائگی کا یہ ہے کہ کسی غیر مستحق کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہ لکھا جائے۔ ہمارے ملک میں ہر ایک مصنف کی تعریف ہوجاتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ نالائق مصنفوں کے سر میں ہوا بھر جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوٹ کی ایڑی سے لکھیں گے جب بھی کمال ہو جائیگا، اس سے لٹریچر تباہ ہوتا ہے۔ —— تیسرا طریقہ اس قرض کی ادائگی کا یہ ہے کہ ہم لوگ اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کریں، ایک سال تک جو شخص نہایت غور سے عمدہ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے وہ کتابوں کا نقاد بن جاتا ہے اور اس قابل ہوجاتا ہے کہ لوگوں کی صحیح سمت رہنمائی کرسکے۔"

(چندن) پرجابندھو احمدآباد (گجراتی)

ہام پی کے کھنڈرات

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے۔ جرنلسٹ)

وجے نگر کے کھنڈر اور اُن کی موجودہ شان

وجے نگر کی رخصت شدہ شوکت کے آثار کا محلِ وقوع ہام پی (Hampi) ہے، جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ دریائے تنگ بھدرہ کے کنارے پر واقع ہے۔ اور ضلع بلاری کے تعلقہ ہاس پت میں ہے۔ یہ "ہام پی کے کھنڈر" کے نام سے مشہور ہے جو شخص ہند و شوکتِ دکن کا شاندار محلِ وقوع اور اس کی رخصت شدہ شان کے نشانات دیکھنے کا خواہاں ہو، اُسے ہاس پت ریلوے اسٹیشن سے اُتر کر کاملا پورم جانا چاہیئے جو سات میل پر واقع ہے۔ وہاں قیام گاہ بنا کر دُور تک پھیلے ہوئے کھنڈروں کی سیر کرنا چاہیئے، جو اب نو مربع میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن اگر استحکامات اور بیرونی چوکیوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو رقبہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً جنوب مغرب کی طرف سے شہر میں داخل ہونے کے واسطے جو دروازہ تھا وہ بڑا مستحکم تھا، اور اس کے ارد گرد استحکامات بنے ہوئے تھے، اس کے آس پاس جو سنگلاخ پشتہ بنا ہوا تھا، وہ ہام پی سے دو میل دوسری طرف تھا، یوں سمجھنا چاہیئے کہ کھنڈروں کے موجودہ مرکز سے سیدھے خط میں نو میل دور ہے۔

وجے نگر کا محلِ وقوع

یہ مقام عجب سنسان بیابان ہے، جو ایک نہایت بڑی سلطنت کا مولد اور مرجع قرار پایا تھا۔ ہر طرف چٹان ہی چٹان ہیں جو روئیدگی سے معرا ہیں۔ اور ان ہی چٹانوں کی پہاڑیاں بنی ہوئی ہیں، جن کے شمال میں تنگ بھدرا بڑی تیزی سے بہتا ہے۔ جس کا پاٹ بڑے بڑے پتھروں سے اٹا ہوا ہے۔ اس کے کنارے بہت اونچے ہیں، اس وجہ سے اس کی گذرگاہ بجائے خود ایک خوفناک طبعی خندق کے مشابہ ہے۔ جو وجے نگر کی حفاظت کا کام دیتا ہے۔ پہاڑیوں پر ہر قسم کے رنگ نظر آتے ہیں، کہیں سیاہی مائل نیلی، کہیں خاکستری، کہیں بھوری، کہیں نارنجی، اور کہیں سفید معلوم ہوتی ہیں، سبزی نام کو بھی نہیں ہے۔ دن کو گرمی ہوتی ہے اور رات کو دسمبر ایسی سردی پائی جاتی ہے۔ جس سے بڑے بڑے چٹان پھٹ گئے ہیں، جنھیں پرانے زمانے کے

خوفناک زلزلوں نے پہاڑیوں کے پہلوؤں پر اور نیز نیچے دیہات میں بڑی بے ترتیبی سے پٹک دیا ہے۔کہیں کہیں نہایت بڑے بڑے چٹان ایک دوسرے پر ایسے دھرے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی اوزار سے جنبش دے تو وہ چشم زدن میں لڑھک کر نیچے آرہیں۔ بعض جگہ ایسے طور پر جمع ہو گئے ہیں کہ وہ سد سکندری کا کام دیتے ہیں، اور کئی جگہ بلندیوں کے اوپر ایسے طریقہ سے آراستہ ہیں کہ وہ سنگلاخ فصیل کا کام دیتے ہیں، گویا جنگی استحکامات بنانے والے کاریگروں نے چن دیئے ہیں۔ایک معتبر راوی ہے کہ "جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے، دس مربع میل رقبہ پر چٹان ہی چٹان دکھائی دیتے ہیں۔" فرش زمین ان ہی بھدے بھونڈے پتھروں سے بنا نظر آتا ہے۔اگر افق کی طرف دیکھو تو بھی پہاڑوں کے تیکھے کالے چٹان آسمان سے سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان کی شکل وصورت ہر نوع کی ہے۔اور شمار میں ہزاروں لاکھوں سے تجاوز کرتے ہیں، ان کے ڈھیر کے ڈھیر ہر طرف نظر آتے ہیں، جو کہیں کہیں ڈھائی ڈھائی سو فٹ بلند ہیں۔"

پہاڑوں کے پہلوؤں اور ان کے مابین نشیبوں پر شہر پناہ اور اس کے استحکامات بنے ہوئے ہیں، کہیں کہیں تو یکے بعد دیگرے کئی دیواریں پائی جاتی ہیں جن کے اندر فصیل شہر محدود ہے، اور نشیب میں وجے نگر کے اُجڑے سونے بازار واقع ہیں، مندر اور حویلیاں اور محل بھی شکستہ حالت میں نظر آتے ہیں۔ ان شاندار اور وسیع کھنڈروں کا سب سے عمدہ نظارہ ماتنگہ پرورتم کی پہاڑی سے دکھائی دیتا ہے۔جس پر چڑھنا آسان کام نہیں ہے، اگر خوبیٔ قسمت سے مطلع صاف ہو، تو ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں کی پیاری روشنی میں رفیع الشان ٹوٹی عمارتوں کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، دل پر عجب کیفیت طاری ہوتی ہے، وجے نگر کی شوکت کی یاد بے چین کر دیتی ہے، عقل انسانی کے شاندار کارنامے ناپائدار اور اس کی تمنائیں بیکار معلوم ہوتی ہیں، یاس وحسرت تصور پر گرفت حاصل کر کے اُسے مسلوب کر دیتی ہے۔

پُرانی روایات کی رو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجے نگر سے پہلے بھی وہاں پر ایک شہر پُرانے زمانہ سے آباد تھا۔ رامائن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی واقعات کش کندھا کے آس پاس واقع ہوئے تھے، اور یہ جگہ ہام پی کے قریب ہی سمجھی گئی ہے۔ دالی اور سگریو کا راج وہیں تھا۔ بھائیوں میں جھگڑا ہوا، سگریو کو ہنومان سمیت وہاں سے بھاگنا پڑا۔

وجے نگر کے جنگی استحکامات میں اگر کوئی خصوصیت ہے تو اُن کی وسعت اور بے نظیر پائداری

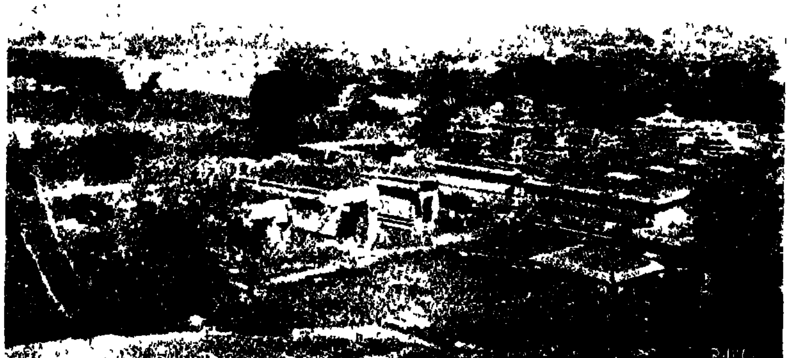
اور مضبوطی اور جنگی انجنیروں کی ہنرمندی ہے جس سے کام لیکر انھوں نے قدرتی مرقع کو ایسا سنگلاخ بنادیا کہ غنیم اسے توڑکر اندر گھسنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ تنگ بھدرہ وجے نگر کے قریب میلوں تک ایسا ہے کہ اسے بآسانی عبور کرنا امر محال ہے۔ اور پہاڑ ایسے دشوار گزار ہیں اور ان کے درمیانی موقع ایسے مستحکم کئے گئے ہیں کہ دشمن ادھر سے بھی آسانی سے نہیں آسکتا۔ گویا شمال میں دریا اور جنوب میں چٹانوں کے سبب سے وجے نگر ناممکن التسخیر ہوگیا تھا۔ اور اصل یہ ہے کہ وجے نگر کی دوسو سال کی شوکت کے زمانہ میں غنیم کو اسے زیر کرنے میں کبھی کامیابی نہ ہوئی، اور اگر تلی کوٹ کے فیصلہ کن معرکوں کے بعد وجے نگر شہر کے اندر کی ڈیڑھ لاکھ مسلم سپاہ نمک حرامی اور غداری نہ کرتی تو مسلم اتحادی اس شہر پر نہ تو آسانی سے قابض ہوسکتے تھے، اور نہ اسے لوٹ کر تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہوتے۔

قابل ذکر عمارتیں۔ ہام پی میں صدہا خستہ حال عمارتیں اور مندر اور محل ہیں جن کے اجمالی تذکرے کے واسطے بہت وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں پر صرف چند خاص عمارتوں ہی کے ذکر پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ وجے نگر کے محل وقوع پر اب اوٹیلہ کی اور جنس پتی کا تسلط ہے، گیدڑ اور دیگر جنگلی جانوروں کے بسیرے ان شکستہ حال عمارتوں میں ہیں۔ جہاں ساڑھے تین سو برس پہلے کروڑ پتی مہاجن اور سوداگر، ذوالاقتدار رؤسا اور امرا، عالی مرتبہ عمائد سلطنت، کفایت شعار دوکاندار اور ایمانداری سے روٹی کمانے والے کاریگر اور خون پسینہ کرنیوالے اہل صنعت رہتے تھے۔ کیا نشیب اور کیا فراز، کیا ٹیلہ اور کیا وادی، کیا میدان اور پہاڑی، جدھر نگاہ دوڑاؤ ہر قسم کے مکانوں کے کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ افق بھی ان ہی سے اٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بعض پہاڑوں پر چڑھنا امر محال ہے، جہاں پرانے وقتوں کے کھنڈر پڑے ہیں

قابل ذکر عمارتوں میں سوامی رگھناتھ مالیہ وانتی کا مندر ہے، جو ایک بلند موقع پر کامل پی والی سڑک پر ہے۔ جیسے اور مندر ہیں ویسے یہ بھی دراوڑی فن تعمیر کا قابل قدر نمونہ ہے۔ مگر سنگ تراشی کی صنعت اور مندروں کی بہ نسبت ہر طرح سے اعلیٰ ہے۔ دیواروں کی آرائش کے واسطے عجیب قسم کی مچھلیاں اور دیگر خوفناک سمندری جاندار کندہ کئے گئے ہیں۔ کرشن سوامی مندر کی آرائش بھی اسی قسم کی ہے۔ مقدس کے اوپر بہت بڑا پتھر دھرا ہے جس کے اوپر مینار بنا ہوا ہے۔ عرصہ سے یہ ویران پڑا تھا مگر شمالی ہند کے ایک بیراگی نے وہاں پر پوجا شروع کرکے سالانہ تیوہار رائج کردیا ہے۔ وہاں پر اب خاصی رونق ہے۔ مسلمان حملہ آوروں نے وجے نگر کے

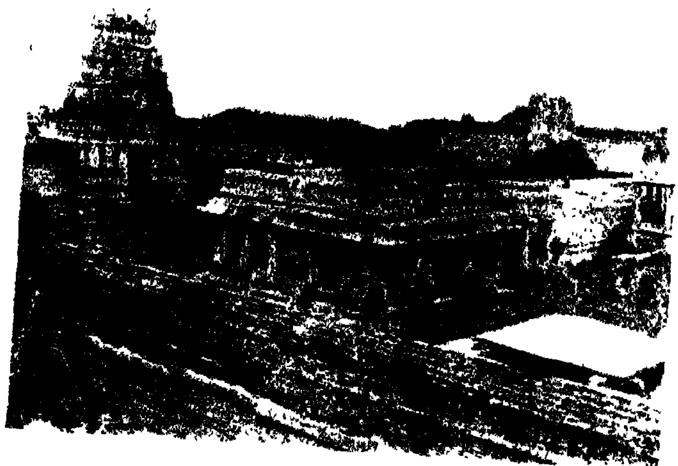


ہامپی کے کھنڈروں کا عام منظر



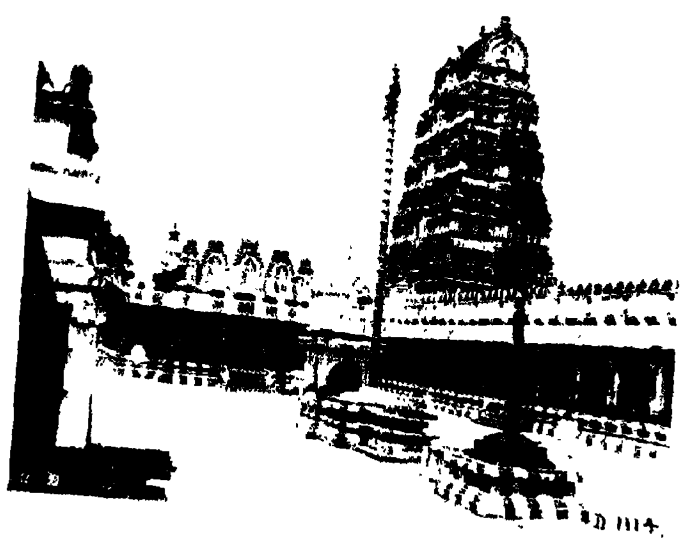
جین مندر اور دریاے تنگ بھدرا کا عام منظر

۱



مندر رگھوناتھ اور اُسکے قرب و جوار کا منظر

۲



مندر وٹھل سوامی

اور کسی حصے کو ایسا برباد نہیں کیا جیسا محلوں اور ان کے قریب کی سرکاری عمارتوں کو برباد کیا ہے۔ یہ حرف بحرف درست ہے کہ اُنھوں نے اینٹ سے اینٹ بجادی، جدھر جاؤ شکستہ دیواروں اور چھتوں کے ملبہ کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ غالباً اس کا یہ سبب تھا۔ کہ مہاراجہ وجے نگر کے محلوں کے اندر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی مشہور تھا کہ ان کے اندر بے قیاس زر و جواہر دفن پڑے ہیں جن کی تلاش میں مسلمانوں نے فرش کھود ڈالے دیواریں توڑ ڈالیں۔

ہزارہ راجہ سوامی کا مندر | اسکی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ تاجدار وجے نگر اور اسکے متعلقین اس مندر میں پوجا کرتے تھے۔ کرشن دیو رائے نے ۱۵۱۳ء میں اسے تعمیر کرایا تھا، اس کی دیوارو‌ں پر عجیب و غریب مناظر کندہ ہیں، جس میں میدان کارزار اور شکار گاہ کے سین دکھائے گئے ہیں۔ نچلے حصے میں ہاتھی گھوڑے، اونٹ اور پیادے ہیں، مگر ان کے اوپر ننگی لڑکیاں ناچتی اور کودتی دکھائی گئی ہیں۔ لیکن مندر کے اندر کی دیواروں پر نہایت نفیس صنعت کاری نظر آتی ہے۔ دو جین پتھر تھنکر سمادھی لگائے بیٹھے ہیں، گنیش جی اور سبرمنی بھی ہیں آخر الذکر اپنے مور کی پیٹھ پر سوار ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مندر وشنو جی کا ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اُس زمانہ میں ہر عقیدہ اور مت کے لوگ صلح اور آشتی سے رہتے تھے۔ منت پم کے باہر چار سیاہ پتھر کے بیل پائے جاتے ہیں جو کہیں دُور سے لائے گئے تھے اور خوب صاف ہیں، اُنکی صنعت قابل تعریف ہے،

شہر پناہ کے بیرونی سلسلہ ہائے استحکامات کے رہنے والے کاشتکاروں کی کھیتی کی آبپاشی کے واسطے نہریں اور ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا، جن کے نشانات ابتک باقی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہانِ وجے نگر رفاہ عام کے کاموں سے غافل نہ تھے۔ کھنڈر دور تک پھیلے ہوئے ہیں محکمہ اثریات کی مساعی حسنہ سے کئی پُرانی عمارتوں اور مندروں کی مرمت کی گئی ہے، ان میں کنول محل، جین مندر، ہزارہ رام سوامی کا مندر اور سوامی رگھناناتھ مالیہ وانتی کا مندر، اور مادھواچاریہ کا مندر، ہاتھی خانہ وغیرہ ہیں۔ دریا کے کنارے پر وٹھل سوامی کا مندر تھا جو خوبصورتی میں لاثانی تھا۔

دکن میں ہندو شوکتِ شاہی ۱۳۳۶ء سے لیکر ۱۵۶۵ء کے اخیر تک رہی۔ اس زمانہ میں وجے نگر کی شان و عظمت سب سے نرالی، اور اُن کا مستقر مال و دولت کا مخزن اور سب سے شاندار تھا۔

قلوپطرا

CLEOPATRA

از چودھری محمد علی بی۔اے، ایل ایل بی۔ وکیل ایبٹ آباد (سرحد)

دو ہزار سال سے کچھ زائد عرصہ گذرا ہوگا کہ اسکندریہ میں ایک ملکہ رہتی تھی، جس نے اپنی ذہانت اور حسن کی بدولت اس زمانہ کے دو بڑے مقتدر جرنیلوں کو یکے بعد دیگرے غلام بنا رکھا تھا۔ اور جس کی سیاسی قابلیت نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، اس کا نام قلوپطرا تھا اور ان جرنیلوں کے نام جولیس سیزر اور مارک انٹونی تھے۔ مورخین کے درمیان قلوپطرا کی ظاہری شکل وصورت اور اس کے چال وچلن کے متعلق سخت اختلاف ہے۔ حال ہی میں اُس زمانے کے سکے اور چند ایک بت برآمد ہوئے ہیں، مگر اُن سے بھی اس کی ظاہری صورت کے متعلق چنداں روشنی نہیں پڑتی۔ گو روایات اور غیر مستند کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی حسین اور خوبرو تھی کہ جس نے اُسے ایک دفعہ دیکھا اُس کا ہمیشہ کے واسطے غلام بنگیا اس کا حُسن حاضرین پر جادو کا اثر رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی جوانی عیش وعشرت کے واسطے وقف کی ہوئی تھی۔ مگر وہ سیاسی معاملات میں اپنے حُسن سے بڑے بڑے پیچیدہ کام نکال لیا کرتی تھی۔

وہ ۶۸ یا ۶۹ سنہ (قبل از مسیح) (والیِ مصر) ٹالمی سیزدہم کے گھر (Ptolmey) اسکندریہ میں پیدا ہوئی۔ ابھی وہ چودہ سال کی ہوگی کہ مارک انٹونی (جو سیزر کا ایک نہایت مشہور جرنیل تھا) کسی ذاتی کام پر اسکندریہ آیا، جب اُن کی آنکھیں چار ہوئیں تو انٹونی اس پر دل وجان سے فریفتہ ہوگیا، مگر یہ صحبت صرف چند روزہ رہی کیونکہ اسے جلدی اپنے ملک میں واپس جانا پڑا۔ چار سال کے بعد قلوپطرا کا والد مر گیا، اور مرتے وقت وصیت کر گیا، کہ اس کی بڑی لڑکی (قلوپطرا) اور اس سے چھوٹا لڑکا (جس کی عمر دس گیارہ سال ہوگی) مشترکہ حکومت کریں چنانچہ ان کے علحدہ علحدہ درباری مقرر کئے گئے۔ چند ایک سال تک تو یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، مگر ملک میں دو جماعتیں ظہور پذیر ہوگئیں۔ جن میں سے ایک قلوپطرا کی طرفدار تھی، اور دوسری

اس کے بھائی ٹالمی چہارم کی طرف۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ بلا شراکت غیرے سلطنت پر حکومت کرے۔

جب قلوپطرا اکیس سال کی ہوئی تو ٹالمی نے اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہن بھائی کی فوجوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی اور کشت و خون کے بازار گرم ہوئے۔ قلوپطرا کو شکست ہوئی اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر سیریا بھاگ گئی مگر اس کی سیمابی طبیعت نے اُسے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ اُس نے تھوڑے عرصہ میں ایک زبردست لشکر تیار کیا اور مصر پر حملہ آور ہوئی۔ پورٹ سعید کے میدان میں دونوں کی فوجیں برسرپیکار ہوئیں، کہ اس اثناء میں پامپئی (Pompey) سیزر سے شکست کھا کر مصر میں بھاگ آیا۔ ٹالمی نے سوچا کہ اگر وہ پامپئی کو اپنے ملک میں امان دیگا تو سیزر ضرور ناراض ہو جائیگا اس لئے اُس نے کسی طریقہ سے پامپئی کو قتل کرا دیا۔ چند دنوں کے بعد سیزر بھی اس کے تعاقب میں مصر آن پہونچا۔ جب اُس نے پامپئی کے موت کی خبر سنی تو وہ بجائے خوش ہونے کے ٹالمی پر سخت ناراض ہوا۔ کیونکہ وہ دل سے اس بہادر جرنیل کی قدر کرتا تھا۔

سیزر اسکندریہ کے شاہی محل میں اقامت پذیر ہوا، اور اُس نے وہاں قلوپطرا اور اس کے بھائی کو اپنے ہاں بلوایا تاکہ ان کے درمیان صلح کرا دے۔ ٹالمی تو فی الفور آ گیا، لیکن قلوپطرا اس سوچ بچار میں تھی کہ وہ کس طرح صحیح سلامت اسکندریہ کے محل میں پہونچ جائے کیونکہ وہاں پہونچنے کے لئے اسے اپنے بھائی کی فوجوں کے درمیان سے گذرنا پڑتا تھا اور اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ رستے میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اُس نے ایک نہایت اعلیٰ تدبیر سوچی، اُس نے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ لیا۔ اور اس کے ایک خدمتگار نے اسے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزدور نے کوئی بوجھ اُٹھایا ہوا ہے۔ جب وہ محل کے دروازے پر پہونچی تو دربانوں نے خدمتگار سے استفسار کیا۔ کہ اس گٹھڑی میں کیا ہے، خدمتگار نے جواب دیا کہ اس میں سیزر کے افسروں کا سامان بندھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بلا روک ٹوک قلوپطرا کو سیزر کے کمرے میں لے گیا، اور وہاں جا کر اُسے چادر سے برآمد کیا۔ جب سیزر نے یہ منظر دیکھا تو سخت حیران ہوا، اور اس کی ذہانت کی بہت داد دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سیزر اس کے ظاہری حسن اور ذہانت سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ وہ صرف چند گھنٹے کے لئے اسکندریہ آیا تھا مگر اب وہیں اقامت کرنے کا مصمم ارادہ کر بیٹھا۔ سیزر کو تمام مہذب دنیا

کے مسخر کرنے کے خواب آنے لگے۔ اور یہ جب ہی ہوسکتا تھا کہ وہ قلوپطرا سے اتحاد قائم کرے وہ چاہتا تھا کہ اپنی ملکہ کو طلاق دیکر قلوپطرا سے علانیہ شادی کرے۔ مصر ان دنوں بڑا دولتمند ملک تھا اور سیزر اس کی دولت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا، چونکہ سیزر خود قلوپطرا کے دام الفت میں پھنس چکا تھا تو پھر ٹالمی کو اس سے انصاف کی قطعاً امید نہ تھی چنانچہ اُسے سلطنت سے علٰیحدہ ہونا پڑا۔ انہی ایام میں سیزر نے قلوپطرا کے ساتھ خفیہ شادی کرلی۔ سیزر کچھ عرصے کے بعد روم واپس آگیا، اور قلوپطرا کو کہہ گیا کہ وہ بھی اپنی سلطنت کا انتظام کسی شخص کے سپرد کرکے وہیں آجائے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا، مگر وہاں سیزر اس کے ساتھ علانیہ تعلقات نہیں رکھ سکتا تھا، اور نہ ہی اسے شاہی معاملات میں کوئی دخل تھا۔ روم کے لوگ اُسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ جب عوام الناس کو معلوم ہوا کہ سیزر اپنی ملکہ کو طلاق دیکر اُسکے ساتھ علانیہ شادی کرنے والا ہے تو اُن کے غیض وغضب کی انتہا نہ رہی۔ اور اُنھوں نے سیزر کو مجبور کیا کہ اُسے واپس مصر بھجوادے۔ مگر قلوپطرا واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ جب سیزر کونسل ہال میں قتل کیا گیا تو اس وقت بھی قلوپطرا روم میں موجود تھی۔ سیزر کے قتل سے اُسے سخت صدمہ ہوا گویا اُس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا۔ چشم زدن میں اسکی ملک گیری کی ہوس خاک میں مل گئی۔ کیونکہ ان دونوں نے تمام دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا

قلوپطرا ابھی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے، آیا وہ اپنے لڑکے کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کرے یا اُسے اپنے ساتھ مصر لے جائے۔ چنانچہ اس نے اغلباً انٹونی سے مشورہ لیا۔ جس نے اس کے ساتھ مدد کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ مصر سے اپنی تمام فوج لے کر آجائے تاکہ وہ متحدہ طاقت سے اکٹیوین (سیزر کے بھتیجے) کو تخت سے اُتار دیں۔ جو اپنے چچا کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھ گیا تھا چنانچہ قلوپطرا اپنے ملک کو واپس گئی اور یہاں آکر اپنی فوج کے نظم ونسق کو مہم کے واسطے درست کرنے لگی۔ مگر اس اثنا میں اُسے اطلاع ملی کہ انٹونی نے غداری کرکے اکٹیوین سے صلح کرلی ہے ۴۱ (ق م) میں جب انٹونی طرسوس میں آیا تو اُس نے قلوپطرا کو مصر سے بلوا بھیجا تاکہ وہ آپس میں کچھ صلاح ومشورہ کریں۔ قلوپطرا اس سے سخت ناراض تھی کیونکہ اُس نے وقت پر مدد دینے سے انکار کردیا تھا مگر ملاقات کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کیونکہ ان دنوں وہ دنیا میں سب سے طاقتور جرنیل تھا اور نہایت بارسوخ تھا۔ جب انٹونی نے اُس کے آنے کی خبر سُنی تو اُس کے استقبال کے لئے بڑی تیاریاں کیں، مگر قلوپطرا ایک غیور ملکہ تھی وہ رعایا کی

حیثیت میں اس کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی، اس واسطے وہ اپنے جہاز میں ہی بیٹھی رہی اور انٹونی کو معہ اس کے جرنیلوں اور سرداروں کے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اُس نے دعوت کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا۔ خود اس نے ایسا خوبصورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا جس سے اس کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی۔ شاہی کمرے میں سامان ایسے سلیقے سے رکھا ہوا تھا جس سے دیکھنے والوں کی عقل دنگ ہوتی تھی۔ فرش پر پھولوں کی دو فٹ موٹی تہ تھی، جس سے تمام کمرہ مہک رہا تھا۔ جب کھانا چنا گیا تو میز پر تمام سونے اور جواہرات کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر عدیم المثال قالینیں لٹک رہی تھیں۔ جب انٹونی نے یہ نظارہ دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس نے قلوپطرا کی امارت اور قابلیت کی تعریف کی۔ جس پر قلوپطرا نے تمام سامان بمعہ سونے کے برتنوں کے اس کو بطور نذرانہ دے دیا۔ انٹونی اس کے حسن سے اتنا متاثر ہوا کہ دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ چنانچہ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ بعض دفعہ انٹونی بھی اسے کھانے پر مدعو کیا کرتا تھا، مگر وہ مہمان نوازی میں ملکہ موصوف سے گوئے سبقت نہ لے جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ قلوپطرا نے اس کی معمولی مہمان نوازی سے چیں بجبیں ہوئی تو انٹونی نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کس طریقہ سے اُس کی خاطر کرے تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ قلوپطرا نے جواب دیا کہ مہمان نوازی میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور کہ وہ ایک کھانے پر ڈیڑھ لاکھ اشرفی خرچ کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے شرط لگائی کہ وہ دوسرے دن اتنا روپیہ خرچ کرے گی۔ جب انٹونی دوسرے دن حسب وعدہ کھانے پر آیا تو اُسے ضیافت کا کوئی خاص انتظام نظر نہ آیا جس سے وہ دل میں بڑا خوش ہوا کہ وہ شرط جیت جائیگا۔ قلوپطرا نے ایک خدمتگار کو اشارہ کیا تو وہ فوراً ایک گلاس لے آیا جس میں سرکہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے کان سے ایک موتی نکالا اور گلاس میں ڈال کر پی گئی۔ اس موتی کی قیمت قریباً پچھتر ہزار اشرفی تھی۔ وہ دوسرا موتی بھی اسی طرح سرکے میں ڈال کر انٹونی کو دینا چاہتی تھی کہ انٹونی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ شرط جیت گئی ہے۔

انٹونی نے دل میں سوچا کہ ان کے اتحاد سے دونوں کو بیحد فائدہ ہوگا۔ چنانچہ اُس نے قلوپطرا سے بڑا پختہ وعدہ کیا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیکر اُس کے ساتھ شادی کرے گا اور علانیہ اس کے ساتھ بود و باش رکھے گا۔ چونکہ قلوپطرا کو بھی یہ اتحاد مفید تھا اس واسطے وہ

رضامند ہوگئی، اور نئے سرے سے دوسرے ملکوں کی تسخیر کے خواب دیکھنے لگی۔ اِس عہد و پیمان کے بعد انٹونی روم کی جانب روانہ ہوگیا۔ ایشیائے کوچک میں پہونچکر اس نے اکٹیوین (جو سیزر کا جانشین تھا) کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ جب اس کی اصلی بیوی (جو اس کی امداد کے لئے تین ہزار سوار لیکر ایتھنز تک آئی تھی) مرگئی، تو انٹونی نے اس کو باہمی جنگ کا ذمہ دار قرار دیکر پھر اکٹیوین سے صلح کرلی۔ اور بادشاہ کی بہن کے ساتھ نکاح کرلیا۔ قلوپطرا کو جب انٹونی کی تلوّن مزاجی کا علم ہوا تو اسکے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مگر وہ انٹونی یا اکٹیوین کو کوئی خاص نقصان نہ پہونچا سکتی تھی۔ ۳۷ء (ق م) میں انٹونی نے قلوپطرا کو دوبارہ ملاقات کے لئے بلوایا۔ مگر وہ اس کی خواہش کو رد نہ کرسکتی تھی۔ اور وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ اس کا لڑکا (سیزرین) ان دونو کے تخت و تاج کا وارث ہو اور انٹونی علانیہ اکٹیوین سے علیٰحدہ ہوجائے۔ مگر تاریخ کی کتب سے یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکا کہ اس ملاقات کا کیا نتیجہ ہوا۔ البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونو کا نکاح انہی ایام میں ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت کے بعض ایسے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں جن میں ان دونوں کے بت اکٹھے ثبت ہیں۔ باوجودیکہ قلوپطرا کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر وہ بالکل نہیں گھبراتی تھی۔ اور انٹونی کے ساتھ ہر ایک مہم پر جاتی تھی اور اُسے ہر وقت اپنی ذہانت سے مستفید کرتی تھی۔ قلوپطرا کے ایما سے انٹونی نے اکٹیوین کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا، انٹونی کو ابتدا میں ہی چند ایک شکستیں ہوئیں جس سے اس کے جرنیل گھبرا گئے، اور وہ انٹونی کو مجبور کرنے لگے کہ قلوپطرا کو فوراً مصر بھیجدیا جائے اور اکٹیوین سے صلح کی جائے۔ مگر قلوپطرا نے واپس جانے سے انکار کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے جرنیل اکٹیوین سے جاملے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخری دفعہ فریقین کے درمیان ایک بحری لڑائی ہوئی۔ انٹونی کے پاس تین سو جنگی جہاز تھے جن میں سے ساٹھ قلوپطرا نے مصر سے منگوائے تھے۔ قلوپطرا دُور سے اس لڑائی کو دیکھ رہی تھی جب اُس نے دیکھا کہ انٹونی کے جہاز غرق ہو رہے ہیں اور عنقریب اُسے شکست ہوجائیگی تو اُس نے اپنے جہازوں کو اکٹھا کرکے واپسی کا حکم دیدیا۔ اُسے انٹونی سے دلی محبت نہ رہی تھی وہ محض اس واسطے اس کی عزت کرتی تھی کہ وہ ایک بڑا بارسوخ اور طاقتور جرنیل تھا۔ جب انٹونی کو شکست ہوئی تو وہ بھی اُس کے پیچھے بھاگ آیا۔ اکٹیوین بھی ان کے تعاقب میں اسکندریہ جا پہنچا۔

قلوپطرا نے ساحل کے کنارے ایک خوبصورت مندر بنوایا تھا، وہ عموماً کہا کرتی تھی کہ اگر اس کے آخری دن قریب آگئے تو وہ اپنی جان اسی مندر میں دیگی۔ اسکندریہ کے میدان میں جانبین

کے درمیان ایک سخت لڑائی ہوئی جس میں آنٹونی اور قلوپطرا کی متحدہ فوج کو پھر شکست ہوئی۔
جب انٹونی شکست کھا کر اسکندریہ میں آیا تو اس نے قلوپطرا کی نسبت دریافت کیا اس کے ایک نوکر نے کہا کہ قلوپطرا نے شکست کی خبر سنکر مندر میں خودکشی کرلی ہے، جونہی اس نے یہ وحشتناک خبر سُنی اُس نے فوراً تلوار اپنے پیٹ میں بھونک لی، اور اپنے بستر پر جا گرا مگر وہ اسی وقت جاں بحق نہ ہوا۔ جب قلوپطرا کو یہ خبر سنائی گئی تو اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ انٹونی کو اس کے پاس لے آئیں وہ انٹونی کی حالتِ زار کو برداشت نہ کرسکی، اُسے اب اسکی محبت کا احساس ہوا جس سے اس کے دل کو سخت ٹھیس لگی، اور وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ انٹونی نے آخری وقت میں قلوپطرا کو نصیحت کی کہ وہ اکٹیوین سے صلح کرلے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کی گود میں جان دیدی۔ قلوپطرا نے صلح کرنے کی بڑی کوشش کی کیونکہ اسے اب یقین ہوچکا تھا کہ اس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ وہ اب صرف اپنی آزادی کی خواہاں تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اکٹیوین کے بعد اس کا لڑکا سیزرین روم کے تخت پر بیٹھے۔ اکٹیوین نے بظاہر اس شرط کو منظور کرلیا، اور اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ اگر وہ روم چلی جائے تو وہاں بڑے آرام سے رہیگی۔ مگر چند دنوں کے بعد اُسے یقین ہوگیا کہ اکٹیوین اُسے قیدی کی حیثیت میں لیجانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جہاں وہ اسے شہر کے بازاروں میں لیجاکر اس کی علانیہ بے عزتی کرے گا۔ چنانچہ اس نے اس بے عزتی سے بچنے کے لئے خودکشی کا پورا ارادہ کرلیا۔

اس نے اکٹیوین سے انٹونی کے مقبرہ پر جانے کی اجازت حاصل کی، واپسی پر وہ اپنے مندر میں چلی آئی اور اپنے مرنے کی تیاری کرنے لگی۔ غسل کرنے کے بعد اُس نے اپنے جسم پر حسب معمول خوشبو لگائی اور ایک قیمتی لباس پہنا، پھر پرتکلف کھانا کھایا اور اس کے بعد اکٹیوین کو ایک خط لکھا کہ وہ اسے انٹونی کے مقبرے میں دفن کرے۔ جب ان تمام کاموں سے فارغ ہوچکی، تو ماسوائے دو خدمتگاروں کے باقی تمام کو رخصت کردیا، کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے آرام کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اُس کے مرنے کی خبر پھیل گئی۔ یہ بات صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکی کہ اُسکی موت کس طرح واقع ہوئی۔ البتہ یہ مسلمہ امر ہے کہ اُسے ہر قسم کے زہر بنانے میں کمال حاصل تھا اور اُس نے بعض ایسے زہر بھی بنائے تھے جن سے فوری موت بلا تکلیف واقع ہوجاتی تھی۔ مگر یہ عام طور پر روایت کی جاتی ہے کہ اس کی موت ایک زہریلے سانپ کے کاٹنے سے واقع ہوئی۔

جب اکٹیوین کے سرداروں کو معلوم ہوا کہ وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہے تو وہ اس کے کمرے میں گھس آئے، مگر وہ اُن کے پہنچنے سے پہلے مر چکی تھی۔ وہ اپنے بستر پر بڑی شان شوکت سے لیٹی ہوئی تھی گویا وہ بڑے آرام سے سو رہی ہے۔ شاہی جواہرات اس کے زیب تن تھے۔ اور فرعون کا تاج اُس کے سر پر تھا۔ ایک خادمہ فرش پر بیہوش تھی اور دوسری اپنی ملکہ کا تاج اس کے سر پر ٹھیک کر رہی تھی۔ چنانچہ وہ بھی لوگوں کے آتے آتے قلوپطرا کے قدموں پر گری اور وہیں مر گئی۔

تسنیم (آگرہ)

تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ ۷۲ صفحات، سالانہ قیمت عہ، ششماہی ۳؎،

یہ ماہوار ادبی رسالہ جناب فانی بدایونی، حضرت مانی جائسی اور سید مخمور اکبرآبادی کی مشترکہ ادارت میں جنوری ۱۹۳۱ء سے جاری ہوا ہے۔ فانی صاحب مشہور سخنور ہیں، مانی صاحب بھی اسی حیثیت سے عموماً مشہور ہیں۔ مخمور صاحب جدید طرز کی جذباتی نظمیں اور لطیف نثر لکھنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے جو رسالہ ایسے قابل حضرات کی ادارت میں شائع ہو اُس کی دلآویزی و دلکشی میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی، چنانچہ پہلا نمبر ہی اس کے شاندار مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔

مضامین میں تنوع کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور سنجیدہ و متین مضامین کے ساتھ بقدر ضرورت ادب لطیف کی چاشنی ہر آئینہ دلچسپ ہے۔ مضامین میں "توارد خیالات" اور "نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ" نامکمل (باقی) ہونے کے باوجود خصوصیت سے بہت مفید و پُر از معلومات ہیں۔ دوسرے مضامین بھی اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔ حصۂ نظم بھی جذبات لطیف کا آئینہ دار و قابل قدر ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی یہ نمبر ہر طرح مطالعہ کے لائق ہے۔

صوبۂ متحدہ میں اُردو رسائل کی بہت کمی ہے، اس لئے تسنیم کا اجرا موجب مسرت ہے، امید ہے کہ اہل ذوق اس ادبی صحیفہ کی کماحقہ قدر کریں گے۔

بُوڑھی ماما

(از مسٹر جے کرشن)

(۱)

مسٹر یوسف مغربی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے۔ انگریزی پوششش تو اُنھوں نے کالج میں قدم رکھتے ہی اختیار کرلی تھی۔ جو کچھ خامی رہ گئی تھی وہ بھی ایل۔ ایل بی ہونے پر پوری ہوگئی۔ اکثر وہ شام کا کھانا احباب کے ساتھ ہوٹلوں ہی میں کھاتے۔ کرسچین کلب میں مسوں کے ساتھ ٹینس سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ گھر کے خوشحال تھے، بے فکری سے داد عیش دیتے تھے۔ مگر اُن کے والد پُرانی وضع کے دیہاتی زمیندار تھے اور مغربی تہذیب کے دشمن۔ اُنھوں نے یوسف کی شادی دوسرے گاؤں کے ایک رئیس کی لڑکی کے ساتھ کردی۔ جمیلہ حسین تھی اور زیورات سے بھی رغبت تھی۔ جدھر سے نکل جاتی چھم چھم کی آواز سے مکان گونج اُٹھتا تھا، وہ گھونگھٹ بھی لمبا رکھتی اور گفتگو کرنے میں بھی شرماتی تھی۔ والدین کی اس پسند پر اگر مسٹر یوسف منہ بناتے تو کیا بیجا تھا۔ ایک دن اُنھوں نے جمیلہ سے بہت سے زیورات اُتار ڈالنے کو کہا۔ پہلے تو اُس نے منہ بنایا اور آنکھوں میں آنسو بھی بھر لائی لیکن آخر میں بجز چند کے (جنکو شاید مسٹر یوسف پسند کرتے تھے) سب زیورات اُتار ڈالے۔ مسٹر یوسف اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے اور اُسی روز اونچی ایڑی کا ایک جوڑہ لیڈی شو اُنھوں نے جمیلہ کو لادیا۔ ادھر ساس نے جب بہو کے ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے تو اُس کے بدن میں آگ لگ گئی، وہ بہت ناخوش ہوئی۔ مگر مسٹر یوسف ان باتوں سے ذرا بھی مایوس نہیں ہوئے، اور جمیلہ کو اپنے قدم بقدم چلنے کا سبق سکھاتے رہے۔ وہ کہتے "دیکھو خدا نے انسان کو آنکھیں دیکھنے ہی کو دی ہیں، یہ بڑی ناشکری کی بات ہے کہ اُنھیں گھونگھٹ میں چھپایا جائے۔ پھر تم اتنا لمبا گھونگھٹ کیوں نکالتی ہو، بھلا تم نے کسی لیڈی کو اس طرح سر ڈھلکے ہوئے دیکھا ہے؟ زیورات جسم کے لئے ایک بار گراں ہوتے ہیں ان کی وجہ سے عورت تیزی سے نہیں چل سکتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ آخر جمیلہ کی سمجھ میں بھی یہ باتیں کچھ کچھ آنے لگیں۔

(۲)

ایک دن یوسف کے والدین گاؤں میں کسی رشتہ دار کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ مکان میں یوسف اور جمیلہ کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا۔ یوسف کے لئے جمیلہ کو مغربی تہذیب سکھانے کا یہ ایک نادر موقعہ تھا۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس پر مغربی رنگ چڑھنے لگا ہے اور یہ دیکھ کر اُن کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ جمیلہ کو زیورات سے نفرت ہو چلی تھی، گھونگھٹ بھی تقریباً معدوم ہو چکا تھا، حالانکہ ساس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بہو کو بُرا بھلا کہا بیٹے پر خفگی ظاہر کی، لیکن مسٹر یوسف بد تمیز اور گستاخ نہ تھے۔ ماں کی باتوں کو خاموشی سے سُن لیتے اور اپنے راستے چلے جاتے۔ مگر جب جمیلہ نے بھی ساس کی جانب سے کچھ پہلو تہی اختیار کی تو وہ خاموش ہو گئی۔

یہ سب کچھ تھا مگر پھر بھی جمیلہ میں ایک خامی باقی رہ گئی تھی، مسٹر یوسف اُسے اپنے ساتھ کھلانا چاہتے تھے لیکن وہ مارے شرم کے ہمیشہ انکار کرتی رہتی۔ اُس روز مسٹر یوسف نے انگریزی تہذیب کے مطابق میز کرسیاں لگائیں اور میز پر باقاعدہ کھانا چن دیا۔ سب سامان درست ہو گیا تو آپ نے جمیلہ سے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ جمیلہ شرم سے زمین میں گڑی جاتی تھی، آخر شوہر کی اطاعت و خوشی کے خیال سے وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ مسٹر یوسف بار بار اُسے کھانے کا سلیقہ سکھاتے، لیکن بیچاری جمیلہ اُس پر عمل نہ کر سکتی اور شرم سے سر نیچا کر لیتی تھی۔

(۳)

ابھی کھانا ختم نہ ہوا تھا کہ ایک نیا گل کھلا، انتظام کی مصروفیت کی وجہ سے صدر دروازہ بند کرنا یاد نہ رہا تھا۔ اتفاق سے بوڑھی ماما کسی ضرورت سے اندر چلی آئی مگر اندر قدم رکھتے ہی اس نے میاں بیوی کو ساتھ کھاتے دیکھا، تو دانتوں کے تلے اُنگلی دبائی اور چند منٹ تک تو وہ یہ تمام رنگ رلیاں دیکھتی رہی پھر اُلٹے قدم لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ مسٹر یوسف کی نظر اُس پر پڑ گئی، وہ حیران و پشیمان ہو گئے۔ جمیلہ کا بھی شرم کے مارے بُرا حال ہو گیا، مگر مسٹر یوسف نے فوراً اپنی غلطی کی تلافی اس طرح کی کہ ماما کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ماما تم یہ بات ابا جان سے نہ کہنا ورنہ وہ ناخوش ہونگے۔ تمہیں میری قسم ہے جو کسی سے کہو۔ ماما منہ پھلائے ہوئے لاپروائی سے بولی، "چھوٹے میاں میں کیوں کہنے لگی؟" تاہم مسٹر یوسف مطمئن نہ ہوئے، اور اُنھوں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا چپکے سے ماما کے ہاتھ میں دینے لگے۔ ماما روپیہ دیکھ کر تعجب سے پیچھے ہٹ گئی اور بولی "میاں یہ کیا کرتے ہو، میں موئی کہاں سے میاں بی بی کے بیچ میں آ پہونچی"۔ مگر مسٹر یوسف

نہ مانے اور اُن کے اصرار سے ماما کو روپیہ لینا ہی پڑا، ماما دل میں تو بہت خوش ہوئی کہ مفت میں ایک روپیہ ہاتھ آیا لیکن بظاہر بھویں سکیڑ کر بولی "ارے میاں تم تو بڑے زبردست ہو" یہ کہکر وہ دروازہ کی طرف بڑھی۔ جمیلہ نے خوشامدانہ طور پر کہا کہ "دیکھو یہ بات کسی سے نہ کہنا" ماما لاپروائی سے بولی "بھلا میں تم دونوں کے بیچ میں کیوں پڑنے لگی، وہ تمہارے میاں تم اُن کی بیوی" کہہ کر وہ چلی گئی۔

(۴)

ماما کی عمر قریب ساٹھ سال کے تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ایک بات کو گھنٹوں بڑبڑایا کرتی، یہ عادت قریب قریب سبھی بوڑھوں میں ہوتی ہے، چاہے کوئی ان کے پاس ہو یا نہ ہو اُن کو بڑبڑانے سے مطلب، دوسرے وہ کسی راز کو بھی دل میں نہیں رکھ سکتے ہیں، حالانکہ دل سے وہ کسی کی بات کسی دوسرے پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ بہرحال ماما جیسے ہی باہر نکلی بڑبڑانے لگی "اُونھ مجھے کیا غرض، تم اُن کے میاں وہ تمہاری بیوی، پھر بھلا میں تمہارے بیچ میں کیوں پڑنے لگی"۔ وہ یہی بڑبڑاتی چلی جاتی تھی کہ محلے کی ایک عورت اُدھر سے نکلی، اور بڈھی کا بڑبڑانا سنکر بولی "کیا ہے بوا، کیا کہہ رہی ہو؟"

ماما نے کہا "کچھ نہیں"

عورت۔ ابھی کچھ کہہ رہی تھیں، مجھے کیا.........

ماما۔ کچھ نہیں، کہہ رہی تھی کہ مجھے کیا پڑی ہے، پھر بھلا میں کیوں کہنے لگی۔

عورت۔ کیا بات ہے بوا؟

ماما۔ آج میاں بی بی ایک ساتھ اونچی چوکی پر کھا رہے تھے، جب مَیں نے دیکھ لیا تو مجھ سے کہنے لگے کہ کسی سے نہ کہنا، وہی کہتی ہوں کہ مجھے کیا غرض ہے کہ کسی سے کہنے جاؤں۔ یہ سنکر عورت ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اپنے گھر پہونچکر ماما نے رسّی اور گھڑا اُٹھایا، اور کنوئیں کی طرف چلدی۔ راستے میں اُس نے وہی کلمات دُہرائے "اُونھ مجھے کیا غرض ہے تم ان کے میاں وہ تمہاری بیوی پھر بھلا میں کیوں بیچ میں پڑنے لگی"۔ لیکن کوئی کچھ پوچھنے والا نہ ملا۔

کنوئیں پر کئی عورتیں پانی بھر رہی تھیں، بوڑھی ماما نے گھڑے کو جگت پر رکھدیا اور رسّی کھولتی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوکر بولی "بتاؤ بیٹا، بھلا مجھے کسی سے کہکر کیا لینا ہے، میں کہنے والی کون؟" عورت تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگی، اور پھر بولی "کونسی بات بوا؟"

ماما۔ کوئی بات ہو، میں کیوں کہنے لگی۔

عورت بڈھی کی خصلت سے واقف تھی، چڑھ کر بولی "نہ بتلاؤ نہ سہی، پھر کیوں کہنے آئی ہو؟"

اس پر سب عورتیں ہنسنے لگیں، عورتیں جب خاموش ہوگئیں تو ماما پھر بولی:۔

"آج یوسف میاں اور جمیلہ بی بی ساتھ کھا رہے تھے جب میں نے دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ کسی سے نہ کہنا، بھلا بیٹا مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی سے کہنے جاؤں۔ تمہیں سے پوچھتی ہوں کہ مجھے کیا غرض ہے؟"

یہ سن کر سب کی سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں، کئی نئی بہوئیں بھی وہاں پر تھیں، ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ بڑھیا بگڑ کر وہاں سے چلدی۔

شام کو مسٹر یوسف کے والدین مکان واپس آئے۔ تھوڑی دیر بعد ماما بھی کھانا پکانے ان کے یہاں آئی۔ جب کھانا تیار ہوگیا اور ماما اپنے مکان کو واپس جانے لگی تو اُس نے مسٹر یوسف کی والدہ سے پوچھا "بہو کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "ابھی تو یہیں تھیں، اندر کمرے میں ہونگی، کیوں کیا بات ہے؟"

ماما۔ کچھ نہیں اُن سے ایک بات کہنی ہے۔

دونوں میں باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جمیلہ وہاں آ پہونچی، اس کو دیکھکر ماما بولی "بہو تمہیں میرے اوپر بھروسہ ہی نہیں ہے، تعجب ہے کہ تم دونوں کی باتیں میں کسی سے کیوں کہنے لگی، اور تمہاری بات کہنے سے مجھے کیا مل جائیگا"

یہ سنکر جمیلہ بہت گھبرائی، اور بت بنی خاموش سر نیچا کئے کھڑی کی کھڑی رہگئی۔ یوسف کی والدہ کو یہ باتیں سنکر بڑا تعجب ہوا، پھر ماما سے بولیں "کیا کہہ رہی ہو ماما، کونسی بات ہے میں بھی تو سنوں؟"

"کیا کہوں۔ بہو کو میری بات کا یقین ہی نہیں ہوتا تو میں کیا کروں"

"اُسے کچھ کہو گی بھی"

"کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج چھوٹے میاں اور بہو اونچی چوکی پر ساتھ کھا رہے تھے (میز کی طرف اشارہ کرکے) میں نے دیکھ لیا تو مجھ سے کہنے لگے کہ کسی سے یہ بات نہ کہنا، وہی کہتی ہوں کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی سے کہنے جاؤں۔"

مسٹر یوسف کی والدہ یہ سنکر ہنس پڑیں اور کہا "اسے یہ کونسی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپائی جائے، میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی کی بات ہے کہ میاں بیوی دونوں خوش و خرم رہیں۔"

ماما کھسیانی سی ہوگئی۔ ساس کو ہنستے دیکھکر جمیلہ بھی مسکراتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

تنقید کتب

اکبر الہ آبادی

مرتبہ جناب طالب الہ آبادی ، رائل سائز ، ۴۰۲ صفحات - مجلد ، قیمت بلحاظ کاغذ معہ اور عہ ، مطبوعہ انوار احمدی پریس الہ آباد -

جناب اکبر الہ آبادی کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ، اُن کی ضخیم کلیات کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے ، اور بعض جلدوں کے کئی اڈیشن طبع ہو چکے ہیں - اکبر صاحب کی شہرت و قبولیت کا راز زیادہ تر اُن کے ظریفانہ کلام میں پنہاں ہے ، اور اس رنگ میں اُنھوں نے وہ کمال پیدا کیا تھا جس کی نظیر اُردو ادبیات میں نہیں ملتی -

کلیات اکبر کی ترتیب میں کسی خاص مقصد کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور سنجیدہ و ظریفانہ کلام پہلو بہ پہلو مرتب گیا گیا بعض صاحبانِ نظر کو یہ ترتیب پسند نہیں - جناب طالب نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ، اور کلام اکبر کو تین حصوں میں منقسم کر کے صبح ، دوپہر اور شام کے نام سے موسوم کیا ہے ، پھر مختلف عنوانات کے ماتحت اُس عنوان کے متعلق اشعار انتخاب کر کے پیش کئے ہیں ، اور اکثر و بیشتر اشعار کی تشریح نیز حضرت اکبر کے بعض نظریات کی توضیح بھی کی ہے - خطوط اکبر کے مجموعوں سے اکثر خطوط اقتباس کر کے پیش کئے ہیں - حضرت اکبر کے ذاتی حالات بھی ذرا تفصیل سے لکھے ہیں - غرض اس مجموعہ کو بہتر و کامیاب بنانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے ، اور حضرت مؤلف کو اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے ، مگر ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں بعض لغزشیں بھی موجود ہیں جن میں خصوصیت سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ جوش عقیدت میں جناب مؤلف اکثر جگہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں اور حضرت اکبر کو ایک دیوتا کے رتبہ تک پہونچا دیا ہے - علاوہ ازیں اکبر صاحب کی زندگی یا ان کے انتقال کے بعد جن حضرات نے تذکروں یا رسالوں میں اُن کے ذاتی حالات یا خصوصیات کلام کا ذکر کیا ہے اور اُن میں کسی قسم کی کوئی لغزش ہو گئی ہے اُس پر انتہائی سختی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے - سر عبد القادر مسٹر رام بابو سکسینہ ، مولانا شبلی عمادپوری مؤلف شعر الہند وغیرہ کسی کو بھی مؤلف نے نہیں چھوڑا

اور ہر ایک کی معمولی فروگذاشتوں پر نہایت درشت لہجہ میں اپنے نزدیک اظہار حقیقت کیا ہے۔ یہ ایک ایسی خامی ہے جس سے اس کتاب کے مقصد تالیف پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑسکتا ہے۔

بہر حال جو حضرات کلام اکبر کے مختلف پہلوؤں کو علٰحدہ علٰحدہ دیکھنے کے مشتاق ہیں اُن کے واسطے اس کتاب کا مطالعہ ضرور دلچسپ ہوگا۔

یادگار نسیم

مرتبہ مولانا اصغر حسین صاحب اصغر (گونڈوی) رائل سائز، حجم ۱۵۰ صفحات سے زیادہ۔ مجلد۔ ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس لیمیٹڈ۔ الہ آباد

مثنوی "گلزار نسیم" اس قدر مشہور و مقبول عام ہے کہ اس کے تعارف کی مطلق ضرورت نہیں، اس کے قدیم و جدید متعدد ایڈیشن مختلف مطابع سے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض جدید ایڈیشن نئے طرز پر مع مقدمہ وغیرہ بھی طبع ہو چکے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مثنوی کی بدولت پنڈت دیاشنکر کول نسیم لکھنوی کا نام حیات جاوید حاصل کر چکا ہے۔ اب اس مثنوی کو اصغر صاحب نے مرتب کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی نسیم صاحب کی غزلوں کا مختصر انتخاب بھی اضافہ کر دیا ہے۔

شروع میں ایک قابل قدر مقدمہ ہے جس میں "اجتماعی و انفرادی ذہنیت" پر مفصل بحث کر کے گلزار نسیم پر دلچسپ تبصرہ کیا گیا ہے۔ چونکہ یادگار نسیم کی ترتیب کا مقصد طلبا کو فائدہ پہنچانا ہے لہذا حسب ضرورت مشکل الفاظ و اشعار کے معانی حاشیہ پر لکھ دیئے گئے ہیں اور بعض اشعار میں جہاں لفظی و معنوی صنائع آگئے ہیں اُن کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مثنوی سے ایسے اشعار جو موجودہ زمانہ کی تہذیب کے خلاف سمجھے گئے حذف کر دئے گئے ہیں، اور اس طرح اس کے مطالعہ سے طلبا کے اخلاق و عادات پر کوئی خراب اثر پڑنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

آخر میں اس مجموعہ کے متعلق بعض اہل الرائے اصحاب کی آرا بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

الغرض یادگار نسیم ہر حیثیت سے قابل قدر و لائق مطالعہ ہے اور امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

ترانۂ مغرب

مولفۂ جناب مولوی سید راحت حسین صاحب بی۔ ایل فلسفی (صدر دار التالیف چھپرہ۔ بہار) کراؤن سائز ۸۰ صفحات، قیمت ۶ ؍

یہ تیرہ نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس میں بقول مؤلف تین نظموں کے علاوہ باقی نظمیں

انگریزی نظموں سے ماخوذ ہیں - اور اس کی غایت تالیف یا نظم کرنے کی ضرورت یہ ہے :-

"پرانی اُردو شاعری جو صدیوں سے ایک ہی طرح کے فرسودہ خیالات اور جھوٹے جذبات کو دُہراتی چلی آرہی ہے اب اس کام کی نہیں رہی کہ اس سے کوئی اثر پیدا ہو یا بچوں کو تعلیم دی جائے ۔ اسکول اور مدارس میں ہمارے بچوں کی تعلیم کے لئے نظم کی کوئی ایسی کتاب یا ذخیرہ جو ایک سبق آموز یا اثر نصاب کا کام دے سکے موجود نہیں ہے ۔ اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے یہ کتاب جس میں چھوٹی چھوٹی دل آویز نظموں کا مجموعہ ہے ہمارے دارالتالیف نے تیار کی ہے ۔"

کتاب کا مقصد تالیف بہت اہم ہے لیکن افسوس کہ اس میں جو نظمیں جمع کی گئی ہیں وہ کتاب کے مقصد کو پورا نہیں کرتیں ، جا بجا زبان و بیان کی خامیوں اور جذب و اثر کے فقدان نے نظموں کو بے لطف کر دیا ہے ۔ مثلاً "ترانۂ حمد" کے چوتھے بند میں :-

دل کو تو نے میرے لبھایا   ناتا تجھ سے میں نے لگایا

"ناتا" لگایا نہیں جاتا بلکہ "ناتا" کے ساتھ ہمیشہ "جوڑنا" استعمال کیا جاتا ہے ۔ یا صفحہ ۱۲ پر :-

خوش ہوا مکڑ ، چھلانگیں مارتا گھر کو چلا   اپنے کنج تار میں سفاک قاتل جا چھپا

اس میں "کنج تار" سے مراد مکڑی کا جالا ہے جو اصل مفہوم کو پورے طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے ، پھر مکڑ کو "قاتل" کہنا بھی غور طلب ہے ۔ قتل کرنے کے لئے ایسے آلہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں دھار ہو اور مکڑ کے پاس نہ تلوار ہوتی ہے نہ خنجر ۔ ممکن ہے فلسفی صاحب یہ کہیں کہ یہ تو وہی "پرانی شاعری" ہے لیکن جدید شاعری میں اصل و حقیقت سے دور ہو جانا بھی مستحسن نہیں کہا جا سکتا ۔

اگرچہ ناظم نے اُن انگریزی نظموں کا حوالہ نہیں دیا جن سے یہ اُردو نظمیں ماخوذ ہیں مگر نظموں کے سرسری مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ان ... وں کا ترجمہ ہیں جو انگریزی کی ابتدائی کتابوں میں موجود ہیں ، مثلاً "طفل نابینا" کالی سائبر کی نظم "دی بلائنڈ بوائے" کا ترجمہ ہے ، یا "مچھر کی کہانی" وہ حکایت ہے جو مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی کتابوں میں "شہد کی مکھی اور مچھر" کے متعلق درج ہے اور غالباً کسی انگریزی نظم ہی سے ماخوذ ہے ۔

بایں ہمہ یہ نظمیں اپنی سادگی کے لحاظ سے بچوں کے پڑھنے کے قابل ہیں ، کیونکہ مؤلف نے اکثر نظموں کے آخر میں بطور نتیجہ جو اشعار اضافہ کئے ہیں وہ بچوں کے لئے ضرور کارآمد ہوں گے ۔

نظام الادب

مرتبہ پروفیسر محمد محی الدین خاں ایم۔اے۔ کراؤن سائز۔ ۱۱۰ صفحات
قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ لکشمی نراین اگروال۔ بک سیلر۔ آگرہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مختصر کتاب میں ادب کے نظام کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں زبان کی حقیقت، قانون زبان، لغت و اصطلاح، زبان کی ترقی، نظم و نثر، اردو کی خوبی، اقسام سخن، شعر کی تاثیر وغیرہ تمام لوازم ادب پر اظہار خیال کیا ہے۔ ضمناً تصوف و اخلاق اور شاعری سے ان کا تعلق وغیرہ مباحث بھی آگئے ہیں۔ اس کے بعد حصۂ نظم میں حمد و نعت، مناظر قدرت، تغزل، مرثیہ وغیرہ اقسام کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ مگر اس میں جس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے اُس نے اس کی افادی حیثیت کو بہت کم کر دیا گیا ہے۔ اکثر مسائل کے متعلق صرف اشارے کر دیے گئے ہیں جو طالبانِ فن کے واسطے زیادہ مفید نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب کے مرتب کرنے کی غرض و غایت بھی پردۂ خفا میں ہے۔ کاش ایک مختصر دیباچہ میں اس کو واضح کر دیا جاتا۔ غالباً یہ کتاب طالب علموں کے مطالعہ کے لئے مرتب کی گئی ہے، مگر اندیشہ ہے کہ شاید طلبا اس کے مطالعہ سے کماحقہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ البتہ اگر معلم مطالب کتاب کو طلبا کے ذہن نشین کرنے کی زحمت گوارا کرے تو اس سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکے گا۔

پطرس کے مضامین

از اے۔ ایس۔ بخاری، ایم۔اے۔ کراؤن سائز ۱۵۵ صفحات
مجلد قیمت ۶ر، ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور

جناب پطرس کا شمار ملک کے اُن چند اہل قلم میں ہے جو ظرافت آمیز مضامین لکھنے کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، یہ پطرس صاحب کے دس مختصر مضامین کا خوبصورت مجموعہ ہے اور غالباً سب کے سب مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

سنجیدہ مضامین کے مقابلہ میں ظریفانہ مضامین لکھنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اس قسم کے مضامین کو عامیانہ و سوقیانہ خیالات نیز الفاظ سے محفوظ رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ جناب پطرس کے مضامین میں ظرافت سے زیادہ سنجیدگی و متانت پائی جاتی ہے اور ظرافت کا رنگ اس قدر ہلکا ہوتا ہے کہ عام نگاہیں اُس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس مجموعہ کے ہر مضمون میں یہ خصوصیت نمایاں ہے، اور ہمارا خیال ہے کہ ان مضامین کے مطالعہ سے صرف خواص محظوظ ہو سکتے ہیں، عوام کے لئے دلچسپی

کا کوئی زیادہ سامان اِن میں نظر نہیں آتا۔ اور غالباً یہ عوام کے لئے لکھے بھی نہیں گئے ہیں۔ امید ہے کہ اہل علم و وسیع النظر اصحاب اس مجموعہ کی قدر کریں گے۔

نیرنگِ زمانہ

مولفۂ مولوی شیخ علی حسن منصرم ریاست محمود آباد، ڈمائی سائز ۲۲۰ صفحات

ملنے کا پتہ: جناب مؤلف، قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی۔

مہابت خاں عہد جہانگیری کا مشہور و سربرآوردہ سپہ سالار تھا اور تاریخ مغلیہ میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں لائق مؤلف نے مختلف کتب تاریخ سے مہابت خاں کے حالات اخذ کر کے حسن ترتیب کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں۔ مہابت خاں کی بغاوت اور جہانگیر کو قید کرنے کے واقعات پر خصوصیت سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اُس زمانہ کی عام ملکی حالت، واقعات سلطنت اور اکثر دوسرے سربرآوردہ عمائدینِ دربار کے حالات بھی لکھدیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب صرف مہابت خاں کے سوانح حیات پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت سے عہد جہانگیری کی مختصر تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ جو حضرات تاریخ ہند خصوصاً عہد مغلیہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے اسکا مطالعہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

حفیظ کی خامیاں

از سید برکت علی صاحب گوشہ نشین، کراؤن سائز ۱۶۰ صفحات

قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: جناب مصنف، وزیرآباد (پنجاب)

ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری پنجاب کے ایک مشہور شاعر ہیں، ان کا کلام عموماً سادہ و دلکش ہوتا ہے، اور عام طور پر مقبول ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کلام حفیظ میں زبان و بیان، نیز فن شعر کی غلطیاں بھی ہوتی ہیں، اور بعض رسائل میں نکتہ چینی بھی ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں جناب گوشہ نشین نے حفیظ صاحب کی منظوم کتاب نغمہ زار و شاہنامۂ اسلام پر نہایت سختی کے ساتھ احتساب کیا ہے اور ان دونوں کتابوں کی دو سو پینتالیس ۲۴۵ خامیاں نمایاں کی ہیں اس کے ساتھ ہی ان خامیوں کی اصلاح کی کوشش بھی فرمائی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "شاہنامۂ اسلام" میں بکثرت غلطیاں ہیں لیکن چونکہ یہ ایک واقعاتی نظم ہے اور ایسی نظموں میں ادبی و شعری لطافت پیدا کرنا صرف باکمال سخنور کا حصہ ہوتا ہے لہذا ہمارے خیال میں اس پر اس قدر سختی سے احتساب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں معترض

نے جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ بھی پسندیدہ نہیں، اور حفیظ صاحب کے لئے برہمیٔ مزاج کا باعث ہوسکتا ہے جس سے اس کتاب کی غایت تصنیف بے سود ہو جاتی ہے۔

نور اللغات (جلد چہارم)

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی۔ اے ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ لکھنؤ بڑی تقطیع، ایک ہزار سے زائد صفحات۔ قیمت للعہ

اُردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے، اور الفاظ کے ذخیرہ کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغات سے افضل ہے اسکی ترتیب و تدوین میں تقریباً بارہ سال صرف ہوئے ہیں۔ تین جلدیں وقتاً فوقتاً پہلے شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہو چکی ہیں۔ چوتھی اور آخری جلد حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کاف سے یائے تک کے الفاظ ہیں۔

یہ لغت اس قدر مقبول و مشہور ہو چکی ہے کہ اس کے تعارف کی مطلق ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ مولوی نور الحسن صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بیحد محنت و جانفشانی کے بعد اس کو مکمل کر دیا، اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم و زبان دان حضرات اس کی قدر کما حقہ کریں گے اور مؤلف کی محنت کی داد دیں گے۔

لائف آف حسین (انگریزی)

مولفہ مولوی مرزا غلام عباس علی صاحب اسسٹنٹ گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس۔ کراؤن سائز۔ ۳۶۰ صفحات، مجلد

اس کتاب کی تالیف کی غایت بقول مؤلف یہ ہے کہ انگریزی زبان میں ہر قسم کے علوم و فنون و تاریخ و سیر پر بکثرت کتابیں موجود ہیں، مگر واقعۂ کربلا کے متعلق کوئی مستند کتاب موجود نہیں اور جو کتابیں انگریزی میں لکھی گئی ہیں اُن کی حیثیت افسانے یا ڈرامے سے زیادہ نہیں ہے

ابتدائی ابواب میں قبل از اسلام عرب کی حالت، پیغمبر اسلام کی بعثت کے حالات لکھنے کے بعد خلافت کے مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے، اور شیعی نقطۂ نظر سے اس کو بیان کیا ہے۔ بعد از اں واقعات کا سلسلہ قائم رکھتے ہوئے کربلا کا واقعہ لکھا ہے۔ واقعۂ کربلا در اصل اسلامی تاریخ کا نہایت اہم و الم ناک واقعہ ہے۔ یزید کا ظلم و ستم اور حضرت حسین کی راستبازی، صبر و تحمل

جرأت و ایثار اہل دل کے لئے درسِ بصیرت ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی تالیف موجب تحسین کہی جاسکتی ہے مگر مسئلہ خلافت اور دوسرے واقعات جو شیعہ وسنی حضرات میں باعث اختلاف ہیں ان پر صرف شیعہ حضرات کے عقائد و روایات کے مطابق روشنی ڈالی گئی ہے، چونکہ کتاب کا مقصد تالیف انگریزی داں حضرات یا بالفاظ دیگر مغربی دنیا کو سیرت حسین سے واقف کرنا ہے اس لئے اس میں صرف تاریخی واقعات درج کرنے پر اکتفا کرنی چاہئے تھی اور مختلف فیہ مسائل پر مخصوص عقائد و روایات کے ماتحت قلم نہ اُٹھایا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔
بہرحال شیعی عقائد و روایات کے لحاظ سے سیرت حسین کے متعلق یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ زبان سادہ اور انداز تحریر صاف ہے۔

دو رنگی تحفہ

مرتبہ شیخ غلام محی الدین ایم۔اے۔ کراؤن سائز۔ ۸۰ صفحات مجلد قیمت ۱۰؍ ۔ ملنے کا پتہ: مشرقی کتب خانہ، حویلی کابلی مل۔ لاہور

اس کتاب میں انگریزی زبان کی وہ مختصر و سادہ نظمیں مع منظوم اردو ترجمہ درج ہیں جو ابتدائی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر نظموں کا منظوم ترجمہ خود حضرت مؤلف نے کیا ہے اور بعض کا دوسرے شعراء نے۔ ایک صفحہ پر اصل انگریزی نظم ہے اور اسکے مقابل دوسرے صفحہ پر منظوم ترجمہ ہے مشکل الفاظ کے معانی حاشیہ پر لکھدیئے گئے ہیں تاکہ بچے اس سے پورا فائدہ اُٹھاسکیں۔
اردو ترجمہ قریب قریب لفظی ہے اور فن شعر کی خامیوں سے بھی خالی نہیں۔ کہیں کہیں پنجابی محاورے بھی نظر آتے ہیں مثلاً: "مجھ غریب اندھے کو بھی فرمایئے"
"اندھے کو فرمایئے" اُردو کا محاورہ نہیں "اندھے سے فرمایئے" ہونا چاہیئے۔
بہرکیف یہ مجموعہ بچوں کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اور اُمید ہے کہ دلچسپ ثابت ہوگا۔

رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی

مرتبہ مولوی محمد حمید اللہ۔ رائل سائز۔ ۴۴ صفحات۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ: بزم قانون، عثمانیہ کالج، حیدرآباد دکن

اس مختصر رسالہ میں غلامی کے متعلق رومی اور اسلامی اصول کا تقابل کیا گیا ہے اور دونوں اصول کے مطابق غلاموں کا جو درجہ تھا اور اُن کو جو حقوق حاصل تھے انکا مقابلہ کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ رومن لاء کے مقابلہ میں اسلامی قوانین کی روسے غلاموں کو بہت زیادہ مراعات حاصل تھیں، جابجا مستند کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے تاہم دلچسپی سے خالی نہیں۔

بعض رسایل پر ایک نظر

آجکل ملک میں جس قدر رسائل جاری ہیں اور آئے دن جاری ہوتے رہتے ہیں اُن کی کثرت اگرچہ اُردو زبان کی ترویج واشاعت میں بڑی حد تک ممد و معاون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ باستثنار چند محتاط رسائل کے عام طور پر جو لٹریچر شائع کیا جارہا ہے اُس سے اُردو کو بہ حیثیت زبان کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ رسائل کی کثرت کے مقابلہ میں مستند انشاپردازوں کی تعداد کم ہے۔ پھر اعلیٰ درجہ کے مضامین کہاں سے آئیں؟ لازماً جو کچھ ہاتھ آجاتا ہے اُسی کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ اور اس صورت میں عام لٹریچر کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ بریں اوریجنل مضامین لکھنے والے بہت ہی کم ہیں البتہ مترجموں کی کثرت ہے۔ ترجمہ میں اکثر و بیشتر انگریزی سے مختصر افسانے ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ مغرب کا معیار تہذیب مشرق سے بالکل جدا ہے۔ اس لئے اکثر ترجمے اہل مشرق خصوصاً ہندوستانیوں کے واسطے بیکار ہوتے ہیں۔ بعض رسائل میں تو اُردو کے قدیم رسالوں کے شائع شدہ مضامین ہی بار بار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عموماً سب رسالوں کے حصۂ نظم میں غزلوں کے ساتھ جدید طرز کی مسلسل نظمیں بھی شائع ہوتی ہیں، اور اب تصاویر کا رواج بھی عام ہوتا جاتا ہے بلکہ اکثر تصاویر کے متعلق نظمیں لکھوانے کا بھی التزام کیا جاتا ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نظمیں عموماً افراط و تفریط سے خالی نہیں ہوتیں بلکہ بعض اوقات ان کو عنوان سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ لہذا اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اہل علم اس طرف متوجہ ہوں اور مشفقانہ و مخلصانہ طور پر رسائل کی موجودہ حالت پر تنقید کریں تاکہ بے خبر حضرات اپنی لاعلمی سے واقف ہو کر اپنی خامیوں کی اصلاح کر سکیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ تنقید اگر غیر جانبداری و دیانت کے ساتھ کی جائے تو افادہ و استفادہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اگرچہ ہمارے اہل قلم میں ابھی اتنی وسیع النظری پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنی خامیوں کو نمایاں ہوتے دیکھکر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ تاہم اس فرض کو ادا کرنا ضروری ہے

ہم نے کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً موجودہ رسائل پر بے لاگ تنقید شائع کرتے رہیں۔ اِس سلسلہ میں موقر معاصرین کے علاوہ زمانہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائیگا اور تنقید میں حتی المقدور غیر جانبداری و بے لوثی کا خیال رکھا جائے گا۔ اگر بمقتضائے بشریت ہم سے کوئی لغزش ہو تو ہم ہر وقت اس کی تلافی کے لئے آمادہ رہیں گے۔

اس وقت جن چیزوں پر احتساب کی ضرورت خصوصیت سے محسوس ہو رہی ہے وہ مختصر افسانے اور منظومات ہیں۔ آج کی صحبت میں بعض رسائل کے حصۂ نظم پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے اگر فرصت ملی تو آیندہ افسانوں کا جائزہ بھی لیا جائیگا۔

چاند الہ آباد، جنوری ۱۹۳۱ء

پہلے صفحہ پر لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کی ایک غزل ہے۔ زمین مشکل ہے اور ردیف و قافیہ کا مربوط رکھنا دشوار، مگر صفی صاحب کی کہنہ مشقی نے اس زمین میں بعض اشعار خوب کہے ہیں ؎

(۱) قفس دام بھرے خانۂ بیداد بھرے خیر سے اب بھی جو نیت تری صیاد بھرے

(۲) شوخیاں اس نگہ مست کی اللہ اللہ جس طرح چوکڑیاں آہوئے آزاد بھرے

(۳) مدرسہ دہر کا شاگردوں سے خالی ہے صفی ہر جماعت میں ہیں اُستاد ہی اُستاد بھرے

پہلے شعر کو اگر ملک کی موجودہ سیاسی تحریک پر منطبق کیا جائے تو وہ حقیقت کا ایک آئینہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں جو آرزو ظاہر کی گئی ہے وہ داد طلب ہے۔

دوسرے شعر میں تشبیہ کی لطافت خوب ہے۔ تیسرے شعر میں موجودہ زمانہ کے نوجوانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔ علم و ادب، سیاسیات و معاشیات وغیرہ ہر شعبہ میں نوجوانانِ ملک اپنے اپنے خیالات کے مطابق سرگرم کار ہیں، اور ان میں اکثر۔ بیشتر ایسے ہیں جو واقعی اپنے آپ کو اُستاد سمجھتے ہیں حالانکہ عموماً وہ ان علوم کی مبادیات سے بھی پورے طور پر واقف نہیں ہوتے۔ مثلاً آجکل انگریزی تعلیم یافتہ حضرات فن شعر میں کسی کہنہ مشق استاد سے استفادہ کرنا موجب عار سمجھتے ہیں اور اصول فن حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ایسی حالت میں ان کی سخن گوئی کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

صفحہ ۱۲ پر "افسانہ ساوتری" کے عنوان سے بابو شیام موہن لال جگر بی اے۔ بریلوی کی

غیر مطبوعہ مثنوی کا ایک حصہ شائع کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی اس مشہور بحر میں ہے جس میں قدیم مثنویات میں "گلزار نسیم" اور اس کی مطبوعہ مثنوی "تنظیم الحیات" بہت کامیاب ہیں۔ مثنوی کی خصوصیات، بیان کی سادگی و روانی اور مضمون کا ربط ہے۔ جگر صاحب نے بھی ان خصوصیات کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے حمد و مناجات کے بعد "آغاز داستان" کے ذیل میں "ست جگ" اور "راجہ اشپت" کا حال نظم کیا گیا ہے اس مثنوی کا جس قدر حصہ اس نمبر میں شائع ہوا ہے وہ مجموعی حیثیت سے اچھا ہے، مگر مندرجہ ذیل شعر میں پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ اور باقی اشعار کے اول مصارع ناموزوں ہیں جو شاید کاتب کی عنایت کے احسانمند ہونگے ؎

کیا راز ہے قوت کشش میں ستارے ہیں کیوں دوا دوش میں
تھی اس پہ سلطنت کی بنیاد راجہ تھا پدر تو پرجا اولاد
کرتے تھے دعائیں وہ کبریا سے طالب تھے مدد کے اولیا سے

صفحہ ۲۵ پر "خالص اردو" کے عنوان سے جناب آرزو لکھنوی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ آرزو صاحب قدیم طرز سخن کے علم بردار ہیں اور خالص اردو میں بہترین غزلیں لکھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ مگر اس شعر میں ؎

ٹھہرا نہ جی مجھی کو ٹھکانے لگا دیا اے سب کے دین والے دیا بھی تو کیا دیا

"سب کے دین والے" غور طلب ہے، "سب کے دینے والے" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۲۹ پر جناب روشن صدیقی کی ایک مختصر نظم طرز جدید میں ہے۔ جذبات کے لحاظ سے نظم اچھی ہے لیکن "عشق ہو جن سے شکوہ گر" میں "شکوہ گر" محل نظر ہے۔ حالانکہ اس کی جگہ "شکوہ سنج" کہا جا سکتا تھا۔ آخری مصرعہ (یا ٹیپ) میں ؎

حسن فریب حسن ہے
حسن کا اعتبار کیا

"حسن کو فریب حسن" قرار دینا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ شاید کوئی جدید نظریہ ہوگا۔

ان کے علاوہ اور بھی قدیم و جدید طرز کی نظمیں اور غزلیں ہیں مگر بخوف طوالت ان کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دو باتیں اور عرض کرنی ہیں۔

اس نمبر کے شروع میں ایک تصویر ہے جس کو "پنگھٹ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ایک جوان دیہاتی عورت سر پر پانی کا گھڑا یا گگرا لئے ہوئے مستانہ چال سے چلی جا رہی ہے۔ تصویر آرٹ کے لحاظ سے قابل قدر

ہے مگر "چگھٹ" کا کوئی منظر اس میں نہیں دکھایا گیا۔ تصویر کے نیچے حضرت نوح ناروی کا یہ شعر ثبت ہے

ادھر گھونگھٹ بھی رخ پر اُدھر مٹکا بھی سر پر فدا سو خوبیاں پنگھٹ کے اس دل زیب منظر پر

ایک اور رنگین تصویر "اشنان" کے نام سے موسوم ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عورت سر کے بال کھولے، ساری باندھے نہانے کے لئے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے پاس ایک بالٹی اور صابندانی رکھی ہوئی ہے، دیوار پر تولیا لٹکا ہوا ہے، تھوڑے فاصلہ پر فرش پر سلیپر رکھے ہوئے ہیں۔ غرض اُن شہروں میں جہاں میونسپل بورڈ کی عنایت سے آب رسانی کے لئے گھروں میں نل لگے ہوئے ہیں، عموماً عورتیں اور مرد اسی طرح غسل کرتے ہیں، جو اس تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے بھی حضرت نوح ناروی کا ایک شعر درج ہے ؎

مستعد اہل وفا ہیں ڈوب مرنے کے لئے ہے کوئی بےچین اشنان کرنے کے لئے

ط۔ اس شعر کا پہلا مصرع ناموزوں ہے

قطع نظر اس کے کہ دوسرا مصرعہ ناموزوں ہے، اور نہانے والی کے چہرہ سے اشنان کرنے کے لئے کسی قسم کی بےچینی ظاہر نہیں ہوتی، وہ اہل وفا جو ڈوب مرنے کے لئے مستعد ہیں تصویر میں کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کو بھی نظر انداز کر دیجئے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو اشنان کرنے کے لئے آمادہ دیکھ کر اہل وفا کیوں ڈوب مرنے کے لئے مستعد ہونگے، اور اگر بفرض محال ایسا ہو سکتا ہے تو کیا وہ نل میں ڈوبینگے یا بالٹی میں؟ اگر دریا کے کنارے کا کوئی منظر ہوتا تو اہل وفا کے لئے ڈوب مرنا آسان ہوتا مگر موجودہ صورت میں اس شعر کو تصویر سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔

سر دست اسی قدر کافی سمجھا جاتا ہے، آیندہ بشرط فرصت دوسرے نمبروں پر بھی اظہار خیال کیا جائے گا۔

نیرنگِ خیال، جنوری ۱۹۳۱ء

اس نمبر میں نظم کا حصہ زیادہ تر دوسرے رسائل سے منقول ہے، جس کو "شیرازہ" کے عنوان کے ذیل میں جمع کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۲۰ پر جناب اقبال احمد سہیل ایم۔ اے (علیگ) کی ایک ناتمام غزل ہے۔ سہیل صاحب زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، ایک فارسی گو سخنور کے لئے اُردو میں فکر سخن کرنا اور پھر کامیاب اشعار کہنا از حد دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ سہیل صاحب کے اشعار خود اس حقیقت کے گواہ ہیں ؎

آگ لگا کے چل دیئے خرمنِ امتیاز میں کونسی برق تھی نہاں نالۂ نے نواز میں

پہلے مصرعہ میں "آگ لگاکے چلدیئے" سے مراد کون اصحاب ہیں؟ شعر میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ دوسرے مصرعہ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ "نالۂ نے نواز" میں کوئی برق تھی اور غالبًا وہی برق خرمنِ امتیاز میں آگ لگاکر چلی گئی۔ اگر اسکو صحیح تسلیم کیا جائے تو پہلا مصرعہ ناقص ٹھہرتا ہے اور برق کی رعایت سے "آگ لگاکے چلی گئی" ہونا چاہیئے۔ اگر یہ خیال غلط ہو تو دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

دل کہ حریف خاص تھا جسکی کہ بزمِ ناز میں　　　آج وہ تشنہ کام کیوں مصطبۂ مجاز میں

یہ شعر "المعنی فی البطن الشاعر" کا صحیح مصداق ہے۔ غالبًا شاعر یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ ساقی (یا محبوب) جس کی بزمِ ناز میں دل حریفِ خاص تھا آج مصطبۂ مجاز میں کیوں تشنہ کام ہے۔ مگر الفاظ اس مطلب کو واضح نہیں کرسکے اور شعر ایک معمّا بنکر رہ گیا۔ پہلے مصرعہ میں "مصطبہ" سے جو غرابت پیدا ہوگئی ہے وہ غزل کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ "مصطبہ" کی جگہ "میکدہ" آسانی سے کہا جاسکتا تھا مگر غالبًا طبیعت کی جدت پسندی اسکو گوارا نہ کرسکی۔ دوسرے مصرعہ میں کاف بیانیہ کی تکرار اور "جسکی کہ" نے بندش کو بہت سست کردیا ہے۔

ہوش کسے سجود کا اُن کی حریمِ ناز میں　　　وحدتِ مدعا بس ایک رکن ہے یاں نماز میں

پہلا مصرعہ صاف نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے وحدتِ مدعا میری نماز میں ایک ہی رکن ہے لہٰذا اُن کے حریمِ ناز میں سجدہ کا ہوش ہی نہیں کیونکہ صرف ایک ہی رکن (قیام) ادا کرنا کافی ہے، یا یوں کہیئے کہ اے وحدتِ مدعا بس کر، سجدہ کی ہوس نہ کر، کیونکہ "وحدت مدعا" کے لئے صرف ایک رکن کافی ہے۔ بہر صورت "بس ایک" کچھ زیادہ اچھے الفاظ نہیں کہے جاسکتے۔ علاوہ ازیں پہلے مصرعہ میں "یاں" بجائے "یہاں" اور دوسرے مصرعہ میں "حریم" کی تانیث بھی قابل غور ہے۔

آج ادائے خاص تھی نرگسِ نیم باز میں　　　دل کا فسانہ کہدیا کیا مری چشمِ شوق نے

یہ شعر صاف اور اچھا ہے۔

صفحہ ۵۰ پر مرزا یاس یگانہ لکھنوی کی ایک غزل ہے اور اپنے رنگ میں خوب ہے مگر مقطع میں ؎

آج کیا فیصلہ کرے کوئی　　　غالب اور میرزا یگانہ کا

بیچارے غالب پر اس حملہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی مخالفت حضرت یگانہ کی فطرت ثانی بن گئی ہے۔ اور شاید پاس وضعداری بھی یہی ہے کہ ؎

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی　　　چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

صفحہ ۱۵ پر جناب شاطر غزنوی کی ایک جدید طرز کی نظم "شاعر اور تاریکی" کے عنوان سے ہے۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ دن ڈھل گیا شام ہوگئی اور ہر طرف تاریکی چھاگئی، چرند و پرند، انسان وحیوان اپنے اپنے مسکن و مامن میں پہنچ گئے، دنیا پر خاموشی اور تاریکی مسلط ہوچکی مگر شاعر اس تاریکی میں بھی قدرت کے جلوے دیکھتا اور اپنے کاشانہ کو روشن کرتا ہے۔ نظم بلحاظ خیالات و طرز ادا مستحق داد ہے، لیکن اس میں چند لغزشیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً ؎

سوار آئی جہاں میں دوش ظلمت پر سیاہ کاری　　مندھی ہیں خوف سے گو فطرت مجبور کی آنکھیں

سیہ کاری لکھنا چاہیئے تھا۔ مندھی کی جگہ مندی ہونا چاہیئے لیکن آنکھوں کے لئے مندنا بمعنی بند ہونا بہت ہی غیر فصیح ہے۔ یا ؏ وہ اندھیرے میں نقشے کھینچتا ہے عیش و عشرت کے

اندھیرے میں نون کا اعلان غلط ہے

چاند (اردو)

معصر "چاند" الہ آباد اگرچہ صرف جنوری ۱۹۳۰ء سے جاری ہوا ہے مگر اس ایک سال کی قلیل مدت ہی میں اس نے کافی شہرت و قبولیت حاصل کرلی ہے۔ حال میں اس کا ایک خاص نمبر (نومبر اور دسمبر ۱۹۳۰ء یکجائی) "ایڈیٹر نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سو پچیس مضامین منثور و منظوم ہیں جو قدیم اور موجودہ اخبار و رسائل کے ایڈیٹر صاحبان کے لکھے ہوئے ہیں۔ چار سہ رنگی تصاویر اور ایک سو پینتیس ۱۳۵ سادہ تصاویر ہیں۔ یہ تصویریں مضامین نگار حضرات کی ہیں، ان کے علاوہ سولہ ۱۶ کارٹون ہیں۔

تمام مضامین دلچسپ و مفید ہیں، اگرچہ بعض بہت ہی مختصر ہیں تاہم دلچسپی سے وہ بھی خالی نہیں۔ بعض مضامین میں زبان کی خامیاں بھی بکثرت ہیں۔ ایک دو مضمون میں درپردہ دوسروں پر حملے بھی ہیں، کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہیں۔ لیکن ان خامیوں کو نظر انداز کرکے دیکھا جائے تو یہ رسالہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نرالا ہے۔ اس کی اشاعت سے اکثر ایسے اخبار و رسائل کے نام بھی محفوظ ہوگئے جو کبھی جاری ہوئے تھے اور زمانہ کے دست برد کے ہاتھوں روپوش ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تصاویر کا ذخیرہ بھی قابل قدر ہے، تمام حضرات کی تصاویر جمع کرنا آسان کام نہ تھا مگر اب اہل ذوق اس ایک نمبر میں قدیم و جدید اخبار و رسائل کے ایڈیٹر اسسٹنٹ ایڈیٹر اور اراکین ادارت کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ کاش یہ تصویریں آرٹ پیپر پر چھاپی جاتیں تو ان کے نقوش زیادہ نمایاں اور دیرپا ہوتے۔ بہرحال جو کچھ کیا گیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔ ہم کارکنان "چاند" کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس خاص نمبر کی ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحات اور قیمت ۲ ہے

ہندوستانی اکیڈمی کا تماہی رسالہ

صوبہ متحدہ کی اکیڈمی نے ایک رسالہ سہ ماہی شائع کرنا شروع کیا ہے، جس کا پہلا نمبر جنوری ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا ہے۔ ہم اس رسالہ کی علمی حالت کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اس میں وہ کامیابیاں جھلک رہی ہیں جن کی نہ صرف امید ہے بلکہ یہ رسالہ عجب نہیں کہ ایسے مضامین شائع کرے جن کا مجموعہ اکیڈمی کا محکمۂ تصنیف بھی مشکل سے پیدا کر سکے گا۔ ہمارے اس خیال کی تحریک صرف دو ہی تین مضمونوں سے ہوئی ہے۔ پہلا مضمون پروفیسر صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا ہے جو اس قابل ہے کہ اُس پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون علیحدہ لکھا جائے۔ یہ مضمون "اُردو املا" کے متعلق ہے۔ اِس میں کمال یہ ہے کہ بہت کم جزئیات ایسے ہیں جن پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اور گو یہ مضمون اپنی نوعیت میں نیا نہیں ہے مگر نہایت جامع ہے۔

دوسرا مضمون پروفیسر محمد حبیب ایم۔ اے۔ آکسن نے لکھا ہے، جس کا عنوان "قرون وسطےٰ میں ہندو مسلم تعلقات" ہے۔ اِس مضمون کی تعریف بھی چند سطروں میں ناممکن ہے، تاریخ پڑھ لینا اور یاد کر لینا معمولی بات ہے مگر اُس کی صحیح فلاسفی اور اُس کا حقیقی راز معلوم کرنا اور اُس سے نتیجہ اخذ کرنا ایک ایسے مورخ کا کام ہے جو ابن خلدون کا سا دماغ رکھتا ہو۔ اِس مضمون میں ایک اور بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اتنے گہرے خیالات اور پیچیدہ معاملات اُردو زبان میں تعجب انگیز صفائی سے سما گئے اور پھر الفاظ مغلق نہیں، ترکیبیں جدید و مشکل نہیں، اور اس کا تبصرہ ہم اس تیسرے جملے پر ختم کرتے ہیں کہ مقصد حقیقی کے لحاظ سے ہمارے اس تمام ملک میں جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے وہ اس مضمون کا موضوع ہے، اور تاریخی کورس نے جو کانٹے رواداری کے راستے میں بچھا دیے تھے وہ پروفیسر محمد حبیب نے صاف کر دیے ہیں۔ تیسرا مضمون مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے "اُردو لغت" پر لکھا ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت جامع و دلچسپ ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبۂ لغت پر مصنف کی کیسی وسیع نظر ہے۔ اِس مضمون میں خالق باری کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے اس وہم کو باطل کر دیا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف کی ہوئی نہیں ہے، چند نئے لغات کا بھی انکشاف اس مضمون سے ہوتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس فن پر کوئی تصنیف اب اس مضمون کے دیکھے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اس رسالہ میں ایک قابل قدر تبصرہ ڈاکٹر زبید احمد پی ایچ۔ ڈی (الہ آباد یونیورسٹی) کا ہے جو مولانا سید محمد سلیمان ندوی کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" پر کیا گیا ہے۔ خاص خاص خوبیاں ظاہر کرنے کے بعد چند تاریخی غلطیوں کا بھی انکشاف کیا ہے جن میں سے اکثر صحیح او قیمتی ہیں۔ ناقد نے رسالہ کے ناظرین سے یہ بھی پوچھا ہے کہ لفظ بندرگاہ مذکر ہے یا مونث۔ کیونکہ مولانائے ممدوح نے بحالت تانیث لکھا ہے اور سید زبید احمد — نے مذکر بتایا ہے، ہماری رائے مین بھی مذکر ہے۔

سوائے دو ایک تحریرون کے تمام مضمون بالعموم قابل تعریف ہین اور اردو میں ایسے کم رسالے ہیں جو اس کے ہموزن ہوں۔

دو ایک باتیں قابل اصلاح بھی ہیں اُمید ہے کہ آئندہ درست ہو جائیں گی۔ مثلاً رسالہ کا نام" ہندُستانی "رکھا گیا ہے، جسکے نیچے یہ عبارت لکھی ہے" ہندُستانی اکیڈمی کا تماہی رسالہ " ایڈیٹوریل بورڈ نے اِس میں دو جدتیں اختیار کی ہیں مگر لفظ" ہندوستان" کو ہندُستان لکھنے کے وجوہ کچھ زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتے ہیں، اس کے مقابل میں ہندوستان کو ہندوستان برقرار رکھنے کے بہت قوی وجوہ ہیں کیونکہ" ہندوستان" کے معنے یہ ہوئے کہ جہاں ہندو زیادہ ہوں، اور ہندُستان کا مفہوم یہ ہوا کہ جہاں ہند زیادہ ہوں، اور یہ بات مہمل ہے۔ املا میں جہاں تک ہو ماخذ برقرار رکھنا چاہیئے۔ ورنہ چند صدیوں کے بعد لفظ کی اصلیت معلوم کرنے والوں کا خون پانی ایک ہو جائے گا۔

" تماہی " کے لفظ میں جدت کی گئی ہے، ت تین کا مخفف ہے جو اُردو ہے ماہ فارسی ہے جس میں یائے معروف نسبتی ہے، اِن دونوں کو ترکیب دینا مروّجہ اصولِ صرف کی رو سے غلط ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ بارہ ماہہ یا چو ماہہ اس قسم کے ناجائز ترکیب کے جو لفظ مروج ہو گئے ہیں وہ محاورے میں داخل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لفظ بھی جب تک مقبول ہو کر محاورہ نہ بن جائے گا غلط سمجھا جائیگا یہ ضرور ہے کہ محاورے خلاف اصول بہت ہیں، مگر مقبولیت سے پہلے اُن کی ذمہ داری واضع پر ہوتی ہے۔

ہندُستانی (ہندی)

(از مسٹر اقبال ورما سحر ہتگامی)

صوبہ متحدہ کی ہندوستانی اکیڈیمی نے جنوری ۱۹۳۱ء سے وہ تماہی" رسالوں کا اجرا کیا ہے، یعنی ایک

اُردو میں اور دوسرا ہندی میں۔ اس تنقید کا تعلق ہندی رسالے سے ہے۔

سب سے پہلے ہمکو "تباہی" لفظ کے متعلق کچھ کہنا ہے، یہ لفظ نہ تو اُردو میں مستعمل ہوتا ہے اور نہ ہندی میں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے محاورات سے قطع نظر نئے محاورات کو رواج دینے کی کوشش کرنا کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں ہے جسپر سختی سے اعتراض کیا جا سکے مگر تاوقتیکہ کوئی جدید محاورہ مقبول عام ہوکر صدیوں کے استعمال سے مستند نہ ثابت ہو جائے اُس وقت تک وہ صحیح اور فصیح نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی حالت میں ایک اعلیٰ ادبی انجمن کے ادبی رسالے سے اس کا آغاز ہونا کسی طرح مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا، خصوصاً جبکہ محاورہ زیر بحث نہ اُردو ہو اور نہ ہندی، اور جبکہ "چھ ماہی" کے موقع استعمال کا لحاظ رکھتے ہوئے اُس (تماہی) میں ایک ذم کا پہلو نظر آتا ہو، ہم ہندی اور اُردو میں یکسانیت پیدا کرنیکی کوششوں کے خلاف نہیں ہیں مگر ہماری رائے میں اس میں وہیں تک کامیابی ہوسکتی ہے جہاں تک کہ ہر دو زبانوں کا تعلق عوام کی بول چال سے ہے۔ آپ کسی ملک کی زبان پر بھی نظر ڈالئے، آپ کو ادبی اور روزمرہ کی زبانوں میں نمایاں فرق نظر آئیگا۔ رسالہ زیر تنقید کے مضامین کو دیکھتے ہوئے بھی ہمیں یہی بات نظر آتی ہے۔

رسالہ ہذا کے تقریباً جملہ مضامین تاریخی ہیں اور تاریخی حیثیت سے واقعی بے نظیر ہیں۔

پنڈت پرسرام چترویدی جی کا مضمون "میراں بائی" نہایت دلکش ہے جس میں سوانحی حالات کے علاوہ میراں بائی کے ایسے متعدد منتخب بھجن بھی دیئے گئے ہیں جو اہل مطالعہ کے دل کو وجد روحانی کے جذبات سے معمور کر دیتے ہیں اور میراں کی اُس گہری لگن کا پتہ دیتے ہیں جس کی دھن میں اُس کرشن پرست خاتون نے گھربار، راج پاٹ، اپنے پرائے سبھی سے ناتا توڑ دیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب کا مضمون "مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا" بھی ایک قابل قدر مضمون ہے جو معلومات سے مملو ہے اور جس سے مضمون نگار صاحب کے مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ مضمون میں یہ دکھلانے کی کوشش کیگئی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام کی اشاعت بالعموم اسلامی بادشاہوں کے طاقتور ہاتھوں کے ذریعہ نہیں بلکہ اسلامی فقراء کے نحیف مگر مقدس ہاتھوں کے ذریعہ ہوئی۔ تقریباً یہی بات ایک اور قابلانہ مضمون سے بھی ظاہر ہوتی ہے جسے پروفیسر محمد حبیب نے "زمانۂ وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات" کے عنوان سے حوالہ قلم کیا ہے۔ مسٹر دھیریندر ورما کا وہ مضمون بھی قابل غور ہے جسمیں مضمون نگار نے ہندی میں نئی آوازوں کیلئے چند جدید علامات کے اضافہ کی ضرورت بتلائی ہے۔ رسالہ کے آخر میں دو کتابوں کی تنقیدیں ہیں جو ورما صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہیں اور نہایت دلچسپ ہیں۔

اس رسالہ میں ایک بھی خاص نظم نہیں ہے، جو ادبی نقطۂ خیال سے ایک کمی ہے مگر ان باتوں کے باوجود بھی یہ رسالہ قابل قدر ہے اور قوی امید ہے کہ انجمن مذکور کی سرپرستی میں اسکو روز افزوں ترقی نصیب ہوگی۔ اسکی قیمت سالانہ ؏ ہے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

محشرستانِ کانپور

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں! اے جبینِ ارض کے داغ۔ اے دنی ہندوستاں!
تجھ کو عورت نے جنا ہے؟ جھوٹ ہے یا یقیں آدمی کی نسل سے اور تو؟ نہیں ہرگز نہیں
تیری جانب اُٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ! سبحہ و زنار میں جکڑے ہوئے دیوِ سیاہ!
رودِ گنگا سے لیے اس طرح طوفانِ ممات کس کو کھا کر آ رہا ہے؟ اے وبائے کائنات!
اے درندے! یہ ترا جبڑا ہے کیوں سمٹا ہوا؟ کس کا یہ گودا ترے تالو میں ہے چمٹا ہوا؟
تیغِ براں اور عورت کا گلا! کیوں بدصفات!! چھوٹ جائیں تیری نبضیں ٹوٹ جائیں تیرے ہات
کہنیوں سے یہ تری کیسا ٹپکتا ہے لہو؟ یہ تو ہے اے سنگدل بچوں کا خونِ مشکبو
مرد ہے تو اس سے لڑ پہلے جو مارے پھر کے تو نے بچوں کو چبا ڈالا، خدا غارت کرے!
تو نے اے بزدل لگائی ہے گھروں میں جن سے آگ کیا انھیں ہاتھوں میں لیگا رخشِ آزادی کی باگ؟
دل میں کھوٹا پن، ارادوں میں بدی، نیت خراب او سیہ باطن! یہ عالم اور آزادی کے خواب؟
سن کہ کم ظرفوں کو دنیا دے نہیں سکتی خراج یہ ترا چھوٹا سا سر اور ننگِ ہستی! اور تاج؟
تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا یوں بہایا خون، امیدوں پہ پانی پھر گیا

رُکنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
بجنے ہی والا ہے کوسِ غلامی زندہ باد

پروانے کی خاک

(از جناب برق دہلوی بی۔اے۔مصنف "مطلع انوار")

صرفِ تعمیرِ حرم، اور ایسے کاشانے کی خاک!
زینتِ کعبہ حقیقت میں ہے بُتخانے کی خاک

ہم نے پایا گوشہ دل میں اُسے خلوت نشیں
مدتوں چھانی عبث کعبے کی بُتخانے کی خاک

بادہ نوشی زاہدِ بدبیں کو ہے بارِ نظر
بس چلے تو جھونکدوں آنکھوں میں پیمانے کی خاک

بارشِ رحمت ہے رندوں کو پیامِ میکشی
ابر کے چھینٹوں سے کیا دیتی ہے پیمانے کی خاک

سوختہ قسمت، پھر اُس پر نارسائی اس قدر
شمع کی لو تک نہ پہونچی اُڑ کے پروانے کی خاک

عشقِ صادق سے ہوا یہ اتحادِ سوز و ساز
بن گئی ہے دودِ آہِ شمع، پروانے کی خاک

اب بھی چکر میں پئے لیلیٰ ہے مجنوں کا غبار
اُڑتی رہتی ہے بگولا بن کے دیوانے کی خاک

بے ثباتی نقشِ ہستی کی ہے اِک زندہ ثبوت
چار دیوارِ عناصر میں ہے ویرانے کی خاک

اس قدر کیف آفرینی جامِ صہبا میں کہاں
ہو تری آنکھوں کے آگے قدر پیمانے کی خاک

نسخۂ اکسیر سے بڑھکر ہے اسے زاہد سمجھ
ہاتھ آتی ہے کہاں خاک اور پیمانے کی خاک

اس کے ہر ذرہ میں پنہاں جوہرِ تقدیس ہے
سرمۂ چشمِ حقیقت بین ہے بُتخانے کی خاک

جیتے جی تک سب ہے یہ ما و شما کا امتیاز
ایک ہے مٹی میں ملکر اپنے بیگانے کی خاک

آسماں رس برق ہے میرا غبارِ ناتواں
آندھیوں سے کیا دبے گی مجھ سے مستانے کی خاک

میری دُنیا

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب - بریلوی)

(۱)

جب نالۂ غمگیں نے ——— تاثیرِ دعا پائی
جب نغمۂ شیریں نے ——— مستانہ ادا پائی
جب پیکرِ سیمیں نے ——— معصوم حیا پائی
جب شاعرِ رنگیں نے ——— تخئیل رسا پائی

ناکام تمنا کی
دنیا ابھی سونی تھی

(۲)

جب بربطِ ہستی کو ——— چھیڑا یدِ قدرت نے
مخلوق کی بستی کو ——— زندہ کیا فطرت نے

میں نے بھی بسا ڈالی
دنیائے طرب اپنی

غنچوں سے چٹک لیکر ——— بجلی سے چمک لیکر
موجوں کے ترنم سے ——— تاروں کے تبسم سے
پھولوں سے نزاکت لی ——— رنگینی و نکہت لی
لی حسن سے خودبینی ——— رعنائی و شادابی
عشاق سے مسکینی ——— بیتابی و بے خوابی
وارفتۂ الفت کی ——— دنیا نئی بستی تھی

جب تم نے نظر ڈالی
برباد ہی کر ڈالی

(۳)

ارمانوں کی دنیا کو ——— یعنی دلِ شیدا کو
برباد کیا تم نے ——— ناشاد کیا تم نے

جس دم تمہیں دیکھا تھا ——— جس دم تمہیں چاہا تھا
دنیا مری سونی تھی ——— اب بھی وہی حالت ہے
اب آنکھ نہیں ملتی ——— یہ تازہ مصیبت ہے
ہر پردۂ حائل کو ——— سو بار اُٹھا دیکھا
دنیائے تصوّر کو ——— سو بار بسا دیکھا
آشفتۂ وحدت کو ——— کب تم سے جدا پایا
پر دید کی حسرت کو
حاصل سے سوا پایا

دنیا مری سونی تھی ——— اب بھی وہی حالت ہے
اب آنکھ نہیں ملتی ——— یہ تازہ مصیبت ہے

ہنگامۂ کانپور

مکّار ہے اور فتنہ جو ہے دنیا ——— غدّار ہے اور ظلم خو ہے دنیا
کرتی رہتی ہے حشر برپا دن رات ——— ہنگامہ نوازِ ہائے و ہو ہے دنیا

اے چرخِ فریب کار تجھ پر رحمت ——— مغرور و ستم شعار تجھ پر رحمت
دم بھر میں کیا سکونِ عالم برہم ——— رحمت رحمت ہزار تجھ پر رحمت

ساز چاندپوری

مخمس

(بر غزل جناب چکبست آنجہانی)

(از جناب رادھے شیام رستوگی صاحب)

مکدر جو ہے وہ ہرگز مصفا ہو نہیں سکتا   کہ ہر دریا کا پانی آبِ گنگا ہو نہیں سکتا
ترانہ زاغ کا بلبل کا نغما ہو نہیں سکتا   اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

تصنع میں حقیقت کا تماشا ہو نہیں سکتا   طلسمِ سامری اعجازِ موسیٰ ہو نہیں سکتا
جو مصنوعی ہے قدرت کا نمونا ہو نہیں سکتا   زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

بہت کی سیر ہم نے شہر و بازارِ تعصب کی   مسافت قطع کی وادیٔ و کہسارِ تعصب کی
چھپی ہر جا ملیں چنگاریاں نارِ تعصب کی   بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی
مگر اب امتحاں کے وقت پردا ہو نہیں سکتا

نگاہِ غیر میں گرچہ ذلیل و خوار و اسفل ہوں   نفاقِ باہمی سے ہند کے سب شہر مقتل ہوں
جگر میں زخم ہوں اور درد کی شدت سے بیکل ہوں   جدا سینے سے دل ہو دست و بازو قوم کے شل ہوں
مگر دل سے جدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا

خریداری کی خواہش اور خالی کیسہ زر ہے   سمجھتے یہ نہیں اصلا غرف ہے یا کہ گوہر ہے
جو لعل بے بہا ہے اُس کو کہتے ہیں کہ پتھر ہے   گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے
اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

محبانِ وطن کو ہم وطن جاہل سمجھتے ہیں   ہر اک اصلاح کی کوشش کو لاحاصل سمجھتے ہیں
طبیبِ قوم کے نسخہ کو لاطائل سمجھتے ہیں   جسے ہے فکر مرہم کی اُسے قاتل سمجھتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

ترقی روکتی ہے ہر زماں بے مائگی دل کی
کیا کرتی ہے خونِ نوجواں بے مائگی دل کی
تنزل سے ہے ہر دم ہمعناں بے مائگی دل کی
اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

سانپ

(از بابو شیام موہن لال جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

رات کا ہے وقت اور پچھلے پہر کا ہے سماں
پردۂ ظلمت میں لپٹے ہیں زمین و آسماں
ایک سنّاٹے کے عالم میں ہے ساری کائنات
ڈوبتے جاتے ہیں تارے بھیگتی جاتی ہے رات
پیستی ہے اپنے گھر میں چکّی اِک عورت غریب
اسلئے، ہو سارے گھر کو پیٹ بھر روٹی نصیب
دل میں جذباتِ جوانی نے لگا رکھی ہے آگ
ہے صدائے آسیا کے ساتھ جاری لب پہ راگ
دین و دنیا کا نہیں غم اپنی دھن میں مست ہے
پُر نوائے خوشدلی سے خانۂ نے بست ہے
سرخوشی کی لہر آئی تجھ کو اُس کے راگ سے
آگ تیرے دل میں بھڑکی اُس کے دل کی آگ سے
سر وہیں تو نے نکالا پاس کے سوراخ سے
چھُپ گیا سوراخ میں پھر آہ اُس کو کاٹ کے
"سانپ نے کاٹا ارے" چلّا کے خامش ہو گئی
اب نہ جاگے گی وہ ایسی نیند پڑ کر سو گئی
مچ گیا کہرام گھر میں بچھ گئی ماتم کی صف
نالۂ غم کی صدائیں گونج اُٹھیں ہر طرف
شدّتِ شیون سے شوہر ہو رہا ہے بدحواس
روتی ہے آرام کو اپنے سسر کے ساتھ ساس
جاگ اُٹھے ہمسائے اِک دم دوڑ کر آنے لگے
کچھ نہیں اُمید لیکن چارہ فرمانے لگے
آہ کالے تو نے برپا کر دیا کیا انقلاب
ہو گئے وہ وقفِ ماتم جو ابھی تھے محوِ خواب

تو نے ظالم کچھ نہ رحم اُس کی جوانی پر کیا
یہ صلہ بیدرد لطفِ نغمہ خوانی کا دیا
تجھ کو کیا غم کون آغوشِ فنا میں سو گیا
تجھ کو کیا غم کون اسیرِ رنجِ حرماں ہو گیا
کچھ خیال آیا نہ رنجِ والدین پیر کا
گود کے بچے کا چھوٹا دودھ تجھ کو اس سے کیا
گھر کا گھر ظالم ہلاکِ شدتِ غم ہو گیا
ادد تو زیرِ زمیں چپ چاپ جا کر سو گیا

لطفِ سخن

(از جناب برق دہلوی بی۔اے)

دل تری زد پر نگاہِ فتنہ ساز آہی گیا — بچتے بچتے بھی تہِ شمشیرِ ناز آہی گیا
مجھ کو محشر میں خیالِ ضبطِ راز آہی گیا — پاسِ خاطر کچھ ترا اے فتنہ ساز آہی گیا
کر دیا غرقابِ سیلابِ حوادث نے مجھے — میری ہستی کا تباہی میں جہاز آہی گیا
ہوتے ہوتے ہوگئی آخر حقیقت بیں نظر — آتے آتے راہ پر عشقِ مجاز آہی گیا
میں ابھی تک آشنائے جذبۂ الفت نہ تھا — تجھ پہ دل بے ساختہ او مستِ ناز آہی گیا
ہم نہ کہتے تھے مریضِ غم کا حال اچھا نہیں — دیکھتے ہی غش تجھے اے چارہ ساز آہی گیا
جل کے سوزِ عشق سے گو دونوں خاکستر ہوئے — شمع و پروانہ کو لطفِ سوز و ساز آہی گیا
پند ناصح سن کے میں ہوں پاسِ خاطر سے خموش — وہ سمجھتا ہے محبت سے میں باز آہی گیا
کھلتے کھلتے کھل گئیں اُن پر مری بیتابیاں — ضبط کرتے کرتے لب تک دل کا راز آہی گیا
جب نمائش حسنِ مطلق کو ہوئی مدِ نظر — جلوۂ عرفاں میں اندازِ مجاز آہی گیا
مضطرب ہیں سن کے وہ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا — کام آخر قلبِ بشکستہ کا ساز آہی گیا
عشق جب صادق ہوا تو بڑھ گیا عجز و نیاز — حسن جب کامل ہوا تو کبر و ناز آہی گیا
آفریں اے فطرت شناسی تیری قسّامِ ازل — برق کے حصّہ میں ذوقِ سوز و ساز آہی گیا

(حضرت کوکب شاہجہانپوری)

فنا کیا ہے؟ بس احساسِ خودی کا دُور ہو جانا — صدائے ہر نفس کا نعرۂ منصور ہو جانا
تصوّر اور پھر کس کا تصوّر، اے دلِ ناداں — غنیمت ہے بس اُس کی یاد سے معمور ہو جانا
اگر ہے صرف ترکیبِ عناصر پردۂ حائل — تو کیا مشکل ہے اُس کا درمیاں سے دُور ہو جانا
اُدھر پیہم کسی کے جلوۂ رنگیں کی ارزانی — اِدھر قیدِ تعیّن سے مرا مجبور ہو جانا
غضب کی او نگارِ عالم آرا خود نمائی ہے — حجاباتِ مجازی میں ترا مستور ہو جانا
طلسمِ فکر ہے انسان کی نیرنگیٔ فطرت — گہے مختار ہو جانا، گہے مجبور ہو جانا
محبت میں شکستِ اوّلیں کیا حیرت افزا تھی — نگاہوں کا وہ لڑنا شیشۂ دل چور ہو جانا
نہ ہوں لب آشنا جوشِ خروشِ دل سے اے کوکب — کہ آئینِ ادب میں ننگ ہے منصور ہو جانا

(مولوی نورالحسن نیرؔ کاکوروی)

شکوہ یہ عام ہے سرِ محفل جگہ جگہ
کمبخت آہ کرتی ہے منزل جگہ جگہ

سر میں ہوائے شوق بنی دل میں آرزو
اُلفت ہوئی ہے رونقِ محفل جگہ جگہ

دیکھا جو رنگ بندہ نوازی کا میرے ساتھ
مایوس ہو کے پھرتے ہیں سائل جگہ جگہ

آہوں کی آس کیا ادھر اٹھیں ادھر گریں
گویا تڑپتے پھرتے ہیں بسمل جگہ جگہ

مجنوں کی آہ آہ سے اتنا اثر ہوا
اُٹھ اُٹھ گیا ہے پردۂ محمل جگہ جگہ

دنیا و دیں سے گذرے تو پہنچے ہیں تیرے پاس
کرنا پڑی ہے راہ میں منزل جگہ جگہ

نیرؔ سے کیوں کرے کوئی قیمت کی بات چیت
ملتے ہیں مفت ٹوٹے ہوئے دل جگہ جگہ

(جناب منوّر لکھنوی)

زباں پر اُن کے دل کا مدعا آنے نہیں دیتے
انھیں کے وسوسے کچھ ان کو فرمانے نہیں دیتے

شکن پڑنے نہیں دیتے کبھی ہم اپنے چہرے پر
مصیبت میں بھی اپنے دل کو گھبرانے نہیں دیتے

کھلا ہے شمعِ نورانی سے کچھ رازِ دروں ورنہ
پتہ کچھ سوزشِ پنہاں کا پروانے نہیں دیتے

اُٹھا کر لے گئے سوئے لحد ہوتے ہی بند آنکھیں
تھکے ماندے مسافر کو بھی ستانے نہیں دیتے

مآل اندیش ہیں عبرت ملی ہے موسمِ گل سے
کسی کے غنچۂ دل کو بھی مرجھانے نہیں دیتے

گہر ہو، آئینہ ہو، سنگریزہ ہو کہ دریا ہو
کسی کی آبرو پر حرف ہم آنے نہیں دیتے

منوّرؔ ہم کو ہے احساس اپنے دل کی عظمت کا
گھٹا اس آسماں پر رنج کی چھانے نہیں دیتے

(جناب بسملؔ الہ آبادی)

بادۂ حسن اور مستی ہے
واہ کیا شانِ خود پرستی ہے

ذوقِ کامل میں لطفِ ہستی ہے
بت پرستی خدا پرستی ہے

بعد مٹنے کے امتیاز کہاں
نہ بلندی ہے وہ نہ پستی ہے

مٹ گئے ولولے جوانی کے
اب نہ وہ جوش ہے نہ مستی ہے

ہو نظر میرے دل کی دنیا پر
ایک چھوٹی سی یہ بھی بستی ہے

نیستی کہتی ہے جسے دنیا
درحقیقت وہ اپنی ہستی ہے

اس زمانے میں حضرت بسملؔ
عشق کیا ہے ہوس پرستی ہے

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی ایکاڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد کے تماہی رسالہ "ہندستانی" بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے "اُردو املا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اُردو میں اکثر الفاظ کے املا میں جو اختلاف ہے اُس کو دُور کرکے ایک قاعدے کے مطابق لکھا جائے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے متعدد اصول بیان کئے ہیں جو قابل غور ہیں، ان میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ہائے مختفی سے بحث کی گئی ہے، اور چند قاعدے بیان کئے ہیں، مثلاً ہندی الفاظ ہ کی جگہ آ سے لکھنے چاہئیں۔ جیسے بٹوا، بٹوارا وغیرہ۔ اسی طرح یورپ کی زبانوں سے جو الفاظ اُردو میں آئے ہیں اُن کو بھی آ سے لکھنا چاہیئے۔ جیسے ڈراما۔ کمرا وغیرہ نیز عربی و فارسی کے وہ الفاظ بھی جن کا مفہوم اُردو میں بدل گیا ہے آ ہی سے لکھے جانے چاہئیں، جیسے بدلا، بے فکرا۔ نودولتا۔ کیابیا۔ برفیا۔ خاصا۔ بعضا۔ مسالا۔ میدا۔ وسپنا وغیرہ۔

مندرجہ بالا اصول کے مطابق اس قسم کے تمام الفاظ کا املا الف ہی سے درست ہے اور عموماً اہل علم الف ہی سے لکھتے ہیں البتہ ناواقف حضرات ہ سے بھی لکھتے ہیں اور یقیناً یہ صورت صحیح نہیں ہے۔

نون غنہ کی بحث میں ڈاکٹر صاحب کی تجویز کے مطابق بعض الفاظ کا املا مندرجہ ذیل صورت میں ہونا چاہیئے:-

کنواں	کنوا
دھواں	دھنوا
گانوں	گانو
چھانوں	چھانو
پانوں	پانو

یعنی ان الفاظ کے آخر میں نون غنہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اب بھی اکثر اصحاب نون کو حذف کر دینا روا رکھتے ہیں۔

ذ اور ز کی بحث کے سلسلہ میں خصوصیت سے قابل لحاظ لفظ "ذات" ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جس مفہوم میں اُردو میں "ذات" مستعمل ہے اسکو عربی کی "ذات" سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سنسکرت کے لفظ "جات" سے نکلا ہے۔ اُردو والوں نے اسکو "ذات" بنالیا ہے لہذا اس کو ز سے لکھنا صحیح ہے یعنی "زات" لکھنا چاہیئے۔

آخر میں بعض الفاظ کی ایک مختصر فہرست دی ہے جس میں ان کا صحیح اور غلط املا جو مروج ہو گیا ہے برابر برابر لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مقصد اصلاح ہے اور اس مضمون میں انھوں نے نہایت محنت و تلاش سے اصول و الفاظ بیان کر کے اصلاح کی ضرورت واضح کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل علم اس مضمون پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور اگر ڈاکٹر صاحب کی رائے سے کہیں اختلاف ہوگا تو اس کو اصولی بحث سے رفع کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

زمانہ اس قسم کے مضامین کو بخوشی شائع کریگا بشرطیکہ وہ صرف اصولی بحث پر مشتمل ہوں اور ذاتیات و تعصب سے پاک ہوں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ہندوستان کی ادبی دنیا میں غیر فانی عزت و شہرت حاصل ہے نیز غیر ممالک میں بھی آپ کے کلام کی کافی قدر ہو رہی ہے چنانچہ آپ کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" کا مکمل ترجمہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے اور "پیام مشرق" کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی انگریزی اور جرمنی زبانوں میں شائع ہو گیا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک اور تصنیف بھی مکمل ہو گئی ہے جو اٹلی کے شاعر اعظم ڈینٹے کی مشہور و مقبول نظم "ڈوائن کامیڈی" (Divine Comedy) کے جواب میں لکھی گئی ہے ڈینٹے نے مشہور شاعر ورجل کو اپنا رہبر بنا کر جنت و دوزخ وغیرہ کی سیر کی اور وہاں کے مناظر کو دنیا کے روبرو پیش کر کے ناموری حاصل کی تھی۔ اقبال نے مولانا روم کو اپنا رہبر بنا کر سبع سیارہ کو اپنی سیر و سیاحت کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ ڈینٹے نے اپنی نظم میں اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر اقبال نے اس کا نہایت برجستہ جواب بھی دیا ہے۔ لطف یہ کہ اس جواب میں ڈینٹے کے مذہب یا اعتقادات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے بلکہ پیغمبر اسلام کے محاسن ذاتی کو اس طرح نمایاں کر دیا ہے کہ ڈینٹے کے

اعتراضات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید ادبی کارنامہ جس کا نام "جاوید نامہ" ہے، فی الحال زیرِ طبع ہے۔

ہمارے مکرم دوست چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ اردو کے مایۂ ناز شاعر ہیں آپ کے کمال فن سے عموماً شائقین اور خصوصاً ہمارے ناظرین بخوبی واقف ہیں، آپ کی متفرق نظموں کا مجموعہ بھی "روحِ رواں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آجکل آپ مہاتما گوتم بدھ کی سوانح عمری مثنوی کی صورت میں نظم کر رہے ہیں۔ قابل مصنف کی عنایت سے ہمکو اس مثنوی کے بعض ٹکڑے سننے کا بھی موقع ملا ہے، اور ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ گو اس قابل قدر مثنوی کے اختتام کا کام دیرطلب ہے تاہم اس کی تکمیل سے ادب اردو میں ایک مستقل اور گراں بہا اضافہ ہوگا۔

منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔اے کا نام نامی اردو کی دنیائے ادب میں کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کا کلام بلاغت نظام زمانہ اور اردو کے تمام رسائل میں عرصہ سے شائع ہوکر قدردانانِ ادب سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کئی سال ہوئے کہ آپ کا متفرق کلام تین حصوں میں شائع ہوا تھا، اب ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ کے مجموعۂ کلام کا ایک شاندار ایڈیشن مسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کے مطبع میں زیرِ طبع ہے۔ اس مجموعہ کا حجم تقریباً ساڑھے پانچسو صفحات ہوگا، امید کہ قدر دان اصحاب اس کی وہی قدر کریں گے جس کا وہ بہمہ وجوہ مستحق ہے۔

مسٹر پرمانند میوا رام نے کامل تیئیس سال کی محنت میں انگریزی اور سندھی زبان کی ایک لغت تیار کی ہے جس میں انگریزی الفاظ کے معنی سندھی زبان میں تحریر کئے گئے ہیں، یہ اپنی قسم کی پہلی اور مکمل لغت ہوگی۔

ہمارے مخدوم مولانا نظامی صاحب بدایونی ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین نے اُن نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب کیا ہے جو مشاہیر شعراء نے ہندوستان گیر ہنگامہ کے بعد کہی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ "انقلاب دہلی" کے نام سے موسوم ہے اور اس وقت زیرِ طبع ہے۔ آپ نے اس قابل قدر مجموعہ کے لئے ایک قابل قدر مقدمہ بھی لکھا ہے جو اسی نمبر میں کسی دوسری جگہ ہدیۂ ناظرین زمانہ ہے۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کی دوسری ادبی کانفرنس امسال اول ہفتہ اپریل میں الہ آباد میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی مفصل کارروائی تو زمانہ کے آئندہ نمبر میں درج ہوگی لیکن اس نمبر میں آنریبل جسٹس سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا معرکۃ الآرا افتتاحی خطبہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ہم کو امید ہے کہ یہ عالمانہ ایڈریس نہایت غور کے ساتھ پڑھا جائیگا جن مختلف مسائل پر اس قابل قدر خطبہ میں بحث کی گئی ہے وہ ہندوستانی ادب کے ہی خواہوں کے غور و فکر کے مستحق ہیں۔

مارچ کا پچھلا ہفتہ اہل کانپور کے لئے سخت مصیبت کا ہفتہ تھا جو وحشت انگیزیاں ہندو مسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھیں ان کو خیال کرتے ہوئے بھی بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قلم کو تاب نہیں کہ ان ہولناک واقعات کا ذکر کر سکے۔ ان کے خیال ہی سے ہر ہندوستانی کی گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی ہے۔ باہمی منافرت کا جنون انسان کو حیوان بلکہ شیطان سے بھی بدتر بنا سکتا ہے۔ اس کا ثبوت ہنگامۂ کانپور کی خونیں داستان نے بخوبی بہم پہونچا دیا ہے۔ ایک کانپور کیا تمام ملک کو بہ حیثیت مجموعی اس شرمناک سانحہ سے سبق لینے اور عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے نامور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے اس محشرستان کے متعلق جو کانپور میں برپا ہوا ایک عبرت انگیز اور سبق آموز نظم لکھی ہے جو گو خاص طور پر زمانہ کے لئے تو نہیں لکھی گئی ہے لیکن مناسبت موقعہ کے لحاظ سے ہم اس کو حصۂ نظم کے عنوان میں ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ حضرت جوش نے جس دلسوزی اور حب الوطنی سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی ہے، جذبات کا جو تلاطم اس نظم میں برپا ہو گیا ہے اس پر اردو شاعری اور ہمارے مکرم دوست حضرت جوش کو جس قدر فخر ہو کم ہے۔ نظم کیا ہے تازیانۂ عبرت ہے جس کے سامنے ہر شخص جس میں ذرا بھی حمیتِ انسانی ہوگی اپنا سر نیچا کر لیگا

ہم اپنے محترم دوست خواجہ حسن نظامی صاحب کی عنایت و توجہ کے مرہون منت ہیں جنھوں نے زمانہ مارچ نمبر کی تصویر کے متعلق ہمارے نوٹ کی ایک غلطی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے جیسا کہ ہمارے مخدوم خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے واقعہ یہ نہیں ہے کہ نور جہاں آگرہ سے جہانگیر کے پاس گئی بلکہ وہ بادشاہ کے ہمراہ تھی فوج جہلم کے پار چلی گئی تھی بادشاہ پیچھے رہ گئے تھے اور جب انکو مہابت خاں نے قید کر لیا تو نور جہاں ہاتھی پر بیٹھکر واپس آئی اور مہابت خاں کی مزاحمت کے باوجود دریا عبور کرکے جہانگیر سے ملگئی۔

زمانہ

مرتبہ - دیا نرائن نگم بی - اے

جلد ۵۶ | مئی سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

تصاویر: - مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو و دیگر ارکان ورکنگ کمیٹی کانگریس

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
[illegible]

زمانہ

جلد ۵۶ — مئی ۱۹۳۱ء — نمبر ۵

ہندوستان کا سیاسی مستقبل

(از مسٹر اننت پرشاد نگم ۔ بی ۔ اے ، ایل ایل ۔ بی)

سول نافرمانی کی تحریک جس کا اختتام حال میں مہاتما گاندھی اور لارڈ اروِن کے سمجھوتے سے ہوا ہے آنے والے زمانہ میں ایک مدت دراز تک خاص اہمیت کی نظر سے دیکھی جائیگی ۔ اِس تحریک کا آغاز شروع ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء میں اُس مشہور خط سے ہوا تھا جو مہاتما گاندھی نے وائسرائے کے پاس مسٹر ریجنلڈ رینالڈ کی معرفت روانہ کیا تھا ۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو قانونِ نمک کی خلاف ورزی کے لئے آپ پاپیادہ سمندر کی طرف روانہ ہوئے اور ۶ ۔ اپریل سنہ ۳۰ء کو علی الصباح آبِ شور میں غوطہ زنی کرتے ہوئے قدرت کی عطا کی ہوئی نعمت اور بندگانِ خدا کے درمیان قانونِ نمک کی جو دیوار موجودہ حکومت نے تعمیر کر رکھی تھی اس کو منہدم کرنا شروع کر دیا ۔ مہاتما جی کا یہ فعل جو بادی النظر میں بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا گورنمنٹ کے لئے رفتہ رفتہ ایک مہیب اور پریشان کن جنگ ثابت ہونے لگا ۔ ہندوستان میں حبِ وطن کا اس قدر گہرا جذبہ اس سے پہلے نہ آنکھوں دیکھا تھا نہ کانوں سُنا ۔ کیا تھوڑا سا نمک بنا کر کوئی شخص کسی مالی نفع کا خیال دل میں لا سکتا تھا ؟ نہیں بلکہ یہ سودا تھا قانون شکنی کا جو فدایانِ وطن کو جیل کی بیڑیاں پہننے کے لئے خانۂ عافیت سے نکال لاتا تھا ۔ گورنمنٹ نے جس قدر چشم پوشی کی اسی قدر دائرۂ عمل وسیع ہوتا گیا ۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ ، بدیشی کپڑوں کی ہولی ، قومی جھنڈے کی

پرستش، غرضکہ وطن سے محبت پیدا کرنے کے تمام سامان روز افزوں ترقی کرنے لگے، حتیٰ کہ اہل حکومت کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا رعب داب رفتہ رفتہ غائب ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ حکام نے بھی کروٹ بدلی، پولیس نے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیے، گرفتاریاں اور سزائیں شروع ہوئیں، لاٹھیوں اور کوڑوں کی مار پڑنے لگی۔ گھبراہٹ اس قدر تھی کہ محض گاندھی ٹوپی اُن کے غیض وغضب کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی۔ کتنے غریب وطن پرست محض اس ٹوپی کے استعمال کے جرم میں جیل کی ہوا کھا آئے۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے کم وبیش اس پُرامن جنگ میں شریک تھے لیکن عدم تشدد کے سنہرے اصول پر کلیتاً کاربند ہونے کا سہرہ گجرات ہی کے سر رہا۔ یہ وہ سرزمین تھی جو مہاتما گاندھی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے قدموں کی خاک سے فیضیاب ہوتی رہی تھی۔ یہاں کسانوں نے عہد کر لیا کہ جب تک سردار پٹیل حکم نہ دیں گے وہ مالگذاری نہ ادا کریں گے۔ اس عہد کے پورا کرنے میں انھیں کن کن مصائب کا شکار ہونا پڑا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بیچارے گھر گرہستی مال واسباب چھوڑ کر جلاوطنی کی حالت میں بھوکوں گذر کرتے تھے لیکن اس پر طیار نہ تھے کہ مالگذاری ادا کر کے سوراج کے راستہ میں کانٹے بوئیں۔ غرضکہ ساری فضا جنگ آلود تھی اور دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت کا پودا پھولتا پھلتا نئے نئے کلے نکال رہا تھا۔

برطانوی حکومت کے اعلان شاعر کے خیالی معشوق کے وعدوں سے بھی زیادہ دلفریب ہوا کرتے تھے، لیکن اس مرتبہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کے اعلان کے مطابق راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا انعقاد کرنا تو تھا ہی پھر کیوں اس میں تعجیل نہ کی جائے اور اہل ہند کو اپنے ارادوں کے بارے میں یقین نہ دلایا جائے۔ برطانوی مدبران نے دیکھا کہ اب "دیر آید درست آید" کے اصول پر چلنا مفید نہ ہوگا۔ حسن تدبر اگر ان میں انتہائی نہ ہوتا تو اکتیس کروڑ نفوس پر ہزارہا میل کی دوری سے حکومت کیسے کرتے، اب توقف و تامل کی گنجائش نہ تھی، چند حضرات نے اس امر کی شکایت بھی کی کہ دسمبر کی سردی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگی، لیکن گورنمنٹ نے ایک نہ سنی اور سب کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بُلا بھیجا۔ پُرانی وعدہ خلافیوں کے ستائے ہوئے تو اب بھی شک کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ٹائیں ٹائیں فش ہو کر معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن واقعات اس کے برعکس تھے۔ کوئی جدوجہد عام اس سے کہ وہ آئینی ہو یا غیر آئینی، کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے پس پشت کوئی ایسی قوت نہ ہو جس سے یہ توقع

کی جاسکے کہ وہ فریق مخالف کی قوت کے مقابلہ میں کام کرسکے گی۔ اب تک ہمارے تمام مطالبات کا جواب محض ہماری ناقابلیت سے دیدیا جاتا تھا، ہم اپنی قابلیت کے ثابت کرنے میں بہترین دلیلیں پیش کرتے تھے مگر اہل حکومت کو یقین نہ آتا تھا۔ برعکس اسکے اس گول میز کانفرنس میں کسی نے اہل ہند کی قابلیت کا ثبوت نہیں طلب کیا۔ کیا برطانوی گورنمنٹ کا ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ذمہ داری عطا کرنے کی وجہ محض یہ تھی کہ برطانیہ ہندوستان میں اپنا مشن پورا کرچکا ہے اور اب ہندوستان کو اس کے اصلی حقداروں کو واپس دینا چاہتا ہے؟ یا ہندوستان کی موجودہ فضا نے مدبران برطانیہ کو کسی قیمت اور کسی معاوضہ پر امن خرید کرنے کے لئے بے قرار بنادیا تھا تاکہ اُن کی تجارت ازسرنو اس ملک میں قائم کی جاسکے؟ برطانوی مدبران کے اندرونی خیالات سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر ہمارے مطالبات اس اعلان سے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیراعظم سلطنت برطانیہ نے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو کیا ہے پورے ہوتے ہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کوئی حجت نہ ہونا چاہیئے۔ اس اعلان میں گورنمنٹ کا منشا ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون سازی کو ایسی شرائط کے ساتھ دی جائیگی جو تبدیلی کے زمانہ میں چند ذمہ داریوں کے پورا کرنے اور دیگر خاص حالات او واقعات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور نیز اقلیتوں کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے ضروری ہوں گورنمنٹ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھے کہ تبدیلی کے زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے جو قانونی شرائط عاید کی جائیں ان کے متعلق اختیارات کی ترتیب اور نفاذ اس طور سے ہو کہ وہ ہندوستان کے جدید آئین کے ذریعہ مکمل ذمہ داری کی معراج ترقی پر پہونچنے میں سدراہ نہ ہوسکیں...... تمام ہندوستان کی مرکزی حکومت جس میں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا دونوں شامل ہونگے ترکیبی نظام حکومت کی شکل اختیار کریگی۔ اس میں دو ایوان ہوں گے ...... ترکیبی نظام حکومت کے مطابق مجالس قانون ساز کے طیار ہونے پر گورنمنٹ ایگزیکیٹو کا لیجسلیٹو صیغہ کی جانب ذمہ داری کا اصول مان لے گی۔ موجودہ حالات میں امورات خارجیہ اور حفظ مملکت کے صیغے گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اور گورنر جنرل کو ان صیغہ جات کے متعلق ضروری اختیارات دیے جائیں گے۔ مزید برآں چونکہ خاص ضرورت کے وقت بالآخر گورنر جنرل کے لئے مملکت میں امن قائم رکھنا ضروری ہے اور اسی طرح اقلیتوں کے آئینی حقوق کے قائم

دجاری رکھنے کی ذمہ داری بھی انھیں پر ہے لہذا ان اغراض کے لئے بھی ضروری اختیارات ان کو دیئے جائیں گے۔ مالی ذمہ داری کا انتقال اس امر پر منحصر ہوگا کہ ان ذمہ داریوں کو پورا کیا جاسکے جو وزیر ہند کے اختیارات سے عائد ہو چکی ہیں۔ اور نیز اس امر پر کہ ہندوستان کے مالی استحکام اور ساکھ پر حرف نہ آسکے...... ان شرائط کے ساتھ حکومت ہند کو منتقل شدہ صیغہ جات میں آمدنی اور اخراجات کے وسائل کے متعلق مکمل ذمہ داری دیجائیگی۔ ...... گورنر کے صوبے مکمل آزادی کے اصول پر ترتیب دیے جائیں گے، وزرا کی تقرری ممبران کونسل میں سے ہوگی۔ صوبجاتی اختیارات کے حدود اس طور پر قائم کئے جائیں گے کہ وسیع ترین حکومت خود اختیاری اُن کو دی جاسکے۔ مرکزی حکومت کے اختیارات مرکزی صیغہ جات کے متعلق محدود ہونگے جن کا تعلق تمام ہندوستان سے ہوگا۔ اور جو آئین میں واضح کردیئے جائیں گے۔ گورنر کے خاص اختیارات صرف اس حد تک محدود رکھے جائینگے جن کا استعمال غیر معمولی اوقات میں امن و امان قائم رکھنے اور ملازمان سرکاری اور اقلیتوں کے حقوق قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوں......"

اگر عملی کارروائی کے وقت حکام کسی قدر وسیع الخیالی سے کام لیں تو موجودہ اعلان میں اہل ہند کے مطالبات پورا کرنے کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ اس میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا کہ نو آبادیات کے طرز کا مکمل آئین ہندوستان میں نافذ کرنے کے لئے کچھ زمانہ چاہیئے بہت بہتر ہوتا کہ یہ زمانہ محدود کردیا جاتا۔ موجودہ صورت میں اس کی حد معین کرنا۔ برطانوی حکومت کی دریا دلی اور اہل ہند کی قربانیوں پر منحصر ہوگا، ہر حالت میں اہل وطن کے لئے جد وجہد اور ایثار کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ بہر حال اس وقت تک جبکہ خود اختیاری حکومت اپنی پوری شان کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین جلوہ گر ہوگی چند اختیارات گورنر جنرل اور گورنروں کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہیں۔ امورات خارجیہ اور تحفظ ہند کے محکمہ جات بھی اس زمانہ تک ذمہ دار حکومت کے سپرد نہ ہونگے۔ جہاں تک صیغۂ مال کا تعلق ہے اس کے انتقال میں یہ شرط لگادی گئی ہے کہ جو ذمہ داریاں وزیر ہند نے عاید کردی ہیں وہ مسترد نہ کی جاسکیں اور ہندوستان کی ساکھ اور نیک نامی دنیا میں قائم رہ سکے۔ ہندوستان کو اس سے زیادہ خوش کن کیا موقعہ ہوسکتا ہے کہ ٹرسٹیوں کو آخری حساب کتاب دیتے وقت بھی اسکا نیک نام قائم رکھنے کی تمنا ہے۔ ان چند باتوں کے علاوہ مرکزی حکومت اپنے طرز عمل میں ہندوستانی نمایندوں کے سامنے مکمل طور پر

جوابدہ ہوگی اور ان کی رائے کی پابند ہوگی۔ جو صیغہ جات حکومت ہند کے سپرد ہونگے اُن کی تعداد محدود ہوگی۔ بقیہ تمام صیغہ جات صوبجاتی حکومتوں کے سپرد ہونگے۔ یعنی نظام حکومت فیڈرل طرز کا ہوگا۔ ہندوستان کے نظام میں فیڈرل طرز حکومت کا داخل ہونا اس کے لیے مفید ہوگا یا مضر اس معاملہ پر بحث کرنا اب بیکار سا ہوگیا ہے کیونکہ اس اصول پر تمام پارٹیاں متفق ہو چکی ہیں، اور اب اس کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن فیڈرل نظام حکومت کا اہم ترین پہلو ہندوستانی طرز معاشرت پر ضرور اثر ڈالے گا۔ کیونکہ یہ امر اس قسم کی طرز حکومت کی خصوصیات میں ہے کہ صرف مخصوص صیغوں کو جن کا اطلاق تمام ہندوستان پر ہو چھوڑ کر بقیہ تمام امور مملکت صوبجاتی حکومتوں ہی سے متعلق ہوں گے۔ جن کی تکمیل اور جن کے اختیارات کا رعایا کی روزانہ زندگی پر استعمال صوبجاتی حکومتوں کی ترکیب اور ساخت پر منحصر ہوگا۔ چونکہ مختلف صوبجات کی پولٹیکل حالت اور حیثیت میں فرق ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی حکومتوں کی ساخت اور ترکیب بھی جدا جدا ہو، اور اس افتراق اور اختلاف کے لحاظ سے مختلف صوبجات کی عملی حکومت میں فرق ہو۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ جدید نظام حکومت کے عمل میں آنے سے مختلف صوبجات کی مادّی ترقی اور طرز معاشرت میں فرق ہوگا۔ اس فرق کا مضر نتیجہ اس وقت زیادہ پریشان کن ہوگا جبکہ نظام حکومت میں مذہبی عنصر شامل ہو۔

وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق صوبجات کو مرکزی صیغہ جات کے علاوہ نہ صرف بقیہ تمام امور مملکت پر اختیار ہوگا بلکہ ان کا طرز حکومت بھی مکمل ذمہ داری کے اصول پر مرتب کیا جائیگا۔ گو یہاں بھی خاص خاص معاملات میں ضروری اختیارات گورنر کے ہاتھ میں ہونگے۔

غرضکہ یہ اعلان بظاہر اس قدر حوصلہ افزا ہے کہ برطانوی گورنمنٹ کی دانشمندی اور تدبر کے لئے آفریں کا کلمہ بے اختیار دل سے نکلتا ہے۔ گورنمنٹ نے اس اعلان کے بعد لیڈران کانگریس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا تاکہ انھیں اس کے حسن و قبح پر غور کرنے کا موقعہ ملے۔ اس کا نتیجہ مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کا سمجھوتہ ہے جس نے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے عظیم الشان باب کو اختتام تک پہونچا دیا۔ سمجھوتہ کی شرائط بظاہر ہندوستان کی توقعات کے مقابلہ میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کہ سمندر کے لئے ایک قطرۂ آب۔ ذرا غور کیجئے، قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر ہوا۔ یہ بات سمجھوتے کی دیگر شرائط کے ساتھ پہلے بھی ہر وقت ممکن تھی۔ پھر تمام قیدیوں کی رہائی بھی عمل میں نہ آئی۔ ضبط شدہ جائداد کا واپس ہونا خاص طور پر اس شرط کے ساتھ کہ اگر کوئی جائداد کسی تیسرے شخص کے قبضہ میں جا چکی ہوگی وہ واپس نہ ہوگی ایک ایسی رعایت ہے جس سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔

اگر کسی جائداد کا نیلام خلاف قاعدہ ہوا ہو وہ بذریعہ قانونی چارہ جوئی کے منسوخ ہو سکے گا۔ مگر خلاف قانون کارروائی ہمیشہ قانونی چارہ جوئی سے مسترد ہو سکتی تھی۔ اس سمجھوتے نے کونسا نیا اثر پیدا کیا۔ خاص خاص حالتوں میں نمک سازی کی اجازت البتہ ایک ایسا کرشمہ ہے جس کے منظور کرنے میں وائسرائے کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہونگے کیونکہ اس میں رعب حکومت کا خون ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اس رعایت کی بنا پر اہل وطن اپنی بگڑی ہوئی حالت سنبھال لیں گے ولایتی کپڑے کی بکری پر دھرنا جن شرائط کے ساتھ منظور کیا گیا ہے ان کے ساتھ کوئی دھرنا کسی وقت بھی خلاف قانون نہ تھا۔ غرضکہ اگر ملک کے لئے ظاہرا فوائد کی نظر سے صلح کی شرائط کو دیکھا جائے تو تلاش مقصود میں حیران ہو جانا پڑے گا۔ لیکن بااینہمہ کیا صلح واقعی طور پر ملک کے لئے نفع بخش ثابت نہ ہوگی؟ اس خیال سے قطع نظر کہ اہل وطن کس حد تک آزادی کے لئے اپنے آپ کو مٹا دینے کے لئے اب بھی طیار تھے اور آیا قدیم راستہ پر مزید سفر کارآمد ہوتا یا نہیں؟ سب سے بڑا نتیجہ اس صلح کا ملک کی بکھری ہوئی قوتوں کو یکجا کرنے میں ہے۔ جن صلح جو حضرات نے مہاتما جی کے سامنے رو رو کر گورنمنٹ سے صلح کرنے کیلئے اپلیں کیں اور لیڈران کانگریس کو اہل حکومت کی صدق دلی کا یقین دلایا۔ اب درآنحالیکہ حکام کی جانب سے لیت و لعل ظاہر ہو کس منہ سے ایثار اور قربانی کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو سکیں گے جو فرقہ کانگریس کی تیز رفتاری کی تاب نہ لا سکتا تھا اس کو پیچھے چھوڑ دینا ایک حد تک دانشمندی کا کام نہ تھا۔ اس سمجھوتہ نے ان کو ہم سفر ہونے کا ایک سنہرا موقعہ دیا۔ ان پر یہ ظاہر کر دیا گیا کہ کانگریس کسی ایسے موقعہ سے فائدہ اُٹھانے سے انکار نہ کرے گی جو ملک کے لئے مفید ثابت ہونے والا ہو۔ اب بھی کانگریس کے طرز عمل پر ان کو اعتقاد نہ ہو تو جائے تعجب ہے۔ کسی وسیع پیمانہ کی جدوجہد کا متواتر اور مسلسل ایک عرصہ دراز تک قائم رہنا ایک مشکل امر ہے۔ ہر ایک سفر میں منزلیں کرنا مسافت طے کرنے کے لئے مناسب اور ضروری ہے چنانچہ اس لحاظ سے بھی یہ سمجھوتہ خود جدوجہد کی مضبوطی کے لئے ایک ضروری منزل ہے۔ خاصکر ایسی حالت میں جبکہ منزل مقصود کے حصول کا امکان ہو گیا ہو

اب کہ کراچی کانگریس نے اس سمجھوتہ کو منظور کر لیا ہے اور ملک میں پورے طور پر اس کے مطابق عملدرآمد شروع ہو گیا ہے تو اہل وطن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی آئندہ نشست کے اہم نتائج کی طرف قدرتاً متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس وقت رہنمایانِ قوم کے لئے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور ان میں اہم ترین امر مذہبی تنازعات کا فیصلہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایک سچے اور دلیر رہنمائے قوم

کی حیثیت سے اہل ہنود کو صلاح دی ہے کہ انھیں مسلمانوں کے ان متحدہ مطالبات کو جو جائز حقوق کی حفاظت کے لئے ہوں بلا رد و کد منظور کر لینا چاہیئے۔

اگر در حقیقت عام طور پر یہ صلاح مان لی جائے تو اس پرانے قضیہ کا خاتمہ کس حسن و خوبی سے ہو جاتا ہے۔ گو اہل ہنود کو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ عام طور پر مسلم مطالبات ان کے جائز حقوق سے بہت زیادہ ہیں اور ان کے اس طور پر مان لینے میں ہندو مفاد کا خون ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ خیال محض سطحی ہے، اگر ذرا گہری نظر سے دیکھیئے تو اس طریقہ پر جو نتائج ظہور پذیر ہونگے وہ بدرجہا زیادہ مفید ہونگے۔ مانا کہ اہل اسلام کو ملکی نظام میں ایک خاص حصہ مل جائیگا لیکن کیا سوراج کی نعمتیں سرکاری ملازمتوں اور مجالس قانون ساز کی ممبری تک محدود ہیں؟ دراصل سوراج کی اصلی غرض ملک کی مادی ترقی اور اہل وطن کی خوشحالی ہے، جو حکومت خود اختیاری کے زمانہ میں اہل وطن کو بلا تمیز مذہب و قوم فائدہ پہونچائیگی۔ سیاسی مجلسوں اور ملازمتوں کی خاص اہمیت تو موجودہ حکومت کے ساتھ ہے جبکہ اہل وطن کے لئے اپنے علم و ہنر سے ترقی کرنے کا کوئی راستہ نہیں کھلا ہوا ہے۔ اگر اس تھوڑی سی قربانی کی بدولت ہم اس راستہ تک پہونچ جائیں، تو یہ قربانی واقعی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ اہل اسلام کی وطن پرستی کا اب امتحان ہے۔ کیا حب وطن کا جذبہ اُن کو اس بات پر آمادہ نہ کرے گا کہ مہاتما گاندھی کے اس اعلان سے متاثر ہو کر ان شرائط کو جن سے مذہبی اختلافات کی زیادتی ہوتی ہے اپنے مطالبات کی فہرست میں سے خارج کر دیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ جداگانہ انتخاب کے مسئلہ نے ہی ملک کی سیاسی فضا ناخوشگوار بنا رکھی ہے، اور کسی قدر وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ نے اہل اسلام کو کوئی نفع نہیں پہونچایا۔ پھر کیا جادو ہے اس اصول میں جو چند حضرات کو ملکی مسائل کی طرف وسیع نقطۂ نظر سے دیکھنے میں مانع ہے۔ مولانا شوکت علی جو چند سال پہلے ہندوستان کے لئے متحدہ اصول پر سوراج حاصل کرنے کے حامی تھے آج جداگانہ انتخاب کا راگ کس خوبی سے الاپ رہے ہیں۔ شکر ہے کہ اہل اسلام کا قوم پرست طبقہ تعداد اور اہمیت میں روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اور چند ہی روز میں مولانا شوکت علی اور ان کے ہمنوا اصحاب کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی سی آواز رہ جائیگی۔ اس وقت اہل وطن یک دل و یکزبان ہو کر آزادی کا راگ گائیں گے اور تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ دوسرا مسئلہ جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق خاص اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی نمایندوں کے سامنے ہندوستان کی ایک آواز ہونا چاہیئے۔ کانگریس نے مہاتما گاندھی کو اپنا تنہا ڈیلیگیٹ مقرر کر کے اس معاملہ میں

پیش قدمی کی ہے۔ کاش کہ ملک کی تمام جماعتیں اس سے متاثر ہو کر ہندوستان کی طرف سے سارے اختیارات اس سچے رہنما کے سپرد کر دیں اور ہندوستان کی یک جہتی کا سکہ تمام دنیا پر بٹھا دیں پھر کونسی قوت ہے جو ہندوستان کو اُس کے پیدائشی حق سے محروم رکھ سکتی ہے۔

نمک کی آمدنی و خرچ

ہندوستان اور بعض دوسرے ممالک کی آمدنی میں نمک کی آمدنی کا اوسط فی صدی حسب ذیل ہے:-

ہندوستان	۲،۶
اٹلی	۰،۹۵
فرانس	۰،۲۸
جرمنی	۰،۱۰

ہندوستان میں نمک کا خرچ (مطابق تخمینہ ۲۳-۱۹۲۲ء) فی کس ۶ سیر یا ۱۲،۳۰ پونڈ سالانہ ہے۔ مختلف صوبجات میں نمک کا سالانہ خرچ فی کس حسب تفصیل ذیل ہے:-

مدراس	۱۸،۸۸	پونڈ
برما	۱۸،۵۴	"
بنگال	۱۵،۲۴	"
بمبئی مع سندھ	۱۳،۹۴	"
صوبہ متوسط و برار	۱۱،۵۶	"
صوبجات متحدہ	۱۰،۹۸	"
بہار و اڑیسہ	۱۰،۹۷	"
راجپوتانہ و سنٹرل انڈیا	۱۰،۵۹	"
پنجاب	۱۰،۲۶	"

مخارج حروف

(از مسٹر سلیم جعفر)

وہ آوازیں جن کی علامات تحریری کا نام حروف رکھا گیا ہے بہت ہی کم ایک ہی عضو کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر دو دو اعضا کی متفقہ حرکت سے پیدا ہوتی ہیں۔ صوتیات دان کی ذہانت و فراست نے وہ سب اعضا ڈھونڈھ نکالے ہیں جو نطق انسانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

اس[1] مسئلہ نظریہ کی بنا پر کہ آوازیں ہوا کے سوا کچھ نہیں ہیں اور ہوا میں مختلف اسباب مختلف کیفیات پیدا کر کے باعثِ نیرنگی ہوتے ہیں۔ صوتیات دان نے ایک خزانۂ باد (حجاب[2] حاجز Diaphragm) قرار دیا اور پھر اس خزانے سے چلی ہوئی ہوا کو ایک تنگ و تاریک راستے (قصبۃ الرئۃ Lungs) سے لیکر ایک ایسے بلند مقام پر (حنجرہ Larynx) پر پہنچایا جہاں سے یہ قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ یہاں آکر اُسے وہ ہموار راہ نہ ملی جس پر اب تک چلا آ رہا تھا بلکہ منزل آزادیِ کامل پر پہنچانے سے پہلے کہیں مزاحم و مانع اور کہیں ممد و معاون نظر آئے۔ یہ ایسے اٹل اور ناگزیر تھے کہ ان کی ہستی سے انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ انکار بہت سے بدیہات و مسلمات سے انکار کا مرادف تھا۔ کوئی اور نہیں تو سامعہ سخت مخالفت کرتا اور اس کے مقابلے پر پائے استدلال کا جمنا محال تھا۔ اس لئے اس نے بے تکلف تسلیم کر لیا کہ یہ ہوا آزادیِ کامل حاصل کرنے سے پہلے "ہر لحظہ بہ رنگ دگر آں یار بر آمد" کا مصداق بن جاتی ہے۔

خزانے سے چلی ہوئی ہوا کہیں ایک مقام پر پہنچ کر بات کی بات کے لئے روک دی گئی اور

---

[1] اس میں اور بعد کے دو پیراگرافس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماخذ. فصل اصول صوتیات۔ باب تلفظ۔ ویبسٹر ڈکشنری مطبوعہ ۱۹۲۰ء ہے۔ یہ اصول سنسکرت کے اصول سے ملتے ہیں۔

[2] ان اصطلاحوں کا ماخذ قاموس عربی و انگلیزی مؤلفہ ڈاکٹر جان ورٹبات ایم۔ ڈی۔ اور ڈاکٹر ہاردی ورٹبر پی۔ ایچ۔ ڈی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۷ء ہے۔

پھر آگے بڑھنے پائی تو اس شرط پر کہ اس سے ایک صدا پیدا ہو۔ لیکن اس کا مقام توقف ہمیشہ ایک ہی نہ تھا کہیں ہونٹ تھے (ب۔پ پر غور کیجئے) تو کبھی منہ کا پچھلا حصہ (ک۔گ) تو کبھی وہ جگہ جو اسلتہ[۵۱] (نوک زبان) اور نطع (شکن ہائے کام) کے درمیان واقع ہے (ٹ۔ڈ) کبھی بجائے اس کے کہ منہ سے نکلنے پائے ابھی اس نے آدھی ہی راہ طے کی تھی کہ ناک میں ڈھکیل دی گئی اور غنا میں رنگی ہوئی نکلی (م۔ن) کبھی یہ مزمار حنجرہ (Glottis) تک تو بے تکلف چلی آئی اور آگے ایک تنگ راہ سے گزرنا پڑا۔ یہ تنگی کبھی نیچے کے ہونٹ اور اوپر کے دانتوں کے (ف) اور کبھی زبان اور دانتوں (س۔ز) کے درمیان محسوس ہوئی۔

مسطورۂ بالا بیان سے یہ تو عیاں ہے کہ حباب حاجز سے چلی ہوئی ہوا پر اس سے پہلے کہ وہ اپنی ہستی کا اعلان کر سکے کیا کچھ گزرتی ہے لیکن اچھی طرح سے اس کا پتا نہیں لگ سکتا کہ وہ کون کون سے عضو ہیں جو اس پر ستم ڈھاتے ہیں۔ اس لئے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حلق سے ہونٹوں تک مختلف اعضا میں سے جس کو جس وقت نیش زنی کا موقع ملتا ہے وہ باز نہیں آتا۔ ہ حرف گلے سے ادا کی جاتی ہے اسے مزماریہ یا حنجرہ (Glottal) کہتے ہیں۔ ک گ حروف غنہ وغیرہ کے تلفظ میں زبان کا پچھلا حصہ اور تالو کا نرم حصہ کام دیتا ہے انھیں حلقیہ (Guttural) کہتے ہیں۔ ت کے لئے ذلق (اطراف زبان) اور تالو کا سخت حصہ مقرر ہے اس کا نام لہویہ (Palatal) ہے۔ حروف سینہ (dental) چار قسموں میں منقسم ہیں۔ اور ان کے اعضائے تلفظ یہ ہیں (۱) ذلق اور لثہ (مسوڑھا) جبکہ نوک زبان اٹھی ہوئی ہو۔ (ج۔چ۔ش) (۲) ذلق اور دانت (ز۔س) (۳) اسلتہ اور نطع (ٹ۔ڈ۔ل۔ن) اور (۴) اسلتہ اور دانتوں کے کنارے (تھ۔د) (۵) شفویہ کی ایک مد میں (ف) نیچے کا ہونٹ اور اوپر کے دانت کام میں لائے جاتے ہیں اور دوسری میں (ب۔پ۔م) دونوں ہونٹوں سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہ کے علاوہ سب حرفوں کی آواز دو دو اعضا کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ صوتیات دان اگر اس ہوا کی نیرنگیاں ذہن نشین کرنے کے لئے ان

---

۵۱ منتخب اللغات میں اسلتہ۔ ذلق۔ اور نطع کے یہی معنے لکھے ہیں۔ کاسپاری نے بھی اپنی قواعد عربی میں انھیں اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر اسٹینگاس نے ذلق اور اسلتہ دونوں کے معنی نوک زبان لکھے ہیں اسٹینگاس پر دونوں کو ترجیح دی گئی ہے کیونکہ اسٹینگاس نے منتخب اللغات پر اضافہ کرکے اپنی لغات فارسی و وانگریزی بنائی ہے۔ اور کاسپاری کے حامی و موئید اہل زبان ہیں۔

اعضا کے نام لیتا جن کے متفقہ عمل سے یہ وجود میں آئیں تو لمبے چوڑے نام رکھنے پڑتے جنھیں سنکر سامعہ ناک بھوں چڑھاتا اور سہولت و نفاست کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اس لئے اس نے تفصیل سے قطع نظر کر کے اجمال کی طرف رخ کیا اور محض اس مقام کو مدّنظر رکھ کر جہاں آواز پیدا ہوئی تھی نام تجویز کیا۔ مثلاً ب۔ پ کو اس نے شفویہ میں داخل کیا کیونکہ ہونٹوں کے مل کر جدا ہونے کے بعد آواز ہونٹوں میں گونجتی ہے[۵۱]۔

یہ کہنا کہ صوتیات دان راہ راست سے بھٹک گیا یا صراط مستقیم کی جادہ پیمائی کرتا رہا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ تسمیۂ اشیا و تصورات بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کی دشواری نے اسے رسم و قیود سے آزاد کر دیا ہے مگر چند مثالوں سے مقصد واضح کیا جاتا ہے۔

کھیر ایک معمولی لفظ ہے اس کی اصل کشیر (क्षीर) ہے۔ سنسکرت میں کشیر دودھ کو کہتے ہیں، غور کیجئے کہ کھیر میں چاول۔ دودھ۔ شکر تین چیزیں ہوتی ہیں مگر نام رکھنے کے واسطے اس کے تین اجزا میں سے صرف ایک سے کام لیا گیا۔

پانی۔ یہ سیدھا سادہ لفظ پا (पा) انی (अनीय) سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "پینے کے قابل"۔ کیا دنیا میں لوگ صرف پانی ہی پیتے ہیں اور یہی ایک چیز "پینے کے قابل" ہے؟ انگور و انار کو نچوڑیئے اور عرق پیجئے۔ کون ہے جو کہے گا کہ "یہ پینے کے قابل نہیں"؟ پھر اس سے تو ایک ہی وصف ظاہر ہوا، اس میں اور وصف بھی تو ہیں، نام انھیں کیوں نہیں بتاتا؟

دودھ کا ماخذ سنسکرت کا دُگدھ (दुग्ध) ہے۔ اشتقاق کی بھول بھلیوں میں چکر لگا کر نکلنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی ہیں "دوہا ہوا"۔ یہاں خواص شئے نظر انداز کر دئے گئے۔ صرف اس عمل کی بنا پر نام تراشا گیا جو شئے مطلوبہ حاصل کرنے کے لئے ایک جانور کے ایک حصۂ جسم پر کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمار کو اپنی کامیابی کے لئے ایتلاف (Association) پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور ایتلاف کی جان مشاہدہ معائنہ ہے۔ اگر کسی چیز کا نام لیتے ہی اس کی صورت و شکل اور خواص وغیرہ آنکھوں کے سامنے نہ پھر جائیں تو اس کا صحیح صحیح تصور محال ہے۔ مثلاً عنقا کا صحیح تصور بھی اب عنقا ہے۔ جنھوں نے اسے کبھی دیکھا تھا وہ لفظوں میں اس کی دھندلی سی تصویر

---

۵۱ نیسفیلڈ نے زبان کو اس وجہ سے خارج از بحث سمجھا ہے کہ وہ کئی حرفوں کے ادا کرنے میں شریک ہے۔ سنسکرت کی روش سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ عربی نے بھی صرف دو قسم کے حرفوں کے نام زبان کی نسبت سے رکھے ہیں۔

کھینچ گئے ہیں مگر یہ تصویر بھی اتنی دھندلی ہے کہ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پر و بال پنجہٗ ومنقار کیسے تھے۔ اس لفظ کو سن یا پڑھ کر ذہن میں صرف اتنی ہی بات آسکتی ہے کہ یہ ایک پرند کا نام ہے جس کی گردن بہت لمبی تھی اور جواَب معدوم ہے۔ اس بارہ میں ایتلاف کی کل ہی کائنات ہے۔ برخلاف اس کے لفظ کبوتر سُن یا پڑھ کر ایتلاف جو دنیا چشم تصور کے سامنے لاتا ہے اس کی حدود میں اس سے کہیں زیادہ وسعت ہے۔

دراصل اگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ صوتیات دان کا طرز عمل غلطی سے پاک ہے تو یہ کہنا بھی قرینِ صحت نہیں کہ وہ راہِ راست سے بھٹک گیا ہے۔ بظاہر اُس نے اختصار کو مدِنظر رکھا اور سہولت و نفاست طبایع کا پاس کیا۔ اس کی روش سے باقاعدگی ہویدا ہے۔ پستی سے بلندی کی جانب روانہ ہوا اور اوج رفعت پر پہنچکر پھر پستی کی طرف چلا۔ اس کی ذہانت وفطانت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ ہنگام جادہ پیمائی تسمیہ اس نے جس خوبصورتی سے اپنا دامن گرد اشتباہ سے بچایا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

افلاس کے وجوہ

لوگ کیوں مفلس ہو جاتے ہیں :-

(۱) وہ خیال کرتے ہیں کہ انھیں رزق پہونچانا دنیا کا ایک فرض ہے،

(۲) وہ اپنے اخراجات کا حساب نہیں رکھتے

(۳) اُن کے تفریحی مشاغل زیادہ ہوتے ہیں اور وہ اُن میں ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

(۴) اُنھوں نے جلد دولتمند بنجانے کے خیال سے اپنے موجودہ ذریعۂ معاش کو چھوڑ دیا ہے۔

(۵) وہ احباب کو اپنی نیک مزاجی اور فیاضی پر بار ڈالنے کی اجازت دیتے ہیں

(۶) وہ ان کاموں کو کرنا چاہتے ہیں جن کی اُن سے توقع کی جاتی ہے نہ کہ اُن کاموں کو جنھیں وہ بقدر استطاعت کر سکتے ہیں۔

(۷) وہ اس کام کو آج نہیں کر ڈالتے جسے وہ کل تک کے لئے ملتوی کر سکتے ہیں۔

(۸) وہ خیال کرتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر ضرورت کیلئے روپیہ بچالینے کا کافی وقت رہے گا۔

(۹) سو روپیہ سالانہ کی آمدنی رکھتے ہوئے وہ تین ہزار روپیہ کی سالانہ آمدنی والے پڑوسی کا ظاہرداری میں مقابلہ کرنا چاہتے ہیں (باقی)

مسرور کاکوروی

(از حضرت آفسر صدیقی امروہوی)

پیر بخش نام اور مسرور تخلص، کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام حکیم حیات اللہ تھا۔ "سخن شعرا" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور قلاش تخلص کرتے تھے۔ مسرور کی استعداد علمی تو کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن اہل کمال کی صحبت نے ضروریات شعری سے باخبر کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سارے دیوان میں دو ایک مقامات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو زبان کی صحت و شستگی بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں اُردو کے ساتھ پوربی زبان کے مصرعے بھی تضمین کر دئے ہیں جس سے اُن کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مسرور کی طبیعت سیاحت پسند واقع ہوئی تھی، مدت تک دہلی اور اکبرآباد وغیرہ کی طرف گشت کرتے رہے۔ غالباً اسی زمانہ میں صاحب عالم مرزا سلیماں شکوہ کی ملازمت کا شرف حاصل ہوا اور صاحب عالم بہادر کے خدام میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ جابجا اس نسبت و خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:-

ہے بسکہ سلیماں کے علاقہ کا مجھے فخر — ذکر ہوں سکندر کا نہ کچھ جم سے علاقہ
کہتا ہے یہی سارا زمانہ مجھے مسرور — اس شخص کو ہے صاحب عالم سے علاقہ

کہیں کہیں دوسری باتوں کے علاوہ صاحب عالم کی شاعری کی تعریف بھی کر گئے ہیں ؎

میں ریختہ پہ سلیماں کے غش ہوں اے مسرور — غزل وہ کہتے ہیں جس کو کہ فارسی نہ لگے

جس زمانہ میں صاحب عالم بہادر رونق افروز لکھنؤ تھے شعر و شاعری کا مشغلہ اپنے شباب پر تھا، جابجا مشاعرے منعقد ہوتے تھے، غزل گویوں کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر گئی تھی کیا غریب کیا امیر جس کو دیکھئے نشۂ صہبائے سخن میں سرشار نظر آتا تھا۔ خود سلیماں شکوہ کا دربار اکثر شعرائے دہلی و لکھنؤ کا ملجا و ماوے تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی، سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی، شیخ قلندر بخش جرأت اکبرآبادی وغیرہ متعدد شعرائے شیریں کلام رات دن داد سخنوری دے رہے تھے۔ ان میں مصحفی کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ مسرور بھی ان ہی کے شاگرد تھے

مسرور کا دیوان مکمل تھا، لیکن اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ حال میں مولانا حسرت موہانی نے ایک انتخاب شائع کیا ہے جو تیس بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس انتخاب میں صرف غزلیں ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مسرور کو غزل گوئی کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں فکر کرنے کا موقع نہیں ملا یا اور کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ مسرور کا رنگ شاعری وہی ہے جو تمام متقدمین شعرائے اردو کے ساتھ مخصوص ہے۔ خیالات بالکل سادہ ہیں، زبان میں تصنع کو مطلق دخل نہیں البتہ ردیفیں ضرورت سے زیادہ سخت استعمال کی گئی ہیں۔ اور یہ اثر تھا لکھنؤ کی اس بگڑی ہوئی آب وہوا کا کہ ہر طرح میں دوغزلہ سہ غزلہ لکھنا تمغائے کمال اور مشکل سے مشکل ردیف کو آسانی وخوبصورتی کے ساتھ نباہنا نشانِ کامیابی تصور کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں ؎

گھونگھٹ کا شرم پر ہے حجاب اور دوسرا
پردے میں رُخ ہے، رُخ پہ نقاب اور دوسرا

ایک اور غزل ہے ؎

دستِ جنوں کے فیض سے عریاں تو بن چکا
بس لے رفوگرو! یہ گریباں تو بن چکا

اسی زمین میں یہ شعر کس قدر صاف نکل گیا ہے ؎

کیوں ڈالتے نہیں رخِ شفاف پر نقاب
منظور اور کیا ہے میں حیراں تو بن چکا

دن وصل کے، رنجِ شبِ غم بھول گئے ہیں
یہ خوش ہیں کہ اپنے تئیں ہم بھول گئے ہیں

دن وصل کے یعنی وصل کے دن، اس زمانے میں اس قسم کی تعقید ضرورتاً جائز سمجھی جاتی تھی اس زمین میں ایک شعر خوب کہا ہے ؎

کاٹی ہیں مہینوں ہی تری یاد میں راتیں
غفلت میں تجھے گر کوئی دم بھول گئے ہیں

اسی مفہوم کا ایک بہترین شعر مولانا حسرت موہانی کا بھی ہے ؎

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں بھی نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ایک اور شعر ہے ؎

کچھ ہوش ٹھکانے ہوں تو لیں نام کسی کا
ہم دے کے کہیں دل کی رقم[1] بھول گئے ہیں

ہنستے ہوئے اک دن مرے گھر آئے تو ہوتے
لینے دلِ نالاں کی خبر آئے تو ہوتے

---

[1] اصل لفظ رقم بہ سکون قاف ہے لیکن یہاں متحرک استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب سے تقریباً ایک صدی بیشتر بھی رقم کی بدلی ہوئی صورت نے زبان عام پر تصرف حاصل کر لیا تھا۔ داغ نے اسی کی تقلید میں کہا ہے ؎

تمہیں ناز ہو کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا

ردیف کے ساتھ صنعتِ تضاد کا لطف بھی دیکھئے ؎

ہر چند کہ گلشن کی فضا اور ہی کچھ ہے   اے گل ترے کوچے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

مندرجہ بالا ردیفوں کی مشکلات کا اندازہ کیجئے اور دیکھئے کہ شاعر نے مضمون آفرینی اور پرواز تخیل کے لحاظ سے نہیں بلکہ سخت زمینوں میں چلنے کے لحاظ سے کہاں تک اپنے کمال کی نمایش کی ہے۔

مسرور کے دیوان میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں صراحتاً زبانِ قدیم کا تتبع ہے مثلاً ایک غزل ہے ؎

ان ساعدوں کی طرز میں نظر آئیاں ہیں   خوش آئیں شاخِ گل! تری انگڑائیاں ہیں

جن سے خیالِ وصل ہے وہ صورتیں مدام   آ آ کے خواب میں ہیں مرا جی کڑھاتیاں

بعض جگہ عطف و اضافت کی حالت میں اعلانِ نون بھی ہے ؎

شیشوں پہ شکست آئے تو غم اس کا نہیں کچھ   انسان سے یارب دلِ انسان نہ ٹوٹے

لیکن اس بنا پر وہ موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جاسکتے، لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ یہ طرزِ عمل اب سے کچھ مدت پہلے تک جائز تھا۔

مسرور نے طبیعت کے زور میں بعض اشعار ایسے بھی کہے ہیں جن کی عمومیت و رکاکت کو متمدن طبقہ کی شاعری برداشت نہیں کر سکتی، لیکن اس معاملہ میں وہ بے قصور ہیں، ہر شاعر کے یہاں معاملاتِ عشق و محبت کے تحت میں ایسے نقشے بھی کچھ جایا کرتے ہیں جن کی سوقیت مسلم ہو، خیر اب مسرور کے چند شعر سن لیجئے :-

کیا اسی کی بزم میں بھر لانے تھے آنسو تجھے   مفت میں رسوا مجھے اے چشمِ نم تو نے کیا

خوشی کا روز ہے موقع نہیں لڑائی کا   ہنسی کی بات پر اتنا عتاب وصل کی شب

پنہاں لگی ہے سینے کے اندر نظر کی چوٹ   دکھلائیں آہ کس کو ہم اپنے جگر کی چوٹ

فلک پہ مہر خجل جن کے رخ سے ہے مسرور   زمیں پہ ایسے بھی ماہ منیر کتنے ہیں

نظروں سے میری چاہ کو پہچانتے ہیں لوگ   کمبخت اپنے پیار کی چتون کو کیا کروں

ہر گھڑی رنجشِ بیجا ہے، دل آزاری ہے   جی میں سوچو تو یہی طرزِ وفاداری ہے

سادگیِ زبان اور ولی دکھنی

(از سید مقبول حسین احمد پوری)

ولی[1] کے اشعار پر تبصرہ کرنا زبان اُردو کے نونہالوں کی بھولی بھولی باتوں کی ایک دلچسپ اور پیاری کہانی سنانا ہے۔ کیونکہ بقول آزاد ولی کا ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر[2] کا اور فارسی میں رودکی[3] کا اور عربی میں مہلہل[4] کا"۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری کے آغاز میں ولی سب سے زیادہ ممتاز تھے اور نصرتی[5] پر اُن کو تفوق حاصل تھا۔ خود میر صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"

اور بقول آزاد ان کے اشعار کی شہرت سے "گیت موقوف ہو گئے اور قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے"۔ لیکن باوجود غلبۂ فارسیت بھاشا زبان کی سادگی کا اثر ولی کے کلام میں بہت کچھ قائم رہا اور اسی پر ولی کی شاعری کا انحصار ہے۔ انداز بیان میں بھاشا کی پیاری پیاری سادگی قائم ہے۔ اگرچہ خیالات میں فارسی کی سی متانت نظر آتی ہے مثلاً

---

[1] ولی اللہ نام شمس الدین لقب، ولی تخلص۔ انکی جائے پیدایش اور ان کے خاندان کے متعلق تذکرہ نویسوں نے اختلاف ظاہر کیا ہے شمس العلما محمد حسین آزاد مرحوم آبحیات میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے انکی تحصیل علمی کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے"

مولانا عبدالحی صاحب مرحوم "گل رعنا" میں لکھتے ہیں:-

"اورنگ آباد میں تقریباً ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے ...... دلی میں شاہ گلشن نقشبندی ایک بزرگو شاعر ولی کے استاد تھے۔

لیکن اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ ولی نواح دکن کے رہنے والے تھے۔

[2] Geoffrey Chaucer (۱۳۲۸ء - ۱۴۰۰ء)

[3] رودکی دسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں گذرا ہے۔ ساسانی عہد کے شعرا میں رودکی اول مانا جاتا ہے پروفیسر براؤن نے اس کا مقابلہ "بارد" سے کیا ہے۔

[4] مہلہل متمدن عربوں میں سے گذرا ہے (خطبات الاحمدیہ)

[5] نصرتی سلاطین دکن یعنی محمد عادل شاہ اور اسکے بیٹے علی عادل شاہ کے زمانہ میں گذرا ہے۔ (گل رعنا)

ہے ناز میں صنم کا زلفاں دراز کرناں　　فتنہ کا عاشقاں پر دروازہ باز کرناں
ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں　　مشکل ہے جیو سوں تجکو اب امتیاز کرناں
شاید غزل ولی کی لیجا اُسے سناوے　　اس واسطے کیا ہے مطرب سوں ساز کرناں

اِن اشعار کو اگر آجکل کی زبان میں بھی لکھا جائے تو نہایت پُرلطف معلوم ہونگے، مثلاً

ہے ناز میں صنم کا زلفیں دراز کرنا　　فتنہ کا عاشقوں پر دروازہ باز کرنا
ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جی میں　　مشکل ہے جی سے تجکو اب امتیاز کرنا
شاید غزل ولی کی لیجا اُسے سناوے　　اس واسطے بجا ہے مطرب سے ساز کرنا

اشعار میں روزمرّہ واقع ہونے والی باتوں کو بالکل نیچرل یعنی حقیقی انداز میں ظاہر کرنا سادگی زبان کی دلیل ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی　　کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لیجاوے

عاشق کی معراج "دیدار یار" ہے، اس مضمون کو ہر قسم کے تکلفات سے بری رکھکر نہایت سادگی سے بیان کرنا شاید ولی کا ہی حصہ تھا ؎

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق　　کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

انگریزی ادب کے نقادوں نے چاسر کے کلام پر جو تنقیدیں لکھی ہیں ان میں ظاہر کیا ہے کہ چاسر کی زبان نہایت پیاری تھی جیسا کہ ذیل کے خیالات سے ظاہر ہوگا۔ چاسر اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے:۔

"تمہاری آنکھیں یکایک مجھکو افسوس گرفتہ نہ کرلیں"
"وہ فوراً مجھکو قتل کر ڈالیں گی۔"
"کیا اچھا ہوتا کہ اُن کا جادو مجھ پر نہ چلتا"
"لیکن جب میرے دل کا زخم ہرا ہو جائے گا"
"تو وہی (آنکھیں) اچھا بھی کریں گی"　　(مرسی لس بیوٹی)

چاسر کے خیالات کا اندازہ، ان کی سادگی و بے تکلفی کا مقابلہ اگر ولی کے ان اشعار سے کیا جائے تو زبان و بیان کی ابتدائی مگر پرلطف منزلوں کا لطف اِس وقت بھی حاصل ہوجائے مثلاً ؎

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا　　جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہونگا
زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے　　یہ زخم ترا خنجر بھالاں سے کہونگا

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی — یہ کشور ایراں میں سلیماں سے کہونگا
بے صبر نہولے ولی اس درد سے ہر گاہ — جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہونگا

چاسر کی مذکورہ بالا نظم (مرسی لس بیوٹی) میں ایک جگہ اور بھی ولی کی سی سادگی اور دلکش انداز بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے چاسر کے خیالات بالکل مشرقی شعرا کے سے خیالات معلوم ہوتے ہیں :۔

"تمہارے سر کی قسم۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں

"تم ہی میری زندگی ہو، اور تم ہی میری موت ہو"

لیکن اگر ولی کے مندرجہ ذیل اشعار کا مقابلہ چاسر سے کیجئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہی خیالات کسی قدر تصرف کے ساتھ ترجمہ کی صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں ؎

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا — ہے مطالع مطلعِ انوار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا

ولی اور چاسر کا مقابلہ کرنے سے ہمارا مطلب یہ ثابت کرنا نہیں کہ چاسر نے ولی کی صورت میں ایک مسلمان کے گھر میں جنم لیا، مگر یہ دکھانا ضرور مقصود ہے کہ ہر زبان کی ابتدائی منزلیں سادگی اور بے تکلفی کا اظہار کرتی ہیں۔ اگر چاسر کا مقابلہ ملٹن سے کیجئے اور ولی کا غالب سے تو شاید ہمارے قول کی اور بھی زیادہ تصدیق ہوجائے گی۔ کیونکہ موخرالذکر شعرا کے کلام سے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کا سنِ بلوغ ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی شعرا میں سے چاسر کیا اگر فارسی شاعر رودکی کے مندرجہ ذیل مشہور اشعار پڑھیئے اور ان کا مقابلہ ولی سے کیجئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ دونوں بھائی بھائی ہیں۔ ایک فارسی زبان بولتا ہے اور دوسرا ہندوستانی زبان ؎

بوئے یار مہرباں آید ہمی — یاد جوئے مولیاں آید ہمی
ریگ آموو درشتیہائے او — پائے مارا پرنیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہمی

ان اشعار کو پڑھکر ولی کا یہ شعر پڑھئے اور لطف اُٹھایئے ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ۔۔۔ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

غرض ولی کا کلام سادگی زبان کا نمونہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر صاحب اور خواجہ میر درد کے کلام میں بھی بہت کچھ سادگی ہے، مگر ولی کا سا بھولا پن اور "متین بچپن" ان حضرات کے کلام میں نہیں، مثلاً ولی کے یہ اشعار ؎

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر ۔۔۔ جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر

ہے جدائی میں زندگی مشکل ۔۔۔ آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی غیر آستانۂ یار ۔۔۔ جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نوگرفتار عاشق محبوب بے وفا کی خوشامد کر رہا ہے اور اپنی طرح محبوب کو بھی نرم دل سمجھ رہا ہے، یہ سادگی نہیں تو اور کیا ہے، بقول حزیں ؎

مرا بر سادہ لوحیہائے حزیں خندہ می آید ۔۔۔ کہ عاشق گشتہ و چشم وفا از یار ہم دارد

متاخرین کے کلام میں یہ بات نہیں وہ تو معشوق کے ساتھ اسکے اوصاف حسن کو بھی عیاری و چالاکی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بقول غالب ؎

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری ۔۔۔ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

مگر جہاں کہیں فارسیت کا رنگ زیادہ شوخ ہو گیا ہے وہاں ولی بھی بالکل غالب معلوم ہوتے ہیں مثلاً ذیل کے شعر کا دوسرا مصرعہ ؎

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن ۔۔۔ باعث خمیازۂ آغوش ہے

اور شاید یہ شعر پڑھکر اندازہ ہو جائیگا کہ خود ولی میں صلاحیت و متانت بہت کچھ تھی۔ شعر ؎

دشمن دیں کا دین دشمن ہے ۔۔۔ راہزن کا چراغ رہزن ہے

المختصر باوجود طبعی متانت و سنجیدگی کے ولی کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار زبان کی سادگی اور بے تکلفی کو ظاہر کرتے ہیں، اسلئے سادگی زبان کو "نظم اردو کی نسل کے آدم" یعنی شمس الدین ولی کا انداز بیان یا "اسٹائل" سمجھنا چاہیئے۔ اسکے علاوہ کوئی دوسری قابل تحقیق بات انکے کلام میں نہیں جو ان کو اپنے معاصرین یا دیگر شعرائے مابعد میں ممتاز ثابت کر سکے۔ اُردو زبان کے چاسر میں چاسر کی خصوصیات کلام کا موجود ہونا ہی کیا کم ہے، بمصداق ؎

"کہ ہم نادیدہ می دانی و ہم ننوشتہ می خوانی"

یاسمین

(از حضرت روش صدیقی)

(۱)

ایران کے مشہور بندر گاہ بوشہر کے متصل ایک خوش منظر گاؤں ساحلِ بحر پر آباد تھا، اس کا نام ریاض تھا۔ ایک سرسبز پہاڑی کا خوشنما دامن ریاض کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھا، اس کی خوبصورت عمارتوں اور جھونپڑوں کی دلآویزی نے اس دامنِ کہسار میں وہی مقام حاصل کر لیا تھا جو کسی بہار آفریں سبزہ زار میں کھلے ہوئے رنگ برنگ پھولوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

کتنے نام ایسے ہوتے ہیں جنھیں اپنی معنویت سے شرمندہ ہونا نہیں پڑتا؟ یقیناً بہت ہی کم مگر ریاض حیرت انگیز طور پر اسم بامسمّٰی تھا۔ نووارد سیاح اس مینو سواد گاؤں کو ایک دلکش بہارستان سمجھتے تھے۔ اور اُس کے گوشہ گوشہ پر فردوسی کیاریوں کا گمان کرتے تھے، باغبانِ فطرت نے ریاض کی تزئین و آرایش میں کتنی لازوال صناعیاں بے نقاب کر دی ہیں؟ یہی ایک احساس تھا جو ریاض کے ہر نو وارد مسافر کے قلب کو بیدار کر دیتا تھا۔

ذرا ریاض کی فصلِ بہار کا تصور تو کیجئے۔ چشمہ ہائے سیمیں قلّہ کوہ سے اچھلتے ہوئے چلے آرہے ہیں" موجوں نے بہار کا سحر آفریں گیت چھیڑ رکھا ہے۔ خوش آواز سنہرے روپہلے پروں والے طائروں کے قافلے بہار کا نغمۂ خیر مقدم الاپتے ہوئے چشموں کے ادھر اُدھر پرواز کرتے پھر رہے ہیں۔ یاسمین و گلاب کی جھاڑیوں سے مست کن خوشبوؤں کے طوفان ریاض کی گلبار فضا میں منتشر ہو رہے ہیں، مطربانِ محبت، بلبلوں کے جھنڈ، محبت کا پہلا تیر دل میں چبھوئے ہوئے نوخیز کلیوں کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ اس بزمِ نشاط و سرود میں کبھی کبھی کسی بلبل کا نغمۂ رنگیں نالۂ جگر دوز کی سوگواریوں میں ڈوب کر بلند ہو جاتا ہے اور فطرت، ایک بار پھر دل پکڑ کر رہجاتی ہے۔ آہ اے ریاض! تیری کشش انگیز دلچسپیاں!

اسی گاؤں میں ایک روح افزا باغ تھا اور اُس کے عین قلب میں ایک سفید ایوان۔ اسکو باغ نہیں انگورستان کہیئے، جابجا ٹٹیاں لگا کر انگور کی بیلیں پھیلا دی گئی تھیں، کیاریوں میں پتلی سی نہر کے ساتھ ایوان کی دیواروں پر، باغبان کی جھونپڑی پر غرض ہر طرف انگور ہی انگور نظر آتے تھے۔

باغ اور ایوان کا مالک ایک دولت مند ہفتاد سالہ ایرانی تھا۔ تیر کی طرح کشیدہ قامت۔ بھویں کمان کی طرح چڑھی ہوئیں۔ پیشانی چاند کی طرح شفاف۔ اس عمر میں اس کی پیشانی کس قدر روشن تھی! داڑھی عجمی تمدن کی موزوں تصویر، مونچھیں برف کی طرح سفید مگر ایک خاص انداز لئے ہوئے آنکھیں بڑی بڑی جن میں ایک حیرت انگیز کشش پنہاں تھی، مقناطیس میں یہ کشش کہاں؟ رخساروں پر شباب کی سُرخی تو نہ تھی مگر پیری کی سیاہی بھی یہاں کالعدم تھی۔ یہ ہے ہمارے ایرانی بزرگ کی تصویر!

قدامت اس کی ایک ایک ادا پر قربان تھی، زندہ دلی اور خوش باشی اس کی وطنی خوبیاں تھیں، دنیا جانتی ہے کہ ایرانی کتنے خوش دل ہوتے ہیں۔ خیام اور حافظ کے ہموطنوں سے اسکے سوا توقع ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اس کا نام آغا حسن تھا، وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو، ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں۔ ہاں جب وہ اپنی شانزدہ سالہ حورجمال لڑکی یاسمین کے سامنے نظیری و عرفی کے ذوق تغزل پر تنقید کرتا تو فصاحت و بلاغت کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتا، شاید جوانی میں وہ خود ایک ذہین شاعر ہو مگر اب تو مدت سے اس کے افکار تازہ ریاض کے مشاعروں میں نہیں پہونچتے تھے۔

فطرت کی ستم ظریفی تو دیکھئے۔ آغا حسن تو اپنے جذبۂ شعریت کو مدفون کر کے اسکی تکمیل پر آمادہ تھا، کہ یاسمین کے محسوسات رنگین نے شعر کا دلنواز لباس پہننا شروع کیا۔ اُس نے حافظ و عرفی کی کتنی ہی غزلوں پر غزلیں کہہ ڈالیں۔ آغا حسن نے اُسے ایک دفعہ فکر شعر میں مصروف دیکھا مُسکراتے ہوئے پوچھا:۔

یاسمین! قربانت شوم، فکر شعری کنی؟

یاسمین ایک معصوم انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آخر آغا نے یاسمین کی غزل دیکھ ہی ڈالی ایک ایک شعر پر اس کی روح یاسمین کے رنگین و پاکیزہ جذبات میں کھوئی جا رہی تھی۔ اس نے مسرتوں کے لامحدود جوش کے ساتھ یاسمین کو اس ذوق شعری پر مبارکباد دی۔ اور اس کے بعد آغا حسن کا بہترین شغل ریاض کے خوش گو شعرا کے ساتھ مل بیٹھ کر یاسمین کی بلند شعریت پر فصیح و بلیغ تبصرہ کرنا ہو

یاسمین فطرت معصوم کا ایک سحر آفریں نقش تھی، ریاض تو کیا دور دور اُس کے حسن خداداد کا جواب نہ تھا، وہ صبیح تھی اور ملاحت اس کے حسنِ صبیح میں اسی طرح نمایاں تھی کہ جیسے صبح کاذب کی نورانی صباحتوں میں ایک دلکش ملاحت نمودار رہتی ہے، چاہے یہ ملاحت لیلیٰ شب کے گیسوؤں کا سایہ ہی کیوں نہ ہو۔

یاسمین کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے؟ اس کا حُسن ایک نقاد کی گیرائیوں سے یکسر آزاد تھا۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں! خوبصورت اور گھنی بھوؤں کے نیچے۔ دو چشمے دامن کوہ میں اُبلتے ہوئے نہیں نہیں چشموں میں وہ موتی کہاں ہوسکتے ہیں جو اس کی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ شاید آسمان کے دو گم شدہ ستاروں نے اُس کی دلربا آنکھوں میں پناہ لی تھی، اس کے رخساروں، اس کے ہونٹوں، اس کے شانوں، اس کی گردن کے بارے میں کیا کہا جائے؟ بیشک اس کا غیر فانی حُسن تنقید سے کہیں بالاتر تھا۔

ریاض تو اسم بامسمیٰ ہونے کی خصوصیت رکھتا ہی تھا، مگر یاسمین بھی گلستانِ فطرت میں یاسمینی دلربائیوں کی حامل تھی۔ جب وہ اپنے مشکبار بالوں میں یاسمین کی کلیاں لگا لیتی تو بالکل ایک فردوسی حور بن جاتی۔ اندھیری رات میں درخشاں ستاروں کی جگمگاہٹ کتنی نظر فروز ہوتی ہے! گہرے سیاہ بالوں میں یہ سفید پھول بھی اسی طرح چمکتے اور جگمگاتے تھے۔

گاؤں کے نوجوانوں میں کون تھا جسے یاسمین سے بے اندازہ محبت نہ تھی، مگر اظہار محبت کی جرأت کسی کو نہ ہوسکتی تھی۔ آغا حسن کی تمکنت، اس کا خاندانی وقار، اس کی رگوں میں دوڑنے والا شاہی خون، یہ سب چیزیں ان دلدادگانِ حسن کی راہ میں کوہ گراں کی طرح حائل تھیں۔ آغا نے کئی بار اپنے اس عزم بالجزم کا اعلان کر دیا تھا کہ یاسمین کی شرکت حیات کے لئے صرف وہی خوش نصیب منتخب ہوسکے گا جس کی رگوں میں شاہی خون رواں دواں ہو۔ ریاض میں ایسے خاندانی نوجوان کہاں تھے؟ کچھ سوداگر، کچھ زمیندار، کچھ صاحب حرفت اور کچھ معمولی پیشہ ور۔ ان میں بعض کو غیر معمولی طور پر دولت و حشمت حاصل تھی، مگر تمول کوئی ایسی شے تو نہ تھی کہ جو آغا حسن کی خود داری کو خرید سکتی۔

(۲)

اسی ریاض میں ایک متمول زمیندار احمد مرزا تھا، معاشرت کے لحاظ سے وہ اگر خود کو خوش نصیب سمجھتا تو یہ احساس حق بجانب تھا۔ کئی گاؤں کی زمینیں اس کی ملکیت میں شامل تھیں جن کا معتدبہ حصہ

انگوروں کے باغ پر مشتمل تھا۔

احمد مرزا کو اپنی خوشحالی و تمول پر تو کچھ زیادہ ناز نہ تھا مگر اپنے نوجوان اور خوش جمال اکلوتے لڑکے قاسم مرزا کی علمی فتوحات کے ذکر پر اس کی پیشانی غرور و ناز سے اونچی ہو جاتی تھی۔ قاسم مرزا ریاض ہی میں نہیں تمام ایران میں ایک بلند مرتبت ادیب و شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو رہا تھا۔ بیس سال کی عمر میں یہ عظمت و شہرت اس کے تمام خاندان کے لئے سرمایۂ نازش و افتخار تھی۔ آغا حسن جیسے سوائے یاسمین کی غزلیات کے کسی کا کلام پسند ہی نہ آتا تھا، قاسم مرزا کی شاعرانہ اولوالعزمیوں کے سامنے سر خم کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کئی بار اس نے یاسمین کی ہمنوائی کرتے ہوئے ریاض کے اس فطرت نگار شاعر کو خراج تحسین پیش کیا۔

خود یاسمین کے قلب پر قاسم کی شاعری نے جو نقوش قائم کئے تھے وہ اعتراف فن سے کہیں دور، محبت و عقیدت کی دنیا لئے ہوئے تھے، مگر یاسمین نے قاسم پر اور قاسم نے یاسمین پر کبھی معمول میں بھی اپنی ناقابل برداشت محبت کا اظہار نہ کیا، اتنا ضرور تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی بے حد عظمت کرتے تھے۔

یاسمین کے انگورستان میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا تو اس میں قاسم کی شخصیت بجا طور پر بلند و ممتاز ہوتی۔ مشاعرہ ختم ہو جاتا، حاضرین رخصت ہو جاتے، مگر آغا حسن یاسمین کے اصرار پر قاسم مرزا کو روکنے پر مجبور ہو جاتا، شعر و سخن کا ایک خاص دور شروع ہوتا اور اس طرح کبھی کبھی نصف شب کے بعد واپسی کی نوبت آتی۔ ایسا بھی ہوتا کہ اس خوشگوار سلسلے کی کڑیاں دراز ہوتی چلی جاتیں اور قاسم مرزا کو آغا حسن کے خوشنما ایوان میں شب باش ہونا پڑتا۔ جو انگورستان کے وسط میں سفید پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ اس قصر کا ایک خاص حصہ یاسمین کی آرام گاہ تھا جہاں وہ اپنی ایک کنیزک کے ساتھ شباب حیات کی خوش منظر منزلیں طے کر رہی تھی۔ کبھی کبھی سحر و شام کی پر کیف ساعتوں میں یاسمین قاسم کو مدعو کر لیتی اور انگوروں کے سایہ میں فلسفۂ شعر و حسن شعر پر بحث ہوتی یہ سب کچھ تھا مگر اس قربت کے باوجود دونوں محتاط تھے، وہ چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کو محبت سے بے خبر رکھیں۔ قاسم کی تو فطرت ہی کچھ ایسی تھی مگر یاسمین جو شاید اضطراب جذبات سے مجبور ہو کر کئی بار اظہار محبت کر چکی ہوتی صرف آغا حسن کی شخصیت سے مرعوب تھی۔ ریاض والے اور خود یاسمین اور آغا تو یہی جانتے تھے کہ قاسم مرزا شاہی خاندان سے نہیں ہے۔ ایک ایرانی نژاد دوشیزہ اپنے باپ کی فرمانبرداری کو سعادت کونین سمجھتی ہے۔ یاسمین تو بہت ہی فرماں بردار لڑکی تھی۔

(۳)

یاسمین کی سترھویں سالگرہ پر آغا حسن نے انگورستان میں ایک عظیم الشان جشن نشاط ترتیب دیا۔ اس کی مسرتوں کو اس تقریب سعید نے بے پایاں بنا دیا تھا، ایک اصفہانی شہزادہ جسے تاجدار ایران سے دُور کی قربت حاصل تھی اس جشن میں شریک تھا اس کا نام بہزاد تھا۔

بہزاد ایک خوش رو نوجوان تھا، سرخ و سپید چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں، مزاج میں ایک خاص قسم کی تمکنت موجود تھی جس کا سبب اس کی خاندانی عظمت سمجھئے یا اس کی خود بینی۔ آغا نے اپنے مہمان عزیز کا تعارف کراتے ہوئے حاضرین کے سامنے ایک پر جوش تقریر کی۔ آج اس کا قلب لامحدود مسرتوں سے لبریز تھا، اس کی تقریر بڑی مسرت انگیز تھی۔ اس کے بعد طہران کے ملک الشعرا نے یاسمین کی توصیف میں اپنا قصیدہ پڑھا جس میں صناعانہ شاعری کی تمام مرصع خوبیاں جمع کر دی گئی تھیں۔

قاسم مرزا بھی اس خوش نصیب مجمع میں موجود تھا، اس کی نشست آج بھی ایک امتیاز کی حامل تھی، مگر خود قاسم مرزا کسی دوسری ہی دنیا میں تھا، اس کے دلنواز چہرے پر فکر و انتشار کے دھندلے اثرات دوربین نگاہوں کو صاف نظر آسکتے تھے۔ اس قدر پر سرور تقریب اور قاسم مرزا کی یہ سوگوار حالت عقل اس معمہ کو حل کرنے میں ناکام تھی۔ قصیدہ پڑھنے کے لئے اس سے کہا گیا تو اُس نے خشک لہجہ میں جواب دیا "اچانک میری طبیعت ناساز ہوگئی ہے، جناب کوکب میرا قصیدہ پڑھیں گے" آغا حسن جو قریب ہی بیٹھا تھا عجلت سے بول اُٹھا "ایں قاسم مرزا یہ کیا؟ کوکب بیچارہ تمہارا قصیدہ کیا پڑھے گا۔ دیکھو مجھے کافی سے زیادہ رنج ہوگا۔ اگر تم نے قصیدہ پڑھنے میں کوئی عذر کیا۔ عزیزم قصیدہ تم ہی کو پڑھنا ہوگا"

آغا کے ساتھ ہی تمام حاضرین کے زبردست مطالبہ پر قاسم مرزا کو سر جھکا کر خاموش ہو جانا پڑا آخر وہ دیوانوں کی طرح اسٹیج پر پہونچا، مجمع پر ایک وحشت زدہ نظر ڈالی، یکایک اُس نے بہزاد کو حقارت سے دیکھا اور اس کے بعد یاسمین کو جو بہزاد کے پہلو میں زرنگار کرسی پر فردوسی حور بنی بیٹھی تھی۔

اُس نے بے پروائی کے ساتھ اپنے قصیدہ کا آغاز کیا، پہلا ہی مطلع پڑھا گیا تھا کہ مجلس کی فضا احسنت و مرحبا کی صداؤں سے گونج اُٹھی۔ قاسم مرزا کسی اور ہی عالم میں تھا۔ اُس نے گویا یہ تحسین و آفریں کے نعرے سُنے ہی نہیں، وہ بلا توقف قصیدہ خوانی میں مصروف رہا، یہاں تک کہ آخری شعر پڑھکر چپ چاپ اسٹیج سے اُتر آیا۔ یہ تمام عرصہ حاضرین کے پرجوش تعریفی نعروں سے ہنگامہ زار بنا رہا تھا مگر قاسم مرزا کے سکوت نے سب کو متحیر کر دیا۔ کسی پر اس سکون و خموشی کا راز نہ کھلتا تھا۔ ہاں یاسمین

تنقید کتب

ہندوستانی فونٹیکس (اُردو صوتیات)[۱]

(از ڈاکٹر زبید احمد، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی)

ڈاکٹر محی الدین قادری پی۔ ایچ۔ ڈی کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی کے مایۂ ناز فرزند ہیں اور مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم ایسے ماہر فن اُردو پروفیسر کے شاگرد ہیں آپ نے ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر تقریباً دو سال تک پیرس کی مشہور یونیورسٹی میں مزید علمی تحقیق و تفحص کا کام انجام دیا۔ آپ نے لندن میں اپنے مقالۂ علمیہ (Thesis) کے علاوہ فونٹکس (صوتیات) کے متعلق بھی کام کیا آپ نے یہ علم اولاً لندن اسکول آف اورنٹل اسٹڈیز کے پروفیسر صوتیات مسٹر لائڈ جمیس سے حاصل کیا اور پھر پیرس میں اس کی تکمیل کی۔ ولایت جانے سے پہلے آپ اُردو میں کئی قابل قدر کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں۔ جنیں سے روح تنقید، تنقیدی مقالات، اور اُردو کے اسالیب بیان، خاص طور سے ذکر کے لایق ہیں۔ قیام ولایت کے دوران میں آپ وقتاً فوقتاً تحقیقی مضامیں تحریر فرماتے رہے جو مختلف رسالوں میں شایع ہوئے۔ اسی مدت میں آپ نے دو بلند پایہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ایک اُردو میں جس کا نام "اُردو شہ پارے" ہے اور دوسری انگریزی زبان میں جسکا نام "ہندوستانی فونٹکس" ہے۔

علم صوتیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی غیر زبان کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے اس زبان کی صرف و نحو کا جاننا ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی غیر زبان کے حروف اور حرکات کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے اس زبان کی

[۱] مصنفہ جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زورایم۔ اے (عثمانیہ یونیورسٹی) پی ایچ۔ ڈی (لندن یونیورسٹی) بزبان انگریزی تقطیع ۸×۵ صفحات ۱۱۶۔ مطبوعہ پیرس۔

"ہاں!"

"تمھارا جی کیسا ہوتا ہے، بابوجی!"

میں نے مسکرا کر کہا "میٹھا"

ایک لمحے تک وہ خاموش رہا، پھر بولا، "اچھا کون کھائے گا؟" میں نے مسکرا کر جواب دیا "منّو" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "کون منّو؟"

میں "میرا منّو" یہ کہکر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میرا ہنسنا شاید منّو کو ناگوار معلوم ہوا، وہ جھینپ سا گیا، اور فوراً ماں کے پاس اندر بھاگ گیا۔

بچوں میں ایک نہایت پُر لطف وصف ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو کسی کی نظروں سے چُھپانا چاہتے ہیں تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سر نیچا کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کو کوئی نہ دیکھ سکے گا۔

ایک شام کو میں چہل قدمی کے لئے پارک جارہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک نیم کے درخت کے نیچے منّو اپنے چند رفیقوں کے ساتھ ایک کنواں کھودنے میں مشغول ہے۔ یکایک اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی، وہ سہم گیا کہ کہیں میں اس سے ناراض نہ ہونے لگوں۔ بیچارہ بھاگ بھی نہ سکتا تھا، کیونکہ میں بالکل قریب پہونچ چکا تھا، مجھکو اپنی طرف آتا دیکھکر اُس نے اپنا سر نیچا کر لیا اور اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اسکی اس طفلانہ ادا پر رحم آگیا۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھالیا اور پیار کرنے لگا۔ میرے کپڑے اُس کے مٹی بھرے ہاتھوں سے خراب ہوگئے، لیکن مجھے اس کا کچھ خیال نہ ہوا۔

منّو اب بچہ نہیں رہا، وہ اب ایک نوجوان طالب علم ہے، اُس کی صورت دیکھکر اکثر مجھکو اُس دن کی یاد آجاتی ہے، جب اُس نے مجھ کو دیکھکر آنکھیں بند کر لی تھیں میری نظروں میں ایک بار پھر وہ بچہ ہو جاتا ہے اور میں اُسے پیار کرنے لگتا ہوں۔

کان مسل دیتی ہے، تب بھی اس کو پناہ ملتی ہے تو آغوشِ مادر ہی میں، وہ روتا جاتا ہے اور ماں کی گود میں گھس کر اُس کی آنچل میں منہ چھپاتا جاتا ہے۔

بچے کے لئے ہر دل میں جگہ ہوتی ہے، سبھی اس سے محبت کرتے ہیں، اور وہ بھی سب کا لاڈلا ہوتا ہے۔ بچہ مٹھائی سے بھی زیادہ محبت کا بھوکا ہوتا ہے، بغیر مٹھائی کے وہ تھوڑی دیر صبر کرسکتا ہے لیکن محبت کے بغیر اس کا لمحہ بھر خوش رہنا محال ہوتا ہے۔ جس نے بچہ کو پیار کیا بچہ اُسی کا ہوگیا جس نے اُسے تیز نگاہوں سے دیکھا وہ اُس سے کوسوں دُور بھاگا۔

ایک دن میں باہر اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا میرے سامنے ہی دوسری کرسی پر میرے ایک دوست بیٹھے ہوئے تھے، فطرتاً وہ بہت نیک آدمی ہیں، لیکن بچوں سے اُن کو قطعی دلچسپی نہیں جب کوئی اپنے بچوں کو پیار کرتا تو وہ اس کا مضحکہ اُڑاتے۔ شاید ہی کسی نے بچوں کو اُن کے پاس پھٹکتے دیکھا ہو۔ بہرحال ہم دونوں باتیں کررہے تھے کہ اتنے میں میرا منو اندر سے دوڑتا ہوا آیا، اُس نے میرے دوست کی کرسی کے پاس پہونچکر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، شاید وہ بدقسمت اُن کی گود میں بیٹھنا چاہتا تھا، مگر اُنھیں کچھ تامل ہوا، کیونکہ اُنھوں نے عجب انداز سے منو کی طرف دیکھا، اس سرد مہری کو دیکھکر منو نے فوراً آنکھیں پھیر لیں۔ پھر وہ دوڑکر میری گود سے چمٹ گیا، میرے دوست نے بارہا کوشش کی، بہتیرا پُسلایا، مٹھائی اور کھلونے کا لالچ دیا، لیکن منو نے پھر اُن کی طرف آنکھ نہ اُٹھائی، اُنھوں نے اس کی مٹھی میں ایک روپیہ رکھدیا اور اُسے زبردستی گود میں لینا چاہا۔ مگر وہ روپیہ کو پھینک کر رونے لگا۔

بچوں میں انتقام کا جذبہ عجب انداز سے ہوتا ہے، وہ ہر مرد و زن کے ہمدرد اور معاون ہوتے ہیں، جہاں کوئی ذرا سا اُداس ہوا اور اُن سے کہنے لگا کہ مجھکو فلاں نے مارا ہے، تو چاہے مارنے والا آدمی، جانور، اینٹ، پتھر کوئی کیوں نہ ہو وہ اُس پر پل پڑتے ہیں اور بُری طرح اُسکی خبر لیتے ہیں۔

بچوں کے حرکات و سکنات سے معصومیت ٹپکتی ہے، اُن کے چھوٹے چھوٹے سوالات نہایت لطف انگیز ہوتے ہیں۔

ایک روز شام کو بیٹھا ہوا میں اخبار پڑھ رہا تھا منو میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ "بابوجی! گاندھی جی کون ہیں؟"

مَیں نے اخبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت بڑے مہاتما"

"بابوجی! وہ سوراج (سواراج) لیں گے۔"

بچپن

(از مسٹر جے کرشن)

بچپن بھی عجب چیز ہے، اس کی ساری باتیں عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ درحقیقت انسانی زندگی کا یہی زمانہ ہے جو تمام گناہوں سے پاک اور مکروفریب سے مبرا ہوتا ہے۔ اس عمر کی ہر ادا دل لبھانے والی اور طبیعت خوش کرنیوالی ہوتی ہے۔ بچوں کی دنیا ہی ایک نرالی دنیا ہوتی ہے، تفکرات دنیا اور رنج ومصائب سے کوسوں دُور بچہ کو صرف اپنی ماں ہی کی فکر ہوتی ہے، اُسی کی گود اس کے لئے بہشت ہو بچہ چاہے جتنا بلک بلک کر رو رہا ہو لیکن ماں کی گود اور اس کا پیار اس کی بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

بچوں کی شوخیوں میں ایک قسم کا جادو ہوتا ہے، اُن کی زبان سحر بیان ہوتی ہے، اُن کی ہنسی اور مسکراہٹ سے ایک دلکش ادا ٹپکتی ہے۔ اور نگاہوں سے دلفریب سادگی کا اظہار ہوتا ہے۔
انسان خواہ کتنا ہی مغموم ہو، بچے کی ایک پیاری بات، ایک موہنی مسکراہٹ اس کا غم غلط کر دیتی ہے، اسکی توتلی زبان میں وہ حلاوت ہے جو شاید قندونبات میں بھی نہیں۔ ایک تھکا ماندہ مزدور بھی جب اپنے گھر آتا ہے تو اپنے بچے کی صورت دیکھکر نہال ہو جاتا ہے۔ اس کا تکان، اُسکی تھکاوٹ چشم زدن میں مفقود ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ خود فراموشی کے عالم میں بچے کی محبت میں ہمہ تن محو ہو جاتا ہے۔

بچہ کی عجیب ہستی ہے، ذراسی بات پر اُسکی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں، لیکن لمحہ بھر بعد ہی پھر ایک دلفریب تبسم اس کے لبوں پر رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کا چہرہ صبح بہار کا شگفتہ گلاب ہوتا ہے بچہ کا رونا کیا ہے کنوار کی برکھا ہے، باپ نے ذرا ڈانٹ دیا، فوراً منہ لٹک گیا، ماں کے پاس فریاد لیکر پہونچا، ماں بات تاڑ گئی، فوراً ہی بچے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگی، بس اتنا ہی کافی ہو گیا۔ بچہ پھر کھلکھلا اُٹھا، اور آغوشِ مادر میں چہکنے لگا۔ ماں اگر اپنے بچہ کو ڈانٹتی ہے، جھڑکتی ہے یا اس کے

نے اس انکشاف کے متعلق دربار ایران کو ایک رپورٹ بھیجی، جس کے جواب میں ایک شاہی خریطہ موصول ہوا۔ اس خریطہ میں وہ پروانہ محفوظ تھا جس پر احمد مرزا کے شاہی خاندان سے متعلق ہونے پر مہر توثیق ثبت تھی۔ آغا حسن نے یہ پروانہ دیکھا تو باغ باغ ہو کر بول اٹھا:۔

"الٰہی تیرا شکر۔ تو نے میری خودداری کی شرم رکھ لی مجھے فخر ہے کہ میری یاسمین ایک جلیل القدر شہزادے کے دامن سے وابستہ ہے۔"

اور قریب بچھے ہوئے مصلے پر سجدۂ شکر میں جھک گیا۔

راز و نیاز محبت

"مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہاری محبت میرے دل میں گھر کر چکی ہے، میری بے لوث محبت ضرور تمہیں مجھ سے محبت کرنے پر مجبور کر دے گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں نہیں مانتی، یہ سب رسمی باتیں ہیں، حرص و ہوا کے بندے اسی جال سے باغ جہاں کے معصوم طائروں کا شکار کرتے ہیں۔"

"سنو سنو یہ سب غلط ہے، مجھے تم سے سچا عشق ہے، تمہاری محبت میرے دل میں ایسے داغ کی صورت اختیار کر چکی ہے جو کبھی نہیں مٹایا جا سکتا۔ مجھے تم سے ایسی محبت ہے جیسے بلبل کو گل سے"

"میں نہیں مان سکتی، یہ صریح دھوکا ہے، مجھے اپنا دل نکال کر دکھاؤ ورنہ سب باتیں ناقابل تسلیم ہیں"

"عاشق کا دل نہ دیکھو، اس کے نظارہ کی تاب تم میں نہیں ہے"

"جھوٹ بالکل جھوٹ" (شاعر)

شاعری کا معیار

شعر و نظم کے بارہ میں ہمارا آئیڈیل یہ ہے کہ نہ وہ کھتونی کی طرح بے کیف و بے روح ہو اور نہ پھر اس درجہ پر الم و رقیق کہ قدم قدم پر حرکت قلب بند ہونے کا احتمال ہونے لگے۔ افلاطون نے اپنے آئیڈیل ریپبلک میں شاید اسی قسم کے شاعر و شعر کی گنجایش نہیں پائی تھی۔

(ہندوستانی)

چھپی ہوئی تھی۔

مریض باپ کے مردنی چھائے ہوئے چہرہ پر اس کی نظر تھی اور دل قاسم مرزا کو ڈھونڈھ رہا تھا، کہ ایک کنیز نے قاسم مرزا کے آنے کی خبر سنائی۔ دوسرے ہی لمحہ میں قاسم مرزا یاسمین کے سامنے تھا۔ آہ! یہ وہی قاسم مرزا تھا جس کے حسن و شباب کی نظیر مردانہ حسن میں بہت کم ملتی تھی، مگر اب وہ ایک زردرو، نحیف و ضعیف نوجوان تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا "یاسمین آغا کی علالت کا حال مجھے یزد میں معلوم ہوا اور میں فوراً روانہ ہوگیا، اسی وقت یہاں پہونچا ہوں۔ خوش قسمتی سے میرے ہمراہ ایک قابل ترین طبیب بھی ہے۔"

یاسمین، جس کی دنیا اب بالکل بدل چکی تھی، ایک معصومانہ تشکر کے ساتھ قاسم مرزا کو دیکھنے لگی اس کے خلوص میں فرشتوں کی سی عصمت شامل تھی۔ آخر فوراً طبیب صاحب بلائے گئے، انھیں شاہی طبیب ہونے کا فخر حاصل تھا، مرزا محمد علی یا آقائے محمد علی جو کچھ بھی سمجھئے انکا نام تھا۔

آقا محمد علی کی آمد آغا حسن کے لئے نئی زندگی کا پیغام لائی۔ اُسے حیرت انگیز طور پر صحت ہونے لگی یہاں تک کہ ایک ہفتے میں وہ بالکل صحت یاب ہوگیا۔ دوسرا ہفتہ اس کی کمزوری کو قوت سے بدلنے میں صرف ہوا۔ قابل طبیب نے کچھ ایسی دوائیں اور غذائیں تجویز کیں کہ مہینہ ختم ہونے کے ساتھ ہی آغا نئے سر سے چاق و چوبند ہوگیا۔

اس درمیان میں قاسم مرزا کی خدمت و محبت نے آغا پر بڑا گہرا اثر ڈالا، اُسے معلوم تھا کہ قاسم ہی کے لائے ہوئے طبیب نے اُسے دوبارہ دولت حیات بخشی ہے، آخر اُس نے ماضی کے ایک خاص آغاز کی تکمیل کا ارادہ کرلیا اور اپنے اس فیصلہ پر وہ بنہایت مسرور تھا۔

(۵)

یاسمین و قاسم مناکحت کی پاک زنجیروں میں جکڑ دیے گئے ہیں، یہ قیداُن کے لئے کس قدر خوش گوار تھی! اس کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ آغا حسن کی مسرتوں میں ایک اہم راز کے انکشاف سے انتہائی اضافہ ہوگیا، اور وہ یہ حقیقت تھی کہ قاسم مرزا شاہی خاندان کا ایک فرد ثابت ہوا، احمد مرزا کے آبا و اجداد بوشہر میں رہتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنے دورِ زوال کے بعد احمد مرزا کا باپ ریاض میں چلا آیا، مگر اُس کی خاندانی شخصیت کسی پر نہ کھل سکی، یہاں تک کہ خود احمد مرزا اور قاسم مرزا اپنی اصلیت سے بے خبر تھے۔ آقائے محمد علی اسی باعظمت خاندان کے افراد میں سے تھے۔ اُنھوں نے احمد مرزا سے اس کے متوفی والد کا مفصل حال پوچھا تو عقدہ کھلا۔ اس کے بعد آقائے موصوف

قبر میں میرے ساتھ جائیگی، نہ معلوم کہاں کہاں آوارہ پھرتا ہوگا۔اس کا معصوم دل میری شکایتوں سے لبریز ہوگا، مگر اس کا گلہ ہی کیا، میں محبت کی مجرم ہوں، اور قاسم مرزا کی گنہگار۔آہ! اس کی بربادی میں میرا ہاتھ کام کررہا تھا اور میں خاموش بیٹھی دیکھ رہی تھی۔میری خاموشی جرم تھی، بیشک جرم عظیم مگر خدایا! اب کیا ہوگا؟ کیا آغا کو تنہا چھوڑکر قاسم کی تلاش میں نکل جاؤں؟ ہاں یہی ہے وہ شاہراہ کہ جس پر مجھے چلنا ہے۔

اب یاسمین انھیں خیالات میں گھری رہتی تھی۔اُس نے ارادہ کرلیا تھا کہ جلد ہی ریاض کو خیرباد کہکر قاسم مرزا کی تلاش میں نکل جائے۔یکایک آغا سخت بیمار ہوگیا، گردونواح کے مشہور طبیب ریاض میں جمع ہوگئے اور بڑی جاں فشانی سے آغا کا علاج کیا گیا، یاسمین اپنی زندگی کے آخری سہارے، اپنے پیارے باپ کی علالت سے نہایت متفکر ہوگئی۔ وہ ایک بہترین تیماردار تھی اور اپنے باپ کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا، پہروں پاس بیٹھکر دل بہلاتی، راتوں کو جاگ جاگ کر مریض باپ کی خدمت کرتی۔بہزاد کو بُلانے کے لئے آغا کے حکم سے ایک قاصد روانہ کیا گیا، مگر پورا ہفتہ ختم ہوگیا۔عشرہ بھی گذر گیا، پھر دو ہفتے بھی پورے ہوگئے، نہ بہزاد آیا نہ قاصد، آغا کو اب مرض کی شکایت تو نہ تھی، ہاں کمزوری اور نقاہت بے اندازہ تھی۔ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ ہوکر رہ گیا تھا، نا امید ہوکر آغا نے بہزاد کو ایک خط لکھکر دوسرے قاصد کو بھیجا، جس کو زبانی بھی بہت کچھ سکھایا پڑھایا گیا تھا۔خط میں لکھا تھا:۔

"میں اپنی زندگی سے دُور ہوں اور موت سے قریب، میرے بعد یاسمین تنہا رہ جائیگی، عزیزم! جلد سے جلد آؤ تاکہ میں تم دونوں کو نکاح کے پاک رشتے میں منسلک کرسکوں اور اس کے بعد راحت واطمینان سے اپنی جانِ ناتواں جان آفریں کے سپرد کردوں۔"

پورے پندرھویں دن دونوں قاصد لوٹے، مگر بہزاد اُن کے ساتھ نہ تھا، معلوم ہوا کہ اُس نے ایک دولتمند ایرانی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ یہ خبر بد سنکر یاسمین کو ایک خاص مسرت ہوئی اور اُس کے قلب سے ایک بوجھ سا اُتر گیا، مگر آغا حسن پر ایک ایسی بجلی گری جس نے اس کے خرمنِ امید کو بالکل خاکستر بنادیا، وہ جلد ہی دوبارہ بیمار ہوگیا۔مرض پھر عود کر آیا اور شہر کے قابل طبیب نے یاسمین پر ظاہر کردیا کہ آغا کی زندگی خطرے میں ہے۔

قاسم مرزا کی گمشدگی کے ساتھ باپ کی اندوہناک علالت نے یاسمین کے رنج وغم کو دوبالا کردیا، وہ فطرت سے ایک مستقل اور متحمل قلب لیکر پیدا ہوئی تھی مگر آج باپ کی بالیں پر بیٹھے ہوئے اُس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل ہی پڑے، آہ! ان دو آنسوؤں میں درد وکرب کی کتنی شدت

خوب جانتی تھی کہ قاسم مرزا کیوں خاموش ہے، جب تک قاسم مرزا قصیدہ پڑھتا رہا وہ بت بنی ہوئی سنتی رہی، تخیلات کی بلندی، الفاظ و معانی کا دلآویز ربط، اور اسلوب بیان کی شگفتگی نے سب سے زیادہ یاسمین ہی کو متاثر کیا تھا۔ "میرے لئے قاسم نے کتنا بہترین قصیدہ کہا ہے" یہ خیال کئی بار کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکا۔ آخر جشن کی پہلی تقریب ختم ہوئی اور حاضرین اپنے دل و دماغ میں قادر الکلام قاسم مرزا کے پیدا کئے ہوئے احساسات لئے ہوئے رخصت ہوگئے۔

(۴)

بہزاد اب آغا حسن کا مہمان تھا، کل اس کی اور یاسمین کی نسبت (منگنی) کا اعلان ہونے والا تھا۔ اس رسمی جلسہ میں شرکت کے لئے ریاض کے خاص خاص افراد مدعو تھے۔ ان میں قاسم مرزا بھی شامل تھا مگر اس کی غیر متوقع عدم شرکت پر سب کو تعجب ہوا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ جشن سالگرہ سے اگلے دن ہی بوشہر چلا گیا تھا، اور ابھی تک واپس نہیں ہوا۔ قاسم کی عدم موجودگی سے یہ رسم رک تو نہیں گئی مگر ایک خاص بے لطفی شروع سے آخر تک شریک رسم رہی، مناکحت کے لئے ایک خاص تاریخ کا تعین کیا گیا۔ اور ایک ہفتے کے بعد خوش نصیب بہزاد اپنی خوشحال منگیتر سے رخصت ہوکر اصفہان روانہ ہوگیا۔

یاسمین کی زندگی ایک عجیب کشمکش میں گذر رہی تھی، کبھی تو وہ اُن ساعتوں کے تصور سے لرز جاتی جب اُسے بہزاد کی بیوی بنکر اصفہان کے شاہی قصر میں جانا ہوگا کبھی قاسم کی یاد ہلکے ہلکے نشتروں سے اس کے دل کو چھیڑتی۔ قاسم مرزا ابھی تک ریاض میں واپس نہ آیا تھا اور نہ بہت دنوں تک کوئی امید تھی کیونکہ مسافروں سے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ بوشہر سے کہیں اور چلا گیا ہے۔ آغاز تعارف سے لیکر قاسم مرزا کی گمشدگی تک کا زمانہ یاسمین کی آنکھوں میں پھر جاتا۔ وہ ایک عجیب یاس انگیز لہجے میں خود بخود کہہ اُٹھتی "کاش! قاسم مرزا شاہی خاندان سے ہوتا"۔

اب اس نے خود ہی کو لعنت ملامت کرنا شروع کیا کہ میں نے کیوں آنکھیں بند کرکے باپ کی فرماں برداری پر اپنی محبت کو قربان کیا، اُسے رہ رہ کر حسرت ہوتی تھی کہ کاش میں جرأت سے کام لیکر آغا کو اپنے دلی عزم سے مطلع کردیتی۔ اور اگر وہ ناراض بھی ہوتے تو آغا کے انگورستان و ایوان پر خاک ڈالکر قاسم مرزا کو لیکر کہیں نکل جاتی۔ آہ! دنیا تو محبت والوں پر آوازے کسا ہی کرتی ہے۔ لوگوں میں کچھ دنوں تک یہ چرچا رہتا پھر خود ہی بھول جاتے۔ آغا بھی صبر کرلیتے مگر میں اس طرح اپنی محبت کا گلا گھونٹنے پر مجبور تو نہ ہوتی۔ بیچارہ قاسم مرزا جس کے دامنِ محبت میں پناہ لینے کی حسرت

صوتیات کا علم ناگزیر ہے البتہ جسطرح مادری زبان کے لئے صرف ونحو کی چنداں ضرورت نہیں، اسی طرح صوتیات کی بھی چنداں حاجت نہیں۔ لیکن جس طرح مادری زبان کے لئے اسکی قواعد کا علم بہت مفید ہے اسی طرح اس کی صوتیات کا جاننا بھی نہایت کارآمد ہے

مجھے جہاں تک معلوم ہے اُردو میں ہنوز علم صوتیات پر مغربی انداز میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی پنجابی زبان کی صوتیات پر البتہ پروفیسر بلی نے کچھ لکھا ہے لیکن وہ انگریزی زبان میں ہے اسی طرح ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کی صوتیات پر کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اُردو یا اُردو کی کسی مقامی بولی پر ہنوز کوئی کتاب انگریزی زبان میں بھی تصنیف نہیں ہوئی تھی، یہ کمی ہمارے فاضل دوست نے پوری کردی۔

کتاب زیر تبصرہ حیدرآبادی اُردو صوتیات پر ہے اور انگریزی زبان میں ہے۔ فاضل مصنف کے خلاف یہ شکایت کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں نہیں، اُردو میں لکھی جانی چاہیئے تھی، لیکن یہ شکایت بیجا ہے۔ علم صوتیات دو طرح کا ہے۔ ایک عام جسکا تعلق عام السنۂ عالم کے حروف و حرکات سے ہے۔ دوسرا خاص جس کا تعلق کسی خاص زبان سے ہوتا ہے۔ جب اُردو میں عام صوتیات کا ہی علم مدون نہیں تو پھر خاص صوتیات یعنی اُردو زبان کی صوتیات پر کیونکر قلم اٹھایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ اُردو میں علم صوتیات کے مبادی و مقاصد بیان کئے جائیں اور اس کی اصطلاحات اور علامات مقرر ہوں پھر البتہ ان اصطلاحات و علامات میں اُردو زبان کی صوتیات لکھی جاسکتی ہے یہ دشواری انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ اسلئے موصوف نے انگریزی زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ قرار دیا۔ اگر آپ تمام دشواریوں کا مقابلہ کرکے اُردو ہی میں یہ کتاب لکھتے تو اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہوتا لیکن موجودہ صورت میں بھی آپکا یہ کارنامہ کچھ معمولی نہیں۔ اسلئے کہ ہندوستان کی زبانوں پر اس قسم کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ یورپ والوں ہی کی شرمندۂ قلم ہیں، مگر حیدرآبادی اُردو پر کسی یوروپین نے نہیں، ایک ہندوستانی نے قلم اٹھایا ہے، اور ہم خوش ہیں کہ کامیابی کے ساتھ اٹھایا ہے۔ فاضل مصنف کے خلاف یہ شکایت بھی کی جاسکتی ہے کہ حیدرآبادی اُردو کو کیوں منتخب کیا۔ اُردو ہی کی صوتیات پر لکھنا چاہیئے تھا لیکن اس کا یہ معقول جواب ہے کہ موصوف باشندہ حیدرآباد ہونے کی حیثیت سے بمقابلہ عام اُردو کے۔ فطری طور پر حیدرآبادی اُردو کی صوتیات

سے زیادہ واقف ہیں۔ دوسرے جہانتک حروف و حرکات کا تعلق ہے حیدرآبادی اُردو اور ٹکسالی اُردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں،

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر بلاش کا (جو پیرس یونیورسٹی میں علم اللسان کے پروفیسر ہیں) لکھا ہوا مقدمہ ہے جسمیں موصوف نے فاضل مصنف کی اس علمی خدمت کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ مصنف علاّم کے لئے کچھ کم فخر نہیں۔ اصل کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلا باب مقدمہ کے طور پر ہے اور فاضل مصنف کے اس مقالۂ تحقیقیہ کی دو فصلوں پر مشتمل ہے جس پر موصوف کو لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ یہ باب جہانتک اُردو زبان کی ابتدائی نشو و نما کی تاریخ کا تعلق ہے نہایت دلچسپ اور معلومات مفیدہ سے پُر ہے اس باب کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّے میں اُردو کی تاریخی نشو و نما سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں شمالی اور جنوبی اُردو کا باہمی فرق بتایا گیا ہے، فاضل مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ اُردو کا خمیر اُسوقت سے بننے لگتا ہے جب سے فتوحات اسلامیہ کے باعث فارسی اور شمالی ہند کی زبان کے درمیان اختلاط شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان جب کبھی ہندوستان میں داخل ہوئے اور جہاں کہیں انہوں نے سکونت اختیار کی انکو لازمی طور پر ہندوستانیوں سے ملنا جلنا پڑا۔ ان دو مختلف زبان بولنے والی جماعتوں کے باہمی میل جول سے جو ایک نئی بولی وجود میں آئی وہی اُردو ہے چونکہ مسلمان ہندوستان میں مختلف راستوں سے آئے اسلیئے اس نئی زبان کی اصلیت کی بابت مندرجۂ ذیل نظریئے ہیں۔

ایک نظریہ تو یہ ہے کہ جب مسلمان عرب ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں بغرض تجارت ہندوستان کے ساحل مالابار پر متوطن ہوئے تو ان عربوں اور جنوبی ہند کے باشندوں کے باہمی اختلاط سے جو نئی زبان پیدا ہوئی وہی موجودہ اُردو زبان کی ماں ہے۔ لیکن یہ نظریہ قابل توجہ اس لئے نہیں کہ اُردو کا تعلق آریائی خاندان سے ہے اور جنوبی ہند میں ڈریویڈین زبان بولی جاتی ہے اور عربوں کی زبان سامی ہے۔ سامی اور ڈریویڈین زبانوں کی باہمی آمیزش سے آریائی زبان کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جب عربوں نے سندھ فتح کر کے اس حصّۂ ہندوستان میں سکونت اختیار کی تو ان عربوں اور اُس طرف کے ہندوستانیوں کے باہمی میل جول سے جو زبان پیدا ہوئی وہ اُردو کی ابتدائی صورت ہے مگر یہ نظریہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک نئی زبان ضرور پیدا ہوئی لیکن یہ اُردو نہ تھی بلکہ موجودہ سندھی زبان کی ماں تھی،

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ محمود غزنوی کے ہندوستان فتح کرنے کے دو سو برس بعد تک صوبہ پنجاب غزنوی خاندان کی حکومت کا جولانگاہ بنا رہا اس مدت میں فارسی بولنے والے مسلمانوں اور پنجابیوں کے باہمی اختلاط سے اس صوبہ میں ایک نئی زبان ضرور پیدا ہو گئی ہوگی یہی زبان اُردو کی ابتدائی شکل ہے اس نظریہ کی بنا پر۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اُردو" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو، قدیم پنجابی سے نکلی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُردو بمقابلہ برج بھاشا کے پنجابی سے زیادہ قریب ہے۔ پروفیسر ممدوح نے دو طرح کی دلیلیں بیان کی ہیں ایک تو یہ کہ صرف و نحو کے متعدد مسائل میں پنجابی اور اُردو کا حال یکساں ہے۔ دوسرے یہ کہ اُردو میں بعض عناصر ایسے پائے جاتے ہیں جن کی تشریح موجودہ پنجابی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے یہ عناصر زیادہ تر دکنی اُردو میں نظر آتے ہیں۔

چوتھا نظریہ جو عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے یہ ہے کہ جب محمد غوری نے دہلی کی سلطنت فتح کی تو آگے چلکر جو زبان فارسی اور ہندی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوئی وہ اُردو کی ابتدائی صورت تھی اس نئی زبان نے اسقدر جلد ترقی کی کہ محمد تغلق کے زمانہ تک یہ زبان عام طور پر بولی جانے لگی تھی محمد تغلق کی فوج اس زبان کو دکن میں لیگئی۔

ان چار نظریوں کے علاوہ فاضل مصنف نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ میں مذکورہ بالا آخری دو نظریوں کے ڈانڈے ملانے کی کوشش کی گئی ہے اس نظریہ کے بیان کئے جانے سے پہلے ایک مختصر سے مقدمہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ لسانیات ہند کے ماہرین کی رائے ہے کہ ہندوستان کی تمام موجودہ زبانیں ۱۰۰۰ء کے ایک دو صدی بعد وجود میں آئیں، گیارہویں صدی کے شروع میں موجودہ سرحدی اضلاع سے لیکر الہ آباد تک ایک ہی زبان بولی جاتی تھی جو بگڑی ہوئی پراکرت تھی، اس قدیم ہندوستانی زبان سے تین بولیاں نکلیں۔ پنجابی، ہندی اور گجراتی۔ تیسرے نظریہ کی رو سے تو اُردو پنجابی سے نکلی ہے اور چوتھے نظریہ کی بنا پر ہندی سے۔ ہمارے فاضل مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ اُردو نہ پنجابی سے نکلی ہے، نہ ہندی سے بلکہ ان دونوں کی ماں قدیم ہندوستانی زبان ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اُردو قدیم پنجابی یا قدیم ہندی کی بہن قرار پاتی ہے نہ کہ بیٹی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ان دونوں سے مشابہ ہے یعنی اس مشابہت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُردو ان زبانوں سے نکلی بلکہ یہ کہ ان کی بہن ہے۔ چونکہ دہلی اور آگرہ صدیوں تک اسلامی حکومت کے مرکز رہے اور ان اطراف میں ہندی کا دور دورہ تھا۔ اسلئے اُردو پر بمقابلہ قدیم پنجابی کے قدیم ہندی کا زیادہ اثر پڑا اس نظریہ کے ثبوت میں فاضل

مصنف لکھتے ہیں کہ اگر دکنی اُردو میں ایسی صورتیں پائی جاتی ہیں جو قدیم یا جدید پنجابی سے مشابہ ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ محمد تغلق کی فوج جو زبان دکن میں لیگئی وہ قدیم اُردو تھی جسمیں قدیم پنجابی اور قدیم ہندی کی یکساں مشابہت تھی اور جسپر ہنوز قدیم ہندی کا زیادہ اثر نہیں پڑا تھا پس قدیم پنجابی کی جو مشابہت اس ابتدائی اُردو میں موجود تھی وہ دکن کی اُردو میں ابتک محفوظ ہے اسلئے کہ دکنی اُردو کا نشو و نما شمالی اُردو سے مختلف ماحول میں ہوا۔

اس نظریہ میں جو سقم معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جس قدیم ہندوستانی زبان (یعنی بگڑی ہوئی پراکرت) کا وجود سرحدی اضلاع سے لیکر الہ آباد تک مانا گیا ہے وہ محض ایک خیالی زبان ہے۔ کیونکہ اسکا کوئی نمونہ کسی شکل میں موجود نہیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ قدیم زمانہ میں جبکہ آمد و شد کے وسائل نسبتہً بہت ہی محدود تھے۔ سرحدی اضلاع سے لیکر الہ آباد تک صرف ایک ہی زبان بولی جائے اور پھر کچھ مدت کے بعد جبکہ وسائل آمد و شد میں نسبتہً کچھ زیادتی ہو گئی ہو اسی حصہ ملک میں ہندی، پنجابی، گجراتی تین زبانیں بولی جانے لگیں۔

باب اوّل کے دوسرے حصے میں موجودہ شمالی اور دکنی اُردو زبانوں کے باہمی اختلافات سے بحث کی گئی ہے اوّل ان اختلافات کے اسباب بیان کئے گئے ہیں جنمیں سے چند یہاں مثالاً نقل کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ گنگا جمنا کے دوآبے میں اُردو کے علاوہ صرف ایک اور زبان (ہندی) بولی جاتی تھی اُردو اور ہندی میں کافی قرابت ہونے کی وجہ سے اُردو کو ہندی سے خاصی تقویت پہونچی برخلاف اسکے دکن میں اُردو کے علاوہ کئی زبانیں بولی جاتی تھیں اور ان میں سے کسی کو اُردو سے قرابت نہ تھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو کسی دکنی زبان سے مدد نہیں ملی۔

۲۔ شمالی ہند میں ہمیشہ بیرون ہند سے حملے ہوتے رہے یہاں جسقدر شاہی خاندان ہوئے وہ سب باہر کے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے تک کوئی ایسا بادشاہ نہیں ہوا جس نے اُردو میں نظم یا نثر لکھی ہو اسکے مقابلہ میں دکن کو ایران و ترکستان سے کچھ تعلق نہ تھا دکن میں جسقدر اسلامی حکمراں خاندان ہوئے انکے بانی عرصہ دراز تک ہندوستان میں رہ چکے تھے اور ہندوستانی زبان سے واقف تھے کئی دکنی بادشاہوں نے اُردو میں شعر کہے۔

۳۔ ایران و توران سے شمالی ہند میں ہمیشہ امرا و علما آتے رہتے تھے، انکو ہندوستان میں پہونچتے ہی بڑے بڑے عہدے مل جاتے تھے حالانکہ یہ ہندوستانی زبان سے مطلقاً آشنا نہیں ہوتے تھے، اسکا نتیجہ

یہ ہوا کہ شمالی اُردو عرصہ تک ادبی زبان نہ ہو سکی، دکن میں بیرونی اثر اسقدر ہرگز نہ تھا۔

۴۔ دکن کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جس قدر میل جول تھا اسقدر (اکبر کے زمانہ کو چھوڑ کر) شمالی ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہ تھا۔ دکن کی اسلامی حکومتوں میں بہت سے ہندو امرا اور وزرا گذرے، اس ہندو مسلم اختلاط کی وجہ سے دکنی اُردو کو بڑی مدد ملی۔

پھر فاضل مصنف نے شمالی اور دکنی اُردو زبانوں کے باہمی اختلافات کو ظاہر کیا ہے۔ کسی دو زبانوں میں فرق بتانا کچھ مشکل کام نہیں لیکن اس فرق کو منظم و مرتب شکل میں پیش کرنا غایت تفحص و تجسس کا کام ہے۔ چنانچہ مصنف علام نے ان دونوں قسم کی اُردو زبانوں کے باہمی فرق و اختلاف کو صوتیاتی اصول کے مطابق مرتب و منظم کر کے پیش کیا ہے ہم چند اختلافات مثال کے طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

(۱) اختلاف تلفظ

(الف)۔ اختلاف حرکات و اعراب (Vowels)

(۱) ایک خاص حرکت جو شمالی اُردو میں نہیں پائی جاتی یہ آواز واو معروف اور واو مجہول کے درمیان کی ہے مثلاً پوٹا (لڑکا) میں پ کی حرکت۔

(۲) اگر کسی لفظ کے دونوں مقطع ہجائی (Syllable) طویل ہیں تو اکثر پہلا مقطع مختصر پڑھا جاتا ہے مثلاً۔ آدمی کو ادمی، آسمان کو اسمان بولتے ہیں۔

(۳) حرکات مرکبہ کو حرکات مدغمہ (diphthongs) کی شکل میں پڑھتے ہیں مثلاً صفائی کو صفئی بولتے ہیں۔

(ب) اختلاف حروف صامتہ (Consonants) اسکی دس صورتیں بیان کی ہیں جنمیں سے دو مثالاً یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) جنوبی اُردو میں قاف کی آواز خ کی طرح نکالی جاتی ہے۔

(۲) جب حروف ٹ۔ ڈ۔ ڑ میں سے کوئی دو حروف کسی لفظ میں آئیں تو پہلا حرف بشرطیکہ وہ لفظ کے شروع میں ہو ہمیشہ ت۔ د۔ یا۔ ر کی طرح بولا جاتا ہے، مثلاً ٹاٹ کو تاٹ، ٹکڑا کو تکڑا، ڈنڈا کو دنڈا وغیرہ بولتے ہیں۔

(۲) اختلاف لفظ و معنی و ساخت جملہ۔

(الف) اختلاف کلمات۔ دکنی اُردو میں ایسے بے شمار الفاظ رائج ہیں جو شمالی اردو میں مستعمل نہیں، انکی

کئی صورتیں ہیں۔ اور انہیں سے دو مثال کے طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) انہیں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں جو دکن کی مقامی زبانوں سے آئے ہیں مثلاً اَکل (کچھ)، بنڈی (گاڑی)، پوٹّا (لڑکا)

(۲) بعض ایسے الفاظ ہیں جو عربی یا فارسی الفاظ سے تو نکلے ہیں مگر ذرا بگڑی شکل میں۔ مثلاً

عربی لفظ غیب	سے	غیاب	بمعنی	غیر حاضری
〃 مشاہرہ	سے	مشاہری	〃	تنخواہ
〃 حیات	سے	حیاتی	〃	عمر
〃 فہیم	سے	فامنا	〃	سمجھنا۔

(ب) اختلافِ صرف و نحو۔ اس قسم کے اختلافات کافی اہم ہیں، مثال کے طور پر دو اختلاف بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) شمالی اُردو میں فعل متعدی کی تذکیر و تانیث ۔ وحدت و جمع پر مفعول کی تذکیر و تانیث وحدت و جمع کا اثر پڑتا ہے لیکن دکنی اُردو میں فاعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع کا، کیونکہ دکنی اُردو میں 'نے' علامتِ فاعل کا استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً

شمالی اُردو	دکنی اُردو
لڑکے نے روٹی کھائی	لڑکا روٹی کھایا
لڑکی نے لڈو کھایا	لڑکی لڈو کھائی

(۲) دکنی اُردو میں اسم کی جمع خواہ مذکر ہو یا مونث۔ الف اور نون غنہ سے بنتی ہے۔ مثلاً کئی مردان تھے۔ یہ کن کی کتابان ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

باب دوم میں حرکات بسیطہ و حرکات مدغمہ سے بحث کی گئی ہے۔ اسی فصل سے صوتیات کی بحث شروع ہوتی ہے۔ فاضل مصنف نے نو حرکات بسیطہ اور چھ حرکات مدغمہ بتائے ہیں نو حرکات بسیطہ میں سے سات حرکات تو وہی ہیں جو عربی الفاظ میں آتی ہیں اور دو، واو مجہول اور یائے مجہول کی آوازیں ہیں۔ چھ حرکات مدغمہ میں سے صرف ایک دو عربی لفظوں میں بھی آتی ہیں۔

حرکات بسیطہ[1]

(۱) زیر جیسے دِل طِب (۲) زیر ممدودہ (یائے معروف) جیسے نِیم اِیم

[1] ان حرکات سے علامات حرکات مراد نہیں بلکہ وہ آوازیں مراد ہیں جو ان حرکتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۳) یائے مجہول جیسے کھیل۔ تیل (۴) یائے ساکن اور اس سے پہلے زبر جیسے بیل۔ سیر
(۵) زبر جیسے اب۔ سب (۶) زبر ممدودہ جیسے بات۔ جانا
(۷) پیش جیسے تُم۔ گُل (۸) پیش ممدودہ (واو معروف) جیسے دُور۔ تُو
(۹) واو مجہول جیسے چور

حرکات مدغمہ

(۱) زبر + واو مجہول جیسے خَوف۔ طور (۲) زبر ممدودہ + واو مجہول جیسے ناؤ
(۳) زبر ممدودہ + یائے مجہول جیسے رائے (۴) زبر + زیر جیسے فیّاض
(۵) زبر + پیش جیسے رَشو (ہندی نام) (۶) یائے مجہول + واو مجہول جیسے نیولا

ان حرکات بسیط و مدغمہ کی بابت ہمیں کچھ خفیف سا اختلاف ہے، لیکن چونکہ صوتیات کا تعلق لفظ کی صورت مکتوبہ سے نہیں، صورت ملفوظہ سے ہے، اور صورت ملفوظہ اُس وقت تک اردو میں صوتیاتی اصول پر بیان نہیں ہو سکتی جب تک اُردو میں صوتیاتی علامات مقرر نہ ہو جائیں اس لئے ہم اپنا اختلاف بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

بہر حال فاضل مصنف نے اس فصل میں حرکات سے صوتیاتی اصول پر دلچسپ بحث کی ہے، ان حرکات کے ادا کرنے کے وقت منہ میں زبان کی جو شکل ہو جاتی ہے اُس کے فوٹو بھی دئے ہیں ایسے فوٹوؤں کو انگریزی میں پلیٹوگرام (Palatograms) یعنی تالو کی عکسی تصویر کہتے ہیں۔ یہ عکسی تصویر اس طرح لی جاتی ہے کہ تالو پر موم یا اس قسم کے مادہ کا (جو دندان ساز دانتوں کا سانچا بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں) خول چڑھا لیا جاتا ہے، اور اس خول پر کسی قسم کا رنگ یا سیاہی لگا دیتے ہیں جو زبان کے چھونے سے مٹ جاتی ہے، پھر مطلوبہ حرکت یا حرف کو ادا کرتے ہیں تو اس خول پر نشان بن جاتے ہیں کہ زبان کس حصہ میں کس قدر لگی، پھر اس خول کو اُتار لیتے ہیں اور اس کا فوٹو لے لیتے ہیں۔

باب سوم میں حروف صامتہ (Consonants) کے مخارج اور ان کے ادغام (Assimilation) سے بحث کی گئی ہے۔ اور یہاں بھی تالو کی عکسی تصاویر دی گئی ہیں۔

باب چہارم میں دو بحثیں ہیں، ایک تو یہ کہ لفظ کے کس مقطع ہجائی (Syllable) پر زور ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک جملہ کے بولنے میں آواز کا زیر و بم کس نہج پر ہوتا ہے۔ یہ دونوں بحثیں عربی، فارسی، اور اُردو داں حضرات کے لئے بالکل نئی ہیں، کیونکہ حروف و حرکات کے مخارج کا

جہاں تک تعلق ہے، یہ صوتیاتی بحث بڑی حد تک علم ہجا اور علم تجوید میں موجود ہے، لیکن لفظ کے صوتی ٹکڑوں پر زور دیئے جانے اور جملہ بولنے کے وقت آواز کے بلند و پست ہونے کی بحث بالکل نئی چیز ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے ڈاکٹر محی الدین قادری ہی پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اُردو کے متعلق یہ بحث کی ہے۔

الغرض جہاں تک اُردو صوتیات کا تعلق ہے یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور ہم مصنف علام کو اس علمی کارنامہ پر صدق دل سے مبارکباد دیتے ہیں، اور اُردو کے خیرخواہوں اور پرستاروں سے التجا کرتے ہیں کہ اس فن سے دلچسپی لیں اور اس کتاب کی کماحقہ قدر کریں۔

شاعر کی خودداری

ایک مرتبہ (راجہ بھوج کے دربار میں) ایک شاعر نے آکر کہا: "اے راجہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ خوانچے والا میرے گھر کے سامنے آکر آواز دے اور میری بیوی جلدی سے اُٹھکر میرے لڑکے کے کانوں پر ہاتھ رکھ دے۔ اپنی شریف بیوی کی خوبصورت آنکھوں میں جہاں عام طور پر جوانی میں مسکراہٹ کھیلتی ہے، بے بسی کے آنسو دیکھکر میرے کلیجے میں کانٹا سا چُبھ جاتا ہے"

بھوج نے افلاس کا یہ درد انگیز بیان سنکر کہا: "تو شاعر ہے، میرے عہد میں کوئی شاعر بھوکا نہیں رہ سکتا، اگر تو میرے شاہی فیض سے ابتک محروم رہا ہے تو میرا نہیں تیرا قصور ہے، تو میرے پاس پہلے کیوں نہ آیا۔"

شاعر کی بھویں تن گئیں، اس نے کہا: "میں شاعر ہوں اور شاعر آسانی سے اپنی ناداری کا اظہار نہیں کرتا۔"

بھوج: اگر یہ بات ہے تو تو نے آج اپنی شاعرانہ وضعداری کا خیال کیوں ترک کر دیا۔

شاعر: اے راجہ تیرا خیال غلط ہے، یہ تیرے سامنے خوددار شاعر نہیں، بے بس باپ کھڑا التجائیں کر رہا ہے، شاعر بے پروا ہے۔ باپ کو روپیہ کی قدم قدم پر ضرورت ہے۔

بھوج نے خزانچی سے کہا، یہ جو کچھ مانگے دیدو، ہم اس سے بہت خوش ہیں۔

(آچندن)

روح جذبات

از حضرت اکبر حیدری، سائز ۲۰×۲۶/۱۶، ۹۶ صفحات. قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "نیرنگ" دہلی

حضرت اکبر حیدری موجودہ زمانہ کے ایک خوش فکر سخنور ہیں، یہ آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں حمد کے علاوہ ۲۹ جدید طرز کی نظمیں، چند قطعات اور کچھ غزلیں بعنوان "نشترکدہ" ہیں۔ غزلوں کا جو انتخاب پیش کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سختی سے کیا گیا ہے۔ دو چار غزلوں کے سوائے جن میں اشعار کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ ہے۔ باقی غزلوں کے ایک ایک دو دو شعر انتخاب کئے گئے ہیں اور اس طرح غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً ایک سو پچیس ہے۔ گویا صرف وہ اشعار شائع کئے گئے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے بہترین سمجھے گئے ہیں۔

اکبر صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اردو شاعری کو قدیم و مسلّمہ پابندیوں سے اس حد تک آزاد کرانا چاہتے ہیں کہ یہ آزادی بار خاطر نہ ہو، چنانچہ اس مجموعہ میں جتنی نظمیں ہیں سب میں یہ آزادی نمایاں ہے مخمس میں عموماً پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ یا ردیف و قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ مسدس میں ہر ایک بند کا پہلا اور تیسرا مصرعہ الگ ہم قافیہ ہے اور دوسرا اور چوتھا علیحدہ قوافی رکھتا ہے، البتہ ٹیپ کے شعر کے دونوں مصرعے قدیم دستور کے مطابق ہم قافیہ ہیں۔ اگرچہ یہ جدت مروجہ اصول کے خلاف ہے مگر ان مغرب پرست شعرا کی جدت کے مقابلہ میں بدرجۂ غایت بہتر و خوشگوار ہے جو اردو شاعری کو ردیف و قافیہ حتیٰ کہ بعض حالات میں بحر کی پابندی سے بھی آزاد کرنا چاہتے ہیں۔

اس مجموعہ میں جس قدر کلام پیش کیا گیا ہے وہ موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے، مصنف کی تصویر بھی شریک مجموعہ ہے۔

مآثر الشعراء

مرتبہ جناب نصیر علوی۔ ڈبل سائز۔ ۱۶۰ صفحات، کاغذ و کتابت معمولی۔ قیمت ۸/

شائع کردہ: سکریٹری مشاعرہ کمیٹی۔ مین پوری

مین پوری میں ایک مدت سے ہر سال ایک شاندار مشاعرہ کیا جاتا ہے۔ جس میں مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے اکثر شعرا بھی شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ حسب معمول ۲۶-۲۷ اپریل ۱۹۳۰ء کو جو سالانہ مشاعرہ ہوا تھا، اس کی مختصر روداد مع غزلیات مرتب کرکے "مآثر الشعراء" کے نام سے شائع کی گئی ہے۔

اس گلدستہ میں جو خاص بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ باستثناء چند ہر شاعر کے مختصر حالات اس کی غزل سے پہلے لکھ دیئے گئے ہیں، اور اب یہ ایک "تذکرہ" کہلانے کا مستحق ہو گیا ہے۔ افسوس کہ غزلیات میں انتخاب سے کام نہیں لیا گیا ورنہ گلدستہ موجودہ صورت سے مفید و کارآمد ہوتا۔

معلّم اسود

از مسٹر اشتیاق حسین قریشی ایم۔اے۔ کراؤن سائز۔ ۱۰۶ صفحات۔ معمولی کاغذ قیمت ۱۲؍
ملنے کا پتہ:۔ الامان بک ڈپو، گلی قاسم جان، دہلی۔

یہ پانچ ایکٹ کا ایک ڈراما ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ انسان شیطان کے دام تزویر میں گرفتار ہو کر اپنے ضمیر و روح کو کس طرح خراب کر لیتا ہے۔ دولت و حشمت، جاہ و مرتبہ اور عیش و عشرت کی ہوس میں اطمینان قلب و سکون روح کھو بیٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ پروردگار عالم سے منحرف ہو کر ملحد بن جاتا ہے۔ مگر غیبی قوتیں اس کی مدد کرتی ہیں اور شیطان کے پھندے سے چھڑا کر راہ راست دکھاتی ہیں۔

ڈرامے کا پلاٹ موجودہ دور کے سیاسی واقعات سے ملتا جلتا ہے، روپیہ کے لالچ میں مدیران اخبار و ارکین سلطنت کی ضمیر فروشی، شخصی حکومت کے خلاف عوام کا جوش و خروش، جمہوری حکومت کے لئے قوم پرست لیڈروں کی جد و جہد وغیرہ بہت سی باتیں قابل غور و لائق مطالعہ ہیں۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ ڈراما بہت دلچسپ ہے۔

سرگذشت وزیر خان لنکران

مترجمہ مولوی عبد القوی فاقی ایم۔اے۔ رائل سائز ۷۷ صفحات۔ قیمت ۱۲؍
کاغذ اور لکھائی چھپائی معمولی۔ ملنے کا پتہ: آسی پریس، محمود نگر، لکھنؤ۔

یہ فارسی زبان کا ایک مشہور مختصر ڈراما ہے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے فارسی نصاب میں داخل ہے۔ موجودہ زمانہ کی زبان قدیم فارسی سے بہت مختلف ہے۔ خصوصاً ضروریات زمانہ و جدید ایجاد و اختراع کے سبب سے بکثرت نئے الفاظ مروج ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے قدیم فارسی کی تعلیم پائے ہوئے اصحاب کے لئے جدید فارسی کا سمجھنا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے۔ طلبا و عام شائقین کے افادہ کی غرض سے فاضل مترجم نے اس کا سلیس ترجمہ اردو میں کر دیا ہے۔ ہر صفحہ پر دو کالم ہیں۔ ایک میں اصل فارسی اور اس کے مقابل دوسرے کالم میں اُردو ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر مجلس (ایکٹ) کے شروع میں اس کا خلاصہ اُردو میں لکھ دیا گیا ہے۔ آخر میں مشکل و جدید الفاظ کی فرہنگ و شرح ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ قابل تحسین مترجم صاحب کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے بطور دیباچہ ڈرامے کے متعلق مرتب کیا ہے۔ اس میں ڈرامے کی ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کی ارتقائی صورت تک قابل قدر مسالہ فراہم کیا ہے اور مختلف ممالک میں یہ فن جس حالت میں ہے اسکو مختصراً بیان کر کے ایرانی ڈرامے پر روشنی ڈالی ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی یہ ترجمہ بہت مفید معلوم ہوتا ہے۔

دلگداز افسانے از ڈاکٹر سید علی کوثر صاحب کوثر چاندپوری۔ چھوٹی تقطیع حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت عہ، ملنے کا پتہ: صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ۔

جیساکہ نام سے ظاہر ہے یہ جناب کوثر کے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض افسانے اصلاح معاشرت و تقلید مغرب کے بُرے نتائج پر ہیں، باقی میں حسن و عشق کی داستان ہے۔

تمام افسانے بلحاظ جذب و اثر بہت اچھے ہیں، زبان سادہ، رواں اور دلکش ہے، البتہ بعض افسانوں کا پلاٹ زیادہ اچھا نہیں، اور وہ نتیجہ کے لحاظ سے بہترین نہیں کہے جاسکتے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے۔

نورس حیدر آباد دکن (عبدالحق نمبر) یہ اورنگ آباد کالج کا دو ماہی رسالہ ہے جس کے اجرا کا واحد مقصد طلبہ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا اور مضامین نگاری کی مشق بہم پہنچانا ہے۔ پیش نظر نمبر ہمارے قدیم دوست پروفیسر عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں مولوی صاحب موصوف کے ان کارناموں کو خصوصیت سے نمایاں کیا گیا ہے، جو آپ نے عثمانیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے نیز انجمن ترقی اُردو کے آنریری سکرٹری ہونے کی حالت میں انجام دیئے ہیں۔ آخر میں وہ ایڈریس اور نظمیں ہیں جو مولوی صاحب کے کالج سے علٰحدہ ہونے کے موقع پر الوداعی جلسہ میں پڑھی گئی تھیں۔ شروع میں مولوی صاحب کی سہ رنگی تصویر ہے۔ حسب معمول یہ نمبر ٹائپ میں چھپا ہے اور اس میں ۱۸+۲۲ سائز کے ۱۰۰ صفحات ہیں۔

دی اسکاوٹس ریڈ بک آف گڈ ٹرنس (انگریزی) کراؤن سائز ۰۰ ۵ صفحات۔ قیمت ۴، پبلشرز دی انڈین سنٹرل اسکول یونین۔ کونور دکن۔

آجکل ہندوستان میں تحریک "اسکاؤٹ" بہت مقبول ہورہی ہے اور اکثر جگہ اسکے مستقل دفتر بھی موجود ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں اس تحریک کے متعلق ضروری باتیں درج کی گئی ہیں، ابتدا میں اسکاؤٹس کا مطمح نظر، عہد، قانون وغیرہ بیان کرکے چند مضمون بطور خطوط لکھے گئے ہیں، جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسکاؤٹس کس طرح خلق کی خدمت کرسکتے ہیں۔ اور اپنے گھر میں، اسکول میں، گاؤں یا شہر میں حتیٰ کہ ہر جگہ وہ کس طرح کارہائے نمایاں انجام دیکر اپنا فرض پورا کرسکتے ہیں۔ اسکاؤٹس کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مُباحثہ

عرب و ہند کے تعلقات

(از جے۔ ا۔ ر)

زمانہ بابت نومبر ۱۹۳۰ء میں راقم السطور کا لکھا ہوا مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی معرکۃ الآرا تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" کا جامع ریویو شائع ہوا تھا جس میں کتاب مذکور کی علمی قدر و قیمت کو تسلیم کرنے کے بعد آخر میں چند خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا، جو بدقسمتی سے مولانا محترم کے فاضل مداح ڈاکٹر زبید احمد صاحب ایم۔ اے۔ ڈاکٹر آف فلاسفی کو پسند نہ آیا اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے زمانہ بابت فروری ۱۹۳۱ء میں ایک جوابی ریویو لکھنا اپنا فرض تصور فرمایا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ڈاکٹر صاحب کے ریویو پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اپنی توجہ اور تنقید کو ہندو آریہ کے اصلی وطن۔ دیوناگری حروف کے ماخذ اور اہل فنشیا کے سامی نسل ہونے کے مسائل تک محدود رکھا ہے۔ "عرب و ہند کے تعلقات" کی پہلی کوتاہی یہ ظاہر کی گئی تھی کہ "مولانا سلیمان کی نگاہ عرب و ہند کے ساحلوں سے آگے نہیں جاتی" (رسالہ ۳ زمانہ نومبر ۱۹۳۰ء) جس سے راقم السطور کا مطلب صرف یہ تھا کہ مولانا سلیمان صاحب نے تازہ تاریخی اور اثری تحقیقات سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں فرمائی۔ جو نفسِ مضمون کی عالمانہ توضیح کے واسطے بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس پہلے اعتراض سے یا تو اغماض کیا ہے یا "الخاموشی نیم رضا" کے مصداق میرے خیال کو مبنی بر حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔

لیکن اس سے زیادہ ڈاکٹر زبید احمد صاحب کے حسب ذیل کلیہ کا یہ اعلان حیرت انگیز ہے کہ "میری گزارش یہ ہے کہ اول تو غیر متعلقہ مسائل کے بارہ میں اس قدر التزام کرنا کہ تازہ ترین تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا جائے، کچھ زیادہ ضروری نہیں۔ دوسرے مولانا نے ان تینوں مسائل کی بابت انھیں نظریوں سے کام لیا ہے، جو اب تک علمائے مستشرقین کے نزدیک قابل وثوق ہیں۔[۱]

[۱] اس امر کے اعتراف سے راقم کو ہرگز احتراز نہیں ہے کہ کتب خانے میرے وطن سے سو سو کوس دور ہیں۔

اگر کوئی معمولی تعلیم یافتہ شخص ایسا دعویٰ پیش کرے تو اس سے بآسانی چشم پوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر زبید احمد صاحب کو یہ دعویٰ زیب نہیں دیتا۔ سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ "عرب و ہند کے تعلقات" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی قابل قدر مطبوعات میں شمار ہوتی ہے۔ جس کی واضح ہدایات میں جو مصنفین کتب کو دی جاتی ہیں، ایک یہ ضروری ہدایت ہے کہ "معلومات تازہ ترین ہوں۔ اور جہاں کسی اہم مسئلہ پر ماہروں میں اختلاف ہو تو متن کتاب یا ذیلی حواشی یا ضمیمہ جات میں مشاہیر اہل علم کی آرا نقل کردینی چاہئیں" اگر اس قاعدہ کی روشنی میں راقم کے اعتراضات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ برجستہ اور واجب ثابت ہوتے ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کا یہ کلیہ جدید اصول تحقیقات کے صریح خلاف ہے۔ جس کے مطابق ہر زیر بحث مسئلہ پر جامع و مانع نگاہ ڈالنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے فلسفہ کا خصوصیت سے مطالعہ کیا ہے۔ اس وجہ سے موصوف کو اس امر کے اعتراف میں تامل نہیں ہو سکتا کہ کوئی علم مطلق اور غیر متعلق نہیں ٹھہر سکتا۔ کوئی علم ایک خاص دائرے کے اندر مقید نہیں، بلکہ جملہ معلومات لنسبتی ہیں۔ اور اپنی تکمیل کے واسطے سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ کلیۂ احتیاج بالغیر۔ (Law of InterDependence) جس طرح اقلیم اقتصادیات و سیاسیات پر حکمراں ہے اسی طرح طبیعیات، کیمیات اور فلکیات پر بھی حاوی ہے۔ پھر دیار علوم و فنون اس عالمگیر کلیہ کے اثر و غلبہ سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے؛ اگر آپ کسی تاریخی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو آپ کو خواہ مخواہ دیگر علوم کی بحث میں الجھنا پڑے گا، سب سے پہلے آپ کو اثریات کے حلقۂ اثر میں قدم رکھنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ کتبے اور سکے دونوں کی پہچان بین کرنا لازمی ہوگا۔ پھر پرانی کتابوں کی ورق گردانی بھی ضرور کرنی پڑے گی، ورنہ آپ کی بحث یک طرفہ اور تحصیل لاحاصل ہوگی۔

رہا آریہ ہندو کے اصلی وطن کا سوال تو مولانا سلیمان صاحب کے واسطے مناسب تھا کہ وہ مغربی ماہروں کی رائیں نٹ نوٹ میں نقل کرکے انھیں واضح کر دیتے۔ ہندو توانہیں کو شروع ہی سے اسی ملک کے باشندے قرار دیتے ہیں بعض مغربی ماہر پنجاب اور کشمیر کو مولد آریہ تصور کرتے ہیں۔ مگر اب مغرب کے ماہر سطح مرتفع آرمینیا کو آریہ قوم کا گہوارہ ٹھہراتے ہیں۔ بہر کیف ایشیائے وسطی کا نظریہ چالیس سال سے متروک ہے۔ پروفیسر جی۔ چائلڈ نے حال ہی میں ایک بڑی مستند[1] کتاب شائع کی ہے جس میں مولد آریہ کے متعلقہ مسائل پر تازہ ترین تحقیقات کی روشنی میں بحث

[1] ملاحظہ ہو "دی آرینز" (The Aryans) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۶ء

کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وڈل کی معرکۃ الآرا تصنیف "علمبردارانِ تمدن"* سب سے مشہور ہے جس میں آریہ قوم کے مسئلہ پر تازہ ترین اثری تحقیقات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر زبید احمد کی نگاہوں میں اس کی چنداں وقعت نہ ہو۔ مگر ماہر موصوف ہی کو یہ امتیاز خاص حاصل ہے کہ انھوں نے ہڑپہ اور ماہن جوداڑو کے کھنڈروں سے جو مہریں برآمد ہوئی ہیں ان کی عجیب عبارت پڑھنے اور مطالب اخذ کرنے کا بے نظیر علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔

دیوناگری کا سامی اصل ہونے کا نظریہ پہلے پہل سر ولیم جونز نے پیش کیا تھا۔ مگر جرمن ماہر لازن نے سب سے پہلے اس کے دیسی اصل ہونے کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر ای ٹامس سر الگزنڈر کننگھم، ڈاؤسن اور دیگر ارباب تحقیق نے لازن کی حمایت کی۔ مگر اب پروفیسر بھنڈارکر نے دکن کے مقدم التاریخ آثار قدامت کی چھان بین کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دیوناگری حروف کسی غیر قوم سے مستعار نہیں لیے گئے ہیں بلکہ نہایت قدیم زمانہ میں جو مورتی لکھاوٹ (خطِ تصویر) اس ملک میں رائج تھی اسی کے ارتقا سے براہمی حروف معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ضلع نال گنڈا (ریاست حیدرآباد) سے جو مقدم التاریخ برتن برآمد ہوئے ہیں، ان پر ایک قسم کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ مولوی یزدانی صاحب مہتمم اثریات حیدرآباد نے اس قسم کے ایک سو تیس نشانات بہم پہنچائے ہیں۔ پروفیسر بھنڈارکر نے ان میں سے چند نشانات دیوناگری حروف کے متشابہ قرار دیے ہیں۔

جن تین اعتراضات پر جرح کی گئی ہے، ان کی نسبت بطور کلیہ یہی عرض کر دینا مناسب ہے کہ کثرتِ رائے صحت اور صداقت کا معیار نہیں قرار دی جا سکتی۔ ہربرٹ اسپنسر نے ارتقا کا جامع مگر ڈارون نے محدود خیال ارتقا پیش کیا تھا جو انواع حیوانی و نباتی تک محدود تھا۔ لیکن اس کی صحت اور معقولیت تسلیم کرنے سے ارباب سائنس نے صاف انکار کر دیا تھا؛ اب یہی مسئلہ اقلیم سائنس کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں پروفیسر آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیات اول مرتبہ اخبارات میں چرچا ہوا تھا۔ اس وقت سب نے اتفاق رائے سے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نیوٹن کے اصول موضوعات متروک ہوئے جاتے ہیں۔ اسکولوں میں ہندسہ اور اقلیدس کی جو ابھی عرصہ سے پڑھائی جاتی ہیں انھیں اب دریا برد کر دینا چاہیے۔ مگر برطانیہ کے بڑے بڑے ماہروں نے جو اس وقت رائل سوسائٹی کے ایک خاص جلسہ میں جمع ہوئے تھے شاہی مہندس سر ڈائسن کے بیان پر صاد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم اب تمام سرکردہ سائنس داں

* "The makers of civilization" مطبوعہ ۱۹۲۹ء

اور ملا ملوآئن اسٹائن کے (متخرج نتائج کے آگے سرخم کرتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت آریہ قوم کے وطن اور دیوناگری حروف کے ماخذ اور اہل فنشیا کی اصلیت کی بھی ہے۔ ایک مسئلہ کی نسبت چند موافق اور چند مخالف رائیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سائنس کا طریقہ نہیں ہے۔ ممتاز اور بلند پایہ ماہروں کے آرا خاص وقعت رکھتے ہیں، اور انھیں کی شہادت امر متنازع فیہ کی نسبت پیش کرنا مناسب ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو کارپردازان ہندوستانی اکیڈیمی کا مقصود اولی خالص سائنسی اور محققانہ ہے۔ اور حقائق کو بلا تعصب پیش کرنا سائنس کا فرض مقدم ہے۔

مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے موجودہ افسوسناک فضا کو اپنے دل و دماغ پر تصرف حاصل کرنے کا موقع بہم پہونچا دیا، اور مجھ پر بیجا ہٹ اور قابل الزام تعصب کا الزام وارد کر دیا ہے۔ میری دانست میں اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں نے مولانا سلیمان صاحب کے حوالے سے شمالی ہند کے مسلمانوں کے موجودہ طرز عمل کو شمال مغرب کے مسلم حملہ آوروں کی پالیسی کی ناخوشگوار یاد قرار دی ہے کہ "مسلمانان ہند کے برتاؤ سے عیاں ہے کہ جو غلطی اُن کے بادشاہوں اور وزیروں اور قاضیوں اور عالموں سے سرزد ہوئی تھی وہ اب تک ان کے پسماندگان کے ورثہ میں پشت در پشت چلی آتی ہے۔" (ص ۲۹۷ زمانہ نومبر سنہ ۳۰ء) ورنہ آپ سکون دلی سے میرا نومبر کا ریویو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب ممدوح سے ہرگز اتفاق کرنے کو آمادہ نہ ہونگے۔ کہ میں نے خدانخواستہ جناب محترم مولانا سلیمان صاحب پر کسی قسم کی بے جا ہچ کا الزام لگایا ہے۔ یہ خالص علمی بحث ہے۔ اور اسی محققانہ طریقہ سے ریویو لکھا گیا تھا۔ مولانا ممدوح کی نیک نیتی، خلوص دلی اور عالمانہ انداز پر کسی قسم کا حملہ نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب کو اختیار ہے جیسا چاہیں سمجھ لیں۔ غالباً جوش حمایت میں اعتدال کی حد سے تجاوز کر گئے۔

کیا درۂ خیبر کے راستہ سے حملہ کرنے والے مسلمانوں نے مذہبی جوش سے ملک ہند پر حملے کئے تھے؟ ہم اس ناخوش گوار بحث میں الجھنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ مگر راقم السطور کا یہ خیال پختہ ہے کہ آنحضرت کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جن اغراض سے عربوں نے قرب و جوار کے ممالک پر لشکر کشیاں کیں۔ عراق العرب، شام، مصر، طرابلس، مراقش اور ہسپانیہ سے گزر کر سرزمین فرانس پر جھنڈے گاڑے تھے۔ انھیں مقاصد سے متاثر ہو کر پہلے سندھ پر پھر درۂ خیبر سے اُتر کر پنجاب اور شمالی ہند پر مسلمان حملہ آوروں نے حملے کئے تھے۔ افغانستان [illegible]

[redacted]

نہ ہوگا، کہ مولانا سلیمان نے ابوالحسن علی مسعودی کے حوالہ سے قندھار میں رُہبوط یعنی راجپوتوں کی آبادی تسلیم کی ہے۔ حال کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ افغانوں کے سر کا تیم اور ساخت صرف راجپوتوں ہی کے سر سے لگّا کھاتی ہے، اوران کے نرالے دستور بھی راجپوتی دستوروں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ اس ملک میں جو افغان آتے ہیں، وہ بھی اکثر اپنے اجداد کو از روئے روایت راجپوت سمجھتے ہیں۔ علاقہ آزاد قبائل اور نیز افغانستان کے مختلف حصوں میں بدھ مت کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ بامیان کی وادی اور جلال آباد کا علاقہ ان ہی نشانوں کے لئے خصوصیت سے مشہور ہے۔ جن کی کھدائی کئی برس سے فرانس کا نامی ماہر فوشے کر رہا ہے ہزارہا آثار کہنہ دستیاب ہو چکے ہیں، ابھی اور بہت سے کھنڈر باقی ہیں۔

عطیۂ پیغمبر و پیغام رسول از جناب غلام علی خاں کامل جوناگڈھی، کراؤن سائز

جناب کامل کاٹھیاواڑ کے ایک مشہور شاعر ہیں اور نواب صاحب بہادر جوناگڈھ کے یہاں درباری شاعر کی حیثیت سے ملازم ہیں، کاٹھیاواڑ میں عام طور پر گجراتی زبان بولی جاتی ہے مگر اردو بھی وہاں پر مقبول عام وخاص ہے اور اکثر حضرات اسی زبان میں دادِ سخنوری دیتے ہیں۔ چنانچہ جناب اختر جوناگڈھی کا نام بھی ادبی دنیا میں کافی مشہور ہے۔

ان دونوں کتابوں میں جناب کامل نے ۱۰۵ احادیث نبوی کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں کیا ہے ترتیب کی صورت یہ ہے کہ ایک صفحہ پر اصل حدیث مع اُردو ترجمہ نثر درج ہے اور اس کے مقابل صفحہ پر اس کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمہ میں صفائی وروانی ہے اور حتی الامکان حدیث کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تمام احادیث عام اخلاقی اصول پر مشتمل ہیں اور اس لئے بلا قید مذہب و ملت ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہیں، اہل اسلام کو تو خصوصیت سے ان کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔

مظہر علم دین یہ بھی جناب کامل کی جودت طبع کا نتیجہ ہے، اس میں علم کی فضیلت اور جہل کی بُرائی کے متعلق چہل یعنی چھیالیس احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اول تمام احادیث درج کرکے ان کا اُردو ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے پھر اس کو مثنوی کی صورت میں نظم کیا ہے۔ نظم سادہ وروال ہے۔ بچوں کے واسطے خصوصیت سے مفید معلوم ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا تینوں کتابیں جناب مصنف سے (جوناگڈھ کاٹھیاواڑ) مل سکتی ہیں۔ قیمت کسی کتاب پر درج نہیں ہے۔

جذباتِ جوش

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

صرف ظلمت ہی نہیں ہے دیکھ تنویریں بھی ہیں
کاوشِ تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں

جس جگہ خورشید کی حدت سے ہے عالم خموش
واں کسی دیوار کے سائے میں تقریریں بھی ہیں

جس جگہ مایوسیاں ہیں گردشِ تقدیر سے
واں کہیں اُمید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں

جس جگہ تعزیر کے قابل ہے ذوقِ نقش و رنگ
واں کسی آئینے میں رنگین تصویریں بھی ہیں

جس جگہ پیچیدہ عقدوں سے ہیں عقلیں سرنگوں
واں حیات و مرگ کی تابندہ تفسیریں بھی ہیں

جس جگہ پانی میں ہے زہرِ ہلاہل کا اثر
واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں

جس جگہ منڈلا رہے ہیں مبہم و تاریک خواب
واں کسی گوشے میں اُن خوابونکی تعبیریں بھی ہیں

جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگِ خارا کی رگیں
واں درخشاں جوہروں کی نرم تحریریں بھی ہیں

ٹوٹتا ہے سلسلہ کب زلفِ عنبر بیز کا
مَیں نے مانا طوق بھی ہے جوش زنجیریں بھی ہیں

کلامِ شادؔ[۱]

(از مولانا شادؔ عظیم آبادی مرحوم)

سرکارِ دل کی ہوش رُبائے زمانہ ہے
وسعت تو کچھ نہیں مگر اک کارخانہ ہے

خالی سمجھ کے پھینک نہ اے موج رائگاں
ہر کیسۂ حباب میں بند اک خزانہ ہے

اِن دو سے چھوٹنا نہیں ممکن کسی طرح
آفت ہے عشق، حُسن بلائے زمانہ ہے

نکلی جو تن سے روح دکھاتی چلی بہار
جاتی ہے جس طرف نظر آئینہ خانہ ہے

رہ رو تو دونوں ہی ہیں جرس یا ہو کارواں
آگے کوئی رواں کوئی پیچھے روانہ ہے

قشقہ کریں جبیں پہ کہ سجدہ کریں مگر
کیا ہو شرف کہ دُور ترا آستانہ ہے

اب دردِ غم کے سہنے کی طاقت نہیں رہی
دل کے خلاف آب و ہوائے زمانہ ہے

صیاد کی دعا بھی نہ ہوگی وہاں قبول
بلبل بہت بلند ترا آشیانہ ہے

آنکھیں ہوں دونوں کور، جو دیکھا بھی ہو تجھے
تجھ سے خلوصِ دل کو مرے غائبانہ ہے

پیری میں ہے فلک قدر انداز کس قدر
کوسوں سے جس کو تاک لیا وہ نشانہ ہے

آنکھیں شبِ فراق میں کیوں ہو چلی ہیں بند
آتی ہے نیند موت کا شاید بہانہ ہے

نام و نمود پر نہیں مرتے ترے شہید
چادر ہے قبر پر نہ کوئی شامیانہ ہے

الجھاؤ گیسوؤں کا الٰہی کہیں مٹے
وہ دستِ ناز میں بھی مدد گار شانہ ہے

گر عشق ہے تو یار کے در پر جھکا جبیں
ایماں کے بعد فرض بشر پنجگانہ ہے

اے شادؔ کھینچ لیتا ہے بے اختیار دل
کیا پوچھنا کلام ترا عارفانہ ہے

---

[۱] یہ غزل خان بہادر سید الشعرا سید علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی مرحوم کی وہ معرکۃ الآرا غزل ہے جو اُن کے آخری دورِ زندگی کے افکار کا نتیجہ ہے اور ایک مخلص دوست کی تلاش و جستجو سے ہدیۂ ناظرین ہو رہی ہے۔
(زمانہ)

گل گشت

(از جناب محمود اسیر ایلی)

اِک دن وفورِ غم نے جو بیتاب کر دیا
سیرِ چمن ہوئی دلِ ناشاد کو پسند

پہونچا تو دیکھا نکہتِ گلزار جا بجا
گلشن کے جادہاے الم کر رہی ہے بند

بیٹھے ہیں چپہ چپہ پہ گلشن کے پاسباں
خاروں کی ہیں سنانیں تو سنبل کی ہے کمند

شمشیر بن گئی ہے ہر اک موج آب جو
ہے بوئے گل سوار تو بادِ صبا "سمند"

سبزے کے لہلہانے سے شکلِ زمیں یہ ہے
اوڑھے ہوئے ہو جیسے کوئی چادرِ پرند

فرحت ہوئی جو دل کو تو سمجھا کہ واقعی
نظارہ فصلِ گل کا ہے داروئے دردمند

مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو اِک نازنیں وہاں
بیٹھی ہے آہِ سرد کو سینہ میں کر کے بند

کہنے لگی وہ یہ کہ دلِ داغدار کو
صدمہ خزاں سے فصلِ بہاری کا ہے دوچند

تو مجھ سے پوچھ دہر کے اسبابِ انقلاب
تو مجھ سے سن وہ بات کہ ہو تجھکو سودمند

یاں ہے فغانِ مرگ ولادت کی اک نوید
یاں پست کر کے ایک کو ہو دوسرا بلند

بلبل کی طرح شور و فغاں سے نہ کام لے
ایسا نہ ہو کہ تجھ کو بھی پہونچے کوئی گزند

عبرت سے دیکھ نرگسِ حیراں کو باغ میں
جو شیوۂ سکوت پہ رہتی ہے کاربند

غافل مشو ز گل کہ فرو رفتگانِ خاک
ایں نامہ را بخونِ دل انشا نمودہ اند

موت

(از جناب جینمی سرشار)

غیر ممکن ہے کسی جاندار کو اِس سے مفر   چل رہا ہے رات دن دنیا میں چکّر موت کا
ہو فقیرِ بے نوا کوئی کہ شاہِ نامور   ہے تسلط دہر میں سب پر برابر موت کا

موت کے ہاتھوں سے کوئی بچکے جا سکتا نہیں   جو یہاں پیدا ہوا ہے ایک دن مر جائیگا
کوئی بھی اس دام سے خود کو چھڑا سکتا نہیں   بحر و بر میں ہے جو زیرِ آسماں پھیلا ہوا

یاد رکھ دہر میں ہر طفلک و پیر و جواں   چند روزہ ہے بہارِ بوستانِ زندگی
بالیقیں اِک دن چلے گی موت کی بادِ خزاں   خشک ہو جائیگا نخلِ گلفشانِ زندگی

طفلکِ کمسن، جواں ہمت جواں، پیرِ ضعیف   سامنے اسکے سبھی ناچار ہیں، مجبور ہیں
کوئی دنیا میں نظر آتا نہیں اسکا حریف   دام میں اسکے چہار اطراف سے محصور ہیں

گھر میں چھُپ چھُپ کر رہے کوئی کہ ہو گرمِ سفر   موت سایہ کی طرح رہتی ہے ہر دم تاک میں
لاکھ بچ بچ کر زمانے میں رہے اِس سے بشر   باندھ ہی لیتی ہے قسمت موت کے فتراک میں

گونج اُٹھتے ہیں جہاں میں نالہائے دلخراش   بربطِ ہستی پہ جب مضرابِ زن ہوتی ہے موت
دنیوی رشتوں کو کر دیتی ہے یکسر پاش پاش   آکے جب وجہِ فراقِ روح و تن ہوتی ہے موت

بچہ، بوڑھا، مرد و زن، مفلس غنی، شاہ و وزیر   ہو نہیں سکتا رہا کوئی بھی اسکے دام سے
کتنی حیرت ہے کہ جب آنا ہے اس کا ناگزیر   پھر بھی تھر تھر کانپتے ہیں لوگ اسکے نام سے

لطفِ سخن

(جناب تسکین قریشی سوروئی)

تو مری حیرت میں ہے تو میری خاموشی میں ہے
کیا ادائے بے حجابی تیری روپوشی میں ہے

شورِ شیون میں نہ وہ اشکوں کی خاموشی میں ہے
عشق کہتے ہیں جسے وہ خود فراموشی میں ہے

سازِ میری زندگی کا خود فراموشی میں ہے
میں ہوں وہ آواز جو مستورِ خاموشی میں ہے

لیکے جام اُس دستِ رنگیں سے یہ عقدہ کھل گیا
مے میں وہ لذت نہیں جو لطف مینوشی میں ہے

شورِ محفل سے جو فرصت ہو تو اُٹھکر دیکھ لو
ایک ہنگامہ مرے مرنیکی خاموشی میں ہے

جلوہ تا حدِ نظر، حدِ نظر تا شوقِ دل
اسکے آگے اور جو کچھ ہے فراموشی میں ہے

اب نہ وہ راتیں نہ وہ ساقی نہ وہ بزمِ طرب
اپنی مینوشی بھی تسکیں کوئی مینوشی میں ہے

(حضرت اصغر شاہجہانپوری)

ہوئی کچھ اور ترقی پہ دل کی بے جگری
خدنگِ یار مبارک ہو تجھ کو زخم گری

ہر ایک شئے میں وہ موجود پھر کسی میں نہیں
عیاں ہے جلوہ گری سے کمال جلوہ گری

ازل کے روز ہی تصویرِ حسنِ دلکش میں
بھر اتھا خامۂ قدرت نے رنگِ فتنہ گری

خدا کرے کہ ترقی پذیر ہو اتنی
سکونِ قلب کا باعث ہو کاوشِ جگری

وہ بے خبر تھے کہ مطلق خبر ہوئی نہ ہمیں
ق روانہ ہو گئے منزل کی سمت ہم سفری

حواس اُڑ گئے چونکے جو خوابِ غفلت سے
فضا میں گونج رہا تھا ترانہ سحری

کلیم طور پہ غش کھا کے جب گرے اصغر
صدا یہ آئی کہ دیکھا کمال جلوہ گری

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق)

کب سے ہوں سر میں عشق کا سودا لئے ہوئے
پھرتا ہوں اک ہجوم تمنا لئے ہوئے

ہے کاسۂ سفال کہ جامِ جہاں نما
سینہ میں دل ہے عشق کی دنیا لئے ہوئے

دیکھا ہے ہم نے دیکھنے والے کی آنکھ سے ہے شوقِ دید ذوقِ تماشا لئے ہوئے
بے پر کی بادہ نوشوں میں اڑتی ہے ساقیا کیا کہہ رہے ہیں ساغرِ صہبا لئے ہوئے
دل میں بھرا ہے حسرت و ارمان کا لہو ہے چشم شوق خونِ تمنا لئے ہوئے

(جناب جگر بریلوی. بی۔اے)

موت جب تک نظر نہیں آتی زندگی راہ پر نہیں آتی
دل کو لذت شناس غم کر لیں موت ہم کو اگر نہیں آتی
ترک تدبیر بھی نہیں آساں راس تدبیر اگر نہیں آتی
جس نے تیری نظر کو دیکھ لیا اُس کو دنیا نظر نہیں آتی
ہے امینِ وقارِ عجز و نیاز وہ تمنا جو بر نہیں آتی
وہ ہے نا آشنائے رازِ حیات جس کو سعیِ ہنر نہیں آتی
اشکِ پیہم جگر نہیں تھمتے راہ پر چشم تر نہیں آتی

(جناب آبر انصاری گنوری)

اثر والے جنھیں کہتے ہیں سب کیا یہ وہ نالے ہیں کہ اب میری زباں سے تا بدل چھالے ہی چھالے ہیں
خدائی خوار بھی ہیں اور مسجودِ ملائک بھی ہمیں تم جو بنا دو ہم وہی بن جانے والے ہیں
کھلے دیکھے نہ تھے پھول اس قدر میں نے گلستاں میں قفس کی زندگی نے داغ جتنے دل میں ڈالے ہیں
مآلِ زیست تیری راہ میں مٹنا سمجھتا ہوں مرے لمحاتِ ہستی مرگِ الفت کے سنبھالے ہیں
عروجِ سوزِ پنہاں آبر فرقت میں معاذ اللہ زسر تا پا تنِ فریاد پر چھالے ہی چھالے ہیں

(جناب بسمل الہ آبادی)

عدم آباد ہی کا ہو گیا ہے نہیں آیا پلٹ کر جو گیا ہے
تڑپتا تھا ابھی بیمارِ الفت تمہارا نام لے کر سو گیا ہے
کسی کا پوچھنا دل لے کے ہم سے بتاؤ کیا تمہارا کھو گیا ہے
مریضِ غم کی جھپکی ہے ابھی آنکھ تصور میں کسی کے سو گیا ہے
وہ میری چھیڑ پر کہتے ہیں بسمل خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے

منتخبات

یہی وہ فخر ہے جس پر وفا کو ناز رہے   کہ سر رہے تو رہینِ سرِ نیاز رہے

قمر بدایونی

مقام ناز ہے میرے لئے جہاں میں ہوں   جہاں نیاز کی حد ہے وہاں نیاز رہے

عالم بدایونی

دل معرفتِ شوق سے بیگانہ بنا دے   دیوانہ ہشیار کو دیوانہ بنا دے

فانی بدایونی

قصہ مرا دلچسپ ہے اے داورِ محشر   سننا ہے تو پہلے مجھے دیوانہ بنا دے

کامل لکھنوی

وہ حسن جو خود شمع کو پروانہ بنا دے   مختار ہے چاہے جسے دیوانہ بنا دے

ثاقب لکھنوی

ہنس ہنس کے جو ہر بات کو افسانہ بنا دے   وہ تو جسے چاہے اُسے دیوانہ بنا دے

آرزو لکھنوی

نیرنگیِ تقدیر تماشا نہ بنا دے   یہ کم نہیں احسان کہ دیوانہ بنا دے

رضا لکھنوی

وفادار آپ بنتے ہیں بنا کر بے وفا مجھکو   ذرا آنکھیں ملا کر پھر تو کہیئے کیا کہا مجھکو

ہجر لکھنوی

ہوئے ہیں رفتہ رفتہ اس قدر مانوس دُنیا سے   کبھی جینا ہی تھا دشوار اب مرنا بھی مشکل ہے

رسا جالندھری

دل و جگر تو وہی، لب وہی، زبان وہی   مگر وہ اگلی سی رنگینیاں بیاں میں نہیں

سید ظہیری

تشنہ لبوں کے سامنے ساغرِ دل تو پیش کر   بزمِ جہاں میں لے بشر ساقیِ غمگسار ہو
بھرتا ہے دم جو عشق کا پہلے خودی کو دے مٹا   یار پہ بیٹھے پھر فدا شوق سے بار بار ہو

تمنا شاد کھوسلہ

روح سے پوچھو اسکی کیفیت عشق اک مشربِ مکمل ہے

کیا گل کتر رہی تھی جلا کر پتنگوں کو دیکھا سحر کو شمع کا انجام کیا ہوا
کیونکر نکالوں آہ محبت کو دل سے میں یہ درد تو ہے خاص تمہارا دیا ہوا

ساقی مرا خمار ابد تک نہ جائے گا میخانۂ ازل کا میں اک بادہ خوار ہوں

بعد مرنے کے بھی سکوں نہ ہوا اک قیامت ہوئی جنوں نہ ہوا

وہی جس میں کوئی نہیں آرزو وہی دل محبّت کے قابل بھی ہو

آثم خیرآبادی

خود نمائی ہے، خود پرستی ہے واہ کیا رنگِ بزمِ ہستی ہے
سر بسجدہ ہے بتکدے میں راز بس یہی حدِّ حق پرستی ہے

راز چاندپوری

ذیل میں فتحپور کے ایک گذشتہ مشاعرہ کی غزلیات کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

اللہ اللہ یہ بہارِ حُسن و رنگ روئے حُسن کیا کہیں ہم، تجھ میں گلشن ہو کہ تو گلشن میں ہے

نوح ناروی

گلشنِ ہستی میں ہستیِ چمن کیا خاک تھی آنکھ جب گل کی کھلی، دیکھا خزاں گلشن میں ہے

تاباں بدایونی

اُسکو صحرا چاہیئے، خارِ مغیلاں چاہیئے وحشیِ خستہ کی گنجائش کہاں گلشن میں ہے

وحشی فتحپوری

مانتا ہوں میں بھی یہ اہلِ چمن کا فلسفہ موت ہے کنجِ قفس میں، زندگی گلشن میں ہے

بسمل الہ آبادی

ہم اسیرانِ قفس کو خوں رُلانے کے لئے فصلِ گل کس رنگ سے پھر جلوہ زا گلشن میں ہے

سحر ہنگامی

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈمی کی دوسری ادبی کانفرنس

صوبہ متحدہ کی ہندوستانی اکیڈمی کو قائم ہوئے تقریبًا چار سال ہو چکے ہیں، اگرچہ کسی علمی ادارہ کو بہ طور منضبط و منظم کرکے کارہائے نمایاں انجام دینے کے لئے یہ مدت کافی نہیں ہے مگر موجب مسرت ہے کہ اس قلیل زمانہ ہی میں اکیڈمی نے قابل قدر کام کئے ہیں اور جو کام اس وقت ہو رہے ہیں ان کے پایۂ تکمیل تک پہونچنے کے بعد یقینًا اکیڈمی کی کامیابی میں کسی کو شک نہ رہیگا۔ جیسا کہ ناظرین واقف ہیں۔ اکیڈمی کے دو شعبے ہیں۔ (۱) اردو (۲) ہندی۔ ہر شعبہ میں قابل اہل علم و قلم کام کر رہے ہیں اور دونوں زبانوں میں متعدد مفید کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ جنوری ۱۹۳۱ء سے دو سہ ماہی رسالے بھی اردو اور ہندی علیحدہ علیحدہ شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ان سب باتوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کارکنان اکیڈمی اس کو کامیاب بنانے کی سعی بلیغ کر رہے ہیں جس سے پوری امید ہوتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ اکیڈمی صوبہ بھر کی علمی و ادبی انجمن قرار پائیگی۔

شعبۂ اردو میں اس وقت تک متعدد مفید علمی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات" مرتبہ مسٹر عبداللہ یوسف علی ایم۔ اے۔ "عرب و ہند کے تعلقات" مصنفہ سید سلیمان ندوی۔ "ناتن" مترجمہ مسٹر نعیم الرحمٰن ایم۔ اے۔ "فریب عمل" مترجمہ چودھری جگت موہن لال رواں ایم۔ اے، ایل ایل بی، اور متعدد کتابیں زیر طبع ہیں مثلاً "ہندی شاعری" اور "فن زراعت" وغیرہ۔ علاوہ ازیں اکثر کتابیں زیر تصنیف و ترجمہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قابل مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لئے گزشتہ سالوں میں بہترین مطبوعات پر انعام بھی دیئے گئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) تنظیم الحیات۔ مصنفہ حضرت صفی لکھنوی
(۲) وقار حیات۔ مؤلفہ مولوی اکرام اللہ خاں ندوی
(۳) معراج سخن۔ مصنفہ حضرت عروج لکھنوی مرحوم
(۴) نفسیات ترغیب۔ مصنفہ سید ملیح الدین کنتوری

مندرجہ بالا کتابوں میں سے ہر ایک پر پانچ سو روپیہ انعام دیا گیا۔ عمدہ نظم و نثر لکھنے والے طلبار کے واسطے بھی ایک انعامی مقابلہ قائم کیا گیا ہے۔

اکیڈمی کی جانب سے گزشتہ سال ایک ادبی کانفرنس بھی کیگئی تھی جس میں بعض مشہور ارباب علم نے محققانہ مضامین پڑھے تھے۔ امسال ۴۔ اپریل ۱۹۳۱ء کو اس کانفرنس کا دوسرا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا جس کی مختصر روداد درج ذیل ہے:-

افسوس کہ اس کانفرنس میں اکیڈمی کے نامور صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب بالقابہ بعض

ہیں، اور ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف زبانیں بولنے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے:-

(۱) بنگالی	چار کروڑ ترانوے لاکھ	(۵) تامل	ایک کروڑ اٹھاسی لاکھ
(۲) مرہٹی	ایک کروڑ بانوے لاکھ	(۶) تلنگو	دو کروڑ چھتیس ہزار
(۳) گجراتی	پچانوے لاکھ	(۷) کناری	ایک کروڑ
(۴) پنجابی	ایک کروڑ باسٹھ لاکھ	(۸) ملیالم	پچھتر لاکھ

مندرجہ بالا اعداد کے مقابلہ میں اگر مغربی اردو، مشرقی ہندی اور راجستھانی زبانیں "ہندوستانی" زبان میں شامل کر لی جائیں تو ان لوگوں کی تعداد جو ہندوستانی بولتے ہیں تقریباً پندرہ کروڑ ہو گی۔ گویا ہندوستانی زبان کا مرتبہ دنیا کی تمام زبانوں میں دوسرا یا تیسرا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ان مشکلوں کا ذکر کرتے ہو جو کسی ملک میں ایک عام زبان رائج کرنے کے سلسلہ میں پیش آتی ہیں فرمایا کہ دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل نہ ہوں۔ لہذا اہل ملک کو حسب ضرورت غیر زبانوں کے ایسے الفاظ ہندوستانی زبان میں شامل کرنے چاہیئے جو ثقیل نہ ہوں اور آسانی سے جزو زبان بن سکیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اس امر پر زور دیا کہ اگر ملک کے لئے اتفاق و اتحاد ضروری ہے اور اہل ہند ایک قوم بننا چاہتے ہیں تو تمام ملک کی معاشرت اور زبان کا ایک ہونا بھی لازمی و ضروری ہے۔

غرض ہر حیثیت سے اس سال کی ادبی کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ صوبجات متحدہ کے علاوہ دوسرے صوبوں سے بھی بعض ممتاز و مشہور ارباب علم اس میں شریک ہوئے تھے۔ صدر کمیٹی استقبالیہ ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے جملہ شرکائے کانفرنس کے اعزاز میں ایک نہایت پُر تکلف ایوننگ پارٹی بھی دی جس میں معززین الہ آباد بھی مدعو تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے ممبران اکیڈیمی کے اعزاز میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ایک ڈنر بھی دیا۔

صوبہ متحدہ میں سہ ماہی مختتمہ مارچ ۱۹۳۱ء میں اردو زبان کی صرف ایک سو ایک کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن کی تفصیل بلحاظ موضوع حسب ذیل ہے:-

سوانح عمری	۵	مذہبی	۲
افسانے	۹	طبی	۳
زبان	۲۴	سائینس	۱
درسی	۱۳	متفرق	۱۰
سیاسی	۸	نظم	۲۶

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے

نمبر ٦	جون سنہ ۱۹۳۱ء	جلد ۵۹

فہرست مضامین

تصاویر: آنریبل مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم - سردار ولبھ بھائی پٹیل - ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور - شریمت گنیش شنکر ودیارتھی مرحوم

[illegible]

صرف ایک آنے میں

دو انمول ہیرے

(۱) حسن کی چنگاری (۲) جذبے ماتم

حسن کی چنگاری اردو میں شیکسپیر کا مشہور ... مصنفہ اشرف ... دہلوی بی اے ... [illegible] بی اے کے ... کا ... اور نایاب ... ہے ... ایک نہایت حسین تصویر ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر بڑی خوش اسلوبی اور صفائی کے ساتھ چھاپی گئی ہے ... ہے کہ اردو زبان میں آج تک ایسی لاثانی ... اور دلچسپ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس قدر خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۲ ... [illegible]

(۲) جذبے ماتم

... [illegible] ... انگریزی ... اردو ... الٹ ... اور ... [illegible] ... اور ... [illegible] ... اردو، ہندی، انگریزی اور بنگالی زبانوں میں ... [illegible] ... [illegible]

ملنے کا پتہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زمانہ

جلد ۵۶ — جون سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۶

ملک کی موجودہ حالت اور آیندہ ترقی

(از پنڈت اقبال کشن کول شرغہ بی۔ اے۔)

عرصہ دراز سے اہل ہند کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ اپنا ملک آزاد اور خود مختار ہو، اِس خواہش پر انھوں نے جان و مال کو نثار کیا چنانچہ کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ حالات عوام کے پیش نظر ہیں، جد و جہد و انتظار شدید کے بعد حال میں گول میز کانفرنس کا اجلاس بہ مقام لندن منعقد ہوا جس میں ملک کے سربرآوردہ اشخاص اور والیان ریاست ہائے ہند شریک ہوئے۔ مجملاً نتیجہ یہ ہے کہ منجملہ اور باتوں کے امور ذیل پر اتفاق ہوا:-

(۱) کل ہندوستان کے واسطے ایک حکومت متحدہ قائم ہو جسمیں ریاستہائے ہند بھی شامل ہوں

(۲) مرکزی حکومت اور نیز حکومت صوبجات مجلس واضعانِ قانون کے تابع رہیں۔ احتیاطاً چند عارضی اختیارات تحفظ گورنر جنرل اور گورنران صوبہ جات کو دیے جائیں گے مگر یہ اختیارات صرف اُس وقت عمل میں لائے جائیں گے جب معمولی طور سے انتظام ملک ناممکن ہو جائے۔

(۳) اعلیٰ فوجی تعلیم کے واسطے ایک بڑا کالج ہندوستان میں کھولا جائیگا اور بتدریج فوج کے بڑے عہدوں پر ہندوستانی مقرر ہونگے۔

یہ ظاہر ہے کہ ابھی چند ابتدائی امور پر غور ہوا ہے، کوئی بات قطعی طور پر طے نہیں ہوئی، مگر جو کچھ کام ہوا وہ بادی النظر میں قابل تشفی معلوم ہوتا ہے۔ جو اصحاب یہاں سے جاکر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے وہ بحیثیت

مجموعی نمایندگان برطانیہ کی منصف مزاجی، صاف گوئی اور شیریں کلامی سے مطمئن ہو کر واپس آئے ہیں مگر کانگریس کی پرزور جماعت کانفرنس میں شریک نہیں ہوئی، اور وہ اب بھی یہ باور کرنے کو تیار نہیں ہے کہ اقوال مذکورہ پر عمل ہوگا۔ اقوال بھی ایسے ہیں کہ جن میں کمی اور بیشی اور التوا کی گنجایش ہے۔ تاہم ان کے دلوں پر بھی اثر ہوا ہے اور اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ آیندہ گول میز کانفرنس میں پیشوایان کانگریس بھی شریک ہوں، چنانچہ مہاتما گاندھی وائسرائے سے ملے اور عارضی صلح ہو گئی تاکہ عقدہائے ملکی پر کل سیاسی جماعتوں کے نمایندے باہم ملکر غور و فکر کریں۔

باہمی اتفاق واتحاد سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ مختلف فرقوں میں عموماً اور اہل ہنود اور اہل اسلام کی دو بڑی جماعتوں میں خصوصاً باہمی اتفاق اور اتحاد ہو، جب آپس میں پھوٹ ہو تو سوراج کیسا۔

گول میز کانفرنس میں وزیر اعظم برطانیہ نے اس قسم کے خیالات ظاہر کئے کہ جدید حکومت ہندوستان میں سب فرقوں کے حقوق کا تحفظ لازمی ہے، اس کا تصفیہ اہل ہند کو آپس میں کر لینا چاہیئے، اگر ضرورت ہو تو گورنمنٹ برطانیہ امداد سے کنارہ کشی نہ کرے گی۔ لیکن یہ اہل ہند کا نجی کا معاملہ ہے اور اُن کے واسطے یہ زیبا ہے کہ خود ہی اس کو طے کر لیں، اگر ایسا نہ کر سکیں تو اُن کی سُبکی ہوگی کہ اُن میں اپنا نفاق دور کرنے کی قابلیت نہ تھی اور خارجی امداد کی محتاجی ہوئی۔

یہ خیالات صحیح ہیں، باہمی اتفاق نہایت ضروری ہے، بغیر اس کے راہ آزادی میں کس طرح قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے کہا ہے کہ اگر ہندو مسلم اتحاد میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ آیندہ گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہونگے۔ عموماً امید قوی تھی کہ اس میں کوئی بڑی دقت پیش نہ آئیگی، مگر بد قسمتی سے نئی مشکلات پیدا ہوئیں، مختلف مقامات خصوصاً بنارس اور کانپور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا فساد اور کشت و خون ہوا جس کی وجہ سے ہر دو جانب کے بہی خواہان ملک افسردہ خاطر ہوئے، گو یہ واقعات نہایت افسوسناک ہیں تاہم کل امور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناامیدی کی حالت نہیں ہے۔

آثار نیک ایک انگریزی مثل ہے کہ ہر گلہ میں کچھ کالی بھیڑیں ہوتی ہیں، اگر اہل ہنود و اہل اسلام میں کچھ لوگ کوتاہ بیں اور خود غرض اور سیاہ قلب ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، شکر ہے کہ ہر دو جانب ایک بڑی تعداد ایسے نیک نیت اور شریف مزاج اشخاص کی موجود ہے جن کو اپنی طرف کے پُر فساد اشخاص کی حرکات قبیح سے شرمندگی ہے۔ جنھوں نے حسب موقعہ فریق دیگر کے

بیکسوں اور مظلوموں کو پناہ دی اور اپنی جان و مال کو خطرہ میں ڈالکر اُن کی حفاظت کی، جن کو خود نمائی کی غرض نہ تھی اور جو کسی شکریہ کے طالب نہ تھے، اور جو محض ہمدردی انسانی اور خوفِ خدا سے راہ نیک پر ثابت قدم رہے۔ جس ملک کی خدمت کے واسطے ایسے نیک نیت اور باہمت لوگ موجود ہیں اُس کا بیڑا پار ہے اور ساحلِ امید تک اُس کی رسائی ضرور ہوگی۔ ان اشخاص نیک و اولوالعزم پر نظر کرتے ہوئے اس وقت عوام کی نگاہ دلی عزت اور حسرت کے ساتھ سب سے پہلے اُس پاک طینت شیر مرد پر ٹھہرتی ہے جس نے تھوڑا عرصہ ہوا کہ کانپور میں بلا لحاظ مذہب و ملت اور بے خوف و خطر مظلوموں کی امداد میں اپنی جان دیدی۔

گنیش شنکر ودیارتھی عام اصول ہے کہ کسی قریب شے یا شخص کی عظمت بخوبی معلوم نہیں ہوتی ہے ہمت اور سخاوت اور ابنا رجنس سے بے لوث الفت کی مثالیں جب قصوں اور کہانیوں میں پڑھتے ہیں تو طبیعت وجد میں آتی ہے گو ان قصوں کی صداقت کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ عموماً بینشتری سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصے خیالی اور فرضی ہیں۔ گنیش شنکر ودیارتھی نے جو کارنمایاں کیا وہ حال کا واقعہ ہے اور ہم لوگوں کے پیش نظر ہے، ہندوستان کی خوش نصیبی ہے اور اس کے لئے باعث فخر و ناز ہے کہ اس میں ایک ایسا نیک اور باہمت جوانمرد پیدا ہوا جو ہنگامہ شور و شر میں سر بکف سامنے آیا جس نے صدہا آدمیوں کو مصیبت سے نکالا، اُن کی جان بچائی، اور اپنی جان نثار کردی، اس واقعہ پر لاکھوں آدمیوں کو سخت افسوس ہے، اور ان کے خاندان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، مگر افسوس کے ساتھ یہ امید اور عقیدہ ہے کہ گنیش شنکر ودیارتھی کو عالم بالا میں رتبۂ اعلیٰ حاصل ہوگا، اُن کے عیال و اطفال کی آنکھوں سے جو آنسو گرے اُن سے ملک کی زمین سرسبز ہوگی، اُن کی چتا سے جو شعلے نکلے اُن سے اہل ہنود اور اہل اسلام کی باقیماندہ کدورت دور ہوگی۔ طالبانِ اتحاد کی حوصلہ افزائی ہوگی، اور ہر دو جانب کے بانیانِ فساد روسیاہ اور شرمسار ہونگے۔ اگر یہ نتیجہ ظہور میں آئے تو سمجھنا چاہیے کہ سارا ملک شاہد مراد سے ہمکنار ہوا اور یقیناً اُس فدائی ملک و قوم کی روح پاک کو خود سب سے زیادہ سرور موفور ہوگا۔ ع غنیمت جان یار آئے لحد پر جان کھونے سے

ترقیِ ملک کی پہلی منزل (آزادی اور خود مختاری) اگر اہل ہند میں باہمی اتفاق ہو تو حصول آزادی و خود مختاری کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ترقیِ ملک میں آزادی اور خود مختاری تو پہلی منزل ہے آزادی کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے ملک کو فروغ ہوگا، بعد حصول آزادی وہ تدابیر عمل میں آتی ہیں کہ ملک کی قوت اور دولت، عزت اور راحت میں ترقی ہو، یہ دوسری منزل ہے۔

اور پہلی منزل سے بہت زیادہ دشوار ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی قبلۂ حاجات یا کام دھینو ہے، اگر آزادی مل جائے تو سب کچھ مل گیا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، فرض کیجئے آپ ایک بڑے زمیندار ہیں اور آپ کا بڑا خاندان ہے ایک منیجر آپ کے کل کاروبار کا عرصہ سے انتظام کرتا تھا، حال میں آپ نے اور آپ کے دو بھائیوں نے اُس سے کہا کہ ہم تمہارے انتظام سے خوش نہیں ہیں، اب تم اپنے گھر جاؤ۔ اُس نے کہا کہ میں نہیں جاؤنگا صرف آپ دو تین آدمی مجھکو بُرا کہتے ہیں باقی سارا خاندان مجھ سے خوش ہے، اس پر سارے خاندان نے گھر کو سر پر اُٹھالیا، مردوں نے منیجر کو سخت سُست کہا عورتوں نے شور و غل مچایا، بچوں نے رونا شروع کیا، تب منیجر بولا کہ میں اب سمجھ گیا، مجھ سے آپ کے کاروبار کا انتظام نہ ہو سکے گا میں اب جاتا ہوں۔ جب وہ رخصت ہوا تو آپ اُس سے آزاد ہو گئے۔ مگر اس آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ع

فارغ البال ہوئے خوب فراغت پائی

پہلے ۷ بجے صبح سو کر اُٹھتے تھے اب ۹ بجے تک بستر پر آرام کریں گے، برخلاف اس کے اب تو انتظام زمینداری اور پرورش و پرداخت خاندان کا کل بار آپ کو اپنے سر پر اُٹھانا ہے، اگر اپنے فرائض کو فہم و فراست اور مستقل مزاجی سے ادا کیجئے گا تو خاندان مرفہ الحال ہوگا، دولت و عزت، باہمی لطف و محبت میں زیادتی ہوگی ورنہ کل اُمور درہم برہم ہو جائیں گے۔ ملک کی پادشاہت بھی ایک بڑی زمینداری ہے، قوم ایک بڑا خاندان ہے آزادی اور خود مختاری بہت ضروری ہے، مگر آزادی کے معنی یہ ہیں کہ جن زنجیروں سے آپ بندھے تھے اُن کو کھول دیا گیا۔ اب اپنے پاؤں سے چلئے اور منزل مقصود کی راہ تلاش کیجئے۔ ابھی تو سفر دراز درپیش ہے اور آرام گاہ بہت دُور ہے۔

ترقیِ ملک کی دوسری منزل فروغ اور خوش حالی

آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے بعد بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ بہت بڑا مسئلہ غور طلب یہ ہے کہ جب عنانِ حکومت ہمارے ہاتھ میں آئے تو کن اغراض کو ہم مدنظر رکھیں گے اور کن اصول پر ہم عمل کریں گے۔ یہ محض سیاسی سوال نہیں ہے، ملک اور قوم کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر نظر رکھنے اور اصلاح کرنے کی ضرورت ہے، یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اور اسی کے سلجھانے پر ملک کا فروغ منحصر ہے۔ اس دوسری منزل میں بہت سی مشکلات کو حل کرنا ہے آجکل خاصکر (۱) مسئلہ افلاس ملک اور (۲) مسئلہ تعلیم پیش نظر ہے۔ ان امور پر بہت زور دیا جاتا ہے اور یہ نہایت مناسب اور ضروری ہے۔

مسئلہ افلاس

ملک میں غلہ بکثرت پیدا ہوتا ہے، اور قدرتی وسائل بھی بافراط موجود ہیں، مگر ایک

بڑی تعداد آبادی کی بیکار بیٹھی ہے، ان سے بہت زیادہ تعداد اُن اشخاص کی ہے جو بیکار نہیں ہیں، مگر اُن کو اجرت اس قدر کم ملتی ہے کہ دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ لباس مناسب کا کیا ذکر ہے۔ یہ حال زار نہایت غور طلب ہے، امید کہ عوام کی توجہ اور ماہران علوم و فنون متعلقہ کی کوشش سے کوئی فلاح کی صورت جلد پیدا ہو۔

مسئلہ تعلیم | تعلیم سب سے زیادہ مفید اور ضروری ہے، اگر افراد قوم صحیح اور توانا ہیں اور اُنھوں نے معلومات مفید اور عادات نیک حاصل کی ہیں تو ملک میں ہر طرح کا فروغ خود بخود ہو جائیگا، امر غور طلب یہ ہے کہ تعلیم کی غرض کیا ہے اور اس کے وسائل کیا ہیں، یہ دقیق سوالات ہیں، مگر سب لوگ بہ ظاہر تعلیم کو ایک آسان امر سمجھتے ہیں، یا اگر اس کے متعلق کوئی مسئلہ ہے بھی ہے تو وہ آن کی دانست میں مدت سے حل ہو چکا ہے، زائد روپیہ لائیے بہت سے نئے اسکول اور کالج کھول دیجیے، معلموں کی تنخواہ میں اضافہ کیجیے، امتحانات سخت مقرر کیجیے، شاہی کمیشن ولایت سے آئے اور امور تعلیم میں ہدایت کرے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا جاتا ہے کہ ملک کے سب بچے خواندہ ہو جائیں، ان امور کو اگر بالتفصیل دیکھا جائے تو بہت سے معاملات میں اختلاف رائے ممکن ہے۔ مگر یہاں نکتہ چینی کی غرض نہیں ہے، مان لیجیے کہ یہ سب تدابیر مناسب اور ضروری ہیں مگر محض ان طریقوں سے قوم کو قوت اور دولت اور دیرپا عظمت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ سب سے زیادہ غور طلب یہ امر ہے کہ تعلیم کی بنیاد میں کون اصول وعقائد صحیح رکھے جائیں اور بچوں کو کون عادات سکھائی جائیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے اور نہ محض الفاظ پند ونصیحت کافی ہیں، تاہم الفاظ کا بھی اثر ہوتا ہے، مگر اس حالت میں جبکہ سامعین ان کو قبول کریں۔ نیک اصول وعقائد کسی کے دل پر زبردستی چسپاں نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اصول وعقائد راست کس دل کش پیرایہ میں، بچوں اور نوجوانوں کو دکھلائے جائیں اور کس طور پر ان کی مناسب نگرانی ہو۔ اس امر میں بہت کچھ کامیابی معلم پر موقوف ہے مگر لوگ عموماً معلم کو قادر مطلق سمجھتے ہیں، اور ساری ذمہ داری کا بار اُس پر رکھتے ہیں۔ بچوں کے دماغی اور جسمانی نشو ونما کے بہت سے وجوہ ہیں، ان میں معلم کی لیاقت اور کوشش بھی شامل ہے مگر تعلیم پر سب سے زیادہ اثر گرد و نواح کے خیالات اور عقائد کا پڑتا ہے۔ خیالی منصوبہ جو کچھ ہو عملی نتیجہ زیادہ تر اس امر پر موقوف ہے کہ کل قوم کے خیالات اور عادات کیا ہیں، یعنی کس قسم کی اور کس درجہ کی تہذیب اُس میں ہے۔ اُسی قسم کے خیالات اور عقائد خواہ مخواہ بچوں کے دلوں میں سرایت کریں گے۔ کسی قوم کا نظام تعلیم اس کی موجودہ تہذیب سے برتر نہیں ہو سکتا ہے۔

تہذیب | ہر قوم حالتِ ابتدائی میں دست قدرت کی صنعت ہے، اور اپنی چند مختصر ضروریات کو وسائل قدرتی سے رفع کر لیتی ہے، رفتہ رفتہ قوم پھیلتی ہے اور اس کے خیالات کی بھی توسیع ہوتی ہے، نئی نئی ضروریات اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور اُن کے پورا کرنے کے لئے نئی نئی راہیں نکل آتی ہیں، رسوم و رواج قائم ہو جاتے ہیں۔ ان امور میں ملک اور آب و ہوا کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بہت کچھ عاقل اور دور اندیش اشخاص کی ہدایت اور طرز معاشرت قوم کی رہنما ہوتی ہے، اور زیادہ ترقی ہونے پر باقاعدہ مذہب و فلسفہ و علوم مادی و شاعری و مصوری وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔ مگر شروع سے آخر تک ہر قوم کے کچھ بنیادی اصول اور عقائد ہوتے ہیں، اگر یہ صحیح اور درست ہیں تو قوم عرصہ دراز تک شان و شوکت کے ساتھ قائم رہتی ہے اور اگر اُس کے اصول و عقائد غلط ہیں یا پہلے صحیح تھے اور بعد کو غلط ہو گئے تو وہ قوم تھوڑے عرصہ بعد برباد ہو جاتی ہے۔

تہذیب مشرقی و مغربی | اس سلسلہ میں ہر ذی ہوش اور فہمیدہ شخص کے دل میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً (۱) میں کیا ہوں (۲) دنیا کیا ہے (۳) انسان اور دنیا کا آغاز کہاں ہوا اور انجام کیا ہوگا، (۴) انسان کا مقصدِ اعلیٰ کیا ہے۔

ایک بڑا سوال تشفیِ خواہشات کا ہے، ہر خواہش کے دو رُخ ہیں، ایک طرف طالب ہے اور دوسری طرف شئے مطلوب۔ جسمانی خواہشات کے واسطے مادی اشیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے تشفیِ خواہش کے لئے طالب کی ذاتی خوبی زیادہ ضروری ہے یا شئے مطلوب کی عموماً لوگ اشیاء بیرونی پر فریفتہ ہوتے ہیں اور اپنے تئیں بھول جاتے ہیں، حالانکہ ذرا سے غور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی خوشی زیادہ تر اُس کی اندرونی حالت پر منحصر ہے نہ کہ خارجی اشیاء پر۔ صحیح آدمی کو اشتہار صادق پر بُھنے ہوئے چنے لذت دیتے ہیں اور مریض کو پلاؤ اور شیر مال بھی بدمزہ معلوم ہوتے ہیں۔ مزدوروں کو دن بھر محنت کرنے کے بعد سڑک کے کنارے کنکروں کے انبار پر آرام کی نیند آتی ہے، اور بے شغل یا بدافعال امیروں کو نواڑ کے پلنگ اور مخمل کے گدے پر چین نہیں پڑتا ہے۔ یہ دو مثالیں ہیں۔ مگر عام طور پر یہ امر غور طلب ہے کہ کسی انسان یا قوم کی دیرپا قوت اور عظمت اور راحت کے واسطے اشیاء مادی کی افراط ضروری ہے یا قوائے دماغی و روحانی کو ترقی دینا زیادہ ضروری ہے۔

ان سوالات کے دو جواب ہو سکتے ہیں، بہت لوگوں کی رائے ہے کہ ہندوستان میں عموماً روح کو عظمت دی گئی ہے اور مادی اشیاء کو اس کے مقابلہ میں حقیر سمجھا گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں محسوسات ظاہری کی زیادہ قدر کی جاتی ہے اور روحانی اوصاف کی جانب عوام کی توجہ نہیں ہے۔ مشرق میں

مذہب اور فلسفہ کو کمال حاصل ہوا، مغرب میں علوم مادی کو عروج ہے، ایک جانب یہ خیال ہے کہ بڑا وہ شخص ہے جو دولت مند ہے اور جس کے پاس سامان آسایش و آرایش بکثرت موجود ہے۔ دوسری طرف یہ خیال ہے کہ بڑا وہ شخص ہے جو دولت کی حقیقت نہیں سمجھتا ہے، حسب ضرورت مادی وسائل سے کام لیتا ہے اور اوصاف روحانی کی ترقی میں مشغول رہتا ہے کیونکہ عیش و آرام کمزوری لاتا ہے، اور اصلی اور دیرپا اور پاکیزہ خوشی سے محروم رکھتا ہے۔ ان خیالات کی انتہائی حالت بعض شاعروں نے بھی مختلف الفاظ میں ظاہر کی ہے۔ مثلاً:-

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

غرض از جامہ دفع حر و برد است ندارد میل زینت ہر کہ مرد است

ان خیالات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ روحانی تہذیب ساری قوم کو مفلس اور مصیبت زدہ بناتی ہے۔ ہندوستان میں جب روحانی تہذیب کا عروج تھا سامان عیش کی بھی افراط تھی اور اُن سے حظ وافر حاصل ہوتا تھا، راجاؤں کے پاس کثیر دولت تھی، تجارت کے کاروبار میں سیٹھ اور ساہو کار بڑے مالدار تھے، سادی چال تھی مگر سونے چاندی اور جواہرات کی کمی نہ تھی، عام لوگ بھی بے فکر اور خوش حال تھے، مگر سب لوگ چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب زندگی کے ہر قدم پر مالک حقیقی کو یاد رکھتے تھے، بقول میکس مولر یہ عجیب ملک تھا جہاں لوگ مذہب کو کھاتے پیتے، اوڑھتے بچھاتے تھے برخلاف اس کے جن ملکوں میں آجکل مادی تہذیب کا زور ہے وہاں ظاہری شان و شوکت تو بہت ہے مگر انسانیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ لوگ نہایت مغموم اور مصیبت زدہ ہیں، اس کی ایک ظاہری علامت یہ ہے کہ طلاق اور خودکشی کی روز بروز زیادتی سُنی جاتی ہے۔

فہمیدہ اہل ہند کو خیال کرنا چاہیئے کہ اُن کو اپنے ملک میں کس قسم کی تہذیب پسند ہے۔ اگرچہ ایک بڑی قوم کا فروغ یا زوال کسی شخص یا جماعت کے اختیار میں نہیں ہے، کوئی بڑی قوت دنیا کو از غیب اپنی راہ پر لیجا رہی ہے تاہم انسان ہر طرح کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ قوم کی بنیاد کا استحکام اور اس کا دیرپا فروغ کن اصول پر ممکن ہے اور اس میں حتی الامکان کوشش بلیغ واجب ہے۔

روح کی قوت عام خیال یہ ہے کہ روح میں پاکیزگی اور لطافت جو کچھ ہو مگر اُس میں قوت کیا ہے اور دنیا قوت کی خواہشمند ہے، اگر قوت ہو تو دس کام چلیں، اس تحریر میں دلیل کی زیادہ گنجایش نہیں ہے، مگر اس خیال کی تردید میں ایک زندہ مثال سب کے سامنے ہے۔ مہاتما گاندھی کا وزن ۹۳ پونڈ

یعنی تقریبًا ایک من چھ سیر سے سوا نہیں ہے، اُن کے بدن پر کافی لباس بھی نہیں ہے، سادی اور قلیل غذا کھاتے ہیں، اکثر فاقے کرتے ہیں، نہ معجون کا استعمال ہے نہ کشتہ کا، نہ برانڈی ہے نہ وھسکی۔ اُنھوں نے ایک وقت زبان سے کہدیا کہ کل اُمور پر نظر کرکے اُن کی رائے میں قانون شکنی بہ پابندی چند شرائط واجب اور مناسب ہے، فوراً سارے ملک میں قانون شکنی کا جوش پھیل گیا۔ یہ جوش نہ لاٹھی سے دبا نہ بندوق کی گولی سے پست ہوا، جب مہاتما جی، نے حکم دیا کہ قانون شکنی بند ہو ایک دم سے عام شورش مبدّل بہ سکون ہوگئی۔ مہاتما گاندھی کی امداد اور حفاظت کے واسطے نہ قلعہ ہے نہ توپ نہ تلوار، نہ خفیہ پولیس گلی کوچوں میں جو پائے بد اندیشاں ہے۔ نہ اُن کی آمدورفت کے وقت شارع عام پر دورویہ سپاہیوں کا پہرہ ہے۔ صرف حق پر قدم جما ہوا ہے اور مالکِ حقیقی کی طرف نگاہ ہے نہ کسی کا خوف ہے نہ کسی سے نفع کی خواہش، نہ دوست کی رعایت ہے نہ دشمن سے عداوت اور دونوں کی واجبی امداد کے واسطے ہر وقت خوشی سے آمادہ ہیں ان صفات نیک کا نتیجہ یہ ہے کہ جدھر جاتے ہیں ہزاروں آدمی جوش الفت سے بیتاب ہوکر اپنا اپنا کام چھوڑکر دوڑتے ہیں کہ کاش دور ہی سے اُنکی صورت دیکھ لیں، اور اُنکی زیارت کو سعادت دارین خیال کرتے ہیں۔

اگر دنیاوی جاہ و حشم، دولت و حکومت میں ایک شان ہے تو صداقت اور ایمان، نفس کشی اور حق پرستی میں بھی ایک شان ہے اگر اس میں ایک درجہ قوت ہے تو اس میں بدرجہا زیادہ قوت ہے۔

بعض لوگ کہیں گے کہ ایک مہاتما گاندھی کی قوت سے کل شکوک رفع نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ عوام پر روحانی خوبیوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اِس کا جواب بھی بہ آسانی ہر جگہ مل جائے گا۔ عالم کی قوت علم سے ہے، سپاہی کی قوت شجاعت سے ہے، تاجر کا اعتبار اور اس کا فروغ ایمانداری پر موقوف ہے۔ علم، شجاعت اور ایمانداری روحانی صفات ہیں کبھی بازار یا منڈی میں جاکر مزدوروں کو دیکھیئے اور اُن کے رنج کے حالات دریافت کیجیئے تو معلوم ہوجائے گا کہ اگر اور وجوہ مانع نہیں ہیں تو مزدور طاقتور وہ ہیں جن میں دھرم یا ایمان ہے۔

روحانی زندگی اور راحت جسمانی

اس امر کی بابت قبل ازیں کچھ عرض کیا گیا ہے، مگر کسی قدر زیادہ توضیح کی ضرورت ہے، بہت لوگ کہیں گے یا دل میں خیال کریں گے کہ اگر جنگ آزادی کے واسطے سختیاں اُٹھاتی ہیں تو ہم ہر طرح پر تیار ہیں لیکن اگر ہم سے یہ امید کی جائے کہ ہم اور ہماری اولاد ہمیشہ کمر پر خانہ ساز کھدر کی لنگی باندھیں، نان خشک نمک سائیدہ سے لگاکر اپنا پیٹ بھریں اور اوپر سے بکری کا آدھ پاؤ دودھ پی لیں تو ہمارا دُور سے سلام ہے۔ ہم ایسی روحانی زندگی سے باز آئے ہمیں تو زاہد خشک کی راہ پسند نہیں ہے اگر ایسا خیال آئے تو مقتضائے بشریت ہے، مگر اس وہم کی ضرورت نہیں ہے۔ روحانی زندگی

کے مختلف مدارج ہیں۔ درجۂ اعلیٰ پر کہا جاتا ہے کہ لذائذ دنیوی سے خودبخود نفرت ہو جاتی ہے، جب ایسا ہو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی اور شے میں زیادہ پاکیزہ اور دیرپا خوشی حاصل ہوتی ہوگی، مگر ہر شخص کے لئے ترکِ دنیا نہ ممکن ہے نہ مناسب۔

عام لوگوں کے لئے روحانی زندگی یہ ہے کہ تھوڑی دیر مالکِ حقیقی کی یاد ہو، ابنارجنس کی الفت ہو، حسب قابلیت دنیا کی واجب خدمت کی جائے، اور جو اجرت ملے اُس سے اشیاء ضروری فراہم کی جائیں۔ اور خدا کا شکر کر کے اُن سے حظ اُٹھایا جائے۔ اگر سرمایہ کافی ہے تو علاوہ ضروریات کے سامان آسایش و آرایش مہیّا کیئے جائیں اور حسب موقعہ و مقدرت محتاجوں کی امداد کی جائے، جو لوگ خدا کے قائل ہیں وہ ہر ملک اور ہر قوم میں ایسا ہی کرتے ہیں، ہندو پوجا کرتے ہیں، مسلمان نماز پڑھتے ہیں، عیسائی گرجا میں جاتے ہیں۔ کھانا کھانے کے وقت ہندو پہلے نارائن کا نام لیتے ہیں، مسلمان بسم اللہ کہکر پہلا لقمہ اُٹھاتے ہیں، عیسائی دعا مانگ کر مصروفِ خورو نوش ہوتے ہیں، اور اس طور پر غذا کی لذت دہ چند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر اور کاروبار دنیا میں بھی برکت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

چند واقعات اور اصول عام طور پر اور خاصکر ہندوستان کی موجودہ حالت میں بچوں کو چند امور بدیہی کی جانب توجہ دلانی چاہیئے، یہ کوئی نئی باتیں نہیں ہیں مگر نہایت ضروری ہیں، اور عام لوگ ان کو اکثر بھول جاتے ہیں:-

(۱) یہ دنیا بہت بڑی چیز ہے، اور انسان کی ذات محدود بہت چھوٹی چیز ہے

(۲) دنیا کو کوئی بہت بڑی عقل اور قوت چلا رہی ہے جس کے مقابلہ میں انسان کی عقل و قوت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۳) جو دنیا کا انتظام کرتا ہے اُس نے انسان کو ایسا نہیں چھوڑ دیا ہوگا کہ جو چاہے سو کرے اعمال کی جزا اور سزا کا بھی کوئی انتظام ہوگا۔

(۴) اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد حصول اجرت و انعام میں بے صبری اور بیقراری واجب نہیں ہے۔ دنیا کا جو انتظام کرتا ہے وہ مفلس اور نادہند اور بے انصاف نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں علامات ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ انصاف کے ساتھ رعایت اور رحم فضل و کرم بھی شامل ہیں۔

(۵) ہر قوم میں نیک و بد اشخاص موجود ہیں، کسی قوم کو بحیثیت مجموعی بدطینت خیال کرنا

بے عقلی اور بے انصافی ہے۔

(۶) جن لوگوں کے ساتھ رہنا ہے اُن کے ساتھ میل اور محبت رکھنے ہی میں لطفِ زندگی ہے بغض اور عداوت سے دوسرے شخص کو نقصان پہونچے یا نہ پہونچے مگر خود اپنی زندگی بلاشبہ تلخ ہوجاتی ہے۔

(۷) ہم بے عیب نہیں ہیں، ہم کو اقوام غیر سے کچھ سیکھنا ہے، اپنے تحفظ کا لحاظ رکھکر اقوام غیر سے ارتباط ہمارے لئے مفید ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقوام غیر کو بھی اہل ہند سے کچھ سیکھنا ہے مگر یہ اُن کا کام ہے سیکھیں یا نہ سیکھیں۔

نوجوانوں سے امید ملک کا آئندہ فروغ یا زوال نوجوانوں کے ہاتھ ہے، شکر ہے اور مسرت کا مقام ہے کہ عام طور پر نوجوانوں میں آثارِ سعادت اور صدق ارادت پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر قسم کا مادہ موجود ہے، علوم و فنون میں یہاں کے طالب علم ممالک غیر کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں گوے سبقت لے گئے ہیں، شجاعت میں ہندوستانی سپاہیوں نے وہ کارنمایاں کئے جن سے دنیا میں اُن کا نام ہوا اور اُن کے ملک کی سرخروئی ہوئی۔ یہاں کے لوگ انسانی ہمدردی اور فیاضی میں کسی قوم سے کم نہیں ہیں۔ مذہب میں سب سے افضل ہیں، ملکی آزادی کے مرحلوں میں لاکھوں نوجوان بڑے جوش سے شامل ہوئے اور بہ حیثیت مجموعی بڑی پختہ مزاجی اور شائستگی سے کام کیا اور قواعد مقررہ کی پابندی کی، ہزارہا صدمے اُٹھائے اور زبان سے اُف نہ کی۔ یہ بڑی طاقت کی علامت ہے جو ہزار طرح پر کام آئیگی اور فائدہ بخشے گی۔ ابھی کام بہت کرنا ہے اور عرصہ تک مشکلات کا سامنا ہے مگر نوجوانوں کی طبیعت کا رنگ جواب تک رہا ہے اوس سے امید ہے کہ اُن کی کوشش، اُن کے عاقل رہنماؤں کی ہدایت اور تائید ایزدی سے یہ ملک جلد آزاد اور خود مختار اور مرفہ الحال ہوگا۔ عقل و ہوش، صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

مرزا غالب اور دیگر شعرا

(از جناب طالب کاشمیری)

مرزا غالب کے کلام پر بیشمار مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے دیوان کی بیسیوں شرحیں ملک میں موجود ہیں، اُن کی شاعری کے محاسن و معائب پر طویل تحریریں شائع ہوئیں. مداح اہل ادب نے ایک ایک شعر کی شرح کرتے ہوئے بال کی کھال نکالی حتیٰ کہ بعض علم دوست اور باریک بیں احباب نے مرزا کے اصلی خیالات و جذبات اور معانیِ اشعار کو بہت بڑھا دیا اور بخلاف اس کے ان کے کمالِ فن سے انکار کرنے والوں نے ان کی معمولی لغزش کو مبالغہ آمیز اور رنگین پیرائے میں نمایاں کیا، مگر باوجود ان تمام باتوں کے طالبانِ ذوق، نقادانِ فن اور شعر و سخن سے ہر قسم کے مطالب پیدا کرنیوالے تشنہ لب ہیں، اور مرزا کے کلام کی باریکیوں کو پورے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یا دل کھول کر اس پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے مزید سامان بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ مرزا کا کلام بحیثیت مجموعی قابلِ قدر ہے. بعض صورتوں میں بے نظیر ہے ان کی جدتِ موضوع، تنوعِ مضامین، زورِ تخیل فلسفہ تصوف اور دیگر محاسنِ کلام ہر شاعر کے لئے باعثِ رشک خصوصیات ہیں. لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے ابھی تک مرزا کی شاعری کے متعلق بعض امور کی طرف اہل قلم کا ذہن پورے طور پر منتقل نہیں ہوا ہے مثلاً اس امر کے متعلق کہ مرزا نے دیگر شعرا کے کلام سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، یا یہ کہ دیگر شعرا نے ان سے اکتسابِ فیض میں کس قدر حصہ لیا ہے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان امور کے علاوہ مرزا کے کلام میں تکرارِ مضمون کا عیب بھی موجود ہے۔ آج ہم ان کے عام محاسن و معائب سے قطع نظر کر کے متذکرہ صدر خصوصیات پر ایک غیر جانبدارانہ سرسری نظر ڈالتے ہیں، اس سے ہماری مراد نہ بیجا نکتہ چینی ہے نہ بلاوجہ مدح سرائی یا طرفداری۔ کوئی صاحبِ عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ بقول الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے یا یہ کہ ان کے کلام میں بمقابلہ دیگر مستند اور ہردلعزیز شعرا کے زیادہ عیوب پائے جاتے ہیں. نہیں! ہرگز نہیں!! متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے پیشرو اور ہمعصر اساتذہ کے دواوین اور تصانیف سے

فیض نہ حاصل کیا ہو (جس طرح بعد میں آنیوالے شعرا نے خود مرزا کے کلام سے فائدہ اُٹھایا) یا جن کے یہاں مضمون کسی نہ کسی صورت میں مکرر نہ بندھا ہو۔ اس تحریر سے فقط یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرزا جیسے مسلم الثبوت اور نازک خیال شاعر بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں۔

مرزا نے متقدمین اور ہمعصر شعرا کے بعض خیالات و مضامین اپنے کلام میں اس طرح جذب کئے ہیں کہ عام لوگ جن کا مطالعہ وسیع نہیں، ان کو مرزا کے زورِ تخیل ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور عش عش کرتے رہ جاتے ہیں، حالانکہ بعض موقعوں پر وہ سرقہ کے الزام سے بھی نہیں بچ سکتے، بعض اشعار میں توارد واقع ہوا ہے، بعض ترجمے کے تحت میں آجاتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جن کا مضمون تو انھوں نے کسی اور شاعر سے لیا ہے مگر اپنے اسلوب بیان اور مخصوص طرز میں ادا کر کے اس کو بلند تر کر دیا ہے، یا بیان میں شوخی اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں ہم اس قسم کے اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان خصوصیات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں:-

فارسی کے ایک شاعر میر عبداللہ تیامی کا شعر ہے ؎

ہیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من — از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

مرزا کہتے ہیں ؎

ترے وعدہ پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شعر قریب قریب مندرجۂ بالا فارسی شعر کا ترجمہ ہے، لیکن مرزا نے اپنے شعر میں مقابلتہً زور پیدا کیا ہے۔

میر تقی میر کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دم کے جانے کا نہایت غم رہا

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر یہی مضمون بالفاظ دیگر ادا کرتا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ان دو شعروں کے مطلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں، مرزا کا انداز اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن میر کا شعر زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔

مصطفےٰ علی خاں خوشدل کا شعر ہے ؎

بوسم مِن بے برگ و نوا برگِ حنا را — تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پا را

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون اس کے ساتھ لڑ گیا ہے ؎

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ذوق کا شعر ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ۔۔۔ کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

مرزا کہتے ہیں ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد ۔۔۔ جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

ان دو اشعار کے مضمون میں زیادہ باریک فرق نہیں، بلکہ ذوق کا شعر مقابلتاً بہتر ہے۔

مرزا سودا کے ایک ہمعصر نوجوان شاعر کا شعر ہے ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے ۔۔۔ اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مرزا کے ذہن میں اس شعر کی کیفیت سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے. چنانچہ یہی رنگ ان کے اس شعر سے ٹپکتا ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل ویادِ یار تک باقی نہیں ۔۔۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا کا شعر مذکورہ بالا شعر کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے۔

انشاء کی مشہور غزل کا شعر ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی ۔۔۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ۔۔۔ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اگرچہ مضمون واحد ہے۔ اس کو توارد سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ذوق فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا ۔۔۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا نے یہی مضمون ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے ۔۔۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نظیری کہتے ہیں ؎

نشاطِ رفتہ زدوراں بہ صبر بستانم   کہ بدمعاملہ آزردہ از تقاضا نیست
مرزا اسی مضمون کو خفیف سے فرق کے ساتھ یوں باندھتے ہیں ؎
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے   متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎
نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب   نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
مرزا کا شعر اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے ؎
جگر تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا   جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس[1]
ذوق کا ایک اور شعر ہے ؎
کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا   چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
مرزا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے[2] ؎
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل   گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎
زضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را   کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ صحت را
مرزا تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُردو میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎
ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود   قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں
ذوق فرماتے ہیں ؎
جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانے کی فکر میں   محفل میں اس کی کیا کوئی بوسر کا رنگ ہوں
مرزا نے دوسرے رنگ میں اسی مطلب کو بیان کیا ہے ؎
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے   لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
فارسی کا ایک شعر ہے ؎
تو ملولی زما و ما مشتاق   دل بدل میرود چہ حال است ایں
مرزا کہتے ہیں ؎
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

---

[1] یہ شعر غالب کے کلامِ مطبوعہ میں نہیں ہے (زمانہ)
[2] ذوق و غالب ہمعصر تھے لہٰذا ان پر سرقہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ (زمانہ)

یہ شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے، جو خفیف سا فرق مصرعۂ ثانی میں باعتبار معنی پایا جاتا ہے، بحر کی پابندی اور ترجمے کی قید سے لازمی تھا۔

مثنوی پدماوت میں عبرت کا ایک شعر ہے ؎

نزاکت سے شکم میں بچہ اُس کا   نظر آوے تھا جوں مینا میں صہبا

مرزا نے اس مضمون کو لے کر فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت   آید بنظر بچۂ او از شکمِ او

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

کے لازم است بادہ کشیدن ز جامِ زر   مقصود تو گر اینست قصورِ سفال چیست

مرزا کا شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر مشہور ہے اور عرفی کے شعر کے مقابلے میں زوردار بھی ہے، لیکن مضمون اس میں بھی ان کا نہیں ہے۔

فسونی تبریزی کا شعر ہے ؎

باو چو میرسم آسودہ می نشینم از دُور   ندیدہ حال مرا وقتِ بیقراری حیف

مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا کے بلکہ اُردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع ہے بھی خوب، لیکن اس میں بھی سوائے زبان اور بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

حسن بیگ رفیع کا ایک شعر سنیئے ؎

خوش دلم زیں کہ باو نامہ نویسم شب و روز   مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

مرزا ہوبہو اُردو میں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مضمون یکساں ہے اور طرز بیان میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

عرفی شیرازی کا ایک اور شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید   ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ عرفی کا یہی شعر ہے ؎

پھر دیکھئے انداز گل افشانیِ گفتار   رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عاقل خاں رازی کہتے ہیں ؎

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا   اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن   بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر بھی قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرزا کے شعر میں اندازِ بیان نے جان ڈال دی ہے۔

متاخرین ایران میں سے کسی کا شعر ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ دوست   چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی مطلب کو برنگِ دیگر ادا کرتا ہے ؎

زمانہ عہد میں اُسکے ہے محوِ آرایش   بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ممنون کہتے ہیں ؎

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون   وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا نے یہی مضمون اپنے کلام میں اس طرح داخل کیا ہے ؎

ترے سرو قامت سے اِک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

ذوق کا ایک نہایت مشہور شعر جس کی مرزا بھی خود بڑی تعریف کیا کرتے تھے، یہ ہے۔ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے   مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا نے اپنے الفاظ میں اسی خیال کو جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی ہے ؎

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا   لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

گفتم چگونہ مے کشی و زندہ میکنی   از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد

مرزا یہی مضمون یوں باندھتے ہیں ؎

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

فیضی کہتے ہیں ؎

نوشدارو ئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست سودۂ الماس در زہرِ ہلاہل میکنند

مرزا ہو بہو اُردو میں اسی کا ترجمہ یوں پیش کرتے ہیں ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

شرف قزوینی کا شعر دیکھئے ؎

ہست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا چوں بایں تقریب من آرد بیادِ او مرا

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ یہی فارسی شعر ہے، جو مقابلتہً زیادہ واضح ہے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے[1]

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود خوش بود گرواشنود دام را

مرزا کا یہ شعر اسی فارسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

مرزا کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ بطورِ خود ایک علحدہ مضمون چاہتا ہے۔ ہم اس سلسلہ کو یہاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر ایک دو شعر نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل کجا دانند حالِ ما سبکبارانِ ساحلہا

مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

مرزا کے مصرعۂ ثانی میں بجائے اس کے کہ سبکبارانِ ساحل کو حال معلوم نہیں انھیں مشکلات اور مصیبتوں کا بیان پایا جاتا ہے جن کا ذکر دونوں شاعروں کے مصرعۂ اول میں موجود ہے۔

خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

حلاج بر سرِ دار ایں نکتہ خوش سراید از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

رازِ درون پردہ ز رندانِ مست پرس کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

---

[1] مرزا نے اسی مضمون کو دوسرے رخ سے بھی کہا ہے ؎

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں (زمانہ)

مرزا نے انہی دو شعروں کے مضمون کو ایک کرکے دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہو ؎

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است　　بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

اس میں کلام نہیں کہ مرزا نے یہ شعر اختصار اور خوبی کے ساتھ بہتر الفاظ میں لکھا ہے، ناظرین خود اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ مرزا کے کلام سے کن شاعروں نے خیالات اور مضامین اخذ کئے ہیں اس کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ان کی تعداد بے انتہا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے وہ تمام شاعر جو شاعری میں نام پیدا کر گئے اور خاصکر غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہوئے کم و بیش مرزا سے استفادہ کرنے میں بے نیاز نہیں رہے اور بلا واسطہ و یا بواسطہ مستفیض ہوئے۔ اگر ان تمام اشعار کا ذکر کیا جائے تو یقیناً ہمارا مضمون ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کرے گا۔ لہذا ہم نمونے کے طور پر فقط انہی چند شعراء کا حوالہ دیں گے جن کے اشعار ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

نثار علی خاں نثار مرزا کا یہ شعر تقریباً لفظ بہ لفظ یوں چرا لیتے ہیں ؎

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے　　کوئی پوچھے یہ گفتگو کیا ہے

سرقۂ ظاہر کی اس سے بڑھکر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟

مرزا ؎

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن خاں مومن کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ مرزا کا یہی شعر ہے[1] ؎

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مرزا ؎

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

مولانا حسرت موہانی نے اس سے ایک باریک اور عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی　　وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

آرشد دہلوی کا مندرجہ ذیل شعر بھی مرزا کے اسی شعر سے ماخوذ ہے ؎

---

[1] دونوں معاصر تھے اس لئے سرقہ و اخذ کے بجائے توارد کا محل ہے۔ (زمانہ)

حسن اُن کا تاب سوز نگاہِ ناتواں   وہ بے حجابیوں پہ بھی ہیں سو حجاب میں

مرزا ؎ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ارمان دہلوی نے یہی مضمون یوں باندھا ہے ؎

نکلے کیا گئے ان کے مکاں سے   زمیں پہ گر پڑے ہم آسماں سے

مرزا ؎ وہ آیا انجمن میں پھر نہ کہیو یہ کہ غافل تھے   شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

سالک نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

وہ زیبِ شبستاں ہوا چاہتا ہے   یہ مجمع پریشاں ہوا چاہتا ہے

مولانا حالی نے بھی استاد کا یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

دل چاہتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر   وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

مرزا ؎ حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ   کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

مولانا حالی نے بالکل یہی مضمون دو شعروں میں باندھا ہے ؎

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے   پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور بکواس کر جائیگا مفت   اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

مرزا ؎ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے   اسکی خطا نہیں تھی یہ میرا قصور تھا

عالیجاہ نظام آصف نے یہی مضمون اپنے شعر میں جلوہ گر کیا ہے ؎

ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے   میں خطاوار تھا قاصد تو خطاوار نہ تھا

مرزا ؎ شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر مرزا کے شعر سے کتنا مشابہ ہے ؎

شوق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے   مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

مرزا ؎ تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا کہ لالہ سری رام ایم۔اے دہلوی مرحوم مؤلف "خمخانۂ جاوید" بغرض سیر و تفریح کشمیر تشریف لائے تھے اِس تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا، منجملۂ دیگر شعرا کے منشی سراج الدین احمد خاں صاحب نے ایک غیر طرحی غزل پڑھکر سنائی، اس کا ایک شعر جس کی حاضرین جلسہ نے داد دی تھی مرزا کے اسی شعر کا چربہ ہے ؎

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے   سنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھکو

مرزاؔ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

منور خاں غافلؔ نے یہی خیال یوں ظاہر کیا ہے ؎

گرم بازاریِ الفت ہے مجھی سے ورنہ — کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

مرزاؔ مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اخبار "شاعر" آگرہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء میں لالہ گوبرن لال صاحب نامی کی ایک طرحی غزل نظر سے گزری جس کا یہ شعر مرزاؔ کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

کچھ بے طرح سے آج تو لطفِ خمار ہے — ساقی نے جانے کیا ہے ملایا شراب میں

مرزاؔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اکبر الہ آبادی کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی شعر کی جھلک پائی جاتی ہے اگرچہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے ؎

میرے سکوت سے مجھے ناداں نہ جانیئے — الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

مرزاؔ اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

حالیؔ اسی مضمون کو لیکر اپنی نظم موسوم بہ "عرض حال بجناب رسول صلعم" میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں لکھتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مرزاؔ میں ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ڈاکٹر اقبال کی قابل قدر نظم "نوائے غم" کا پہلا شعر مرزاؔ کے اسی شعر کا مولود ہے بلکہ ساری نظم کا محرک یہی شعر کہا جا سکتا ہے ؎

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش — جسکے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

مرزاؔ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

حالیؔ نے یہ مضمون مرزاؔ سے لیا ہے، اور کسی قدر پہلو بدل کر یوں بیان کیا ہے ؎

دل نہ طاعت میں لگا تب تو لگایا غمِ عشق — کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

مرزاؔ ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

مومنؔ نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو — ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

ارشد دہلوی نے بھی یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا جان ابھی ہے نفس کے تار سے

راقم مضمون ہذا کا ایک شعر ہے ؎

خواہش سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پر پھوڑنا سر کا ہے گویا نقش پیشانی مجھے

اپنے استاد نامدار قبلہ علامہ کیفی دہلوی کے سمجھانے سے ہمیں یہ ماننا پڑا کہ یہ شعر مرزا کے مندرجہ ذیل شعر سے لڑ گیا ہے۔ بلکہ یہ کہ یہی مضمون شعر کہتے وقت غالباً ہمارے ذہن میں جاگیر تھا ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہمارا ایک اور شعر ہے ؎

ہے اضطرابِ شوق نقابِ رُخِ امید تا نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

اپنے ایک سخن فہم دوست نے ہمیں مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ ہمارے شعر کا مضمون دراصل مرزا کا ہے ہمارا نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں ؎

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

مرزا ؎ ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

امیر مینائی نے مرزا کے اس مضمون کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگا ہے کہ سطحی نظر سے کام لینے والے احباب اس کو امیر کا ہی مضمون سمجھیں گے ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپکا دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

یہ شعر واقعی مرزا کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔

مرزا ؎ وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

حالی یہی خیال دوسری صورت میں یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

شب وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

مرزا ؎ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

اقبال نے مرزا سے یہ مضمون لیکر ذرا سی تبدیلی کر کے اسمیں جدت پیدا کی ہے ؎

ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا خود وہ اُٹھکر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

اب ہم ان اشعار کا ذکر کریں گے۔ جنہیں مرزا کے یہاں تکرار پائی جاتی ہے۔ اس نقص سے بھی غالباً کسی شاعر کا کلام مبرا نہیں، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بعضوں کے یہاں کم اور بعضوں کے

بیاں زیادہ ہے۔ اصطلاحِ شعرا میں اسے "تمنا" کہتے ہیں۔ محققین کے نزدیک اس کا کچھ مضائقہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تکرار سے مضمون میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا کے کلام میں جو اشعار ایسے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون مرزا نے فارسی میں بھی باندھا ہے ؎

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت　　میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

تا ہمارے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

یہی مضمون دوسرے رنگ میں یوں جلوہ گر ہے ؎

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب　　مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

یہی مضمون بالفاظِ دیگر ملاحظہ ہو ؎

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی　　سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں　　وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

یہی مضمون ذیل کے شعر میں ہو بہو اس طرح باندھا گیا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے　　اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

یہی خیال اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

آگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یہی مضمون معنی میں کسی قدر تخفیف کے ساتھ یوں لکھتے ہیں ؎

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہی خیال مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر سے مترشح ہوتا ہے ؎

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے　　برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے　　پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہی مضمون مرزا کے مندرجہ ذیل چار اشعار میں پایا جاتا ہے ؎

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

اس آخری شعر میں کسی قدر وسعت معنی پیدا کر دی گئی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس کا مضمون مصرعۂ اول میں معنی کا پہلو بدل کر یوں ادا کیا گیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب — یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

ہو بہو یہی مضمون ذیل کے شعر میں دہرایا گیا ہے۔ بلکہ الفاظ میں بھی نمایاں فرق نہیں ؎

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ذیل کا شعر بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، البتہ اسکے معنی میں وسعت پیدا کی گئی ہے ؎

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو — شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں دیکھئے ؎

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھکر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھکر

یہی مضمون بصورت دیگر مکرر بندھ گیا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

قریب قریب یہی مضمون برنگ دیگر یوں پیش کیا گیا ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ذیل کی رباعی اسی مضمون کو دوبارہ پیش کرتی ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

یہی خیال ذیل کے شعر میں دوبارہ جلوہ گر ہوا ہے ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

ہم بخوفِ طوالت اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں، لیکن معزز ناظرین سے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرزا کے وقت میں شاعری جس قسم کی تھی وہ ترجمے یا توارد سے بچ نہیں سکتی تھی؎ اس لئے اس مضمون کے لکھنے کی غرض غالب یا دوسرے شعراء پر نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ عوام کی واقفیت کے لئے اسکو لکھا گیا ہے۔

مستقل مزاجی

جن لوگوں کے ارادے مستقل ہیں انہیں تقدیر او قسمت کے پھندوں سے کیا ڈر، اس قسم کے ہزارہا مستقل مزاج شخص زنجیروں کو کاٹ چکے ہیں جن سے خوف کے مارے بہت سے کمزور مردہ دل انسان جھٹکے کھا رہے ہیں۔

ارادے ارادے میں فرق ہے، صرف وہی ارادے عمل لاتے ہیں جو دلی خلوص اور سچے یقین پر مبنی ہوں، ورنہ ایسے ویسے ارادے تو ہر شخص قدم قدم پر باندھتا ہے اور توڑتا رہتا ہے۔

اگر تمہارے ارادے پورے نہیں ہوتے تو یقین رکھو کہ تمہارے ارادے تمہارے دلی جوش کا عکس نہیں ہیں۔ (ماخوذ)

؎ سرقہ و توارد کی بحث میں ہمارے مکرم دوست حکیم ناطق صاحب لکھنوی کا مضمون مطبوعہ زمانہ بابتہ مارچ ۱۹۲۳ء ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون اس بحث کے متعلق ایک فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (زمانہ)

امن عالم اور تحریک تخفیف اسلحہ

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔اے، ایل ایل، بی۔)

مشہور زمانہ انگریزی مصنف کا۔ لائیل کا مقولہ ہے کہ "بعض آدمیوں کو ہمیشہ کے لئے اور بعض کو کچھ وقت کے لئے دھوکا دیا جا سکتا ہے، لیکن سب کو ہمیشہ کے لئے دھوکا نہیں دیا جا سکتا"۔ اس کی صداقت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی ماہرانِ عالم اس مقولہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں۔

غصہ اور جنگجوئی سے انجام کار سوچنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے، خون کی حرارت کی بدولت تازہ چوٹ اور زخم کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ در اصل انسان اپنے ماحول۔ ماضی و حال، سود و زیاں سے بے خبر اور بے پروا سا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم میں لڑنے مرنے والوں کا یہی حال تھا، جب تک جنگ جاری رہی لکھوکھا سپاہی دائمی امن قائم کرنے کے وعدوں پر اپنی جانیں نچھاور کرتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہی آخری جنگ ہے جس کے خاتمہ پر دنیا میں امن و امان کا راج قائم ہو جائیگا اور آئندہ نسلیں جنگ کی ہستی تک سے ناآشنا ہو جائینگی۔ فتح و نصرت کی فطری خواہش اور خلق خدا پر دائمی امن کا ناقابل فراموش احسان کرنے کی آرزو لوگوں کے دلوں میں موجزن تھی اور زود اعتقاد لوگ جنگ پرستوں کے فریب میں آکر اُن کی چرب زبانی پر یقین کر کے گلے کٹواتے رہے۔ مگر لڑائی ختم ہو گئی جنگ و جدل سے تنگ آئی ہوئی دنیا کمر کھول کر ستانے کے لئے بیقرار تھی، قتل و غارت اور تیغ و تفنگ کے تباہ کن مناظر کی یاد اُن کی راتوں کی نیند حرام کئے ہوئی تھی۔ عوام الناس ان وعدوں کے ایفا کے منتظر تھے جن کے لئے لکھوکھا نے تو اپنے گلے کٹوائے تھے اور کروڑوں نے طرح طرح کی تکالیف برداشت کی تھیں۔ مگر چالاک مدبّروں کے وعدے معشوقوں کے سے وعدے ہوتے ہیں، ان کے الفاظ کا مطلب دقیق ہوتا ہے جو صحیح طور پر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ پھر مدبرانِ دُنیا اپنے وعدوں سے ہٹنے کے بہانے بھی ڈھونڈھ لیا کرتے ہیں۔ بہر حال اگر پچھلے وعدوں پر خیال کرتے تو ان حضرات کو دنیا میں دائمی امن کے قیام کی کوئی سبیل نکالنا چاہئیے تھی مگر سبھوں نے اس کے برعکس عمل کیا اور

ہر ایک نے اپنی فوجی طاقت کو اس درجہ مستحکم کرنیکی کوشش کی کہ کسی حریف کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوسکے۔ اور اگر کوئی مقابلہ پر آئے بھی تو منہ کی کھائے۔ اس جنون کا جو نتیجہ ہوا وہ اس سے پہلے مضمون میں ہدیۂ ناظرین کیا جاچکا ہے، اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا کی فوجی طاقت میں معتد بہ اضافہ ہوا، ہر ایک حکومت نے اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق اپنی بری اور بحری اور ہوائی فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی سعی کی، گویا سب ہی طاقتیں ایک نئی جنگ کیلئے مستعد اور تیار ہوگئیں۔ بظاہر یہ ساری کوشش اپنی حفاظت کے لئے کی گئی ہے مگر اس "حفاظت" میں دراصل توسیع مملکت کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ مقام غور ہے کہ اگر سب حکومتیں "حفاظت" ہی کے خیال سے اپنی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی پالیسی اختیار کریں جیسی کہ اُنھوں نے کی ہے تو اس کا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوگا۔ اور تناسب طاقت کم و بیش وہی رہیگا جو جنگ سے پہلے تھا۔

فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کی تحریک کے (جس کی مختلف ممالک نے کورانہ تقلید کی ہے) اہم ترین اسباب بین الاقوامی بداعتمادی، اقتصادی رقابت اور اہل مغرب کی فطری حرص و آز ہیں قول و قرار کی پابندیاں ان کے لئے کچھ وقعت نہیں رکھتیں، بڑے بڑے صلحنامے وقت پر "محض ردی کاغذ کے پرزے" ثابت ہوتے ہیں۔ غرض عام دستور یہی نظر آرہا ہے کہ جو کچھ حصول مدعا کے لئے ضروری ہو جس طرح ممکن ہو کیا جائے۔ خون کا تعلق سیاسیات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس حقیقت کی توضیح کے لئے ہم کو امریکہ اور برطانیہ کی مثال پر غور کرنا چاہیئے، ذرا دیکھئے تو سہی کہ ان دونوں ہمسایوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کس حسنِ سلوک کا ثبوت دیا ہے۔

برطانیہ کلاں نے اپنی بحری طاقت کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے کہ اس کی بحری طاقت دنیا کی ہر ایک بحری طاقت کے مقابلہ میں مضبوط ہو، وہ عرصے سے اس پر کاربند رہا، نہ صرف خود بلکہ دوسری طاقتوں کو بھی اپنی حکمت عملی، اثر، رسوخ اور طاقت سے اس کا قائل کئے رکھا۔ ہم نے اس سلسلہ کے کسی مضمون میں عرض کیا تھا کہ جنگ عظیم نے امریکہ کی حیثیت سیاسیات عالم میں بالکل تبدیل کردی ہے۔ اب وہ ایک دولتمند، قرضخواہ اور طاقتور سلطنت ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا ہے کہ برطانیہ بحری طاقت کے متعلق اپنے ہی قائم کردہ اصول پر قائم رہے اور دوسروں سے بھی اسکی پابندی کرالے۔ اس کی رائے میں ہر سلطنت کو اپنی ضرورت کے مطابق بحری بیڑہ تیار کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ امریکہ کی تجارت بھی تمام ممالک میں پھیل چکی ہے، چنانچہ اس کو بھی اپنے تاجروں اور

ان کے تجارتی مفاد کی "حفاظت" کا فرض ادا کرنا ہے۔ غرض اُس نے بھی بڑی سرعت سے جہاز بنائے اور واشنگٹن کانفرنس (۱۹۲۲ء) میں برطانیہ سے جہازوں کی مساوات کا اصول تسلیم کرالیا۔ مگر اُس نے اس کو کافی نہ سمجھا اور ۱۹۲۷ء میں امریکہ کے ایما پر بمقام جنیوا ایک بحری کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں جاپان، برطانیہ اور امریکہ شامل ہوئے مگر فرانس وغیرہ دوسرے ممالک نے شرکت سے احتراز کیا اس کانفرنس کا مدعا یہ تھا کہ برطانیہ کروزروں کے متعلق امریکہ کا حق مساوات تسلیم کرلے۔ مگر جب کانفرنس ہوئی تو برطانیہ اپنی بات پر اڑا رہا اور یہ کانفرنس ناکام رہی۔

۱۹۲۷ء میں جنیوا کانفرنس ہوئی، امریکہ کی خواہش تھی کہ برطانیہ بخوشی خاطر یہ تسلیم کرلے کہ امریکہ بھی برطانیہ کی طرح جتنے کروزر چاہے بنا سکے، مگر یہ چال ناکام رہی، مگر چونکہ امریکہ اپنی بحری طاقت کی توسیع پر تلا ہوا تھا اس لئے ۱۹۲۷ء میں اس نے اپنے نئے بحری تعمیری پروگرام میں جولائی ۱۹۳۱ء تک پندرہ کروزر (دس ہزار ٹن فی کروزر) تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تارپیڈو کشتیاں، آبدوز کشتیاں، اور ہوائی جہاز وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ اس پروگرام کی توضیح کرتے ہوئے مسٹر ولبر وزیر بحر امریکہ نے کہا تھا کہ:۔

> "سابق کا مقرر کردہ تناسب (۳: ۵: ۵) کے کوئی معنی نہیں تاوقتیکہ کہ وہ کروزروں کی تعداد پر بھی حاوی نہ ہو.......اگر برطانیہ کسی دوسری طاقت کے بحری پروگرام کے لحاظ سے کروزروں میں اضافہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے، تو یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہمیں بھی دوسری حکومتوں کے بحری پروگرام سے قطع نظر کروزروں میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے تاجر بھی دنیا کی منڈیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں ہمیں بھی اُن کی حفاظت کرنا ہے۔"

بہر حال اس پروگرام کے مصارف کا اندازہ بہتر کروڑ پچاس لاکھ ڈالر لگایا گیا ہے۔

یہاں شاید امریکن امیر البحر مسٹر پلنکٹ (جو نیویارک کے بحری محکمہ کا اعلیٰ ترین آفسر بھی ہے) کی تقریر کا اقتباس بے محل نہ ہوگا، ان کا بیان ہے کہ:۔

> "ہم لڑائی کے نزدیک تر ہیں کیونکہ ہماری تجارتی پالیسی مقابلہ کی ہے۔ اور مجھے برطانیہ یا کسی اور قوم کا جس سے تباین مفاد ہو، خیال ہے۔ برطانیہ خود ہمارے برخلاف اعلان جنگ نہ کریگا وہ کسی چھوٹی قوم سے یہ کام کرائیگا اور خود اُس کے پس پشت رہیگا۔"

ہمارا مدعا ان الفاظ کو نقل کرنے سے محض امریکہ اور برطانیہ کی بداعتمادی دکھانا ہے، یہی ذہنیت امریکہ کے بحری پروگرام کی ترتیب میں نمایاں ہے۔ مگر خیال رہے کہ یہ حالت صرف امریکہ اور برطانیہ ہی

کی نہیں ہے بلکہ دنیا کی سبھی سرمایہ دار حکومتوں کی یہی کیفیت ہے کیونکہ سبھی حکومتیں فوجی طاقت کی ترتیب و تنظیم میں بدرجۂ نہایت سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کررہی ہیں جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ امن کی ضرورت اور ایام جنگ کے وعدوں کو فراموش کرچکی ہیں۔

جنگِ عظیم کے خاتمہ پر "انجمن بین الاقوام" بنائی گئی تھی، جس کے اغراض و مقاصد کی بڑی بلند آہنگی سے تشریح کی گئی تھی۔ اُسے امن عالم کی ضامن و معاون بتایا گیا تھا، وہ کمزور قوموں کی محافظ اور وکیل قرار دی گئی تھی۔ مگر ذرا اس کی کارگزاری ملاحظہ فرمائیے، لڑائی کے اختتام پر ۱۹۱۹ء میں یہ فرشتۂ امن پیکرِ عالمِ وجود میں جلوہ فرما ہوئی، جنگ و جدل سے تنگ آئی ہوئی دنیا کس بیتابی سے دائمی امن کے وعدوں کے تکمیل کی منتظر تھی۔ اس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے، مگر اس امن کی ضامن و معاون انجمن کے کانوں پر چھ سال تک جوں بھی نہ رینگی۔ اس رفیع الشان انجمن کی دنیا میں کیا شنوائی ہوئی، دراصل چھوٹی چھوٹی قوموں کو وہاں کون پوچھتا ہے، البتہ بڑی بڑی سلطنتیں اُسے اپنا آلۂ کار بنا کر من مانی کارروائی کرتی رہتی ہیں۔ سر اقبال نے جمعیت الاقوام کے متعلق کیا خوب لکھا ہے۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن — دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند (پیام مشرق)

بہرحال ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک چھ سال کے طویل عرصہ میں "انجمن اقوام" کی امن گسترانہ سرگرمیاں صفر سے زیادہ نہ ہونگی۔ آخر خدا خدا کرکے دسمبر ۱۹۲۵ء میں تخفیف اسلحہ کے لئے کمیشن کا تقرر ہوا، جس کا اجلاس کئی دفعہ ہوا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس سلسلہ میں ایک بات بڑے مزہ کی ہے۔ جنیوا میں جب تخفیف اسلحہ پر بحث ہو رہی تھی تو روس کے نمایندہ نے اپنی حکومت کی طرف سے فوری تخفیف اسلحہ کی تجویز پیش کرکے دیگر حکومتوں کو "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا مصداق بنا دیا، اب انھیں اس تجویز کا مذاق اُڑانے یا اُسے ناقابل عمل کہہ کر ٹال دینے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ بہرحال اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ داعیانِ امن کی قلبی کیفیت کا اظہار ہوگیا، اور بے لوث و آزاد خیال لوگوں پر یہ ظاہر ہوگیا کہ درحقیقت یہ لوگ تخفیف اسلحہ کے کس قدر خواہاں ہیں۔

درحقیقت یہ تخفیف اسلحہ کا مسئلہ بھی ایک چال ہے جس کا مطلب نہایت گہرا اور اثر نہایت دوررس ہے۔ جہاں اس کا یہ مدعا ہے کہ جنگ و جدل سے تنگ آئے ہوئے لوگ جن کو پہلے وعدوں کی یاد ابتک بے چین کئے ہوئے ہے یہ سمجھ لیں کہ ہماری گورنمنٹ نے تو صلح اور امن کی پوری کوشش

کی ہے۔ اور تخفیف اسلحہ کے لئے ہردم تیار رہی ہے۔ اور اب اگر جنگ چھڑیگی تو دوسروں کی ہٹ دھرمی اور غیر معقولیت کی بدولت جو امنِ عالم کے سدراہ ہیں۔ وہاں اُس کی غرض و غایت یہ بھی ہے کہ مخالفین کو کسی صورت سے تخفیف پر مجبور کیا جائے اور جس طریقہ اور حیلہ سے ممکن ہو اپنی طاقت بدستور قائم رکھی جائے۔ بہرحال اپنی تخفیف دوسروں کی بہ نسبت کم ہو۔ چنانچہ جب لندن کے بحری معاہدہ (۱۹۳۰ء) سے پہلے وزیر اعظم برطانیہ اس کے موافق فضا پیدا کرنے کی غرض سے بہ نفسِ نفیس امریکہ تشریف لیگئے تو اس تکلیف کی وجہ امریکن لوگوں نے یہی سمجھی تھی جو میجر پی۔ ای۔ کرک نے اپنی تقریر کے دوران میں بیان کی تھی، اُنھوں نے کہا تھا کہ :-

"وزیر اعظم میکڈانلڈ امریکہ میں برطانیہ کی تخفیف اسلحہ کی غرض سے نہیں آئے ہیں بلکہ اُن کی غرض یہ ہے کہ امریکہ اور دیگر اقوام کے اسلحہ و فوج میں تخفیف کی جائے جو برطانیہ کی عظمت کے لئے خطرناک ہیں"

ان الفاظ پر مزید حاشیہ آرائی فضول ہے۔ مگر امن کے اس پروپیگنڈے کے نفسیاتی تاثرات اور عملی فوائد سے انکار کرنا محال ہے اور ان کی تشریح غیر ضروری ہے۔

لندن کا بحری صلحنامہ اپریل ۱۹۳۰ء میں مکمل ہوا یہ فریقین کو ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۶ء تک پابند کرتا ہے۔ اعداد و شمار موجود ہیں مگر ان کو لکھکر مضمون کو طویل کرنا مقصود نہیں۔ ہاں ان سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس پروگرام کے مطابق بھی فوجی بحری طاقت میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔ اس کا فائدہ صرف تناسب قائم رکھنا ہے۔ اس معاہدہ میں امریکہ، برطانیہ اور جاپان شامل ہیں۔ بین الاقوامی بداعتمادی کی تازہ ترین مثال اس صلحنامہ کا "حفاظتی ضمیمہ" ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اگر معاہدہ کے دوران میں کسی ملک کے جو صلحنامہ میں شامل ہیں تعمیری پروگرام سے امریکہ، جاپان یا برطانیہ اپنے قومی مفاد کو غیر محفوظ خیال کرے تو وہ باقی دونوں ملکوں کو اطلاع دیکر اس قدر اضافہ کرے جس کا وہ خواہاں ہے اور اس پر دوسرے بھی اُسی قدر تناسب سے اضافہ کرنے کے مجاز ہونگے۔ ہمارے خیال میں اس شرط کی وجہ سے اس کا اطلاق امریکہ، جاپان یا برطانیہ کی رائے پر منحصر ہے۔

یہ صلحنامہ امن عالم کے لئے چنداں مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ جب کبھی کسی کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ دُنیا کی فلاں طاقت کے تعمیری پروگرام نے اس کی قومی محافظت کو مخدوش بنا دیا ہے تو وہ اس سے فائدہ اُٹھائیگا۔ خواہ یہ خیال معاہدہ کے دوسرے ہی دن پیدا ہو۔ اہل نظر کے لئے اس شرط کی مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اس پر مزید خامہ فرسائی سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ہاں عام ناظرین

کے لئے یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ۲۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو انگلستان کے ہاؤس آف لارڈز میں بین الاقوامی تخفیف اسلحہ پر بحث کرتے ہوئے لارڈ سیسل نے کہا تھا کہ "جب تک اضافہ اسلحہ میں بین الاقوامی مقابلہ جاری ہے دنیا کا امن دیرپا ثابت نہیں ہوسکتا۔" لارڈ برجمین نے اپنے وسوسوں کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا تھا کہ "برطانیہ نے بحری بیڑہ میں معتد بہ تخفیف کی ہے، ہمیں امید ہے کہ گورنمنٹ ہمیں اس بات کا یقین دلائیگی کہ دوسری اقوام نے بھی ایسا ہی کیا ہے، مگر اس کے برعکس ان کے اخراجات کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی طاقت میں اضافہ کر رہے ہیں۔" لارڈ پارمور نے گورنمنٹ برطانیہ کی جانب سے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں 'خطرہ' کی صدا بلند کرنا نہیں چاہتا لیکن اس بات کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ تاخیر کی پالیسی میں بیشمار خطرات ہیں، بڑے بڑے مشکلات پیدا ہونے کا بھی امکان ہے۔" کیا اس بیان کے بعد بھی ہوا کا رخ معلوم کرنا مشکل ہے۔

لندن کے بحری معاہدہ کی کامیابی کے تہ میں کہاں تک دنیا کی ناگفتہ بہ اقتصادی حالت، براعظم ہندوستان کی سیاسی بیداری، اشتراکی روس کا خطرہ، فوجی طاقت کی ترقی کا احساس، کام کرتے ہیں، نہایت دلچسپ سوالات ہیں، مگر ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہونے کی وجہ سے ان کے متعلق سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔

سیاسی رجحان

سیاسی رجحان کی اصلیت ارادۂ حصول قوت ہے۔ قوت سے مراد وہ جسمانی اور روحانی طاقت ہے جسکی بدولت انسان فطرت اور سماج پر اقتدار حاصل کرتا ہے تاکہ اپنے محبوب مقاصد و قدور کو حقیقت کا جامہ پہنا سکے یعنی سیاست کا بنیادی جذبہ حصول قوت کی خواہش ہے۔ جو کوئی قوت کی نفی کرتا ہے وہ سیاست کی نفی کرتا ہے۔ یہ بات قیاس میں آتی ہے کہ بعض افراد یا جماعتیں محبت کے مزاج یا حسن کے رام راج کو اپنا اپنا اصول زندگی قرار دیں لیکن اگر وہ اس طرز زندگی کو عام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے قوت کی ضرورت ہوگی .... قوت کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں، جنکی ایک انتہا خالص جسمانی طاقت ہے جس کے ذریعہ سے ہم ظاہری حیثیت سے لوگوں کو مجبور کرسکتے ہیں اور دوسری انتہا ذہنی طاقت ہے جسکی بدولت ہم ترغیب، دلائل وغیرہ سے لوگوں کو قائل معقول کرسکتے ہیں۔

(ماخوذ)

بعض مشہور پھل

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم، ایڈووکیٹ)

کیلا[1]

کیلا نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں بہت پسند کیا جاتا ہے، ہمارے ملک میں اس کے سایہ میں رشیوں اور منیوں نے تپسیا کی ہے اور پوجا کرنے کا سامان بھی اسی کے پتوں سے بنایا جاتا ہے، ہمارے یہاں اس کی کاشت عام ہے اور انواع و اقسام کے کیلے کاشت کئے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ میں کوئی گھر اس سے خالی نہیں، ہر ایک میوہ فروش کی دکان پر اور ہر کھانے کے ساتھ کیلا ضرور ہوتا ہے۔

قدرت نے کیلے کے اندر ایسے اجزا رکھے ہیں کہ یہ انسان کی غذا کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی نسبت یہ خیال عام ہے کہ یہ دیر ہضم ہوتا ہے مگر مسٹر فاسٹ نے اس کو غلط ثابت کیا ہے، پکا کیلا نہایت زود ہضم ہوتا ہے۔ البتہ کچا کیلا ہاضمہ میں فتور پیدا کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو دیر ہضم سمجھا جاتا ہے

عموماً کیلے کی دو قسمیں ہیں، اول پلینٹین جو پکنے سے پہلے درخت سے توڑ لیا جاتا ہے اور سبز ترکاریوں کی طرح پکا کر یا تل کر کھایا جاتا ہے۔ دوم بنانا۔ یہ درخت پر پکتا ہے، البتہ کبھی کبھی اس کو کچا بھی توڑ لیتے ہیں اور پیال میں دبا کر پکایا جاتا ہے، یہ نہایت خوشبودار اور خوش ذائقہ ہوتا ہے، بعض کیلوں میں شیرینی و حلاوت زیادہ ہوتی ہے بعض میں حلاوت کم ہوتی ہے۔ اور گودہ زیادہ ہوتا ہے۔ زمین کی تاثیر سے یہ

---

[1] مسٹر فاسٹ نے "بنانا" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جس میں دنیا بھر کے کیلوں کی اقسام، ان کی کاشت، تجارتی مرکز وغیرہ کا مفصل حال درج کیا ہے اس میں دو باب خصوصیت سے دلچسپ ہیں (۱) کیلے میں اجزائے غذا (۲) کیلے کے طبی فوائد ان دونوں ابواب سے ضروری باتیں اخذ کرکے پیش کی جاتی ہیں (شمیم)

فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

کیلا نہایت اعلیٰ مکمل اور سریع الہضم غذا ہے، یہ کچا اور پکا دونوں طرح کھایا جاتا ہے، اسکو سکھا کر انجیر کے مانند استعمال کرتے ہیں، سوکھے ہوئے کیلوں کو پیس کر آٹا بنایا جاتا ہے اور اس سے مختلف ترکیبوں سے رس بھی بناتے ہیں اور بطور غذا استعمال کرتے ہیں، غرض کیلا مختلف صورتوں میں کھایا جاتا ہے اور ہر عمر کا آدمی اس کو بے تکلف استعمال کر سکتا ہے۔ کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

غذا کے علاوہ کیلا بطور دوا بھی استعمال ہوتا ہے، پیچش واسہال (جو گرمی کی وجہ سے ہو) میں یہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے، پکا کیلا ایک اونس، تمر ہندی (املی) کا گودا آدھا اونس اور نمک چوتھائی اونس ملا کر استعمال کرنا فائدہ دیتا ہے۔ عموماً پہلی خوراک کے بعد ہی فائدہ معلوم ہونے لگتا ہے، ورنہ دوسری یا تیسری خوراک کے بعد تو پیچش یا اسہال رک جاتے ہیں۔ اس کے پتے جلا کر اور راکھ کو پانی میں ملا کر بدن پر ملنا جلد کی بعض بیماریوں کے لئے بہت مفید ہے۔ معدہ کی ترشی دور کرنے کے واسطے کیلے کی خاکستر کھانے کی ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ صفرا کے لئے بھی اس کا استعمال مفید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سیلانِ خون، معدہ کی جلن اور ترشی اور قولنج میں بھی فائدہ دیتا ہے۔

مسٹر اسٹینلی افریقہ کے مشہور سیاح کا بیان ہے کہ ان کو دو مرتبہ معدہ کی سوزش کا مرض ہوا اور کیلے کے آٹے کے استعمال سے ان کو بہت نفع ہوا۔ بچوں اور اُن لوگوں کے لئے جن کے معدے کمزور ہوں یہ عمدہ غذا ہے، اس کے آٹے سے معدہ کو قوت پہنچتی ہے۔

امرود

اس کا ہندوستانی نام امرود ہے۔ مگر وجہ تسمیہ معلوم نہیں، یہ گجرات میں جمرود اور دکن میں جام کہلاتا ہے۔ بعض لوگ اس کو سفری آم یا سپاری آم بھی کہتے ہیں، یورپ اور امریکہ میں اس کو گاوا بولتے ہیں۔

آئین اکبری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں منجملہ دوسرے پھلوں کے امرود بھی عام طور پر استعمال ہوتا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ کس زمانہ میں ہندوستان آیا۔

مسٹر بونو کہتے ہیں کہ امرود کی زاد بوم امریکہ کا گرم حصہ تھا اور اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے پہلے امرود وہاں موجود تھا۔ پیرو اور میکسکی میں بھی یہ پایا جاتا ہے

قیاس غالب ہے کہ قدیم زمانہ میں امرود امریکہ سے ہندوستان لایا گیا اور یہاں خوب پھلا اور اُسکی کاشت ہونے لگی۔ آجکل نیم گرم اور گرم ملکوں میں عموماً کاشت ہوتا ہے، فرانس۔ الجیریا ہوائی، فلوریڈا کیلی فورنیا وغیرہ تمام ممالک میں بکثرت کاشت ہوتی ہے اور اسکی تجارت بھی ہونے لگی ہے۔

امرود کی ایک قسم "اسٹرابیری گاوا" ہے جو برازیل میں زیادہ ہوتی ہے۔ غالبًا پرتگالیوں کے ذریعہ سے یہ پھل چین پہونچا اور چین سے یورپ، کیونکہ یورپ میں مدت تک اسکو چینی میوہ سمجھا گیا ہندوستان میں بھی یہ قسم پائی جاتی ہے مگر مشہور نہیں ہے، لنکا میں اس قسم کے امرود بکثرت ہوتے ہیں

پنجاب میں امرود عموماً چھوٹا ہوتا ہے، بعض سفید و زرد ہوتے ہیں بعض باہر سفید اور اندر سرخ ہوتے ہیں۔ بنارس اور الہ آباد کے امرود بہت مشہور ہیں۔ خصوصًا الہ آباد کا امرود بڑا، نرم اور شیریں ہوتا ہے، اس میں بیج بہت کم اور گودا زیادہ ہوتا ہے۔

طبی حیثیت سے بھی امرود بہت مفید ہوتا ہے، یہ مقوی معدہ ہے اور دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ یونانی طب میں بہی کا بدل صرف امرود ہے۔ اور ضعف معدہ کے لئے اس کو مخصوص ترکیبوں کے ساتھ استعمال کرایا جاتا ہے۔ یوں بھی عام طور پر کھایا جاتا ہے اور سستا ہونے کی وجہ سے خاص و عام کے استعمال میں آتا ہے۔ بعض لوگ لیموں، نمک اور سیاہ مرچ ڈالکر کھاتے ہیں، بعض اسکے ساتھ قدرے شکر کا اضافہ بھی کر لیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں اس کا ذائقہ و لذت زیادہ ہو جاتی ہے اور جلد ہضم ہو جاتا ہے۔

لوکاٹ

پہلے یہ جاپان کا میوہ سمجھا جاتا تھا لیکن آجکل اس کی نسبت چین کے ساتھ مخصوص ہے۔ تاہم قدیم الایام سے یہ جاپان میں کاشت کیا جاتا ہے، چین میں اس کا نام لوکوہ ہے صوبہ کن ٹن میں لکواٹ کہلاتا ہے جس کے معنے ایک قسم کا سنگترہ ہیں۔ چین کے بعض حصوں میں، سکوپی یا بھی کہتے ہیں، اس کا جاپانی نام بیوا ہے۔ یورپ میں یہ جن ناموں سے پکارا جاتا ہے انمیں جاپانی نام شامل ہوتا ہے چین اور امریکہ میں اسکی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔ کیلی فورنیا اسکی کاشت کیلئے خاص طور پر موزوں سمجھا گیا ہے چین کے صوبہ چکیانگ میں بھی بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ایک سال وہاں سے بیس ہزار ڈالر کی قیمت کا لوکاٹ باہر بھیجا گیا تھا۔ جاپان میں ہر سال بیس ملین پونڈ کا لوکاٹ پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سہارنپور کا لوکاٹ بہت مشہور ہے یہ بڑا اور شیریں ہوتا ہے، اور دوسرے مقامات کے مقابلہ میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

بوڑھا بابا

(از مسٹر بنواری لال شرما بی۔ اے)

اُس کا نام جو کچھ بھی ہو مگر ہم سب اُس کو بابا بابا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ غریب تھا مگر بچوں کی جمعیت میں صدر سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں وہ اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک پھٹی پُرانی رضائی اوڑھے بیٹھا رہتا تھا، جھونپڑی کے ایک کونے میں الاؤ تھا۔ ہمیں اس کے کام کرنے میں بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ دس پندرہ نوعمر لڑکے اکثر اُس کے پاس جمع رہتے اور بڑے شوق سے اُس کی کہانیاں سُنا کرتے تھے۔

جب وہ کہتا، "اچھا بچو! میرا حقہ کون بھریگا؟" ہم سب یکزبان ہو کر کہتے "مَیں۔ مَیں" سردی کے دنوں میں ہم صرف چادریں اوڑھا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ پاؤں چادریں میں چھپا کر بیٹھا کرتے تھے مگر جیسے ہی بابا کا حکم ملتا ہماری سردی کافور ہو جاتی اور ہر ایک اس بات کی کوشش کرتا کہ بابا کا حقہ مَیں بھروں۔ اور بابا کے منہ سے اپنی تعریف سنوں۔ اب کہ میں ایک دفتر میں نوکر ہوں جب کبھی ہمیں کوئی حکم ملتا ہے تو ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں، حالانکہ ہمیں تنخواہ بھی ملتی ہے پھر بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مصیبت کا پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا ہے۔ ان دنوں ہمیں تنخواہ نہ ملتی تھی مگر ہمارے لئے یہ کیا کم فخر کی بات تھی کہ ہم بابا کا کام کرتے تھے۔ جو بابا کا حقہ بھر لاتا وُہی اُس کا منظورِ نظر تصور ہوتا تھا۔ اس کی نگاہیں جوشِ مسرت سے چمکنے لگتی تھیں۔ اور باقی سب اُس کی طرف رشک و حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بابا بھی یہ بات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا اور ہمیں دلاسا دیتے ہوئے کہتا تھا "اچھا اب تمہاری باری بھی آجائیگی"۔

بابا کی عمر تقریبًا ساٹھ سال کی تھی مگر ابھی تک اُس کے قوئے مضبوط تھے۔ اُس نے تمام عمر اپنی بھیڑوں کے چرانے میں صرف کر دی تھی، اب بھی اُس کے پاس کچھ بھیڑیں تھیں جنھیں وہ روز چرانے کے لئے باہر لیجایا کرتا تھا۔ بابا کی بھیڑوں کی اُون ہمیں اور بھی زیادہ اُس کی طرف کھینچتی تھی، کبھی کبھی وہ خوش ہو کر کسی ایک لڑکے کو تھوڑی سی اُون دیدیا کرتا تھا اور جس پر اُس کی مہر کی نظر ہو جاتی

تھی وہ اپنے جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ اُون کی داڑھی اور مونچھیں بنا کر اپنے چہرہ پر لگا لیتا اور باقی تمام لڑکے تالیاں بجاتے اور ہُو ہُو کرتے اُس کے پیچھے بھاگتے۔ مگر یہ عنایت کبھی کبھی ہوتی تھی۔ اس لئے بعض اوقات جب اُس کی بھیڑیں چوپال میں سے گذرتیں تو ہم اُس کی نگاہ سے بچکر خود ہی اُون اُکھاڑنے لگتے۔ مگر بابا کو دیکھکر سہم جاتے، اور جب وہ ہمیں دیکھ لیتا تو ایسی گھڑکی دیتا کہ جان نکل جاتی، پھر بھی ہمیں اُس سے بدگمانی نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں اُس کی گھڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ اور اگر ہم اُس سے کبھی ناراض بھی ہو جاتے تو اُس کا نقصان بھی کیا تھا مگر ہم خود ضرور اُس کی دل خوش کُن کہانیوں سے محروم رہ جاتے۔

علاوہ ازیں بابا اتنا سخت بھی نہیں تھا، وہ بچوں سے بڑی محبت کرتا تھا، وہ جنگل سے ہمارے لئے بیر وغیرہ لایا کرتا تھا اور ہمیں کھاتے دیکھکر بڑا خوش ہوا کرتا تھا۔ اُون دینے میں بھی وہ زیادہ سخت نہ تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بابا ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا اور بھیڑیں چرتے چرتے ایک گھڑکی آڑ میں ہو گئی تھیں، مَیں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور اُون اُکھاڑنے لگا، اتفاق سے وہ ادھر آ گیا اور کہنے لگا، "آج تو موقع پر پکڑا گیا ہے، پہلے تو انکار کر دیتا تھا مگر آج؟" یہ کہہ کر اُس نے میرا کمزور ہاتھ اپنے آہنی پنجہ میں لے لیا اور کہا "چل تجھے تیرے باپ کے پاس لے چلوں" میں سہم گیا۔ کیا کر سکتا تھا اُس کے ہاتھ سے چھوٹنا محال تھا، اور اگر وہ مجھے میرے باپ کے پاس لے جاتا تو اور بھی آفت آتی۔ میں نے اپنا پرانا منتر یاد کیا۔ رونی صورت بنائی، بابا کا دل پگھل گیا۔ پھر تو مَیں نے اپنی کامیابی دیکھ کر اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ اب وہ خود مجھے تسلّی دینے لگا، دراصل وہ مجھے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا۔ آج تک اُس نے کسی لڑکے کو بھی کچھ نہ کہا تھا، البتہ ہنسی ہنسی میں چھیڑتا تھا، گاؤں والے بھی اُس کی اس عادت سے خوب واقف تھے اس وجہ سے اُس سے کوئی ناراض نہ ہوتا تھا وہ ہمیں اپنے بچے سمجھ کر پیار کیا کرتا تھا اور اس وجہ سے وہ ہم سے ناراض ہونے کا بھی حق رکھتا تھا، اُس کے کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ بالکل تنہا تھا، اُس نے مجھے روتے دیکھکر تسلّی دی اور کچھ اور اون دیدی، مَیں خوش ہو گیا، بھاگا بھاگا دوستوں میں گیا، داڑھی اور مونچھیں لگائیں اور کہا "دیکھو بوڑھا بابا آیا ہے۔"

زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا، بابا بھی قدرت کے اس قانون سے نہ بچ سکتا تھا، اُس کی زندگی کا آخری دن نزدیک آ چکا تھا۔ رات کے دس بجے تھے اور ہم سب اُس کے پاس بیٹھے کہانیاں سُن رہے تھے۔ گھر جانے کی کوئی فکر نہیں تھی، گاؤں والے اپنے گھروں میں سو رہے تھے، مگر

ہم بابا کے پاس بیٹھے اونگھ رہے تھے اور بابا کہانی کہہ رہا تھا۔

ابھی بابا کی کہانی ختم نہ ہوئی تھی کہ دُور سے ایک چیخ سُنائی دی، ہم سب سمجھے کہ کوئی بھُوت چلّا رہا ہے، ڈر کر بابا کے پاس جا بیٹھے، اُس نے کہا "بچو! ڈر گئے ہو؟ بُری کہانیاں سننے کا یہی اثر ہوتا ہے۔" ہم اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کرنے کے لئے پھر پیچھے ہٹ گئے، مگر دل دہلا جاتا تھا۔

اتنے میں پھر آواز آئی، "ہائے میں مر گئی۔"

یہ آواز سُنکر بابا اُٹھ بیٹھا، اُس نے رضائی علیحدہ رکھدی، اور چادر اوڑھ لی، ایک کونے سے اپنا لٹھ اُٹھایا اور دیا سلائی کی ڈبیا جیب میں ڈال کر چلنے کو تیار ہوگیا، ہم بھی اُس کے ساتھ چلنے کو آمادہ ہوگئے۔ رات اندھیری تھی ہم ڈرتے تھے کہ کہیں بابا کے پیچھے سے بھوت آکر ہمیں نگل نہ جائے۔ اس لئے سب اس کے دائیں بائیں ہوگئے، جن کے گھر راستے میں آئے وہ وہیں رہ گئے اب صرف ہم تین چار لڑکے بابا کے ساتھ رہ گئے تھے، بابا اپنا سونٹا سنبھالے آواز کی طرف جا رہا تھا گاؤں سے باہر ایک جگہ درختوں کا جھنڈ تھا، بابا اُس کے اندر چلا گیا، ہم ڈر کے مارے باہر ہی رہ گئے، لیکن ہماری حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔

تھوڑی دور پر ہمیں ایسا نظر آیا کہ بابا نے دیا سلائی جلائی ہے، اور دیکھا کہ ایک مرد ایک عورت کو مارنے کو تیار ہے، بابا عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔

نوجوان مرد نے بابا کو اپنے کام میں مخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اُس پر گنڈاسے سے حملہ کیا، بابا تجربہ کار تھا بچ گیا، لیکن بابا کے ایک سونٹے سے نوجوان کا کام تمام ہوگیا۔

بابا کوئی پندرہ منٹ کے بعد واپس آگیا، اُس کے ساتھ ایک عورت تھی، ہم میں سے کوئی بھی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا، ہم بابا کے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے، وہ ہمیں ہمارے گھر پر پہونچا گیا اور عورت اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن شام کے وقت ہم مدرسہ سے گھر آئے۔ اور چوپال کی طرف کھیلنے چلے گئے دیکھا کہ ایک طرف بہت سے آدمی جمع ہو رہے ہیں، میں بھی اُس طرف چلا گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ بابا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، دو سپاہی اُس کے پاس بیٹھے ہیں اور سامنے وہی رات والی عورت بیٹھی ہوئی کہہ رہی ہے کہ اسی بڈھے نے میرے خاوند کی جان لی ہے۔ یہ دیکھکر میں حیران ہوگیا، مگر اس واقعہ کا راز آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

گاؤں کے سب لڑکے بابا کے چاروں طرف کھڑے تھے، ہم نے آج تک کسی افسر کو

نہیں دیکھا تھا، سب سے بڑا افسر ہمارے لئے بابا ہی تھا، ہمارا دل چاہتا تھا کہ ان سپاہیوں پر ٹوٹ پڑیں اور بابا کو بچا لیں۔ مگر بابا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہ تھے، اتنے میں ایک سپاہی نے ہماری طرف دیکھا اور چلاّ کر کہا "بھاگ جاؤ"

ہمارے ارادے دل ہی میں رہ گئے، بابا نے ایک نگاہ ہماری طرف ڈالی، گویا یہ کہا "بچو! چلے جاؤ" سپاہی نے ایک گھڑکی اور دی اور سب لڑکے وہاں سے بھاگ گئے۔

آخر وہ سپاہی بابا کو لے گئے، اور ہم ہمیشہ کے لئے اس سے علٰحدہ ہو گئے۔ بابا کے چلے جانے کے بعد ہمیں خیال ہوا کہ اب بابا کی جھونپڑی کون سنبھالے گا اور اُس کی بھیڑیں کون چرایا کرے گا، مگر اس کی جھونپڑی اور بھیڑیں اس کے ایک رشتہ دار نے سنبھال لیں، اور دوسرے روز رات کو جب ہم اس امید پر کہ بابا اپنے بچوں کو کہانیاں سنانے کے لئے واپس آگیا ہوگا اُس کی جھونپڑی کی طرف گئے تو اُس کو بند پایا۔

رفتہ رفتہ ہم بابا کی واپسی سے مایوس ہونے لگے، مگر اُس کی جھونپڑی پر ضرور جاتے تھے۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ اُس کا رشتہ دار اُس کی جھونپڑی کو گرا رہا ہے، ہمیں اس کا بہت صدمہ ہوا، وہ ہمارے بوڑھے بابا کی نشانی تھی، ہمارے بچپن کی یادگار اور سب سے بڑی درسگاہ تھی، ہم سب لڑکے اکٹھا ہو کر وہاں گئے اور مالک سے کہا کہ وہ اس جھونپڑی کو نہ گرائے، مگر وہ وہاں ایک بڑا گھر بنانا چاہتا تھا، اس لئے اُس نے ہماری درخواست کی کوئی پروا نہ کی بلکہ اور الٹا مارنے دوڑا۔ یہ دیکھ کر ہم سب وہاں سے بھاگ آئے۔ اس واقعہ کو ایک مدت ہو گئی مگر بوڑھے بابا کی یاد ابھی تک ہمارے دلوں میں محفوظ ہے، اور جب کبھی دو چار لڑکے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو اُسی کا ذکر خیر ہوا کرتا ہے

رسید کتب

ارتقا۔ مؤلفہ مشتاق احمد وجدی، قیمت غیر مجلد عہ،

دیوان یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ بی۔ اے قیمت غیر مجلد ۱۲ر

نظم ہاشمی، از سید ہاشمی فرید آبادی، قیمت ۴ر

(شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

جزر تبسم، از شوکت تھانوی۔ قیمت عا، شائع کردہ نسیم بک ڈپو، نظیر آباد۔ لکھنؤ

مہابیر جی کا جنم[1]

(از جناب مسلم کاکوروی)

متھلا (ترہت) کے ایک گاؤں کنڈاگراما نامی میں ایک برہمن رسابھادیتہ نامی اور اسکی بیوی دیوانندا عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس وقت مہابیر جی پیٹ میں آئے اسی شب اُن کی ماں دیوانندا نے خواب میں ہاتھی، بیل، شیر، لکشمی، ہار، چاند، سورج، جھنڈا، کنول، سمندر محل، جواہر کا ڈھیر اور ایک شعلہ دیکھا۔ وہ خواب سے بیدار ہوئیں اور اُسے ذہن میں اچھی طرح محفوظ کر کے متانت و سنجیدگی سے خراماں خراماں اپنے شوہر کے پاس پہنچیں اور برہمن کے سامنے ہاتھ باندھ کر اپنا خواب بیان کیا، جس نے تعبیر بیان کرتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی کہ اُن کے ہاں ایک حسین عقلمند لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو بڑا خوش قسمت ہوگا اور جملہ علوم و فنون پر حاوی ہو کر یگانۂ روزگار ہوگا۔ برہمنی کو یہ تعبیر بہت پسند آئی اور میاں بیوی دونوں بیحد مسرور ہوئے۔

اتفاقاً اسی وقت اندر دیوتا (بارش کے دیوتا) سفید براق کپڑے پہنے، کانوں میں سونے کے جڑاؤ بالے ڈالے اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے قدرت کی نعمتوں مثلاً موسیقی اور قصہ گوئی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ اُنھوں نے یکایک آنکھ اُٹھا کر جمبودیپ (ہندوستان) پر نظر ڈالی اور معلوم کیا کہ مہابیر جی نے برہمنی کے پیٹ میں قرار پکڑا ہے۔ وہ مسرت سے اُچھل پڑے، جواہر نگار تخت سے اترے کندھے پر گلیم ڈالی اور سب کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر اس مقدس اوتار کی طرف روانہ ہوئے۔ زمین پر پہنچکر اُنھوں نے تین مرتبہ سجدہ کیا اور ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا:

"سلام ہو مقدس دیوتاؤں، اوتاروں، بہادروں اور رہنمایانِ عالم کو جو ایسی جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں سے آنا ممکن نہیں، وہ لوگ خوف و ہراس کے دیو کو شکست دے چکے ہیں، سلام ہو مقدس مہابیر کو۔ کاش وہ مجھے دیکھ سکتے۔"

یہ کہکر اُنھوں نے پھر سلام کیا اور اپنی عشرت گاہ کو روانہ ہوگئے۔ راستہ میں اُنھیں خیال آیا کہ آج

---

[1] ماخوذ از انڈین آرٹ۔

تک کسی مقدس اوتار نے کسی نیچ خاندان میں کبھی جنم نہیں لیا، وہ کسی غریب برہمن کے گھر میں نہیں پیدا ہوئے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک کم رتبہ خاندان میں اوتار ہونے والا ہے میں کوشش کرکے مہابیرجی کو دیوانندا برہمنی کے پیٹ سے نکال کر سدھارتھ چھتری کی بیوی ترسلا کے پیٹ میں اور اس کے حمل کو دیوانندا برہمنی کے شکم میں داخل کر دونگا۔ یہ سوچکر وہ اپنی پیادہ فوج کے سپہ سالار ہری نامگیسی کے پاس پہنچے، اور اس کو حکم دیا کہ وہ ان دونوں عورتوں کے حمل تبدیل کر دے۔ اپنے آقا کا حکم سُنکر ہری نامگیسی نے سر تسلیم خم کیا اور تعمیل حکم کی غرض سے آسمان سے زمین کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں اُس نے انسانی شکل اختیار کی، دریاؤں پہاڑوں اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا کنڈ اگراما اور آخرکار دیوانندا برہمنی کے گھر پہنچا۔

یہاں پہنچکر اس نے مہابیرجی کو سات بار سلام کیا، ذرا دیر بعد دیوانندا اور اس کے ساتھیوں پر ایک گہری نیند طاری ہوگئی۔ اندر کے سپہ سالار نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق نطفے بدلکر جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے اندر دیو کی خدمت میں پہنچ کر اُنھیں اپنی کارگذاری کی اطلاع دی۔ یہ واقعہ حمل ٹھہرنے کے تراسی دن بعد ظہور پذیر ہوا۔

اسی رات کو چھتری کی بیوی ترسلا اپنے آراستہ و پیراستہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، چاروں طرف گلدستے رکھے ہوئے تھے اور خوشبوئیں جل رہی تھیں۔ اس پر یکایک نیند طاری ہوگئی اور اس نے خواب میں وہی چودہ چیزیں دیکھیں جو دیوانندا برہمنی نے دیکھی تھیں۔ خواب سے بیدار ہونے پر اس کی مسرت کی انتہا نہ تھی، وہ پلنگ سے اُٹھکر اپنے شوہر سدھارتھ چھتری کے پاس پہنچی، اور ادب و تعظیم سے اپنا خواب بیان کیا۔ شوہر نے خواب سُنکر تعبیر بتائی کہ تمہارے ہاں ایک نہایت حسین و جمیل بچہ پیدا ہوگا جو دنیا کے تمام علوم و فنون حاصل کرے گا، اور ہمارے خاندان کے لئے باعث فخر و بہبودی ہوگا۔ ترسلا کو بیحد مسرت حاصل ہوئی، باقی رات اس نے جاگتے بسر کی تاکہ کوئی دوسرا خواب نظر نہ آئے اور پہلے خواب پر بُرا اثر نہ ڈالے۔

صبح کو سدھارتھ نے ملازموں کو بلاکر حکم دیا کہ دربار آراستہ کریں۔ اُس نے شاہی ورزش گاہ میں جاکر کسرت کی اور نہا دھوکر شاہی لباس زیب تن کیا، اس کا جسم جواہر میں غرق تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو تمام خواہشوں کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح آراستہ و پیراستہ ہوکر وہ دربار میں پہنچا جہاں اس کے وزرا اور امرا پہلے ہی سے آکر جمع ہوگئے تھے۔ وہ تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ دربار میں آٹھ زرنگار کرسیوں کے پیچھے ایک پردہ پڑا تھا جسکے پیچھے مہارانی

ترسلا اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔

سدھارتھ نے نجومیوں رمالوں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا، جو درباری لباس زیب تن کرکے حاضر ہوئے اور ادب سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راجہ نے رانی کا خواب بیان کرکے اس کی تعبیر پوچھی۔ کچھ دیر غور وخوض اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے عرض کیا:۔

"مہاراج! ہماری کتابوں میں خوابوں کے متعلق تیس بڑی چیزوں کے حالات لکھے ہیں اور جو عورت ان میں سے چودہ چیزیں دیکھتی ہے اس کے ہاں عظیم الشان شہنشاہ یا اوتار پیدا ہوتا ہے۔ مہارانی ترسلا نے یہ چودہ چیزیں دیکھی ہیں لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ اُن کے بطن سے ایک بڑا اوتار پیدا ہونے والا ہے۔"

سدھارتھ اور ترسلا کو اس تعبیر پر یقین آگیا اور مہارانی اپنے محل میں مسرت وشادمانی سے چلی گئی۔

جس وقت سے مہابیر جی رانی کے بطن میں آئے اس کی شہرت وعزت میں اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ اسی وجہ سے لڑکے کا نام وردھامنا رکھا گیا۔ مہابیر جی نے شکم مادر ہی میں فیصلہ کیا کہ وہ ماں باپ کی زندگی میں دنیا سے کوچ نہ کریں گے اور اپنے جسم سے کوئی بال نہ توڑیں گے

حمل کے زمانے میں مہارانی ترسلا نے بیماریوں سے بچنے کی امکانی کوشش کی وہ زیادہ محنت نہ کرتی تھیں اور کھانے پینے میں خاص احتیاط مدنظر رکھتی تھیں تاکہ بچہ کو کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

نو ماہ اور ساڑھے سات روز بعد ٹھیک بارہ بجے شب میں بچہ تولد ہوا، اس کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ نہایت حسین وجمیل تھا۔ اس شب میں ہر طرف مسرت وشادمانی کے آثار نظر آتے تھے، تمام دنیا روشن سی ہو گئی تھی۔ فرشتے آسمان سے اُتر آئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ مہابیر جی کی پیدائش پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ سدھارتھ نے شہر میں دس روز تک خوشی منانے اور چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ لگان میں کمی کا اعلان کیا، مفلسوں، محتاجوں یتیموں اور مسکینوں کو خیرات تقسیم کی گئی۔ بارھویں دن شاہی ضیافت ہوئی اور بچے کا نام وردھا رکھا گیا۔

تیس سال تک مہابیر جی نے دوبھا میں قیام کیا۔ ماں باپ کے مرنے پر بڑے بھائی اور

اکابرین سلطنت سے مشورہ لیکر اپنی قسم کو پورا کیا۔ اس وقت اُنھوں نے دیکھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر خدا کی یاد میں مشغول ہو جائیں چنانچہ اُنھوں نے اپنی تمام دولت غریبوں اور محتاجوں کو بخش دی۔ یہ تقسیم سال بھر تک جاری رہی۔ اس کے بعد آسمان سے چار فرشتے ان کے پاس آئے اور انھیں تخت پر بٹھا کر مقدس پانی سے غسل دیا اور آلائش دنیوی سے پاک کر دیا۔ تین دن متواتر برت رکھنے کے بعد مہابیر جی نے تخت پر قدم رکھا اور میانہ میں بیٹھکر ایک پہاڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ اِس میانہ کو اُٹھانے میں انسان اور دیوتا دونوں شامل تھے۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچکر اُنھوں نے پالکی رکھوا دی۔ مشرق کی طرف منہ کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے اور شاہانہ لباس اُتار کر تہیہ کیا کہ باقی زندگی خدا کی یاد میں سنیاسیوں اور عابدوں کی طرح بسر کرینگے۔ اندر دیو نے ان کو قدرتی لباس پہنایا اور ان کے لباس کو دودھ کے سمندر میں غوطہ دیا۔

مہابیر جی کو اس حالت میں بارہ سال گذر گئے، اُنھوں نے عیش و آرام کو یکلخت ترک کر دیا اور سیر و سیاحت، عبادت اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ تیرھویں سال ایک روز وہ دھیان لگائے سال کے ایک درخت کے نیچے گرمبھی کا گرام نامی گاؤں میں بیٹھے تھے کہ یکایک ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ گیا اور انھیں نروان (نجات) حاصل ہو گیا۔ اس وقت ان پر انسانوں، دیوتاؤں اور دنیا کی تمام اشیا کے رازہائے سربستہ منکشف ہو گئے۔ یہ درجہ حاصل کرنے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی تعلیمات دنیا میں پھیلائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تیس سال اپنے خیالات کی تبلیغ میں صرف کئے۔ اس عرصہ میں ان کے بہت سے چیلے ہو گئے۔ اپنے مشن کے پورا ہونے پر اُنھوں نے پاپا نامی مقام پر وفات پاکر ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی۔

تشنہ لبوں کے سامنے ساغرِ دل تو پیش کر
بزمِ جہاں میں سلے بشر ساقیِ غمگسار ہو

شرق وہی ہو رات دن دل میں وہی ہو آنند
صبح سے شام تک وہی جشن کو انتظار ہو

بھرتا ہے دم جو عشق کا پہلے خودی کو لے مٹا
یار پہ اپنے پیروز نما شوق سے بلدبار ہو

(پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد۔ ایم۔ اے)

تنقید کتب

سفینۂ شیخ علی حزیں مرتبہ مولوی مسعود علی بی۔ اے (علیگ) مطبوعہ دارالطبع جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ کراون سائز۔ ضخامت تقریباً ۱۵۰ صفحات۔ کتابت و طباعت نفیس

شیخ علی حزیں اپنے زمانہ کے مشہور و مستند سخنور تھے جن کا نام آج تک عزت و وقعت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اگلے زمانہ کے دستور کے موافق شیخ صاحب نے بھی متقدین و معاصرین شعراء کے کئی تذکرے مرتب کئے تھے۔ ان میں سے "سفینہ" غالباً سب سے آخری تالیف ہے۔ یہ مختصر تذکرہ حسنِ اتفاق سے مولوی مسعود علی صاحب کی نظر سے گذرا اور سر مہاراجہ بہادر کشن پرشاد صاحب یمین السلطنت نے اپنی فطری علم دوستی و سخن پروری کی بنا پر اس نایاب "سفینہ" کو اپنے صرف سے شائع کرنے کی اجازت دیدی۔ مہاراجہ بہادر بالقابہ خود بھی ایک بلند پایہ ادیب و سخنور ہیں، آپ اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن سنجی دیتے ہیں اور اکثر مفید کتابیں آپ کی سرپرستی و امداد سے طبع ہو چکی ہیں۔

شروع میں "تمہید" نوشتۂ مرتب صاحب کے بعد مہاراجہ بہادر بالقابہ کے قلم گوہر رقم سے لکھا ہوا ایک مبسوط مضمون بطور مقدمہ ہے جو ۴۵ صفحات پر حاوی ہے۔ اس میں شیخ علی حزیں کے حالات زندگی اُن کے اخلاق و عادات، ہندوستان آنے اور معاصرین سے نوک جھونک ہونے کا حال اور آخر عمر میں بنارس میں گوشہ نشین ہو جانے اور وہیں انتقال کرنے کی کیفیت۔ غرض شیخ صاحب کے متعلق تمام ضروری باتیں نہایت خوش اسلوبی سے جمع کر دی گئی ہیں، اُس کے بعد اصل تذکرہ ہے جس میں تقریباً ایک سو شعرا کا بعبت مختصر حال اور منتخب کلام ہے، جس قدر اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ سب بہترین ہیں۔

اصل تذکرہ فارسی میں ہے مگر "تمہید" اور "مقدمہ" اُردو میں ہیں۔

ہم اس نایاب کتاب کی اشاعت پر مہاراجہ بہادر بالقابہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مفید کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

مرقع اکبرآباد

مؤلفۂ مولوی سید احمد مارہروی (مہتمم شعبہ محمدیہ ہائی اسکول۔ آگرہ) رائل سائز ۲۳۲ صفحات۔ قیمت ؏

ہندوستان میں آگرہ کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے اُس سے سبھی حضرات واقف ہیں۔ خصوصاً تاج محل ہی کی وجہ سے وہ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے آگرہ کی تاریخ، روضۂ تاج گنج و دوسری تاریخی عمارات، قلعہ اور قلعہ کے اندر کی تمام قابل ذکر عمارات، اگرد و نواح مثلاً فتحپور سیکری سکندرہ وغیرہ کے تاریخی حالات اور وہاں کی عمارتوں کا ذکر، بزرگوں کے مزارات۔ قدیم و جدید مناور اور گرجا، موجودہ حکومت کے زمانہ کی مشہور و لایق دید عمارتیں، مثلاً سینٹ جانس کالج۔ شفاخانہ، اور رادھا سوامی ست سنگ کی نو آبادی دیال باغ غرض آگرہ کی ابتدائی تاریخ سے لیکر آج تک کے حالات بالتفصیل مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں تاج محل، قلعہ اور قلعہ کے اندر کی عمارات وغیرہ مشہور تاریخی عمارتوں کے بائیس فوٹو دیئے گئے ہیں بحیثیت مجموعی یہ آگرہ کی ایک مبسوط و مستند تاریخ ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے علاوہ سیاحوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ دلچسپ و مفید ہوگا۔ اور بطور ایک "رہنما" کے کام آئیگا۔

اسلامی لغت (جلد دوم)

مرتبۂ سید حامد حسین رضوی (علیگ) ایم۔ اے۔ ایس بی۔ (محلہ بجریا ڈاکخانہ بینا ضلع ساگر (ممالک متوسط) رائل سائز ۳۶۶ صفحات۔ قیمت ؏

اِس لغت کی پہلی جلد ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے، اس دوسری جلد میں ج۔ ح۔ خ سے شروع ہونے والے الفاظ ہیں۔ یہ لغت جس اصول خاص پر ترتیب دیگئی ہے اُس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"حاکم (ع) بکسر کاف، حکم کرنے والا۔ جمع اسکی حکام اور حاکمین آتی ہے۔ اصولیین اور فقہا کے نزدیک خدائے تعالیٰ حاکم ہے اور باقی محکوم، حاکم نام ہے خدائے تعالیٰ کا۔ چنانچہ (۱) سورۂ تین (پ ۳۰ ع ۱۸۔ آیت ۸) میں احکم الحاکمین آیا ہے جس سے مراد خدائے تعالیٰ ہے۔ سورۂ اعراف (پ ۹ ع ۱۱ آیت ۸۷) میں خیر الحاکمین سے مراد اللہ جل شانہٗ ہے۔"

غرض یہ اپنی قسم کی خاص لغت ہے، اور اسلامی علوم کو سمجھنے کے لئے بہت کارآمد ہے۔

محمود گاواں

از محمد ظہیرالدین متعلم بی اے۔ کراؤن سائز۔ ۵۵ صفحات۔ قیمت ۸/
مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

خواجۂ جہاں خواجہ عماد الدین محمود گاواں اول ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے مگر اپنے ذاتی جوہر و قابلیت کی بدولت سلاطین بہمنیہ کے دربار میں اعلیٰ مناصب پر ممتاز ہو گئے اور بالآخر وزیر اعظم کے درجہ تک ترقی کی، اس مختصر رسالہ میں جو دراصل ایک مبسوط مضمون ہے محمود گاواں کے سوانح عمری کتب تاریخ سے اخذ کر کے مرتب کئے گئے ہیں۔ محمود گاواں کے ذاتی اخلاق و عادات کے علاوہ انکے وہ کارنامے بھی بیان کئے ہیں، جو اُنھوں نے اپنے زمانہ میں انجام دیے اور ان کی دیانت دارانہ خدمات سلطنت بہمنی کے حق میں بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں محمود گاواں کی سیرت و کردار کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

سرمایۂ تصوف

مصنفہ حکیم صوفی صدرالدین حاذق۔ ڈمائی سائز، ۱۹۲ صفحات۔ قیمت ۱۲/
ملنے کا پتہ: دفتر "سرمایۂ تصوف"۔ نورشاہ روڈ۔ مزنگ۔ لاہور

یہ ایک مثنوی ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اور نفس مضمون کے لحاظ سے سات ابواب میں منقسم ہے جنمیں توحید، تفکر، انانیت وغیرہ کا بیان ہے۔ بلحاظ نظم یہ مثنوی بہت بے لطف ہے۔ جابجا فن کی غلطیاں موجود ہیں اور ان کا احساس خود جناب مصنف کو بھی ہے، جیسا اُنھوں نے "التماس" کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ "گو اس میں عروض اور قافیہ کے لحاظ سے اغلاط ہونگے کیونکہ مجھ کو اظہار خیالات قافیہ اور ردیف کی رنگینی سے زیادہ مرغوب رہا" بہرحال جو کچھ ہے غنیمت ہے لیکن ہماری رائے میں اگر نظم کے بجائے نثر میں اظہار خیال کیا جاتا تو موجودہ صورت سے زیادہ مفید ہوتا

دلبستاں

ازجناب ناظم انصاری (نارد یو۔ پوسٹ ملا بمبئی) کراؤن سائز
۱۳۶ صفحات۔ قیمت ۱۲/

یہ ایک سو سات مختصر سلیس نظموں کا مجموعہ ہے جس کو جناب ناظم نے فارسی، ہندی گجراتی اور انگریزی زبانوں کی اخلاقی نظموں کی مدد سے مرتب کیا ہے، دوسری زبانوں کی نظموں کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ ان کا خلاصہ و نتیجہ ذہن نشین کر کے ناظم نے خود اپنی زبان اور ہندی مذاق کے مطابق نظم کیا ہے۔ یہ تمام نظمیں عام اخلاقی امور اور فطری مناظر کے متعلق ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صاف

وسادہ ہیں عطف و اضافت سے پاک ہیں۔ چونکہ یہ بچوں کے لئے مرتب کی گئی ہیں اس لئے انکو سادہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ شروع میں حضرت صفی لکھنوی، جناب عزیز لکھنوی، مولوی عبدالحق بی اے وغیرہ حضرات کی رائیں درج ہیں اور تمام حضرات نے ان نظموں کی سلاست کی داد دی ہے ناظم صاحب کو بچوں کے لئے نظمیں لکھنے میں کافی مہارت ہے اور وہ چند مجموعے اس قسم کی نظموں کے شائع کرچکے ہیں

بچیوں کے کام یہ بھی جناب ناظم کی تصنیف ہے اور اس میں بچیوں کے پڑھنے کے قابل چھوٹی چھوٹی سادہ نظمیں ہیں، اس کی قیمت صرف ۲ ر ہے اور مصنف سے مندرجہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے

خاکِ شفا

از حافظ محمد یوسف علی خاں عزیز۔ مطبوعہ ہیرا لال پریس جے پور
چھوٹا سائز۔ ۵۶ صفحات۔ قیمت ۲ ر

یہ حضرت ابوبکر صدیق کی منقبت میں ایک طویل قصیدہ ہے، جو کئی مطلعوں پر مشتمل ہے۔ جا بجا تلمیحات کی توضیح اور بعض دوسری ضروری باتیں حاشیہ پر درج ہیں۔ پورے قصیدہ میں اکثر جگہ شکوہ الفاظ اور جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اہل اسلام کے مطالعہ کے لائق ہے۔

قواعد مضمون نویسی

(حصہ اول و دوم) مؤلفہ محمد مظفر الدین، مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،
کراؤن سائز، قیمت علی الترتیب ۵ ر اور ۶ ر

ان دونوں کتابوں میں ابتدائی درجوں کے طلباء کو مضمون نویسی سکھانے کے لئے ضروری قواعد طریقے بتائے گئے ہیں۔ ابتدائی ابواب میں صرف و نحو کے ضروری قاعدے بیان کرکے دوسرے ابواب میں مضمون نویسی قصہ نویسی، عرائض و خطوط وغیرہ لکھنے کے طریقے بتائے ہیں اور نمونے درج کئے ہیں۔ ہر بیان کے بعد مشق کے لئے کچھ سوالات قائم کردیئے ہیں۔ طریقۂ تعلیم بہت مناسب و مفید ہے۔ اگر اساتذہ ذرا سی کوشش سے کام لیں، اور ان کتابوں میں بتلائے ہوئے قواعد پر عمل کریں تو بچے بہت جلد آسانی کے ساتھ معمولی مضامین و خطوط نویسی سیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایک آدھ خط میں القاب و آداب مخصوص بہ دکن معلوم ہوتے ہیں اور چونکہ مؤلف دکنی ہیں اس لئے ان کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مثلاً حضرت عمو ی صاحب قبلہ مدظلہ، قدمبوسی عرضہ اور رہن نامہ وغیرہ کے جو نمونے دوسرے حصہ میں دیئے ہیں وہ بھی دکنی معلوم ہوتے ہیں۔ شمالی ہند میں ان کا انداز تحریر و ترتیب مختلف ہوتا ہے۔ اس صورت میں صرف دکن کے طلباء ہی ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

منتخبات ہندی کلام

مرتبہ ڈاکٹر جعفر حسن پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈمائی سائز۔ ۲۲۵ صفحات۔ مجلد
قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دی حیدرآباد بک ڈپو۔ چادر گھاٹ۔ حیدرآباد دکن

ہندی زبان کی شاعری اپنی سادگی و اثر کے لحاظ سے نہ صرف مقبول عام ہے بلکہ دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں ایک امتیاز بھی رکھتی ہے کیونکہ خیالات کی سادگی بجائے خود ایک مؤثر چیز ہے پھر تشبیہات کی بے ساختگی و لطافت اس کے حسن تاثیر کو اور بھی زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد مغلیہ میں فارسی کے ساتھ ہندی شعرا کی قدر بھی کی جاتی تھی، اور بعض اراکین سلطنت خود بھی ہندی میں فکر سخن کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اُردو شعراء عام طور پر ہندی شاعری سے بے التفاتی کرتے ہیں، حالانکہ مغربی زبانوں کے مقابلہ میں ہندی شاعری کا مطالعہ اہل ہند کے لئے زیادہ مفید و کار آمد ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر فاضل مؤلف نے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں ہندی زبان کی خصوصیات اور مسلمانوں نے ہندی سے جو دلچسپی ظاہر کی ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد ہندی کے ایسے دوہے انتخاب کر کے حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں جن میں اخلاقی نکات، فلسفیانہ مسائل، عاشقانہ تخیلات و جذبات وغیرہ ہیں۔ ترتیب کی صورت یہ رکھی ہے کہ پہلے اصل دوہا ہندی حروف میں ہے، اس کے نیچے اُردو میں، پھر اس کا مطلب اور حسب ضرورت تشریح کی گئی ہے۔

اگرچہ اس مجموعہ میں صرف دوہے ہی انتخاب کئے گئے ہیں اور اُن میں اکثر ایسے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں، تاہم مؤلف کی یہ کوشش مستحق ستایش ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے، اور ہندی زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات دوسرے قسم کا اعلیٰ کلام منتخب کر کے دنیائے ادب کے سامنے پیش کریں گے۔

مبادیٔ نفسیات

مولفہ مولوی شیخ عبدالحمید شوق بی۔ اے۔ کراؤن سائز۔ ۱۹۰ صفحات۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔

موجودہ زمانہ میں دوسرے علوم و فنون کے ساتھ علم النفس کا مطالعہ بھی ایک حد تک ضروری ہے یورپ میں تو اس علم کے متعلق بہت قابل قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر ہندوستان میں اور خصوصیت سے اُردو زبان میں صرف دو چار کتابیں ہی موجود ہیں، اور وہ بھی عموماً ابتدائی مسائل تک محدود ہیں، یہ کتاب بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک ابتدائی رسالہ قرار دی جاسکتی ہے مگر مؤلف نے نفسیات کا ایک مکمل مختصر خاکا پیش کرنے کے ساتھ ہی تمام نقطہائے نگاہ سے نفسیات پر بحث کی ہے اور جابجا

مثالوں کے ذریعہ سے نفس مضمون کو عام فہم بنا دیا ہے۔ طرز بیان سادہ و صاف ہے اور بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

انگریزی افسانے

مرتبہ مولوی عبدالقادر سروری ایم۔اے۔ کراؤن سائز۔ ۱۹۰ صفحات قیمت عہ
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن

"دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جو سلسلہ مکتبۂ ابراہیمیہ سے شائع ہو رہا ہے یہ اس کا دوسرا حصہ ہے۔ اس سے پہلے دو حصے (۱) قدیم افسانے (۲) چینی اور جاپانی افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ چودہ حصوں میں منقسم ہے۔ باقی حصوں میں بعض زیر طبع ہیں اور بعض زیر ترتیب

اس حصہ میں انگریزی زبان کے چودہ مختصر افسانوں کا ترجمہ ہے۔ افسانوں کے انتخاب میں یہ بات خصوصیت سے پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کے مختصر افسانہ نگاروں کے عمدہ قصے بہ لحاظ زمانہ مرتب کئے جائیں۔ چنانچہ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "معصوم شہزادی" جیوفری آف مان متھ (سنہ ۱۱۰۰-۱۱۵۴ء) کا ہے، اور آخری افسانہ "سیب کا درخت" کیتھرائن میانس فیلڈ (سنہ ۱۸۹۰-۱۹۲۳ء) کا ہے۔ ہر افسانہ کے شروع میں اس کے لکھنے والے کا مختصر حال بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ترجمہ میں انگریزی طرز تحریر نمایاں ہے۔

ہندوستان کی بہادر عورتیں

کراؤن سائز - ۱۰۹ صفحات - قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ:- ایوان اشاعت گورکھپور

ہندوستان میں اکثر رانیاں ایسی گزری ہیں کہ انھوں نے رزم و بزم میں مردوں سے زیادہ کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور اپنے حسن تدبیر و تدبر سے بڑے بڑے نازک و پیچیدہ مسائل کو حل کیا ہے۔ ایسی خواتین کی تعداد بہت ہے، ان میں سے صرف سات (درگاوتی، چاند بی بی، تارا بائی، پنا، سنجوگتا، پدمنی، اہلیہ بائی) کے حالات عورتوں اور بچوں کے مطالعہ کے لئے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں۔ زبان سادہ اور طرز بیان صاف ہے۔ پانچویں یا چھٹے درجہ کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے موزوں معلوم ہوتی ہے۔

بعض اُردو رسالوں پر ایک تنقیدی نظر

ادب لکھنؤ (مئی ۱۹۳۱ء)

رسالہ ادب لکھنؤ کے مئی نمبر میں لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت آرزو لکھنوی مدیر نگرانؔ کی ایک نظم شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان "پیاسے ساونت کی لڑائی" ہے۔ جناب آرزو خالص اُردو کی ترویج کے حامی ہیں اور یہ وہ مقصد ہے جس سے ہر بہی خواہ اُردو کو ہمدردی ہوگی مگر خالص اُردو کے جوش میں افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نظم کے متعلق بھی بعض جگہ شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً اس نظم کا مطلع ہے

تپتے بن میں رہے پیاسے تو یہ سوکھا پانی — بچے روئے بھی تو آنکھوں سے نہ نکلا پانی

اس مطلع کے قوافی میں ایطا ہے، اور ایطا معیوب ہے۔ اگر تپتے بن میں کوئی پیاسا ہے تو کیا پانی خشک ہو جاتا ہے؟ کیا پہلے مصرع میں بھی پانی بمعنی آنسو ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا آنکھ کی تخصیص کے بغیر پانی سے آنسو مراد ہو سکتی ہے؟ ایسی تخصیص نہ ہو تو پانی سے پسینہ کیوں نہ مراد لی جائے، یا مثلاً مینہ؟

بے بسی دیکھ کے عباس کا جی بیٹھ گیا — پیاسی بچی نے جو منہ پھوڑ کے مانگا پانی

میری رائے میں اس شعر میں "جی بیٹھ گیا" سے "جی بھر آیا" بہتر ہوتا۔ جی بیٹھنا ضعف یا مایوسی کی وجہ سے غمگین یا نڈھال ہونا ہے اور جی بھر آنا اپنی یا دوسرے کی مصیبت اور تکلیف سے متاثر ہو کر ملول ہونا ہے، مگر شعر سے واضح نہیں ہوتا کہ کس کی بے بسی دیکھ کر حضرت عباس کا جی بیٹھ گیا، اپنی یا حضرت سکینہ کی کسی کی بھی بے بسی ہو کیا حضرت عباس کی شجاعت اس کی مقتضی تھی کہ اُن کا جی بیٹھ جائے؟ اس سے بہتر تو یہ پہلو ہے کہ حضرت سکینہ کی پیاس اور اپنی بے بسی (جس کی وجہ حضرت امام حسین کے فرمان کی اطاعت تھی یعنی اُن کے ہنگامِ شہادت تک باوجود قدرت بچوں کو بھی آب و دانہ میسّر نہ ہو کیونکہ خوشنودیِ خالق اسی میں تھی) دیکھ کے حضرت عباس کا جی بھر آیا۔ جی بیٹھ جانے میں تو ہمت کی پستی مضمر ہے۔ عباس سا مردِ میدانِ وغا اور اس کا جی بیٹھ جائے! البتہ اپنی لاڈلی بھتیجی کے ندائی کا جی اُس کی مصیبت پر ضرور بھر آئیگا۔

"منہ پھوڑ کر مانگنا" شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر مانگنا ہے۔ اور حضرت سکینہ کی نسبت یہ کہنا کہ منہ پھوڑ کر پانی مانگا اُن کی شان کے منافی ہے۔ البتہ نایابیٔ آب کا علم ہوتے ہوئے بھی حضرت سکینہ کا پانی طلب کرنا صغر سنی کا تقاضا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی مثال ایسی پیش نہیں کی جا سکتی ہے جس میں منہ پھوڑ کے مانگنا اچھے مفہوم میں استعمال ہوا ہو؟ اس لئے دوسرا مصرع اس طرح ہوتا تو کہیں بہتر ہوتا۔

منہ پہ منہ رکھ کے سکینہ نے جو مانگا پانی

اس لڑائی میں یہی جیت کی اِک کنجی ہے مرتے مرتے کسی پیاسے کو نہ دینا پانی

شاید اس شعر میں جیت کی اِک کنجی (تین تین کافوں کا اجتماع) محض بربنائے "خالص اُردو" ہے مگر اس کی جگہ "فتح کی اک صورت" زیادہ سلیس و فصیح ہوتا۔ اور دوسرا مصرع اگر اس طرح لکھا جاتا تو بہتر ہوتا

مرتے مرتے بھی نہ پائے کوئی پیاسا پانی

کیونکہ اس طرح یہ بھی ظاہر ہوتا کہ کسی پیاسے کو صرف یہی نہیں کہ پانی دیا نہ جائے بلکہ اُسکو حصول آب سے بھی روکا جائے؟

گھات سے ہاتھ چلیں ایسی منجی چوٹوں کے مانگتا ہی نہیں جن چوٹوں کا مارا پانی

ہاتھ اور چوٹ دونوں میں سے ایک حشو ہے۔ اگر اس جگہ ہاتھ کے معنی ضرب یا چوٹ کے ہیں۔ تو "منجی چوٹوں کے ہاتھ" مہمل فقرہ ہو جاتا ہے؛ پالٹ کا ہاتھ، جنیو کا ہاتھ وغیرہ فقروں میں ہاتھ کے معنی وار یا ضرب یا چوٹ کے ہیں۔

بیدھڑک باگیں اُٹھا دیں جو یہ کہکر سب نے دیکھا اب سر سے ہوا جاتا ہے اونچا پانی

دوسرے مصرع میں لفظ دیکھا کا فاعل مقدر ہے۔ اور یہ باعتبار محاسن شعر عیب یا کمزوری ہے، خصوصاً جبکہ پہلے مصرع میں باگیں اُٹھانے والے دوسرے لوگ ہیں؛ البتہ یہی شعر اگر اس طرح لکھائے تو معائب سے پاک ہو جاتا ہے اور حملے کا بھی بہتر نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے ؎

باگیں اک ساتھ اُٹھا دیں جو یہ کہکر سب نے دیکھا غازی نے کہ سر سے ہوا اونچا پانی
عباس نے

یہ شعر اور اس کے بعد کا شعر جو درج کیا جاتا ہے قطعہ بند ہیں، اس میں بھی فاعل محذوف ہے۔

بل پڑے تیوروں پر، ہو گئی چتون کچھ اور تمتمانے لگا منہ ماتھے سے ٹپکا پانی

صحیح محاورہ تیوری پر بل آنا، یا تیوری میں بل پڑنا یا ابروؤں پر بل پڑنا ہے یا تیوروں پر بل پڑنا۔ ماتھے سے پانی ٹپکنا شرم و سکرات کی علامت ہے نہ کہ غیض و غضب کی۔ اور منہ تمتمانے کے ساتھ ماتھے سے پسینہ ٹپکنا غیر فطری امر ہے۔

آرزو ڈوب کے جب تھاہ لگائے تو کھلے اُتھلی ندی میں نہونے پہ ہے کتنا پانی

تھاہ لگانا زبان نہیں ہے بلکہ تھاہ لینا محاورہ ہے، اُتھلی ندی میں ڈوبنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ فرض کیجئے کہ ڈوبنے سے مطلب غوطہ لگانا اور تہ تک پہونچنا ہے تو کیچڑ میں لتھڑنے اور چند خزف ریزے چن لینے کے علاوہ کیا حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ ندی اُتھلی ہے! بحرِ ذخار کی غواصی کیوں نہ کی جائے کہ دُرہائے شاہوار ہاتھ آئیں؟

بہر حال پہلے مصرعہ میں لفظ کوئی کی کمی محسوس ہوتی ہے اور تھاہ لگانا ٹکسال باہر ہونیکے باعث یہ مصرع اگر اس طرح لکھا جاتا تو بے ڈھلک ہوتا؟

آرزو ڈوب کے جب تھاہ کوئی لے تو کھلے

اسی نمبر میں جناب آرزو کی ایک غزل اور چند رباعیاں بھی شائع ہوئی ہیں غزل میں دو تین اشعار ایسے ہیں کہ اگرچہ ان میں کوئی خاص بات تو نہیں تاہم غنیمت ہیں مگر باقی اشعار شک وشبہ سے خالی نظر نہیں آتے مثلاً کہنے آئے ہیں یہ اک بیمار غم سے کل مریض کر تھکے سب کچھ مسیحا اور شفا ہوتی نہیں

ایک بیمار غم کے پاس کل مریضوں کا آنا ایک عجیب سی بات ہے، پھر مریضوں کی بھی کوئی تخصیص نہیں، آیا محلہ بھر کے مریض آئے یا شہر بھر کے یا تمام ملک کے۔ خیر کل مریض آئے مگر آکر کہتے ہیں کہ مسیحا سب کچھ کر تھکے (”کر تھکے“ کتنا خوشگوار ہے) اور شفا نہیں ہوتی۔ بہت اچھا، لیکن مسیحا نے کس کے لئے سب کچھ کیا اور کس کو شفا نہیں ہوتی؟ یہ شاعر کے ذہن میں محفوظ ہوگا۔ معلوم نہیں کہ کل مریض مسیحا کے سب کچھ کرنے اور شفا نہ ہونے کا ذکر اپنے متعلق کرتے ہیں یا اُس ”اِک بیمار غم“ کے متعلق۔

بے مرے زندہ نہ ہوں گی یہ سسکتی حسرتیں انتہا جب تک نہ ہو لے ابتدا ہوتی نہیں

ایک عجیب نظریہ ہے، گویا سسکتی حسرتیں (سسکتی ہوئی حسرتیں ہونا چاہیئے) مرجانے کے بعد زندہ ہونگی، حالانکہ مرنے کے بعد کسی کا زندہ ہونا ناممکن ہے پہلے مصرعہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے دوسرے مصرعہ میں اسکا ثبوت اس خود ساختہ نظریہ سے دیا ہے کہ جب تک کسی چیز کی انتہا نہیں ہو جاتی اس وقت تک اسکی ابتدا نہیں ہوتی یہاں انتہا ہونے سے مراد ہے فنا ہو جانا اور کسی چیز کے فنا ہونے کے بعد اُس کا پھر پیدا ہونا ممکن نہیں غرض یہ شعر ایک عجیب وغریب نظریہ کا حامل ہے۔

کیا کرامت ہے ترے بیمار غم کی زندگی ضعف سے نوبت بجاں ہے اور غذا ہوتی نہیں

مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ تیرے بیمار غم کی زندگی بھی کیا کرامت ہے کہ ضعف کی وجہ سے اُسکی جان لبوں پر آگئی ہے اور غذا بھی نہیں ہوتی مگر وہ زندہ ہے۔ ”غذا ہونا“ ایک خاص

اصطلاح ہے، "اجابت ہونا" کی طرح، اور بعض اطبا و مرضا تک محدود ہے۔ طبیب مریض سے پوچھتا ہے "کہیئے کچھ غذا ہوئی؟" مریض جواب دیتا ہے "نہیں جناب! پانچ تولہ مونگ کی دال کا پانی تیار کرایا تھا، وہ بھی نہیں پیا گیا۔" مریض غم کی زندگی کرامت ہو یا نہ ہو مگر غذا ہونے کی مخصوص اصطلاح کو اُردو کی ادبیات میں شامل کردینا ضرور کرامت ہے۔

پہلے سوچ، اہتمام کر اس کے بعد تا پھر نہ ہو خواہش دگر اس کے بعد
فانی دنیا کی ہے ہر شے فانی چاہا جو کچھ ہوا۔ مگر اس کے بعد

رباعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا چوتھا مصرعہ بہت زوردار اور پوری رباعی کا حاصل ہونا چاہیئے اس رباعی میں چوتھا مصرعہ ہی ناقص معلوم ہوتا ہے جس سے رباعی کا حاصل واضح نہیں ہوتا۔ شاید شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ چاہا وہ ہوا تو مگر یہ سمجھنے کے بعد کہ فانی دنیا کی ہر شے فانی ہے، اگر یہ خیال صحیح ہو تو بھی چوتھے مصرعہ کی پیچیدگی وبے ربطی ظاہر ہے۔

آرزو صاحب نے بقول مدیر ادب "چند دنوں سے اپنے اوپر کچھ قیود عائد کرکے اور ایک محدود دائرہ میں رہکر شعر کہنا شروع کیا ہے۔ یہ ان کی ذاتی وانفرادی کوشش ہے، اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا اس کی پیروی کرے اور مروجہ اُردو کی جگہ یہی زبان لے لے۔ اگر کسی صاحب کو اس قسم کی محدود زبان نہیں مرغوب ہے تو وہ اسے نہ اختیار کریں۔" مدیر ادب کا ارشاد بالکل بجا مگر آرزو صاحب اس ذاتی اور انفرادی کوشش سے "اُردو کی بھی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اسکی بقا کی بھی صورت نکال رہے ہیں" یہ غور طلب ہے۔ چند متروک الفاظ یا عامیانہ محاورات واصطلاحات کو نظم کردینا کوئی خدمت زبان نہیں ہے۔

چندن (اپریل ۱۹۳۱ء)

چندن اگرچہ ابھی بزم ادب میں ایک نووارد عزیز کی حیثیت رکھتا ہے، تاہم ہمارے دوست جناب سدرشن کی کوشش سے ظاہری وباطنی دونوں حیثیت سے قابل دید ولائق مطالعہ ہے۔ نثر کے مضامین میں اکثر زبان کی خامیاں ہوتی ہیں اور ان کو نظر انداز کردینے کے بعد مضامین عموماً مفید ہوتے ہیں، نظم کا حصہ بھی بُرا نہیں ہوتا، مگر اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

پیش نظر نمبر میں متعدد نظمیں اور غزلیں ہیں۔ حضرت اختر شیرانی کی نظم "تاروں کی آبادی سے ایک آواز" جدید طرز کی نظم ہے اور اس لئے جدید خیالات کی حامل ہے۔

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے وہ آواز آہ جس کو نغمۂ بوئے رواں کہیئے

جو میرے دل کی گہرائی میں جا کر ڈوب جاتی ہے — وہ جس کو اک مقدس روح کا رازِ نہاں کہیے

آواز کو نغمہ کہنا تو درست ہے مگر "نغمۂ بے روان" تشریح طلب ہے ؎

جوانی کی حسیں راتیں مجھے بیدار رکھتی ہیں — میں تنہا دیکھتا رہتا ہوں اُن روشن ستاروں کو
مجھے افکار کی رنگینیاں سرشار رکھتی ہیں — نظر سے جذب رکھتا ہوں میں ان خوابی نظاروں کو

پہلے شعر میں تو "اُن روشن ستاروں" کی تشریح نہیں کی گئی، دوسرے شعر میں "افکار کی رنگینیاں" غور طلب ہے، افکار میں پریشانی ہوتی ہے نہ کہ رنگینی۔ پھر ان میں کسی کو سرشار بنا دینے کی تاثیر کہاں سے آگئی۔ علاوہ ازیں نظر سے خوابی نظاروں کو جذب رکھنا بھی ایک نئی بات ہے۔ کسی چیز یا نظارہ کو نظر میں جذب کیا جا سکتا ہے نہ کہ نظر سے۔ "جذب رکھتا ہوں" کی جگہ "جذب کرتا ہوں" ہوتا تو بہتر ہوتا۔

حضرت وقار انبالوی کی نظم "پریم کی گنگا" میں بھی کافی جدت کی گئی ہے۔ خصوصاً یہ کہ ہندی زبان کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ہندی کے الفاظ کا استعمال کرنا بہت خوب ہے، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ الفاظ صحیح اور برمحل استعمال کئے جائیں، ملاحظہ فرمائیے ؎

بہے جاتی ہے گنگا پریم کی میدان ہستی میں — لئے پھرتی ہے موجوں کو بلندی اور پستی میں

اس شعر میں "پریم" کی رے تقطیع سے خارج ہے اور "پیم" پڑھنے سے مصرعہ موزوں ہوتا ہے۔

اسی کے فیض نے تاروں کی محفل کو سنوارا ہے — اسی کے بل سے چندرماں نے سندر روپ دھارا ہے

"چندرماں" بہ سکون نون ودال ہے مگر یہاں دونوں حروف مفتوح نظم کئے گئے ہیں اور اس لئے اگر چندرماں کو اس کے اصلی تلفظ کے ساتھ پڑھا جائے تو شعر کا دوسرا مصرعہ ناموزوں ہو جاتا ہے۔

عناصر کا ہر اک پُتلا اسی کے بل سے بنتا ہے — جوانوں کا لہو اسکے پوتر جل سے بنتا ہے

اس شعر میں پوتر کو پوّتر نظم کیا ہے یعنی تے کو نہ صرف متحرک کیا بلکہ مشدد بھی کر دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ تصرف کسی طرح مناسب نہیں۔

"مجبوریاں" کے عنوان سے جناب اختر ایم۔ اے کی ایک غزل بھی اس نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ جو بہت ہی ناقص معلوم ہوتی ہے، خصوصاً مندرجہ ذیل اشعار نظر ثانی کے محتاج ہیں ؎

جان بھی آخر مرض کے ساتھ ہی چلتی بنی — ہم تری راہ لئے مسیحائے زماں دیکھا کئے
آشیاں باندھا مگر آسودگی کا ذکر کیا — کس طرح گرتی ہیں اس پر بجلیاں دیکھا کئے
آشیاں باندھا کئے ہر فصلِ گل میں ہمصفیر — اور ہم اپنے قفس کی تیلیاں دیکھا کئے
منزلِ مقصد پہ جا پہنچے عدم کے قافلے — ہم بسانِ نقشِ پائے رہرواں دیکھا کئے

ان اشعار کے محاسن و معائب کا پورا پورا اندازہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں، لہذا ان پر تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اختر صاحب سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ "آشیاں باندھنا" کہاں کا محاورہ ہے اور "ہم بسانِ نقشِ پائے رہرواں دیکھا کئے" کا کیا مطلب ہے۔ قطع نظر اس کے کہ "بسان" متروک ہو چکا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ "بسانِ نقش" پائے رہرواں دیکھا کئے یا "بسانِ نقشِ پائے رہرواں۔ اگر دوسری صورت ہے تو مصرعہ مہمل ہوا جاتا ہے اور پہلی صورت میں "بسانِ نقش" پائے رہرواں کا دیکھنا ایک عجیب بات ہے اس لئے کہ نقش پائے رہرواں تو دیکھے جا سکتے ہیں مگر "بسانِ نقش" پائے رہرواں کا دیکھنا ذرا مشکل ہے

نیرنگِ خیال (مئی ۱۹۳۱ء)

اس نمبر میں "رامائن کے چند مناظر" کے عنوان سے ایک طویل نظم جناب نفیس خلیلی کی شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ منظر بہت پر لطف ہے جس میں سیتا جی کو رام کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔ ایک سہیلی رام کی آمد کی خبر دیتی ہے، مگر تمہید کچھ ایسی بے ربط ہے کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کس کے متعلق ہے۔

صبحدم تازہ ہوا کھانے چلے — آنکھ کو پھولوں سے بہلانے چلے
کون اس گلشن میں جلوہ گر ہوا — باغِ رضواں سر بسر منظر ہوا
جھک کے شاخِ گل نے نرگس سے کہا — "کوئی آیا ہے پیاری دیکھنا"
گل کا یہ عالم ہمہ تن گوش ہے — سوسن جادو بیاں خاموش ہے
بوئے گل نے راہ میں روکا نہ کیوں — عندلیبوں نے انھیں ٹوکا نہ کیوں
پھول نے غصہ سے رنگت لال کی — "خوب غمازوں نے ہم سے چال کی"
نوعروسانہ حیا چھائی ہوئی — پیاری پیاری آنکھ شرمائی ہوئی
طبع نازک سخت گھبرائی ہوئی — سانس پھولی شکل کمہلائی ہوئی
روئے گلگوں پر عرق آیا ہوا — آنکھ نے دل پر ستم ڈھایا ہوا
حاضرِ خدمت سہیلی ہو گئی — بوجھنے کو اک پہیلی ہو گئی

تازہ ہوا کھانے کون چلے، اور گلشن میں کون جلوہ گر ہوا، کچھ معلوم نہیں ہوتا، پھر شاخ گل نے نرگس سے جو کچھ کہا خوب کہا مگر بوئے گل نے راہ میں کس کو نہ روکا؟ کچھ ظاہر نہیں ہوتا، علاوہ ازیں اس کا قائل

کون ہے، شاعر یا شاخِ گل ؟ "پھول نے غصہ سے رنگت لال کی" یعنی غصہ کی وجہ سے پھول کا رنگ لال ہوگیا، غصہ آنے کی وجہ کیا ہوئی ؟ "خوب غمازوں نے ہم سے چال کی" اِس کا قائل کون ہے ؟ اگر پھول کو قائل قرار دیا جائے تو دوسرے مصرعہ میں "ہم" سے شتر گربہ کا عیب پیدا ہوتا ہے۔ باقی اشعار میں غالباً سہیلی کی حالت ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن نوعروسانہ حیا کے ساتھ طبعِ نازک کا گھبرانا اور شکل کا کملانا ایک پہیلی ہے، اور "آنکھ نے دل پر ستم ڈھایا ہوا" خالص پنجابی محاورہ ہے۔ غرض پوری نظم ایسی ہی خوبیوں سے بھری ہوئی ہے۔

"معنیِ بیگانہ" کے عنوان سے "میرزا یگانہ علیہ السلام" کی ایک غزل ہے۔ میرزا یگانہ (یاس عظیم آبادی) کا نام و کلام محتاج تعارف نہیں۔ اس غزل کا یہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آتا ؎

پیرہن میں کیا سما سکتا حیاتِ جاں بلب   ہستیِ موہوم کا خوابِ پریشاں دیکھکر

"حیاتِ جاں بلب" یعنی جاں بلب کی حیات ؟

حمید صاحب جالندھری فرماتے ہیں ؎

امید یہ تھی کہ جلد لوٹ آؤ گے   آنکھوں میں نگاہ بن کے بس جاؤ گے
خط کیسا، کہاں کا نامہ، کس کا پیغام   ہم کیا ہیں جو ہمیں یاد میں لاؤ گے

"یاد میں لانا" خصوصیت سے داد طلب ہے۔ یاد کرنا۔ یاد آنا تو ہم نے ضرور سنا ہے مگر "یاد میں لانا" شاید پنجاب کے لئے مخصوص ہے اور اسی وجہ سے اب تک ہمارے کان اس سے نا آشنا ہیں۔

نقاد

ہندوستانی علوم وفنون

ہندوستان کے متعلق یہ کہنا ہٹ دھرمی نہ ہوگی کہ جس زمانہ میں اور ممالک میں علم و فن کا چرچا ہونا شروع ہوا وہ، وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں تمام علوم و فنون ترقی کے کل مدارج طے کر کے انحطاط و زوال کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس سے کہیں پہلے اپنی اپنی ایسی یادگاریں چھوڑ گئے تھے جو دوسروں کے لئے قابل رشک نمونہ بن سکتی تھیں..... چنانچہ بدھ کے زمانہ کی نقاشی اور سنگ تراشی کی بلاغت نے یورپ والوں کو بھی قائل کر رکھا ہے۔ ہومر۔ ڈانٹے اور شکسپیئر کا دم بھرنے والے مہابھارت۔ رامائن کی فوقیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسکائلس۔ سفوکلز اور یوری پیڈیز پر جان دینے والے میگھ دوت اور شکنتلا کا نام آتے ہی دم بخود ہو جاتے ہیں..... رنگ و روپ کی فوقیت غیروں کو مبارک، اپنا تو یہ پندار ہے کہ زمین کی زرخیزی اور دل و دماغ ہندوستان کے حصہ کی چیزیں ہیں۔

(ایوان)

کلامِ جوش

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ہنوز شعلہ ہے پردے میں منہ چھپائے ہوئے
مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں بے جلائے ہوئے

ہنوز قطرۂ نیساں ہے اور ضمیرِ سحاب
مگر صدف میں ہیں موتی سے جگمگائے ہوئے

کھلے ہوئے ہیں صدف میں ہزارہا نافے
اگرچہ زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے

ہنوز غیبتِ خورشید سے افق ہے اداس
تمام دشت کے ذرے ہیں جگمگائے ہوئے

رچی نہیں ہے فلک پر ہنوز شادیِ ابر
چمن کی خاک ہے خود کو دلھن بنائے ہوئے

ہنوز میان سے باہر نہیں ہوئی ہے وہ تیغ
پڑے ہیں کتنے مگر خون میں نہائے ہوئے

نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام
مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے

ضمیرِ سنگ میں خوابیدہ ہے جمالِ صنم
ابھی سے کتنے برہمن ہیں سر جھکائے ہوئے

چہک رہے ہیں عنادل لہک رہی ہے نسیم
ہنوز غنچۂ رنگیں ہے سر جھکائے ہوئے

سلگ رہے ہیں برابر ہزارہا خرمن
ہنوز ابر میں بجلی ہے منہ چھپائے ہوئے

خبر ہے جوش اٹھے گی کسی کی آنکھ ادھر
دلوں کو لوگ کلیجہ سے ہیں لگائے ہوئے

ماخوذ

سرائے فانی

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

ہماری شہرت، یہ جاہ و حشمت یہ مال و دولت، یہ اوجِ رفعت
ہر ایک شے ہے یہاں کی فانی

بقا نہیں ہے کسی کو اس جا ہوا ہے دنیا میں جو کہ پیدا
فنا ہے آخر اُسی کو آنی

ہو خواہ وہ شاہِ ہفت کشور اگرچہ قسمت کا ہو سکندر
نہ کام آئے گی حکمرانی

نہ کام آئے گی کبر و نخوت نہ یہ حکومت نہ یہ ریاست
چلے گی ہرگز نہ لن ترانی

کہاں ہے قارون سا تو انگر؟ کہاں ہے نمرود سا ستمگر؟
نہیں تھا جن کا جہاں میں ثانی

کہاں ہے جم اور کہاں ہے دارا؟ کہاں ہے فرعونِ عہدِ موسیٰ؟
کہاں ہے باغِ ارم کا بانی؟

کہاں ہیں نقش و نگارِ آذر؟ کہاں ہیں نقاش اور بت گر؟
کہاں ہیں بہزاد اور مانی؟

کوئی ہے معصوم عہدِ طفلی کوئی ہے پامال ضعف و پیری
کسی کو ہے نشۂ جوانی

فنا کا ہے ہاتھ سب کے سر پر ہر اک پہ پھرتا ہے "کال چکر"
نہیں ہے ممکن پناہ پانی

عبث ہے مغرور پھر بھی انساں نہیں سمجھتا ہے اتنا ناداں
کہ ہے یہ دنیا سرائے فانی!

شریجت گنیش شنکر ودّیارتھی مرحوم

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

تجھ کو اے ودّیارتھی محزونیِ جاں کی قسم اپنے دل کے درد کی اور اُسکے درماں کی قسم
جس پہ تو یوں مٹ گیا اُس عہدِ پنہاں کی قسم تجھ کو اپنے دین کی اور اپنے ایماں کی قسم

سچ بتا ہاں، کون سا تھا وہ خیالِ پُراُمید؟
جو بنا کر ہی رہا آخر تجھے اپنا شہید!

ہندو و مسلم کے مِل جانے کا تو حامی رہا میل کی خاطر ہی تو نے آہ کتنا دکھ سہا
آپ تو اپنے دلی جذبات کی رَو میں بہا جان ہی دے کر کیا پورا اُسے، جو کچھ کہا

آج ہم سب کے لئے تو اے فدائے اتحاد!
ہو کے قرباں بن گیا ہے رہنمائے اتحاد!

جیسے منظر آشکارا ہو اندھیری رات کا ساتھ ہی ہو چرخ پر چھائی ہوئی کالی گھٹا
ہو یہ حالت بھولے بھٹکوں کیلئے تشویش زا تو اُسی دم دفعتاً ہو برقِ تاباں کی ضیا

بہرِ دل جس طرح ہوتی ہے وہی تسکیں مآب
یوں ہی تو رخصت ہوا دکھلا کے اپنی آب و تاب

آہ تو رخصت ہوا یا اِک سماں رخصت ہوا جرأت و ایثار کا اِک اِک نشاں رخصت ہوا
جس میں ندرت تھی وہ اندازِ بیاں رخصت ہوا لطفِ نظم و نثر اور لطفِ زباں رخصت ہوا

شان وہ "پرتاپ" کی شانِ ادارت تھی بنی
تیری جوہر گستری جانِ ادارت تھی بنی

علم تھا اور ساتھ ہی اُسکے عمل پرواز تھا — تو غریبوں کا سدا ہمدرد تھا، ہمراز تھا
انکسارِ طبع سے تو کس قدر ممتاز تھا — خدمتِ قومی کو تیری خدمتوں پر ناز تھا

رشک کے قابل رہی جس طرح تیری زندگی
رشک کے قابل ہے اب اس طرح تیری موت بھی

گرچہ تھا اپنا ہی اُجڑا گانوں تیرا بھی وطن — اپنی یکتائی سے تھا تو واقعی فخرِ زمن
گو ہے تیری موت سے دل وقفِ آلام و محن — پھر بھی یہ اک بات تسکیں کا سبب جاتی ہے بن

باخبر ہو کر جیا اور باخبر ہو کر مرا،
تو مرا لیکن حقیقت میں امر ہو کر مرا!

(جناب اقبال ورما سحر ہنگامی)

رنگِ فنا کو دیکھ جہانِ خراب میں — دریا میں ہے حباب کہ دریا حباب میں
بھولے اگر خدا کو کبھی اضطراب میں — یہ تو نہیں گناہ ہمارے حساب میں
فیاض و فیض میں بھی وہی فرق جانیئے — جو روز آفتاب و شب ماہتاب میں
ممکن نہیں زمانہ میں دلبر ہو دلنواز — کیا کیا فریب دیتی ہیں موجیں سراب میں
بلبل میں ہے جو نغمہ تو گل میں شمیم ہے — کتنا وہ بے حجاب ہے ہو کر حجاب میں
حالِ عدم سے جب کوئی واقف نہ ہو سکے — پھر کیا ہوا تمیز عذاب و ثواب میں

وہ آئے سحر کیا دلِ شیدا ہی پھر گیا
گھبرا گئے ہم آپ وفا کے حساب میں

لطفِ سخن

(جینی سرشار خیرپور سادات)

ستم سہتا ہوں اور شکرِ ستم ایجاد کرتا ہوں
نہ وہ فریاد سنتا ہے نہ میں فریاد کرتا ہوں

مری بے چین امیدو! مرے بے صبر ارمانو!
مرے دل سے نکل جاؤ تمہیں آزاد کرتا ہوں

یہ انجامِ محبت خون کے آنسو رُلاتا ہے،
وہ آغازِ محبت کا زمانہ یاد کرتا ہوں

زمانہ کس قدر بے درد ہے نغمے سمجھتا ہے،
زبانِ بے زبانی میں اگر فریاد کرتا ہوں

مجھے ضبطِ فغاں کے فائدے معلوم ہیں ہمدم
بہت مجبور ہو کر شکوۂ صیاد کرتا ہوں

(قاضی اختر جوناگڈھی)

دل کو دل سے جو ایک نسبت ہے
نام اسی کا جہاں میں الفت ہے

نوشِ عشرت میں نیشِ حسرت ہے
وصل صبر آزمائے فرقت ہے

تم کو اُلفت نہ مجھ سے ہو نہ سہی
کب کسی سے مجھے عداوت ہے

جستجو میں کسی کی مر مٹنا
عاشقوں کی یہی شہادت ہے

روزِ محشر کا غم نہیں اختر
سوءِ اعمال کی ندامت ہے

(جناب سید حسن صاحب سید)

کوششیں دل کی محبت میں نمایاں ہو گئیں
قطرہ قطرہ آرزوئیں بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

چلتی پھرتی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں

تھا پریشانی میں مضمر کامیابی کا حصول
دل سے کب نکلی ہیں آہیں جب پریشاں ہو گئیں

امتدادِ مدتِ غم نے بدل دیں صورتیں
جس قدر چوٹیں تھیں دل میں راحتِ جاں ہو گئیں

شرم آلودہ نگاہیں برق بنکر گر پڑیں
شوخیاں اُنکی جنونِ فتنہ ساماں ہو گئیں

قہر تھا حدِ تعین سے گذرنا قہر تھا
مشکلیں کچھ بڑھ گئیں کیا خاک آساں ہو گئیں

صنفِ نازک نے مسخر کر لیا سارا جہاں
اس زمانہ کی تو پریاں بھی سلیماں ہو گئیں

کیا شمار اُنکا جو نکلیں آرزوئیں عشق میں　　مشکلیں ہی وہ نہ تھیں جنکیں جو آساں ہو گئیں

(از جناب منظور حسین ماہر القادری)

ذرا اے اہلِ محشر داد دینا خونِ بسمل کی　　وفا آمیز ہیں گلکاریاں دامانِ قاتل کی
سُنانے کو سنا دوں میں مگر سُن بھی سکو گے تم　　کہانی دل کی اور وہ بھی کسی ٹوٹے ہوئے دل کی
طلسمِ ہستی موہوم کی اتنی حقیقت ہے　　نمایاں ہو گئی ہیں مختلف کیفیتیں دل کی
سرورِ زندگی اک کیف ہے صہبائے باطل کا　　خیالِ نیستی اک موج ہے کیفیتِ دل کی
وہ ذوقِ دید میں عنوانِ الفت جس کو سمجھا تھا　　حقیقت میں وہ اک تمہید تھی بربادیٔ دل کی
شبِ راحت بھی ان دُھڑکوں نے ماہر بے مزہ کر دی　　کہ اب آیا سحر کا وقت اب تاروں نے جھلمل کی

رباعیات

(از جناب روش صدیقی)

من خارم و با گلاب ربطے دارم　　داغم و بہ ماہتاب ربطے دارم
ہر چند بہ کافرے دہم ایماں را　　زاہدا بہ رہِ صواب ربطے دارم

گہوارۂ انبساط، کاشانۂ ما　　رنگینیٔ کائنات، میخانۂ ما
ہر لحظہ شرابِ معرفت می نوشیم　　لبریزِ تجلیات پیمانۂ ما

مجبورِ تحسرات! پیمانہ بگیر　　بربادِ تغیرات! پیمانہ بگیر
ایں لوحِ طلسمِ گردشِ ایام است　　ناشادِ غمِ حیات! پیمانہ بگیر

چوں شمعِ حیات سوگوارے دارم　　در سینہ بجائے دل شرارے دارم
عمرِ تو دراز باد! اے زلف بدوش　　زود آ کہ ہنوز انتظارے دارم

یادِ رفتگاں

مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم

مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب والیِ ریاست محمود آباد (اودھ) جن کا انتقال ۲۲ مئی ۱۹۳۱ء کو ہوا ہے، ایک مشہور خاندانی رئیس و قومی کارکن تھے مہاراجہ مرحوم کا خاندان خان زادہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سلطان شہاب الدین غوری کے عہدِ سلطنت میں ہندوستان آئے تھے اور امروہہ میں سکونت اختیار کی تھی، آپ کے خاندان کے افراد تین نسل تک دہلی میں قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، حتیٰ کہ ۱۳۴۵ء میں سلطان محمد تغلق نے قاضی نصرت اللہ صاحب کو اودھ کی طرف اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ بھارون کو جو آجکل بلہرہ کے نام سے مشہور ہے فتح کریں قاضی صاحب کی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں ان کو فتح پور کے قریب ایک بڑی جاگیر عطا کی گئی۔ قاضی صاحب کے بعد شیخ نظام اور غلام مصطفےٰ صاحبان یکے بعد دیگرے جاگیر کے وارث ہوئے۔ غلام مصطفےٰ صاحب کے دو بیٹے تھے (۱) شاہ محمد (بانی تعلقہ بھٹوامئو) اور (۲) داؤد خاں، جو شہنشاہ اکبر کی فوج میں مناصبِ عالیہ پر ممتاز ہوئے اور خان بہادر و نواب کے خطابات پائے۔ آپ کے خاندان کے ایک فرد بایزید خاں صاحب تھے جنھوں نے محمود آباد کی بنیاد قائم کی تھی۔ بایزید خاں صاحب جونپور کے فوجدار تھے، اور عمدۃ المعالی، امیر الملک، غضنفر الدولہ مظفر جنگ کے خطابات سے ممتاز تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد ریاست تین حصوں میں منقسم ہو گئی، اور محمود آباد کی ریاست سب سے چھوٹے لڑکے ہدایت خاں صاحب کے حصہ میں آئی۔ بعد ازاں نسلاً بعد نسلٍ ۱۸۳۵ء میں یہ ریاست نواب علی خاں صاحب کے قبضہ میں آئی۔ نواب علی خاں صاحب کے فرزند امیر الدولہ سعید الملک ممتاز جنگ راجہ سر محمد امیر حسن خاں صاحب تھے جو اپنے والد کے انتقال کے وقت صرف نو برس کے تھے اسلئے ریاست کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ آپ نے سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد عنانِ ریاست اپنے ہاتھ میں لی اور ۱۸۷۱ء میں پبلک خدمات کے صلہ میں امیر الدولہ سعید الملک ممتاز جنگ خطاب پایا۔ ۱۸۸۳ء میں خان بہادر کا خطاب ذاتی ملا جو بعد

میں موروثی قرار پایا، پھر ۱۸۹۳ء میں کے۔سی۔آئی۔ای کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۲ء میں راجہ امیر حسن خاں صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند رشید مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب مرحوم تخت نشین ہوئے۔

مہاراجہ مرحوم اعلیٰ تعلیم یافتہ، فیاض، نیک سیرت و دردمندِ قوم شخص تھے، خصوصاً تعلیمی و قومی معاملات سے آپ کو بہت دلچسپی تھی، اسی کی بنا پر مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ، سائنس کالج علیگڈھ کو چھ ہزار اور میڈیکل کالج لکھنؤ کو پچاس ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا، چنانچہ آپ مسلم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک آپ صوبہ متحدہ کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۱۰ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب کئے گئے۔ اسی سنہ میں آپ نے محمود آباد میں ایک ہائی اسکول قائم کیا جسکا افتتاح سر جان ہیوٹ گورنر صوبہ متحدہ نے کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کونسل آف اسٹیٹ کے رکن بنائے گئے، اور ۱۹۲۱ء میں سر ہارکورٹ بٹلر گورنر صوبہ متحدہ نے آپ کو اپنی گورنمنٹ کا ہوم ممبر منتخب کیا ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرمائی۔ گول میز کانفرنس کی شرکت کیلئے بھی آپکو دعوت دی گئی تھی مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے آپ نے انکار کر دیا تھا۔ آپکو گورنمنٹ کی جانب سے سر اور مہاراجہ بہادر کے خطابات عطا ہوئے تھے، غرض مہاراجہ مرحوم گورنمنٹ کے وفادار اور رعایا کے بہی خواہ تھے

تعلیمی اداروں کے علاوہ مہاراجہ مرحوم کی فیاضی کے اکثر واقعات زبان زد خاص و عام ہیں، آپ بہت رحمدل و نیک طینت تھے یتیموں اور بیواؤں کی امداد اور حاجتمندوں کی حاجتیں پوری کرنیمیں آپکو بہت مسرت ہوتی تھی، مہمان نوازی و سیر چشمی خاندانی امتیاز تھا۔ آپ غریبوں کی امداد اکثر کرتے تھے اور اسطرح کہ دوسروں کو اسکی خبر نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ آپ عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھے مگر آپکی فیاضی و سخاوت سے ہر حاجتمند مستفیض ہوتا تھا

افسوس کہ ایسے وقت میں جبکہ ملک کو آپکی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت تھی آپ نے چون سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ مسلمانوں کی بہی خواہی کے ساتھ ہی ملک کے خیر خواہ بھی تھے اور ہندو مسلم اتفاق و اتحاد کے زبردست حامی تھے، نہرو رپورٹ کی تیاری میں آپ کا بہت بڑا حصہ تھا، اور بعض ذی اثر مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود آپ نہرو رپورٹ کے ہمیشہ حامی رہے۔ حال میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی قائم کرنے میں بھی مہاراجہ مرحوم نے سعی بلیغ فرمائی تھی۔

غرض مہاراجہ مرحوم کی ذات مجموعۂ صفات تھی، آپ کا انتقال ایک قومی و ملکی حادثہ ہے جس پر اہل ملک ماتم کر رہے ہیں۔ خدائے تعالیٰ آپ کی روح کو غریق رحمت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے

مولوی مہدی حسن ناصری مرحوم

افسوس مولوی مہدی حسن صاحب ناصری ایم۔ اے (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڈھ) کی ناوقت وفات سے صوبہ کے تعلیمی حلقوں میں ایک خاص جگہ خالی ہوگئی ہے جسکا پُر ہونا آسان نہیں ہے، آپ اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت اور تبحر علمی کی وجہ سے صوبہ کے تعلیم یافتہ جماعت میں خاص طور پر مشہور تھے، آپ عربی و فارسی و انگریزی کے علاوہ عبرانی و جرمن زبانوں سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔

ابتدا میں آپ تھابرن کالج لکھنؤ میں معلم کی حیثیت سے ملازم ہوئے بعد ازاں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں فارسی کے پروفیسر ہوگئے۔ پھر ہائی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی سینٹ، صوبہ کی ٹکسٹ بک کمیٹی اور ہندوستانی اکیڈیمی کے ممبر تھے۔ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ ہائی اسکول ایجوکیشن اور دوسری تعلیمی کمیٹیوں کے بھی آپ ایک معزز رکن تھے اور انٹرمیڈیٹ کے اُردو فارسی اور عربی کمیٹی کے صدر تھے اور ہر جگہ اپنے فرائض نہایت نیک نیتی و جانفشانی سے انجام دیتے تھے۔

فارسی نصاب کی چند کتابیں اور فارسی کی قواعد بھی آپ نے مرتب کی تھی جو بہت مقبول ہوئی، صنادید عجم پر ایک مستقل رسالہ اور کارلائل کے ایک رسالہ کا ترجمہ "سرور انبیا" بھی آپ کی یادگار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ ایک خوشگو شاعر بھی تھے اور ۱۹۲۷ء میں کانپور میں "انجمن آئینۂ ادب" کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت فرمائی تھی۔ آپ کا مذاقِ سخن نہایت ستھرا تھا، آپ کے کلام میں لطف زبان کے علاوہ سوز و گداز کی بھی پوری تاثیر تھی۔

پروفیسر اور ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے آپ نے اپنی ذمہ داری کو ہمیشہ بوجہ احسن پورا کیا جس جگہ رہے ہر دلعزیز رہے۔ آپ طبعاً خوش اخلاق، خندہ جبیں اور صلح کل واقع ہوئے تھے۔ سب سے بڑی بات آپ کی سیرت میں یہ تھی کہ تحصیل علم و کسب معیشت دونوں کام ساتھ ساتھ کئے، اور فکر معاش کے ساتھ تحصیل علم کا مشغلہ آخر عمر تک جاری رکھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی لیکن آپ نے زمانہ ملازمت میں علوم مغربی میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

افسوس کہ مئی ۱۹۳۱ء کے دوسرے ہفتہ میں آپ نے بمرض فالج انتقال فرمایا۔ خدائے تعالیٰ آپ کی روح کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

علمی خبریں اور نوٹ

۱۹۲۷ء کے بعد کی ہندی اردو مطبوعات نثر کے متعلق ہندوستانی اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے مندرجہ ذیل دو کتابوں کے مصنفوں کو پانچ پانچ سو روپیہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے :-

(۱) مانو شریر رہس (ہندی) مصنفہ ڈاکٹر مکند سروپ ورما

(۲) صدائے برق (اردو) مصنفہ مسٹر آفتاب عمر

نیز اس سال کی مندرجہ ذیل مضامین کی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا گیا ہے :-

(۱) نثر میں کسی بہترین ناول یا مختصر افسانوں کے مجموعہ پر جو ایک ہی مصنف کے لکھے ہوئے ہوں اور یکم جنوری ۱۹۲۸ء کے بعد شائع ہوئے ہوں پانچ سو روپیہ انعام دیا جائیگا۔

(۲) علمی سائنس۔ علم ادویہ۔ انجنیرنگ۔ علم اصطلاحات، زراعت صنعت و حرفت وغیرہ یا ان علوم کی کسی شاخ یا شعبہ کی کتاب پر جو یکم جنوری ۱۹۲۸ء کے بعد شائع ہوئی ہو پانچ سو روپیہ انعام دیا جائیگا۔

دو انعام اردو کی کتابوں پر اور دو ہندی کی کتابوں پر علحدہ علحدہ دیئے جائیں گے۔

انعام کے لئے کتابیں یکم اگست ۱۹۳۱ء سے پہلے سکریٹری صاحب کے پاس پہونچ جانا چاہیئے، ہر کتاب کی سات سات جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔

آل انڈیا ہندی ساہتیہ کانفرنس کے گذشتہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں راجہ گوکل چند صاحب رئیس بنارس نے ہندی کتب کی اشاعت کیلئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے اور الہ آباد میں ہندی ادبی عجائب خانہ بنانے کیلئے شریمت بہادر سنگھ جی نے ساڑھے بارہ ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔ ہندی زبان کی بہترین مصنف خاتون کیلئے شریمت سیتارام صاحب نے پانچسو روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ فرمایا۔ کاش حامیان اردو بھی اردو کی اشاعت و توسیع کی خاطر مالی ایثار کریں۔

منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی جو ایک خوش فکر سخنور ہیں اور جنکا کلام زمانہ میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے آجکل "والمیکی رامائن" کا اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

اس ماہ کی تصاویر میں سر رابندر ناتھ ٹگور کی ایک تازہ تصویر ہدیۂ ناظرین ہے پچھلے ماہ آپکی سترھویں سالگرہ منائی گئی۔ خدا کرے عرصہ دراز تک آپکا سایہ ملک پر قائم رہے۔

زکام، کھانسی و دمہ خشک و تر

[illegible]

امرت دھارا [illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible] امرت دھارا کارخانہ امرت دھارا بھون - امرت دھارا ڈاکخانہ - امرت دھارا روڈ لاہور [illegible]

پنڈت شری رگھوبر نرائن مطبوعہ ہیرالال پریس کانپور

منشی دیانرائن نگم بی۔ اے۔ ایڈیٹر و پبلشر